مئی 2012

کرن

اس شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ

موسم گرما اور آپ

حمد — شام درانی — 11

نعت — مولانا محمد علی جوہر — 11

بیادِ خصوصی گاہیں

اپنی ذات میں انجمن — نگہت سیما — 12

انٹرویو

عروسہ صدیقی — شاہین رشید — 17

دو کا پہاڑہ — ثروت گیلانی — 21

آواز کی دنیا سے — بینش ناصر خان — 29

مجھ سے ملیے — نفیسہ سعید — 26

ناول

دستِ کوزہ گر — فوزیہ یاسمین — 180

دردِ دل — نبیلہ عزیز — 34

مکمل ناول

وہی تو ہے — عظمیٰ افتخار — 64

ناولٹ

ہم معتبر ٹھہرے — ام مریم — 142

وفا کے راستے — نسرین نکہت سبزواری — 200

بڑی ماں — سحر ساجد — 101

پری — ریحانہ امجد بخاری — 230

افسانے

پاکباز — نادیہ امین — 126

چاند کی تلاش — عائشہ ریاض — 59

بند گلی — سندس جبین — 219

بھرم — خدیجہ مغل — 247

عکس — عتیقہ ملک — 254

دھوپ کا روپ — ملیحہ رفیق — 166

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو — شعاع عمیر — 266

یادوں کے دریچے سے — بشریٰ محمود — 269

مجھے یہ شعر پسند ہے — شگفتہ سلیمان — 271

مسکراتی کرنیں — ریحانہ امجد بخاری — 273

کرن کا دسترخوان — خالدہ جیلانی — 276

حسن و صحت — ادارہ — 279

نہلے پہ دہلا — ذوالقرنین — 282

نامے میرے نام — مدیرہ کرن — 285

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

مئی 2012

جلد 35 شمارہ 2

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

اداریہ

مئی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

زندگی سمندر کی طرح وسیع اور بے پایاں ہے۔ جس کا صرف ایک ہی کنارہ، ایک ہی ساحل ہے۔ جو لوگ دوسرے کنارے کی خبر لینے گئے، ابھی تک نہیں لوٹے۔ یہ ہی نظام قدرت ہے۔ انسان ایک خاص وقت میں پیدا ہوتا اور پھر ایک مقررہ شدہ لمحے میں رخصت ہو جاتا ہے۔ زندگی ان ہی دو نکتوں کے درمیان سفر کرتی ہے۔

زندگی بے ثبات ہے لیکن ایک خوبصورت اور بامقصد زندگی کا اختتام کبھی نہیں ہوتا۔

محمود ریاض صاحب کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک بامقصد زندگی گزاری بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ساری زندگی وہ خوب سے خوب تر کی جدوجہد کرتے رہے۔ علم و ادب کی ترویج میں انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ایک شجر سایہ دار تھے جو زمانوں کے تند و تیز موسم خود پر سہہ کر دوسروں کو فرحت بخش چھاؤں بخشتے رہے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی یادوں کے چراغ سدا روشن رہیں گے۔

9 مئی کو محمود ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر قارئین کرام سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو درگزر کرے۔ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ (آمین)

اس شمارے میں،

- بیاد محمود ریاض ـ "اپنی ذات میں انجمن" نگہت سیما کے قلم سے،
- اداکارہ "عروسہ صدیقی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "ثروت گیلانی" در کے پہاڑ کے ساتھ،
- "آواز کی دنیا سے" آر جے "بینش نامر خان" کی باتیں،
- "مجھ سے ملیے" میں "نفیسہ سعید سے ملاقات،
- "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل"، نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "وہی تو ہے" عظمیٰ افتخار کا دلچسپ مکمل ناول،
- ام مریم، نسرین نکہت سبزواری، سحر ساجد اور ریحانہ امجد بخاری کے دلچسپ ناولٹ،
- نادیہ ایمن، عائشہ فیاض، سندس جبیں، خدیجہ مغل، عتیقہ ملک اور ملیحہ رفیق کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "موسم گرما اور آپ"، ہر شمارے کے ساتھ مفت پیش خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

حمد باری تعالیٰ

چاند اور ستاروں والی جس کی کہانیاں ہیں
سورج کے ڈوبنے میں جس کی نشانیاں ہیں

جس کی نشانیوں میں دن کا ہے یہ سویرا
سوچو تو کون ہے وہ؛ اللہ ہے وہ میرا

بارش کا قطرہ قطرہ دریا کا بہتا پانی
سارے سمندروں پر ہے جس کی حکمرانی

ہے پانیوں کا جس کے خشکی کے گرد گھیرا
سوچو تو کون ہے وہ؛ اللہ ہے وہ میرا

جنگل، پہاڑ، میداں، جھیل، آبشار، چشمے
فرش زمیں پہ سارے کس کے ہیں یہ کرشمے

کس کی زمیں پہ آخر کرتے ہیں ہم بسیرا
سوچو تو کون ہے وہ؛ اللہ ہے وہ میرا

شام درانی

نعت رسول مقبول ﷺ

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہے درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

مولانا محمد علی جوہر

اپنی ذات میں انجمن

نگہت سیما

وہ جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ ہمارے دل و روح اور خون کے رشتے بندھے ہوتے ہیں' ان کا ہم پر بہت حق ہوتا ہے کہ ہم انہیں اپنے ہر لمحے میں یاد رکھیں اور ہم یاد بھی رکھتے ہیں۔

وہ ساری باتیں جو ہم نے ان سے کی ہوتی ہیں۔ وہ سارے لمحے جو ان کے ساتھ گزرے ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے کشور دل پر لحہ لحہ دستک دیتے ہیں۔ رلاتے ہیں' تڑپاتے ہیں۔ لیکن اپنوں سے متعلق کچھ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ قلم چلتا ہی نہیں۔ لفظ ملتے ہی نہیں۔ کہیں کھو جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے جب ریاض صاحب سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو میں بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔ اس دن جب اچانک ان کا فون آیا کہ وہ ہمارے گھر آ رہے ہیں تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ ہمارے گھر آئیں گے۔

"بھلا کیا آپ سچ مچ ہمارے گھر آئیں گے؟"

"ہاں۔" وہ ہولے سے ہنسے۔

"کیا میں آپ کے گھر نہیں آسکتا؟"

"کیوں نہیں سر! لیکن کراچی اتنا دور ہے۔ اس لیے مجھے حیرت ہوئی ہے کہ آپ اتنی دور سے..." میں نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"دراصل ہم لوگ لاہور آئے ہوئے ہیں اور ہم نے ایک دن بعد راولپنڈی جانا ہے... اور ہم نے سوچا کہ آپ سے بھی ملتے چلیں۔"

"جی ضرور... راولپنڈی سے تو صرف ڈیڑھ گھنٹے کا رستہ ہے اور آپ پلیز ضرور آیئے گا۔ کہیں پروگرام کینسل نہ کر دیجیے گا۔"

"دیکھیے پروگرام تو ہے' پوری کوشش کریں گے اگر آسکے تو..."

اب وہ میری بے تابی کو انجوائے کر رہے تھے شاید۔

"نہیں پلیز آپ ضرور آیئے گا۔ کوشش نہیں بلکہ ہر صورت آنا ہے۔"

"ارادہ تو پکا ہے... لیکن ہو سکتا ہے نہ بھی آسکیں۔ راولپنڈی سے ہی واپسی کا پروگرام بن جائے۔ دراصل آؤٹ آف وے ہے آپ کا شہر۔"

"نہیں پلیز..." میں نے التجا کی۔

مجھے لگا جیسے وہ بات کرتے ہوئے مسکرا رہے ہوں۔

"اچھا ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ مس امتل اور رضیہ جمیل بھی ہوں گی اور ہم صرف گھنٹہ بھر کے لیے آئیں گے۔"

"خیر' وہ تو دیکھا جائے گا۔ آمدن بہ ارادت رفتن باجازت۔"

میں نے اللہ حافظ کہا اور ریسیور رکھ کر ابو کے کمرے میں گئی... ابو اور امی جان کو بتایا۔ لبنی اور بڑی بھابھی کو فون کر کے بتایا کہ "وہ جو ریاض صاحب نہیں ہیں خواتین ڈائجسٹ والے اور ابن انشا کے بھائی وہ کل آئیں گے' امتل بھی ہوں گی" اور جھٹ پٹ انہیں بھی دعوت دے ڈالی کہ وہ بھی کل آجائیں... اگر ان سے ملنا چاہتے ہیں۔

دوسرے دن صبح سے ہی مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔

پتا نہیں آئیں گے یا نہیں... کیا خبر نہ ہی آئیں۔ بے چین ہو کر لاہور فون کیا حنا کے آفس میں۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے ہیں... اور ان کا ارادہ ہے کہ راولپنڈی میں جو کام ہے' اس سے فارغ ہو کر وہ میری طرف آئیں گے۔

دل کو تسلی ہوئی۔

اور یوں ان سے پہلی بار ملی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت سخت مزاج کے اور کچھ کچھ مغرور سے بھی ہوں گے۔ لیکن ان سے ملنے اور بات کرنے سے پتا چلا کہ وہ تو بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق ہیں۔ چند لمحوں بعد ہی ہم سب امتل' رضیہ جمیل' ریاض صاحب' ابا جان اس طرح گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے بہت عرصہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ذرا سی بھی اجنبیت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ بہت اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔

"دراصل ہم آپ کے شہر میں آنے سے کچھ جھجک

رہے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کیسا شہر ہے' کیسے لوگ ہیں۔ کیا خبر کوئی بہت پسماندہ علاقہ ہو۔"

انہوں نے باتوں کے دوران کہا۔

"لیکن آنا بھی ضروری تھا کہ وعدہ کیا تھا' اگر نہ آتے تو آپ کو افسوس ہوتا۔"

"شکریہ کہ آپ آگئے' ورنہ افسوس نہیں مجھے بہت دکھ ہوتا اور جہاں تک شہر کی بات ہے۔ یہ اتنا بھی غیر معروف نہیں ہے۔ کرشن چندر نے اپنی کہانیوں میں اس کا ذکر کیا ہے اور اسے "گلابوں کا شہر" کہا ہے۔"

میں نے جواب دیا تو فوراً" بولے۔

"اچھا۔۔۔ لیکن گلاب ہیں کہاں؟؟"

"یہ۔۔۔"

شیریں نے یک دم اپنی طرف اشارہ کیا تو اس کی حاضر جوابی پر وہ بہت زور سے ہنسے۔

ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت گزر گیا۔ میں نے تصویریں بنائیں۔۔۔ لیکن ریل جانے کب سے کیمرہ میں پڑی تھی اور فلش نے بھی صحیح کام نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے تصویریں کلیئر نہ آئیں۔ جس کا مجھے آج بھی افسوس ہے۔

"آپ لوگ بہت تھوڑے وقت کے لیے آئے ہیں۔"

ہم سب کو ہی اس کا افسوس تھا۔ ابو کو' شاہدہ کو' مجھے۔۔۔

"ہاں ہمیں بھی اب افسوس ہو رہا ہے' کاش زیادہ وقت ہوتا۔۔۔"

"پھر کبھی آئیے۔۔۔ اور زیادہ دنوں کے لیے۔ آپ کو کلر کہار وغیرہ کی سیر کو لے کر چلیں گے۔ ہمارے اردگرد کے پہاڑوں کا حسن آپ کو اسیر کر لے گا۔"

"ضرور۔ ان شاء اللہ کبھی پھر پروگرام بنائیں گے تو زیادہ وقت لے کر آئیں گے۔"

لیکن پھر وہ کبھی نہیں آئے۔ دوسری بار جب میری ان سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو میں نے فوراً" گلہ کیا کہ" آپ نے وعدہ کیا تھا سب کے ساتھ پھر آئیں گے

اور اب تو ڈرنے والی بھی کوئی بات نہ تھی۔ تجربہ تو ہو چکا تھا۔"

میری ڈرنے والی بات پر وہ مسکرائے۔

"خیر ڈرے تو ہم تب بھی نہیں تھے۔ بس ذرا اجنبی جگہ پر جانا ہو تو تذبذب تو ہوتا ہی ہے نا اور پتا نہیں تب بھی کیسے پروگرام بن گیا تھا۔ ورنہ یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہے اور اب تو کچھ طبیعت بھی گڑبڑ سی رہتی ہے۔ ابھی بھی کتنے دنوں بعد آفس آیا ہوں۔"

"ہاں مجھے امتل نے بتایا ہے۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں' تب ہی آفس آیا ہوں۔"

دراصل میں ایک ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کے لیے کراچی گئی تھی اور رات ہی میں کراچی پہنچی تھی اور صبح سب سے پہلا فون میں نے امتل کو کیا تھا اور امتل نے بتایا تھا کہ میں گیارہ بجے کے بعد آفس میں آؤں تو ملاقات ہو سکتی ہے اور یوں میں کچھ دیر امتل کے پاس بیٹھنے کے بعد اب ان کے سامنے تھی۔ پہلی اور اب دوسری ملاقات میں کئی سالوں کا وقفہ تھا اور اس دوران وہ عزیز از جان بیٹے کی جدائی کا صدمہ سہہ چکے تھے۔ وہ مجھے پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور سنجیدہ لگے۔ ان کی ہنسی اور مسکراہٹ میں بھی ایک دکھ سا رچا محسوس ہوتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں بابر بھائی کے حوالے سے کچھ کہوں۔ کوئی بات' کوئی دکھ کا اظہار' لیکن مجھے لگا جیسے یہ بہت مشکل کام ہے اور میں نہ کر پاؤں گی۔ گو خط اور فون پر بات ہوئی تھی۔ لیکن۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ بات کیسے شروع کروں' وہ محمود سے بات کر رہے تھے۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

میں نے نظریں اٹھائیں تو شاید میری آنکھوں میں نمی تھی یا پھر خود ہی انہوں نے جان لیا تھا کہ ذرا سا ہاتھ اٹھایا۔۔۔ اور کہا۔

"کچھ بھی مت کہیں اور یہ بتائیں کہ کہاں ٹھہری

ہیں؟"

"دوست کی طرف ہی ٹھہری ہوئی ہوں۔"

تب ہی امتل بھی آگئیں اور انہوں نے امتل کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف اشارہ کیا۔

"کیا انہیں سیدھا ہمارے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔"

امتل نے سر ہلا دیا۔

"پھر تو ناراضی ہے سخت۔"

اور میں شرمندہ سی ہو گئی اس خلوص پر۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں جواباً" کیا کہوں کہ امتل نے میری مدد کی۔

"ایسا کریں' کل عثمانیہ میں انہیں ڈنر دے دیں اور نگہت جب کبھی پھر کراچی آئیں۔ یہ آپ کے ہاں ہی قیام کریں۔"

"جب کبھی کا کیا مطلب' آپ آج ہی آجائیں۔ بلکہ آپ کو آنا ہی ہمارے ہاں چاہیے تھا۔۔۔ حق بنتا تھا آپ کا اور ہمارا بھی۔"

میں جو اس خلوص و محبت کے اظہار سے بھیگی جا رہی تھی' مدد طلب نظروں سے محمود کی طرف دیکھا اور انہیں اپنی مجبوری بتائی اور یوں یہ طے پایا کہ ہم کل شام کو چائے ان کے ہاں پئیں گے۔

"میں اس پر خوش تو نہیں ہوں۔ بہرحال آپ کی مجبوری کو مان لیتا ہوں۔"

"اب بتائیں۔ کیا پئیں گے آپ لوگ؟"

"امتل نے کوک پلائی ہے۔"

"کیا خیال ہے قلفہ کھلایا جائے انہیں؟"

انہوں نے امتل کی طرف دیکھا اور پھر ہمارے انکار کے باوجود قلفہ وغیرہ آگیا اور کھانے پر اصرار کہ اسے ختم کریں۔ اتنا کم لیا ہے آپ نے۔

امتل نماز پڑھنے کے لیے چلی گئیں اور ہمارا کھانے کے ساتھ ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔۔۔ ربیعہ کے متعلق بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں محبت تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ اپنے سے متعلق لوگوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔

"میں بھائی صاحب کے سامنے بول نہیں سکتا۔ ان کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

کسی بات پر انہوں نے کہا۔

گفتگو فیملی کے حوالے سے ہو رہی تھی' انہوں نے ابن انشاء صاحب کے متعلق چند ایک باتیں کیں۔ مجھے اب یاد نہیں آ رہا' لیکن اپنی فیملی کے لوگوں کی باتیں کرتے ہوئے ان کے لہجے سے محبت کے رنگ چھلک رہے تھے۔ پھر ان کی بیماری سے متعلق بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں کارپٹ تک سے بعض اوقات الرجی ہو جاتی ہے اور سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے۔

میری تحریر کے حوالے سے بھی بات ہوئی میں نے انہیں بتایا کہ میں کچھ کہانیاں کتابی شکل میں چھپوانا چاہتی ہوں۔

"ضرور چھپوائیں۔" انہوں نے کہا اور اس سلسلے میں کئی مشورے بھی دیے۔

بہت دیر ہو گئی تھی۔ ہمیں لنچ پر جانا تھا' جبکہ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر اور بیٹھیں اور باتیں کریں۔ انہوں نے جاتے جاتے ہم سے پھر کہا کہ "اب کے آپ کراچی آئیں تو ہمارے ہاں ہی آنا ہے۔"

"ان شاء اللہ کل ملاقات ہو گی۔"

میں نے اللہ حافظ کہتے ہوئے سوچا اور کل ڈھیر ساری باتیں ہوں گی۔۔۔ لیکن پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ نادیہ میری دوست کی بہن کو بھی بہت اشتیاق تھا کہ وہ ان سے ملے اور پھر محمود نے بھی بہت تعریف کر کے اس کے اشتیاق کو بڑھا دیا تھا۔ لیکن ان کی بیگم نے بتایا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید وہ سو رہے تھے۔ نادیہ کو تو مایوس ہونا ہی تھا۔ مجھے بھی بہت مایوسی ہوئی اور ان سے دوبارہ نہ ملنے کا افسوس ہوا۔

میں نے سوچا تھا کہ گھر کے ماحول میں آرام سے بہت ساری باتیں کریں گے۔۔۔ لیکن۔۔۔

پھر کبھی۔۔۔ ہاں پھر کبھی جب بھی کراچی آئیں تو۔۔۔ لیکن۔۔۔ اب۔۔۔ اب اگر کبھی کراچی جانا بھی ہوا تو کون

اتنے مان سے کہے گا۔
"ہمارا حق بنتا ہے آپ پر اور آپ کا بھی حق ہے کہ ہمارے ہاں ہی ٹھہریں۔"
"اخبار کی خبر۔ ناقابل یقین سی تھی۔"
"کیا خبر کوئی اور ہو۔" لیکن نہیں یہ تو لکھا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ... ابھی کچھ دن پہلے میں لاہور گئی تھی تو ربیعہ نے بتایا تھا کہ چچا پہلے سے بہتر ہیں۔ ہم کراچی گئے تھے۔ ان کی طبیعت کافی بہتر ہے... لیکن...
میں نے لاہور فون کیا... شہزاد نے اس خبر کی تصدیق کردی اور پھر ربیعہ کراچی سے آئی تو میں نے پھر فون کیا۔
"کیسے... کیسے ہوا یہ سب۔ ابھی تو ان کی بہت ضرورت تھی۔ ان کے کندھوں پر تو بہت ذمہ داریاں تھیں۔"
"بس اچانک ہی... شاید کچھ غم اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ دو جوان بیٹوں کی موت کا صدمہ شاید اندر ہی اندر کاٹتا جا رہا تھا۔"
کچھ دنوں بعد لاہور جانا ہوا تو ربیعہ سے دیر تلک ان کی باتیں ہوتی رہیں... اور میں حیران سی سوچتی رہی۔ کس قدر قد آور شخص تھے وہ... اور کتنے بڑے آدمی' میں ان سے بہت بار نہیں ملی۔ میں انہیں بہت زیادہ نہیں جانتی' پھر بھی جیسے میں انہیں بہت زیادہ جانتی ہوں... دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔
شفیق باپ۔
جان دینے والے بھائی۔
محبت و خلوص کا پیکر۔
زمیں کھا گئی آسمان کیسے کیسے۔
کچھ لوگ اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتے ہیں
ریاض صاحب بھی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔
وہ اپنے گھر کے لیے ہی نہیں اپنے کارکنوں کے لیے بھی ایک سائبان تھے۔ ایک چھت' ایک ڈھارس' ایک مہربان سایہ۔

زندگی کا کارواں تو چلتا ہی رہتا ہے' لیکن جانے والے جو خلا چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ کبھی پر نہیں ہوتا۔
میر کارواں چلا جائے تو اسپرٹ ختم ہو جاتی ہے۔ قافلہ چلتا رہتا ہے... لیکن مسکراہٹوں سے رنگ اور روشنی ختم ہو جاتی ہے۔
موت اتنی ظالم کیوں ہے؟
جن کی ہمیں بہت ضرورت ہوتی ہے' موت کو بھی وہ پیارے لگتے ہیں... موت ایک ابدی حقیقت ہے۔ لیکن یہ ابدی حقیقت کتنے دامن تہی کر جاتی ہے اور کتنی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔
پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت فیض کی وہ نظم یاد آرہی ہے۔

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ میری عمر گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا میرا اور میرا عہد شباب
کیا کروں بھائی یہ اعزاز میں کیوں کر پہنوں
مجھ سے لے لو میری سب چاک قمیصوں کا حساب

جانے والے چلے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے یادوں کے خزانے چھوڑ جاتے ہیں... یہ یادیں کبھی نہیں مٹتیں' کبھی مدھم نہیں پڑتیں... وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔
جانے والوں کے لیے ہمارے پاس ایک ہی تحفہ ہے۔ دعائے مغفرت... خداوند کریم ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کا حساب آسان فرمائے اور حد نگاہ تک ان کی قبر کو کشادہ اور روشن کرے۔
(آمین ثمہ آمین)
آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

☆ ☆

عروسہ صدیقی سے ملاقات

شاہین رشید

عروسہ صدیقی کا پہلا ڈرامہ تو نظر سے نہیں گزرا' لیکن میرے لیے ان کا پہلا ڈرامہ "چاند پروسہ" تھا۔ ویل چیئر پہ بیٹھی میک اپ سے عاری چہرے والی اس لڑکی کی اداکاری نے متوجہ کیا اور ٹی وی میڈیا کی سب سے بڑی خوبی ہی یہی ہے کہ اس میں پرفارمنس دیکھی جاتی ہے۔ گو کہ اس میں عروسہ کا کردار بہت جاندار نہیں تھا مگر عروسہ نے اسے قابل توجہ بنایا۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ اس ماڈرن فیلڈ میں کیا یہ لڑکی اپنے آپ کو منوا سکے گی یا پھر یہ ایسے ہی سادہ رولز کے لیے مخصوص ہو جائے گی مگر انسان کے اندر صلاحیت ہو تو وہ اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ "چاند پروسہ' ڈولی کی آئے گی بارات' آزر کی آئے گی' تانکے کی آئے گی بارات' باؤلی بیٹیاں چل جھوٹی ٹوپی ڈرامہ' عینی کی آئے گی بارات اور نہ جانے کتنے ڈراموں میں انہوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنی طرف ناظرین کو متوجہ کیا۔ اس ماہ ہم نے عروسہ صدیقی سے بات کی جو نذر قارئین ہے۔

★ "کیسی ہیں عروسہ؟"
✳ "جی اللہ کا شکر ہے۔"
★ "آج کل مصروفیات کیا ہیں؟"
✳ "مصروفیات تو چلتی ہی رہتی ہیں... ایک دو سیریلز ہیں جن پہ کام ہو رہا ہے اور میرا پروڈکشن ہاؤس ہے Fantastic کے نام سے جس کے تحت کچھ ڈراموں پر کام ہو رہا ہے۔"
★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"
✳ "جناب میں 13 مئی 1985ء کو کراچی میں پیدا ہوئی اور میرا ستارہ جمنائی ہے میں پیدا کراچی میں ہوئی ہوں اور تیرہ سال میں سعودی عرب میں رہی ہوں۔ سعودی عرب کے شہر ریاض میں ہماری رہائش تھی پڑھائی کے سلسلے میں پاکستان آنا پڑا اور پاکستان آکر میں گریجویشن کیا اور پھر تین سال کا ڈپلومہ کیا ہے ایکٹنگ میں ناپا (نیشنل اکیڈمی پرفارمنگ آرٹ) سے اور ان شاء اللہ اب بہت جلد میرا ارادہ ایم بی اے کرنے کا ہے اور ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں ہوں اور مجھ سے چھوٹے دو بھائی ہیں۔"
★ "آج کل ناپا سے کافی لوگ شوبز میں آرہے ہیں۔ جیسے ایمن طارق اور ثنا عسکری وغیرہ؟"
✳ "ایمن طارق اور میں ایک ہی بیچ کے ہیں جبکہ ثنا عسکری ہمارے بیچ کی نہیں ہیں۔"
★ "تانکے کی آئے گی بارات" میں آپ کی شادی ہو گئی۔ اصل میں کب ہے؟"
✳ "ڈرامے میں ہو گئی ہے تو کیا پتا اصل میں بھی

ہو جائے ایک دو سال میں کچھ کہہ نہیں سکتی اور ویسے بھی میں سمجھتی ہوں کہ اب وہ دور آگیا ہے کہ جب لڑکا ہی مالی طور پر اپنے قدموں پہ کھڑا نہ ہو لڑکی بھی کھڑی ہو گھر کو چلانا صرف لڑکوں کی ہی ذمہ داری نہیں ہونی چاہیے۔ لڑکیوں کو بھی کمانا چاہیے۔ تب ہی شادی کامیاب ہوتی ہے ورنہ نہیں ہوتی۔"

★ "آج کل مہنگائی کا جو حال ہے اس میں کمانا سب گھر والوں کی ذمہ داری ہے؟؟"

✱ "بالکل جی..... اب ہمارے یہاں ہی دیکھ لیں ہم گھر میں پانچ افراد ہیں اور چار کماتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ آپ اگر بہت خوشحال ہیں تب بھی آپ کو یعنی لڑکیوں کو کمانا چاہیے۔ کیونکہ تعلیم کا کوئی تو ریٹرن ہو اور ایسا کوئی ایشو نہیں ہونا چاہیے کہ شوہر کمائے اور بیوی بیٹھ کر کھائے اور یہ کہ شوہر کمائے گا تو بیوی کھائے گی ورنہ جھگڑے۔"

★ "بہت اچھے خیالات ہیں۔ شوبز میں آمد کیسے ہوئی؟"

✱ "گھر والوں کے اصرار کی وجہ سے "ناپا" میں داخلہ لیا۔ ورنہ میں تو نہیں جانا چاہ رہی تھی۔ ویسے میری اپنی خواہش تو یہ تھی کہ میں ضیاء محی الدین اور خوش بخت شجاعت کی طرح کمپیئرنگ کروں اور ان کی طرح بڑا نام کماؤں..... لیکن جب میں ناپا آئی تو ہمیں سارے کام کرنے پڑے۔ یعنی اداکاری بھی کی ڈائریکشن بھی کی، اسکرپٹ بھی لکھے۔ ڈانس بھی کرنا پڑا۔ تو میری ساری پرفارمنس کو دیکھ کر ہمارے ٹیچرز ارشد محمود، خالد انعم، ضیاء صاحب، طلعت صاحب ان سب کا کہنا تھا عروسہ اداکاری میں زیادہ بہتر رہے گی اور یوں انہوں نے مجھے زبردستی اداکاری میں ڈال دیا اور میں نے تھیٹر بھی کیا اور ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ مجھے پروڈکشن میں جانا چاہیے کیونکہ میں ہیروئن تو بن نہیں سکتی اس لیے مجھے کیمرے کے پیچھے بھی کام کرنا چاہیے۔"

★ "کیا آپ بچپن سے ہی ماشاء اللہ ایسی ہیں معذرت کے ساتھ؟"

✱ ہنستے ہوئے "میں دس پاؤنڈ کی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد بڑھتی ہی چلی گئی، کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ دل چاہتا ہے کہ دبلی پتلی اسمارٹ ہو جاؤں لیکن جب بریانی سامنے آتی ہے تو پھر ہاتھ نہیں رکتا میں بہت ٹوٹکے آزما چکی ہوں مگر جب بریانی سامنے آتی ہے تو سب کچھ بھول جاتی ہوں۔"

★ "تھیٹر کتنے سال کیا؟"

✱ "میں نے تقریباً" تین سال تھیٹر میں کام کیا ہے اور ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کی۔ اس کے بعد مزید دو سال ناپا والوں کے ساتھ تھیٹر کیا۔ تو تھیٹر دیکھنے والے مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ البتہ جب میں ٹی وی میں آئی تو ٹی وی والوں کے لیے میں ایک نیا چہرہ تھی۔ تو جناب تھیٹر کے لیے میرا پہلا کھیل ضیاء محی الدین کا کھیل تھا "سفید خون" اس میں پرفارم کیا اور جب ٹی وی پہ آئی تو پہلی ٹیلی فلم "بارش میں دیوار" تھی جو کہ اظفر علی کی تھی اور اس میں میرا رول چھوٹا سا ہی تھا پھر ایک کھیل کیا تھا "کھاریاں سے کھارادر" یہ اسامہ علی رضا کی ٹیلی فلم تھی اس کے بعد میرا کام نوٹس ہوا اور مجھے مزید کام ملنے لگا اور آج اللہ کا شکر ہے کہ تقریباً" سب مجھے جانتے ہیں۔"

★ "کمائی کا عمل کب شروع ہوا؟"

✱ "کمائی کا عمل تو جب میں آٹھویں کلاس میں تھی تب سے شروع ہو گیا تھا اور اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے کے لیے اور مجھے یاد ہے کہ میری پہلی کمائی پانچ سو روپے تھی اور مجھے ایک ہاؤس وائف کو انگریزی پڑھانی تھی تاکہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ انگریزی بول سکیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھا سکیں تو پانچ سو روپے مہینہ مجھے ملا کرتا تھا۔"

★ "انگریزی پڑھانے کے صرف پانچ سو روپے؟"

✱ "ارے اس زمانے میں 500 بہت بڑی رقم تھی۔ میں تو امیر ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے لکھ پتی ہو گئی ہوں۔ اس زمانے میں دس روپے مہینے کے ملا کرتے تھے پاکٹ منی کے طور پر اور 500 روپے تو میرے لیے بہت بڑی رقم تھی اور ان پیسوں سے خود بھی مزے مزے کی چیزیں کھاتی اور بھائیوں کو بھی کھلاتی تھی۔"

★ "اور میڈیا جوائن کرنے کے بعد تو اللہ کا کرم ہو ہی گیا ہو گا؟"

✱ "جی بالکل مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے میں نے ہارون کی ویڈیو کی تھی اور ایک دوست کو فیور دیا تھا اور اس میں مجھے ایک دن کے 1000 روپے ملتے تھے اور میں اتنی خوش تھی کہ میں بھائیوں کو کہتی تھی کہ تم لوگ کیا کماتے ہو گے جو میں کماتی ہوں 1000 روپے پڑے مل رہا ہے مجھے۔"

★ "اس فیلڈ میں مزا آرہا ہے؟"

✱ "بہت مزا آرہا ہے اپنی مرضی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اپنی مرضی سے سوتی ہوں اپنی مرضی سے اٹھتی ہوں اور جو کام کر رہی ہوں وہ مجھے کام کام نہیں لگتا..... کیونکہ مجھے اپنے کام سے بہت دلچسپی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صبح اٹھ کر کہتے ہیں کہ "اللہ اب کام پر بھی جانا ہے" میں اپنے کام میں جنونی ہوں..... میں نے جو بھی کام کیا ہے خواہ وہ ایڈمنسٹریشن کا ہو یا مینجمنٹ کا ہو۔ ٹیچنگ ہو یا اداکاری کا۔ جب بھی کوئی کام کیا الحمدللہ بہت دل سے کیا ہے اور بہت خوشی سے کیا ہے۔ میرے جو بھی خواب ہیں وہ پورے ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے وقت کا بھی کوئی ایشو نہیں ہے میں ہر کام کے لیے بڑی آسانی سے وقت نکال لیتی ہوں بس میرے لیے اپنے آپ کے لیے وقت نہیں ہے اور یہ بات تو میری دوست بھی کہتی ہیں۔"

★ "غلطی کر کے پچھتاتی ہیں؟"

✱ "صرف ایک غلطی ایسی ہے کہ جس کو کرنے کے بعد میں پچھتاتی ہوں۔ ہر کھانے کے بعد میں سوچتی ہوں کہ میں نے غلطی کی ہے اور پورا دن پچھتاتی ہوں۔ لیکن جب پھر بھوک لگتی ہے تو پھر غلطی کو دہراتی ہوں اور خوب سیر ہو کر کھاتی ہوں اور پھر پچھتاتی ہوں اور عموماً" لوگ غصے میں کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں، لیکن میری ناراضی کبھی کھانے کے ساتھ نہیں ہوتی۔ میرا تو غصہ بھی کھانے پر نکلتا ہے کہ میں بہت کھاتی ہوں۔"

★ "جو کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں وہ خود بھی بہت اچھی کوکنگ کر لیتے ہیں کیا آپ بھی کرتی ہیں؟"

✱ "ہاں، ہاں میں بہت اچھی کوکنگ کر لیتی ہوں..... مجھے سب کام آتے ہیں۔ سلائی بھی آتی ہے آج میرا رشتہ آئے آج میں تیار ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا مجھے۔"

★ "اپنے فیوچر کے بارے میں کیا سوچتی ہیں یا یہ کہ چند سال بعد کہاں دیکھتی ہیں اپنے آپ کو؟"

✱ "مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے کہ چند سال بعد کہاں ہوں گی۔ آج سے چند سال پہلے بھی مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں یہاں ہوں گی اور میں یہاں ہوں تو چند سال بعد کا کیا کہہ سکتی ہوں۔ جہاں اللہ لے جائے گا چلی جاؤں گی۔ شادی ہو گی تو شادی کر لیں گی۔ اسٹار بننا ہو گا تو اسٹار بن جائیں گی پتلا ہونا ہو گا تو پتلی ہو جاؤں گی۔"

★ "کام کے دوران کب الجھن کا شکار ہوتی ہیں؟"

✱ "جب میں اپنا کام سو فیصد ٹھیک نہیں کر پا رہی ہوتی۔ میرا کوئی سین جیسا میں کرنا چاہ رہی ہوتی ہوں ویسا نہیں کر پا رہی ہوتی تو پھر میں بہت زیادہ الجھن کا شکار ہو جاتی ہوں اور میرا موڈ بھی خراب ہو جاتا ہے۔"

★ "ویسے تو ہر فیلڈ میں ہی لڑکے لڑکیاں کام کرتے ہیں تو اس فیلڈ میں لڑکوں کو کیسا پایا؟"

✱ "میں بچپن سے کو ایجوکیشن میں پڑھ رہی ہوں اور ہمارے گھر میں میرے بھائی بھی لڑکے ہیں اور بچپن سے ہی میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر لڑکوں میں ہوا اور سچ پوچھیں تو میں لڑکوں کے درمیان زیادہ ایزی فیل کرتی ہوں۔ میرے سارے دوست لڑکے ہیں کوئی ایک آدھ ہی لڑکی میری دوست ہو گی۔"

★ "شوبز میں کیا برائی دیکھتی ہیں؟"

✱ "یہاں یہ بات مجھے کہنے میں کوئی شرم کوئی جھجک نہیں ہے کہ یہاں اس فیلڈ میں مجھ سمیت ایک ایک بندہ Fake ہے اور ایسا ہر انڈسٹری میں ہے اور آپ یہ ضرور لکھیے گا کہ اگرچہ ہر جگہ ایسے لوگ ہیں لیکن میڈیا کے لوگ چونکہ سامنے ہوتے ہیں اس لیے نظر آجاتے ہیں۔"

★ "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں اور تہوار منانا کیسا

لگتا ہے؟"

✻ "چھٹی کا دن اپنی فیملی کے ساتھ گزارتی ہوں اور تہوار منانا مجھے اچھا لگتا ہے اور تہوار ہونے چاہئیں۔ سالگرہ ہو تو دل چاہتا ہے کہ بہت سارے گفٹ ملیں خوب ہلا گلا ہو۔ مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ عید پہ اتنی زیادہ گھر کی صفائیاں ہو رہی ہوتی ہیں کہ مہندی لگانے کا بھی ٹائم نہیں ملتا۔ یہ تہوار ایسے ہی نکل جاتا ہے چودہ اگست پہ انتا رش ہوتا ہے کہ تفریح تو کیا کریں گے ٹریفک میں ہی پھنس جاتے ہیں ہاں مما پاپا کی شادی کی سالگرہ ہو یا گھر میں کسی کی سالگرہ ہو تو ڈنر پر چلے جاتے ہیں۔ گھر سے باہر جا کر تو تہوار منا ہی نہیں سکتے اور بسنت ہمیں کھیلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

★ "ڈنر پہ جاتی ہیں یا کہیں اور..... لوگ پہچان لیتے ہیں؟"

✻ "ہاں پہچان لیتے ہیں "ڈولی کی آئے گی بارات" کے بعد لوگوں نے بہت پہچانا اور لوگ پہچان لیتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے اور آج جو بھی کوئی بڑا فنکار ہے وہ صرف اور صرف ان لوگوں کی وجہ سے ہے جو انہیں پسند کرتے ہیں۔ تو جب بھی کوئی آپ کے پاس آئے۔ آپ سے ملنے کی خواہش کرے تو ضرور ان سے اچھے طریقے سے ملیں نہ کہ نخرے دکھا کر آگے نکل جائیں۔"

★ "غصے کی تیز ہیں..... کن باتوں پہ آتا ہے؟"

✻ "ہاں جی..... بہت تیز ہوں۔ ہر وقت آتا ہے غصہ بہت سی باتوں پہ آتا ہے۔ کوئی کام ٹھیک نہ ہو رہا ہو گھر میں کوئی ٹینشن ہو گرمی لگ رہی ہو لائٹ چلی جائے، کہیں جانا چاہ رہی ہوں اور نہیں جا پاتی تو غصہ آتا ہے۔ کسی پر انحصار کرنا ہو تو بس بہت غصہ آتا ہے۔ ویسے میڈیا میں آنے کے بعد کافی سدھر گئی ہوں۔"

★ "کوئی کردار ملے تو کیسے مشاہدہ کرتی ہیں؟"

✻ "میں جب گھر سے باہر نکلتی ہوں تو مختلف قسم کے لوگ ہی میرے مشاہدے میں ہوتے ہیں۔ فقیروں کو دیکھتی ہوں کہ کس طرح مانگتے ہیں۔ بن کباب والے کو دیکھتی ہوں۔ غبارے والا کیسے غبارے بیچتا ہے۔ تو اس طرح بہت سے کرداروں کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔"

★ "حنا دل پذیر کے ساتھ آپ کی جوڑی بہت سیٹ رہتی ہے؟"

✻ "بالکل! ارے وہ اتنی اچھی خاتون ہیں کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں میں تو ان کی گود میں بیٹھ جاتی ہوں اور وہ مجھے اتنی پسند ہیں میں بڑی ہو کر حنا دل پذیر ہی بنوں گی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ ان کے ساتھ کام کرنا تھا تو میں سوچتی تھی کہ اتنی بڑی آرٹسٹ ہیں میں کیسے کر پاؤں گی مگر وہ سیٹ پہ اتنا Comfortable کر دیتی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ وہ بہت ہی اعلا خاتون ہیں۔"

★ "کوئی کردار جو کرنے کو بہت دل چاہتا ہے؟"

✻ "میں ایک مظلوم عورت کا رول کرنا چاہتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے دیکھ کر کوئی مجھے مظلوم لڑکی یا عورت کا رول دینا ہی نہیں چاہتا۔"

★ "اس فیلڈ میں آنے کے بعد اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی محسوس کرتی ہیں؟"

✻ "میں تو کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرتی۔ ہماری زندگی بالکل عام لوگوں جیسی ہی ہے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑا۔ بس یہ ہے کہ ہمارے کام کا کوئی ٹائم مقرر نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو پوری پوری رات گزر جاتی ہے کام کرتے کرتے اور صبح کے وقت واپسی ہوتی ہے، جبکہ عام لوگ شام کو اپنے گھر آ جاتے ہیں..... باقی تو جیسے دوسرے لوگوں کو دال چاول پسند ہیں ہمیں بھی پسند ہیں۔ جس طرح دوسرے اپنے والدین کو ٹائم دیتے ہیں اسی طرح ہم بھی دیتے ہیں ہماری ایکٹویٹیز بھی وہی ہیں جو دوسروں کی ہوتی ہیں۔"

★ "لوگ تعریف کرتے ہیں یا تنقید؟"

✻ "لوگ بہت تعریف کرتے ہیں۔ بہت محبت کرتے ہیں اور آج ہم جو کچھ ہیں لوگوں کی محبت کی وجہ سے اور پسندیدگی کی وجہ سے ہیں۔"

✡ ✡

دوکا پہاڑہ

ثروت گیلانی

شاہین رشید

1 "کوئی دو نام جن کے لیے آپ کی خواہش ہو کہ وہ آپ کے ہوتے؟"

☆ "ایک تو مجھے "پلوشہ" بہت پسند ہے اور دوسرا تو ثروت ہی ہونا چاہیے تھا۔"

2 "دو باتیں، جو آپ کو دوسروں میں، بہت نمایاں کرتی ہیں؟"

☆ "میں سب سے، بہت ہنس کے بات کرتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ دوسرے لوگ اتنے کھل کر اور ہنس کر بات نہیں کرتے' یہ بات مجھے دوسروں میں نظر نہیں آتی۔"

3 "دو تاریخی ادوار جن میں آپ جانا چاہتی ہیں؟"

☆ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور اور میرا خیال ہے کہ ہر مسلمان ان کے دور میں جانا اور ان کو قریب سے دیکھنا اور چھونا چاہے گا اور مائیکل انجیلو اور پکاسو کا دور' جب وہ بڑے ہو رہے تھے اور پینٹنگ سیکھ رہے تھے۔ اگر میں اس زمانے میں ہوتی تو ان کی اسٹوڈنٹ ضرور بنتی اور پینٹنگ ضرور سیکھتی۔"

4 "دو افراد جن کے ایس ایم ایس کے جواب آپ "فوراً" دیتی ہیں؟"

☆ "امی اور ابو کیونکہ دونوں کو میری بہت فکر ہوتی ہے۔ آج کل حالات بہت خراب ہیں۔ اس لیے وہ جلد پریشان ہو جاتے ہیں۔"

5 "دو بری عادتیں، جو آپ چھوڑنا چاہتی ہیں؟"

☆ "ایک تو "نیند کے لیے پیار" مجھے نیند سے بہت پیار ہے دیر تک سوتی ہوں اور میں اداکاری سے زیادہ پینٹنگ پہ توجہ دینا چاہتی ہوں۔ اب آپ اسے بری عادت کہیں یا اچھی بس ہے یا عادتیں۔"

6 "دو جھوٹ، جو آپ اکثر بولتی ہیں؟"

☆ "ایک تو یہ کہ "میں ٹھیک ہوں" چاہے میں ٹھیک ہوں یا نہ ہوں۔ چاہے کتنی ہی طبیعت خراب ہو اور دوسرا جھوٹ یہ کہ ابھی سین میں ہوں فارغ ہو کے فون کرتی ہوں۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر غصہ آجاتا ہے؟"

☆ "کہ تم کھانا کیوں نہیں کھاتیں اور دوسری یہ کہ تم سوتی بہت ہو۔"

8 "کرنٹ افیرز کے دو اینکر جو آپ کو پسند نہیں؟"

☆ "کامران خان۔"

9 "مارننگ شو کی دو اینکر' جو آپ کو بہت پسند ہیں؟"

☆ "سویرا ندیم' نادیہ جمیل اور سونیا رحمن یہ تینوں مجھے بہت پسند ہیں۔"

10 "دو شخصیات جن پر آپ بھروسہ کر سکتی ہیں؟"

☆ "اپنی بہن پہ آنکھیں بند کر کے اور ایک اپنے

چوکیدار پہ۔" قہقہہ۔

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ۔ آپ دنیا گھومنا چاہتی ہیں؟"

☆ "انور مقصود صاحب۔ میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ گھوموں گی تو آرٹ اور لٹریچر دونوں سے فائدہ اٹھاؤں گی اور بہت کچھ سیکھوں گی ان سے اور اپنی والدہ کے ساتھ دنیا گھومنا چاہتی ہوں۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

☆ "شرمین عبید چنائے ان کی کامیابی پہ واقعی رشک آتا ہے اور دعائیں بھی دل سے نکلتی ہیں اور دوسرے مشکور صاحب یہ پینٹر ہیں اور پوری دنیا میں انہوں نے اپنی پینٹنگز بیچی ہیں ان کا کام بہت ہی حسین ہے۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتی ہیں؟"

☆ "رمضان المبارک اور محرم الحرام۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "بہت سے لوگوں کو مغرب کا وقت بہت ڈیپریسنگ لگتا ہے۔ مگر مجھے مغرب کا وقت سکون دیتا ہے اور فجر کا وقت بہت اچھا لگتا ہے اور سکون بھی دیتا ہے۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتی ہیں؟"

☆ "سوری اور تھینک یو۔۔۔ پتا نہیں کیوں۔"

16 "دو کھانے جن کو کھا کر کبھی بور نہیں ہوتیں؟"

☆ "بریانی اور مچھلی اور یہ سوشی مچھلی ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی؟"

☆ "اپنے والدین سے اور ویسے مجھے معافی مانگنے میں کبھی شرم محسوس نہیں ہوتی۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ میچ دیکھتی ہیں؟"

☆ "شاہد آفریدی اور جب وسیم اکرم کھیلا کرتے تھے۔"

19 "دو خواہشات جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں؟"

☆ "اپنی امی کے لیے گھر بنانے کی خواہش اور فیملی ٹور کرنا چاہتی ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ میری یہ خواہش پوری کرے۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

☆ "موبائل فون اور والٹ۔"

21 "دو پسندیدہ صحافی؟"

☆ "ایک تو آپ ہیں اور دوسرے حفیظ جو کہ صحافی بھی ہیں اور مصنف بھی۔"

22 "سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "جمعہ اور اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ یہ برکت والا دن ہے اور دوسرے یہ کہ اس دن میرا سیریل "متاع جاں ہے تو" آتا ہے اور دوسرا دن اتوار کا ہے۔ جو فیملی کے ساتھ گزرتا ہے۔"

23 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "جنوری اور دسمبر۔"

24 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"

☆ "امی کا کمرہ" ہر وقت گھسی ہوئی ہوتی ہوں اور دوسرا میرا اپنا پینٹنگ اسٹوڈیو۔"

25 "گھر کے دو کام جن کو نہ کرنے پر گھر والوں سے ڈانٹ پڑتی ہے؟"

☆ "ویسے تو میں گھر کے سارے کام کر لیتی ہوں۔ جھاڑو پونچھا بھی کر لیتی ہوں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ شوٹ سے آکر اپنی چیزیں ڈائننگ ٹیبل پہ ہی رکھ دیتی ہوں انہیں اٹھانا یاد نہ رہے تو ڈانٹ پڑتی ہے اور تو ایسا کوئی کام نہیں ہے۔"

26 "دو ایسی شخصیات جن پر کسی قسم کا شک نہیں کر سکتیں؟"

☆ "اپنی بہن پر اور اپنے بھائی پر۔"

27 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"

☆ "ایران اور بنگلہ دیش۔"

28 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

☆ "لال، وائٹ اور آف وائیٹ۔"

29 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

☆ "کراچی اور پشاور سے آگے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اڑمڑوہ بہت پسند ہے۔"

30 "اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو کیا دو چیزیں لینا چاہیں گی؟"

☆ "قومی خزانے کی چابی اور Kesc والوں سے بجلی چرانا چاہوں گی۔"

31 "لڑکوں کے لیے دو نصیحتیں؟"

☆ "قرآن میں لکھا ہے کہ مرد جب گھر سے نکلے تو اپنی نظریں نیچی رکھے اور لڑکیوں کا دل نہ دکھایا کریں کیونکہ وہ بہت نازک ہوتی ہیں۔"

32 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"

☆ "سردی اور بہار۔"

33 "لڑکوں کی دو ناپسندیدہ عادتیں؟"

☆ "جو صفائی پسند نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ پرابلمز ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ اپنی ماں کی عزت نہ کرے اور اپنے گھر والوں کی برائی کرے تو مجھے یہ باتیں بہت بری لگتی ہیں۔"

34 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتی ہیں؟"

☆ "میرے برابر میں میرا بلا (Cat) ہوتا ہے اس کو گلے لگاتی ہوں اور پھر امی کو آواز دے کر کہتی ہوں کہ گرما پانی کھول دیں۔"

35 "دو مرد جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"

☆ "میرے نانا جو نواب ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت سے میں بہت متاثر تھی اور میرے والد۔"

36 "آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت ترین مرد؟"

☆ "ہر بیٹی کا باپ اور ہر لڑکی کا شوہر۔"

37 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "پینٹنگ اور رائٹر بننا مجھے بہت پسند ہے۔"

38 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"

☆ "ایران کے صدر اور بھٹو صاحب۔"

39 "دو چیزیں جن پر آپ بہت خرچ کرتی ہیں؟"

☆ "دوسروں کی خوشی کے لیے بہت خرچ کرتی ہوں اور دوسرے اپنے بیگز پہ مجھے بیگز کا جنون ہے۔"

40 "اپنے دو ڈرامے جنہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں؟"

☆ "میری ذات ذرہ بے نشاں اور متاع جاں ہے تو۔"

41 "دو قیمتی چیزیں جو آپ خریدنا چاہتی ہیں؟"

☆ "اگر پیسے سے ملتی تو سب کے لیے "محبت" اور اگر میرے بس میں ہوتا تو سب کے لیے پیٹرول خریدتی۔"

42 "دو کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"

☆ "میں "اسپیشل چائلڈ" کا رول کرنا چاہتی ہوں۔ ایک ہسٹری کا کوئی کردار کرنا چاہوں گی۔"

43 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتی ہیں؟"

☆ "عموماً" جب شوٹ پہ ہوتی ہوں تو گھر آکر قضا نمازیں پڑھتی ہوں۔ ویسے مغرب اور عشاء ضرور

پڑھتی ہوں۔"

44 "بیرون ملک شاپنگ میں کون سی دو چیزیں لازمی خریدتی ہیں؟"

☆ "ٹائیگر بام" اپنی اماں کے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے گفٹ۔"

45 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "ایک تو اپنے ابو کے غصے سے اور اپنے غصے سے۔"

46 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتیں؟"

☆ "ساتھ کام کرنے والے اور اپنے گھر والوں کی تعریف میں۔"

47 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"

☆ "پانی اور مائیلو۔"

48 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

☆ "شفقت امانت علی اور عابدہ پروین۔"

49 "شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "کنڈی پکڑنا یعنی دولہا کو اندر کمرے میں جانے نہ دینا جب تک وہ پیسے نہ دے اور مایوں کی رسم بھی بہت پسند ہے۔"

50 "دھنک کے سات رنگوں میں کون سے دو رنگ پسند ہیں؟"

☆ "ایک لال اور بلو۔"

51 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"

☆ "کوئی پلان بن کے ختم ہو جائے اور کسی کی منافقت کا پتا چل جائے تو موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

52 "افسردگی میں کن دو لوگوں کے ساتھ آنسو بہاتی ہیں؟"

☆ "میری بہت ہی عزیز اور قریبی دوست "ساشا" اور اپنے بلے کے ساتھ۔"

53 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟"

☆ "دوپٹے کا بہت خیال رکھتی ہوں اور لباس چیپ نہ ہو۔"

54 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "سب کے ساتھ کیونکہ مجھے بارش بہت پسند ہے اور انہی کے ساتھ بارش انجوائے کرنے کا مزا آتا ہے جو خود بارش کو انجوائے کرنا جانتے ہوں۔ تو اپنی دوست میرین کے ساتھ اور گھر والوں کے ساتھ۔"

55 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "کیڑوں سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

56 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانے میں مزا آتا ہے؟"

☆ "باربی کیو ٹونائیٹ اور سکورہ۔"

57 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرتی ہیں؟"

☆ "ابھی جو سی ویو پہ نیا ڈالمن مال کھلا ہے وہاں سے اور کبھی فورم تو کبھی پارک ٹاور۔"

58 "دو چینلز جو شوق سے دیکھتی ہیں؟"

☆ "ہم اور کوئی بھی نیوز چینل۔"

59 "دو تبدیلیاں جو اپنی شخصیت میں لانا چاہتی ہیں؟"

☆ "کسی کو انکار نہیں کر سکتی میں چاہوں گی کہ انکار کرنے کا فن سیکھوں اور یہ کہ میں اتنی آرگنائزڈ ہو جاؤں کہ اپنی پینٹنگ کو وقت پر ختم کر سکوں۔"

60 "کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

☆ "کھانے میں کچھ بھی رکھا ہوا ہو مزا آتا ہے۔"

61 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

☆ قہقہہ "اپنے صدر کو اور قومی خزانے کی چابی وصول کروں گی اور کسی مشہور و معروف آرٹسٹ کو اغوا کر کے ان کی پینٹنگز لینا چاہوں گی۔"

مجھ سے ملیے

نفیسہ سعید

ادارہ

○ "تاریخ پیدائش / اسٹار؟"
☆ "24 اپریل / ثور۔"
○ "خدا سے تعلق۔"
☆ "قلبی اور روحانی / ہر مشکل گھڑی میں اپنا ہر دکھ صرف اُسی سے ہی کہتی ہوں۔"
○ "فرصت کا وقت گزارنے کا بہترین طریقہ؟"
☆ "کمپیوٹر گیم / بچوں سے گپ شپ۔"
○ "کون سی چیز خوش گوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
☆ "اپنے بچوں کا اچھا رزلٹ / صبح سویرے کا منظر جب ملگجے اندھیرے میں سورج کی مہربان کرنیں بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش کر رہی ہوں اس سمے میں چڑیوں کی چہچہاہٹ، بہت ہی خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے۔"
○ "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"
☆ "جب آپ ایک مصروف ترین دن گزارنے کے بعد آرام کرنے کی نیت سے بستر پر جائیں اور کوئی آپ سے ملنے آجائے۔"
○ "مشکل ترین لمحہ؟"
☆ "جب کوئی آپ کے سامنے مسلسل غلط بیانی کر رہا ہو اور آپ چاہ کر بھی اسے ٹوک نہ سکیں۔"
○ "بہترین تعریف جو وصول کی؟"
☆ "جب بھی کوئی میرے بچوں کی تعریف کرتا ہے میرے لیے وہ بہترین ہوتی ہے۔"
○ "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
☆ "موبائل اور انٹرنیٹ چیٹنگ۔"

○ "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
☆ "اپنے جواں سال بھائی کی اچانک موت۔"
○ "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
☆ "جو وصول کرنے والے کے معیار کے عین مطابق ہو۔"
○ "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں گی؟"
☆ "خلیفہ ہارون رشید / ذوالفقار علی بھٹو۔"
○ "پسندیدہ ساتھی؟"
☆ "میرے شوہر نامدار / بڑا بیٹا اسامہ۔"
○ "پسندیدہ ہستی؟"
☆ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔"
○ "پسندیدہ پروفیشن؟"
☆ "ڈاکٹر۔"
○ "بہترین کاوش؟"
☆ "ابھی تک کچھ ایسا نہیں لکھا جو بہترین میں شمار ہو۔"
○ "پسندیدہ ملکیت؟"
☆ "میرا گھر۔"
○ "زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟"
☆ "اللہ تعالیٰ میرے بچوں کو وہ تمام کامیابیاں نصیب فرمائے جس کے وہ خواہش مند ہیں۔"
○ "پریشان کن لمحہ؟"
☆ "بہت سارے ایسے لمحات جب آپ کے لیے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے / جب کوئی آپ کے بارے میں غلط رائے قائم کرے۔"

○ "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
☆ "کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا بالکل خاموش بیٹھ جاتی ہوں۔"
○ "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
☆ "جھوٹے اور شیخی خور لوگ کیونکہ میں ایسے لوگوں کے سامنے کھڑا ہونا پسند ہی نہیں کرتی۔"
○ "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
☆ "جب وہ اپنی عمر کا لحاظ کیے بغیر کیا جائے۔"
○ "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
☆ "جب کوئی ایسا شخص آپ کے بارے میں غلط بیانی کرے جس سے آپ ایسی امید نہ رکھتے ہوں۔"
○ "کیا چیز جذباتی کردیتی ہے؟"
☆ "جب کوئی پاکستان کی برائی کرتا ہے۔"
○ "زندگی کا یادگار دن؟"
☆ "میری یادداشت بہت کمزور ہے اس لیے کوئی بھی ایسا دن نہیں ہے، جو مجھے یاد رہ جاتا۔"
○ "موسیقی میرے نزدیک؟"
☆ "ڈپریشن دور کرنے کا ذریعہ ہے۔"
○ "پسندیدہ گانا؟"
☆ "کوئی خاص نہیں اور اس حوالے سے پسند ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔"
○ "پسندیدہ فقرہ؟"
☆ "بات سمجھ میں آئی۔"
○ "پسندیدہ کردار؟"
☆ "بارات سیریز کی صائمہ چوہدری۔" (بشریٰ انصاری)
○ "سب سے عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
☆ "میرے بچے۔"
○ "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
☆ "سخت سردی کا موسم / گرمیوں کی بارش۔"
○ "ناقابلِ فراموش واقعہ؟"
☆ "جب میری بڑی بیٹی ڈھائی سال کی عمر میں حیدری مارکیٹ میں گم ہو گئی تھی اس کی تلاش کے وہ دو گھنٹے میں ساری زندگی نہیں بھول سکتی اور یہ واقعہ آج بھی جب مجھے یاد آتا ہے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"
○ "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
☆ "بہت زیادہ خوشی جو اس کے بعد اتنا لکھنے پر بھی حاصل نہ ہوئی۔"
○ "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
☆ "18 اکتوبر کی رات جب میرے بھائی کی سارا دن کی تلاش کا سفر ایدھی سینٹر جا کر مکمل ہوا۔"
○ "حسد محسوس کرتی ہیں؟"
☆ "حسد نہیں ہاں رشک ضرور کرتی ہوں کسی کی کامیابی دیکھ کر۔"
○ "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
☆ "کیونکہ یہ روح کو تازگی بخشتی ہے۔"
○ "آخری کتاب جو پڑھی؟"
☆ "عمیرہ احمد کی پیر کامل۔"
○ "پسندیدہ جگہ؟"
☆ "حرم شریف۔"

○ "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا چاہیں؟"
☆ "اپنا گھر۔"
○ "میری قوتِ ارادی؟"
☆ "ماشاءاللہ بہت مضبوط ہے۔"
○ "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"
☆ "اپنا بیڈ روم۔"
○ "بہترین لباس؟"
☆ "شلوار قمیص۔"
○ "پسندیدہ رنگ؟"
☆ "سفید اور گرین۔"
○ "پسندیدہ مصنف۔"
☆ "اشفاق احمد، مستنصر حسین تارڑ، فرحت اشتیاق۔"
○ "پسندیدہ شاعر؟"
☆ "امجد اسلام امجد، پروین شاکر، وصی شاہ۔"
○ "ویران اور سنسان جزیرے پر پہلا کام؟"
☆ "باہر نکلنے کا راستہ تلاش کروں گی۔"
○ "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"
☆ "جہاں کا ماحول پرسکون ہو۔"
○ "اگر مصنفہ نہ ہوتی تو؟"
☆ "سیاستدان ہوتی۔"
○ "اپنی کوئی بری عادت؟"
☆ "غصہ جلدی آجاتا ہے۔"
○ "ایک لفظ جو مجھے واضح کردے؟"
☆ "قابل بھروسہ۔"
○ "جنس مخالف کے بارے میں آپ کی رائے؟"
☆ "زندگی کا کوئی بھی سفر ان کے بغیر ممکن نہیں۔"
○ "پسندیدہ رشتہ؟"
☆ "ماں اور بچوں کا۔"
○ "محبت کے بارے میں خیال؟"
☆ "کوئی بھی رشتہ محبت کے بغیر مکمل نہیں۔"
○ "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"
☆ "نہیں بلکہ اکثر ہی یہ آپ کو دھوکہ دیتے ہیں بظاہر معصوم نظر آنے والے لوگ سانپ کی طرح جب کینچلی بدلتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"
○ "شاعری کے بارے میں خیال؟"
☆ "خوب صورت احساسات کی مکمل عکاسی۔"
○ "بہترین کامیابی؟"
☆ "اپنے بچوں کی ہر وہ کامیابی جو انہیں دوسروں میں نمایاں کرے۔"
○ "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہیں؟"
☆ "قرآن شریف پڑھ کر۔"
○ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
☆ "بجلی / موبائل فون۔"
○ "سائنس کی بدترین ایجاد؟"
☆ "انٹرنیٹ۔"
○ "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"
☆ "اپنا بھائی حامد جو آج ہم میں نہیں۔"
○ "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"
☆ "کوئی آپ کے ساتھ کتنا بھی برا کیوں نہ کرے آپ ہمیشہ اس کے ساتھ اچھا ہی کریں کیونکہ آپ کی اچھائی کا اجر اللہ تعالیٰ ضرور دیتا ہے۔"
○ "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام"
☆ "لائٹ آف کرنا۔"
○ "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"
☆ "جب اسامہ نے 9th کلاس میں نمایاں پوزیشن لی۔"
○ "پیغام قارئین کے لیے؟"
☆ "ہمیشہ اپنی زبان کو میٹھا رکھیں کیونکہ لوگ آپ کی زبان دیکھتے ہیں دل نہیں۔"
○ "کرن کے بارے میں رائے؟"
☆ "یہ ایک اچھا ڈائجسٹ ہے جس میں زندگی گزارنے کے لیے جگہ جگہ رہنمائی موجود ہوتی ہے لہٰذا اسے اپنے بچوں کو پڑھنے دیا کریں تاکہ انہیں زندگی کی تلخیوں کا اندازہ ہو۔"

☆ ☆

آواز کی دنیا سے

بینش ناصر خان

شاہین رشید

جو بچے بچپن میں یتیم ہو جاتے ہیں ان کی اگر پرورش صحیح نہ کی جائے تو وہ بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پہ ساری ذمہ واری ماں پہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اس مشکل وقت میں کس طرح اپنے غم کو بھلا کر اپنی ساری توجہ اپنے بچوں پر مرکوز کردے اور ایسی ماں جب اپنے بچوں کو کسی قابل بنا دیتی ہے تو پھر وہ امر ہو جاتی ہے۔

"سلیم ناصر" کے نام سے نئی نسل نام کی حد تک تو ضرور واقف ہو گی لیکن پرانی نسل اور مڈل ایج کے لوگ سلیم ناصر کے کام سے بخوبی واقف ہوں گے۔ وہ ایک ورسٹائل فنکار تھے۔ ان کے سیریل "آنگن ٹیڑھا" کو کون بھول سکتا ہے اور آج بھی لوگ ان سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا ان کی زندگی میں کرتے تھے۔ وہ جوانی میں ہی اپنے چاہنے والوں سے جدا ہوئے جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے تین بچے تھے۔ سب سے چھوٹی بیٹی صرف چھ سال کی تھی۔ یہی چھ سال کی بیٹی آج ایف ایم 91 کی آر جے بھی ہیں اور ہیڈ آف پروڈکشن اینڈ پروگرامنگ بھی ہیں۔ آواز کی دنیا میں ان کی باتیں شامل ہیں۔

★ "کیسی ہیں بینش.... اور آپ ایک اچھی آر جے تو ہیں ہی لیکن آپ کے لیے یہ بھی فخر کی بات ہو گی کہ آپ سلیم ناصر صاحب (مرحوم) کی بیٹی ہیں؟"

☼ "جی مجھے بہت فخر ہے کہ میں سلیم ناصر کی بیٹی ہوں اور میں جب چھ سال کی تھی تو ابا کا انتقال ہوا اس وقت مجھ سے بڑی بہن اور ایک بھائی تھے۔ ماشاءاللہ دونوں شادی شدہ ہیں۔ بہن کے تین بچے بھی ہیں.... اور بھائی کے بھی ماشاءاللہ دو بچے ہیں۔"

★ "ابا کے انتقال کے بعد مالی طور پر کوئی پرابلم ہوئی؟"

بیک گراؤنڈ بتاؤں کہ ابو مردان کے علاقے اوبتا میں پیدا ہوئے اور ہم بنیادی طور پر پٹھان ہیں میرے والد ایک سیلف میڈ انسان تھے جرنلزم میں ایم اے کیا اور جرنلزم سے ہی وابستہ ہوئے۔ بہت ینگ ایج میں انہوں نے ٹی وی پہ کام شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ دیگر کام بھی کرتے رہتے تھے۔ مثلاً "ڈیفنس اتھارٹی میں ڈائریکٹر آف پبلک ریلیشن تھے اور ہمارے اپنے پبلشنگ ہاؤسز تھے اور امی کبھی کبھی ابا کی مدد کر دیا کرتی تھیں ان کے کام میں ویسے وہ ہاؤس وائف تھیں اور ان کا فوکس ہم بچے اور گھر تھا۔
میں 9 مئی 1983ء میں پیدا ہوئی اپنا بچپن یاد

کرتی ہوں تو بہت مزا آتا ہے۔ کوئی ایسی تلخ یاد نہیں ہے۔ جو وقت ہم نے اپنے ابا کے ساتھ گزارہ ہے۔ وہ بہت ہی حسین وقت تھا اور ہماری پرورش میں ہماری امی کا بہت بڑا ہاتھ ہے ہمارے ابو بہت مصروف رہتے تھے مگر اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے بچوں کا کوئی ایونٹ نہ منایا ہو یا وہ بھول گئے ہوں۔ ہر تہوار پہ میرے امی ابو ہمارے لیے خاص اہتمام کرتے تھے۔ بہت شاہانہ زندگی تھی ہماری اور اگر میرے اختیار میں ہوتا کہ میں اپنا وقت تبدیل کرسکتی تو میں ابا کے ساتھ گزارا وقت واپس لانا چاہوں گی ۔ بس افسوس ہے تو یہ کہ ابا بہت جلدی چلے گئے اور ان کے ساتھ گزارنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا۔ ورنہ میں نے وقت بہت اچھا گزارہ ہے اور گزار رہی ہوں..... اور میرے امی ابو ہمیشہ مجھے اپنے دوست لگے اور ابھی بھی کوئی پوچھے کہ آپ کی بہترین دوست کون ہیں تو میں اپنی امی کا ہی نام لوں گی اور اپنی بہن کا۔ جو میری ہر بات سے واقف ہیں۔"

★ "ان کے ڈرامے دیکھے ہیں آپ نے؟"

✻ "جی بالکل دیکھے ہیں ابا کا انتقال 19 اکتوبر 1989ء میں ہوا تو گزشتہ سال میں نے ہم ٹی وی کے تعاون سے ابا کے لیے ایک ڈاکومنٹری بنائی تھی اور اس ڈاکومنٹری کا نام "زندہ یادیں" تھا اور یہ ڈاکومنٹری ایک بیٹی کے پوائنٹ آف ویو سے "وہ کیا تھے" کے بارے میں ہے۔ ابا کے بعد میڈیا سے ہمارا کوئی زیادہ تعلق نہیں رہا میڈیا کے لوگ آتے جاتے تھے مگر کم اور امی کا سارا فوکس ہم بچے تھے۔ ابا کے دوستوں میں شکیل صاحب سے ہمارے تعلقات رہے اور وہ تو بالکل ہمارے والد کی طرح ہیں۔ بشریٰ انصاری آنٹی کے ساتھ کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی تھی۔"

★ "آج آپ بہنوں اور بھائی کی جو قابلیت ہے اس کا سارا کریڈٹ آپ کی والدہ کو جاتا ہے؟"

✻ "بالکل سو فیصد مجھے یاد ہے کہ ابو کے انتقال کے بعد چار پانچ سال تک ہم بہن بھائی سات بجے سو جایا کرتے تھے۔ میری امی ہمیں سلادیا کرتی تھیں اور پھر رات کو خود بھی ہمارے ساتھ سویا کرتی تھیں اور ہم سب ایک ہی کمرے میں سویا کرتے تھے۔ رشتے داروں نے ملنا بھی ہوتا تھا تو دن کے اوقات میں آتے تھے۔ ہماری سوشل لائف بالکل ختم ہو کے رہ گئی تھی۔ بس ساری توجہ پڑھائی پہ تھی۔ میں نے بیچلر کیا ہے انگلش لٹریچر اور سائیکلوجی میں اس کے علاوہ انڈس ویلی اسکول آف آرٹ میں آرکیٹکچر۔"

★ "ایف ایم ۔ 91 تک کیسے آئیں اور ریڈیو کے علاوہ کیا کیا کرتی ہیں؟"

✻ "ٹیلی وژن اور ایف ایم ۔ 91 میں نے ایک ساتھ ہی شروع کیا تھا اور یہ بات ہے تقریباً" سات سال پہلے ایک نجی ٹی وی پر غضنفر علی صاحب کے تعاون سے آئی اور ہوسٹ تھی میں اس زمانے میں میں کالج میں تھی اور کچھ کرنا چاہتی تھی کالج کی چھٹیاں تھیں تو سوچا کہ کچھ نیا کرنا چاہیے اس وقت یہ قطعی نہیں سوچا تھا کہ میں اپنے اس کام کو اتنا سیریس لوں گی۔ یوں ایک نجی ٹی وی کی ہوسٹ بن گئی اور ایف ایم کے لیے میں نے آڈیشن دیا کامیاب ہو گئی۔ اس وقت ایم ایف 91 ایک نیا چینل تھا۔ تو اس وقت سے لے کر آج تک ایف ایم 91 سے ہی وابستہ ہوں۔ البتہ ٹی وی میں نے چھوڑ دیا کیونکہ میری پڑھائی مکمل نہیں ہوئی تھی اور امی نے کہا کہ پڑھائی پہ کوئی کمپرومائز نہیں ہوگا اور ریڈیو ایسا میڈیا ہے کہ جہاں ایک تو وقت کی پابندی ہوتی ہے اور پھر ریڈیو کے لیے میری امی کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

تو بس امی نے یہی کہا کہ پڑھائی مکمل کرلو۔ پھر بے شک میڈیا کے لیے کام کرلینا۔ ریڈیو نہیں چھوڑا کیونکہ ریڈیو میرا First Love ہے۔"

★ "ایف ایم تک رسائی کیسے ہوئی اور یہ ایک انگلش چینل ہے اردو ایف ایم کا انتخاب کیوں نہیں کیا؟"

✻ "میں کالج کی طالبہ تھی اور مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ ایک دن کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے تھے اور گپ شپ

کررہے تھے تو ہماری ایک ساتھی نے کہا کہ تم اتنا اچھا بولتے ہو (میرے ساتھ میرا کو آر جے علی اصغر بھی تھا) تم لوگ ریڈیو کیوں نہیں ٹرائی کرتے..... اس وقت تو ہم ہنس پڑے لیکن پھر ہماری ایک دوست نے ایف ایم 91 کے لیے ہماری آڈیشن ارینج کروائی اور ہم نے آڈیشن دیا اور انہیں ہمارا انداز اتنا اچھا لگا کہ ایک مہینے کے اندر اندر انہوں نے اپنے شو کے لیے ہمیں بلالیا اور میں لنچ شو کرتی ہوں جو کہ ایک طویل ترین شو ہے۔ یعنی لنچ شو کرتے ہوئے مجھے تقریباً" ساڑھے چھ سال ہو گئے ہیں اور میں خوش بھی ہوں اور مجھے فخر بھی ہے۔"

★ "کس دن ہوتا ہے آپ کا پروگرام؟"

✻ "میرا روزانہ تو نہیں لیکن پیر سے جمعرات ہوتا ہے اور ایک بجے سے تین بجے تک۔ اس کے علاوہ اور بھی شوز کرتی ہوں۔ میں ایک پولیٹکل شو کیا کرتی تھی فیصل قریشی (نیوز اینکر ٹی وی ون) کے ساتھ کافی پسند کیا جاتا تھا۔۔۔ سوائے لنچ شو کے باقی شوز change ہوتے رہتے ہیں اور رہی بات اردو ایف ایم کی تو میں نے اردو کبھی نہیں کیا اور میں مانتی ہوں کہ اردو ایف ایم سننے والوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن میں شروع سے ہی اس سے وابستہ ہوں تو اس سے انسیت بھی بہت ہوگئی ہے۔"

★ "والد صاحب کا نام کہیں کام آیا؟"

✻ "کبھی زندگی میں والد کے نام کو کیش نہیں کرایا اور جب میں اس فیلڈ میں آئی تو تقریباً" سال ۔۔۔ کے بعد سب کو معلوم ہوا کہ میں سلیم ناصر صاحب کی بیٹی ہوں۔ میرے ابو نے ہمیں بچپن سے ہی ایک بات سکھائی تھی کہ جو تم خود اپنی محنت سے حاصل کرو گے وہی تمہارے لیے دیرپا ہوگا۔ بچپن کی باتیں انسان کو ذہن نشین ہوجاتی ہیں مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کالابل کے پاس ہماری کار کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ میرے ابو خود ٹائر بدلنے لگے تو جانے کتنے لوگوں نے مدد کرنی چاہی مگر ابو نے کہا کہ میں خود کرلوں گا۔ اس دوران کوئی ابو کے لیے پانی لے آیا کوئی بیٹھنے کے لیے اسٹول تو کوئی مکینک کو لے آیا۔ میرے ابو نے کبھی اپنے آپ کو بڑا اسٹار نہیں سمجھا نا صرف اپنا کام خود کرتے تھے بلکہ لوگوں کے بھی بہت کام آیا کرتے تھے اور اس طرح مدد کرتے تھے کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا۔"

★ "آپ کا نام بینش ناصر خان ہے۔ بینش سلیم ناصر کیوں نہیں؟"

✻ "میرے ابو کا پورا نام سلیم ناصر خان تھا تو ہم بہن بھائی کا نام نعمان ناصر خان، مہوش ناصر خان اور بینش ناصر خان اسکول کالج میں لکھا گیا تو یہی نام پہچان بھی بنا۔"

★ "آپ کے بھائی اور بہن بھی اس فیلڈ سے ہیں اور ٹی وی میں مزید کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

✻ "نہیں..... صرف میں ہی اس فیلڈ سے ہوں..... میرے بھائی کا اپنا بزنس ہے اور میری بہن ہاؤس وائف ہے بس ابا کی کچھ صلاحیتیں مجھ میں آگئیں اور میں اس فیلڈ میں آگئی۔ میں نے ٹی وی پر ہوسٹنگ کی ہے اور مجھے ابھی بھی کافی آفرز آتی رہتی ہیں۔ ڈراموں میں کام کرنے کی کافی آفرز آتی ہیں اور پہلے تو میں انکار کر دیتی تھی۔ مگر اب کچھ سوچتی ہوں ان آفرز کے بارے

میں ہمیں کوئی پلان نہیں بناتی دل میں جو بات آجائے کر لیتی ہوں۔ ہوسٹنگ سے مجھے زیادہ لگاؤ ہے اور میں کوئی "ٹاک شو" ٹائپ کا پروگرام کرنا چاہتی ہوں۔ وہ چاہے مارننگ شو ہو یا سیلبرٹی شو..... اداکاری سے مجھے زیادہ لگاؤ نہیں ہے۔ میں نے سیلبرٹی کے کافی انٹرویوز کیے ہیں جن میں لالی ووڈ اور بالی ووڈ کے لوگ بھی شامل ہیں۔"

★ "اب تھوڑے سے نجی سوال ہو جائیں ..... شادی کا کب تک ارادہ ہے؟"

✳ "شادی نہیں ہوئی سب کا زور اور اصرار ہے کہ میں شادی کرلوں اور سب کہتے ہیں کہ اب شادی ہو جانی چاہیے۔ جبکہ میں کہتی ہوں کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے اور میں اس بات پر بھی اتفاق نہیں کرتی کہ زور زبردستی سے شادی کرلوں یا سب کر رہے ہیں تو میں بھی کرلوں۔ بلکہ میرا یہ ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے جو وقت میرے لیے مقرر کیا ہوا ہے وہ یقیناً" میرے حق میں بہتر ہوگا مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

★ "طبیعت میں نرمی ہے یا گرمی ہے؟"

✳ "میری طبیعت میں نرمی ہے۔ غصہ کم ہے مجھ میں البتہ اصولوں کی بہت پکی ہوں میں جھوٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اور کوئی میرے سامنے جھوٹ بولے تو پھر میں کوئی رعایت نہیں کرتی اس کے ساتھ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میرے رائٹس کیا ہیں۔ ابا جلدی چلے گئے اماں کو میں نے بہت اسٹرونگ شخصیت کے روپ میں دیکھا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ہماری سوسائٹی بہت کرپٹ ہے اور جو آپ میں برائیاں نہیں بھی ہیں تو بھی یہ سوسائٹی آپ کے خلاف برا ہی بولے گی۔ تو میری بچپن سے یہ نیچر ہے کہ جب تک میں دل کی بھڑاس نہ نکال لوں چین سے نہیں بیٹھتی حالانکہ امی اس بات پہ ناراض بھی ہوتی ہیں۔"

★ "گھرداری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

✳ "ماشاء اللہ سے اماں کی ٹریننگ ایسی ہے کہ باہر ہوں یا گھر میں ہر کام میں پرفیکٹ ہیں اور میں ہوں یا میری بہن جب کچن میں کسی کام کے لیے جاتی ہیں تو اتنی خاموشی سے اور اتنی جلدی ہر کام کرتی ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ سب کام ہو کیسے گئے۔"

★ "وائس اوور بھی کرتی ہیں؟"

✳ "جی جی ..... بہت وائس اوور کرتی ہوں اور مجھے بہت مزا آتا ہے میں نے ڈاکومنٹریز کافی کی ہیں "یوفون" کے کافی کمرشلز کیے ہیں۔ Zong کے بہت کمرشل کیے ہیں ابھی گارنر کلر کا ایڈ چل رہا ہے۔"

★ "پیسہ من پسند کا ملتا ہے؟"

✳ "الحمد للہ میں کافی مطمئن ہوں۔ بہت اچھا پیسہ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مالی طور پر کافی مستحکم کیا ہوا ہے۔"

★ "اپنی کمائی سے اپنے لیے سب سے اچھی چیز کیا خریدی؟"

✳ "میں اپنی فیملی پر بہت خرچ کرتی ہوں۔ ماشاء اللہ بہن کے بچے دو بھائی کے بچے' ان کے لیے گفٹ لیتی ہوں۔ اپنے بھائی بہن اور امی کے لیے گفٹ لیتی ہوں اور بحیثیت پھپھو کے بھی اور بحیثیت خالہ کے بھی میں بہت چاہی جاتی ہوں۔ بچے میرے بہت قریب ہیں اور مزے کی بات یہ کہ پانچوں بچے اپنی دوسری ماں سمجھتے ہیں اور اپنی ماں کے لیے تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان کی خدمت کروں۔ میں اکثر فضول میں ان کو بازار لے جاتی ہوں۔ اکثر میرا دل کرتا ہے کہ امی کے ساتھ مووی دیکھوں تو مووی کے لیے ان کو ساتھ لے جاتی ہوں۔ کھانا کھانے ایک ساتھ چلے جاتے ہیں تو اس قسم کی ایکٹویٹی امی کے ساتھ بہت ہیں۔"

★ "ریڈیو کے لیے اسکرپٹ خود ہی لکھتی ہیں؟"

✳ "جی بالکل مجھے لکھنے کا شوق بھی بچپن سے ہی ہے اور میں نے کافی شارٹ اسٹوریز لکھی ہیں اور میں ایک کتاب بھی لکھ رہی ہوں اور وہ کتاب میں اپنے والدین کے نام کروں گی۔"

★ "کبھی ایسا ہوا ٹریفک میں پھنس گئیں۔ ریڈیو پہنچ نہیں پائیں اور موڈ بھی خراب ہو گیا..... پھر سب باتوں کو کس طرح سنبھالتی ہیں؟"

✳ "ریڈیو کے لیے عموماً" لوگوں کا یہ تصور ہے کہ یہ کوئی بہت ہی آسان جاب ہے۔ جبکہ میرے نزدیک ریڈیو کی جاب مجھے ٹی وی کی جاب سے زیادہ مشکل لگتی ہے۔ میں یہ بات اپنے تجربے سے کہہ رہی ہوں کیونکہ میں نے دونوں جگہ جاب کی ہوئی ہے۔ مجھے ریڈیو کی جاب زیادہ چیلنجنگ لگتی ہے۔ اس لیے کہ ٹی وی کیمرے کے سامنے آپ ہاتھ ہلا کر یا اپنی باڈی لینگویج کے ذریعے اپنے ایکسپریشن دے رہے ہوتے ہیں جبکہ ریڈیو میں آپ نے صرف اور صرف اپنی آواز کے ذریعے لوگوں کو کنونس کرنا ہوتا ہے۔ ہنسانا ہوتا ہے۔ متاثر کرنا ہوتا ہے۔ یعنی سارا کھیل آواز کا ہوتا ہے اور ریڈیو کے لیے ماشاء اللہ سے ہماری ٹریننگ ایسی ہے کہ جب ہم مائیک کے سامنے آتے ہیں تو یہ سوچ کر آتے ہیں کہ لوگ آپ کو اس لیے نہیں سن رہے کہ آپ کا دن کیسا گزرا یا گزر رہا ہے بلکہ وہ آپ کو اس لیے سن رہے ہیں کہ ان کا دن کس طرح اچھا گزر سکتا ہے۔ تو جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو میں بھی انسان ہوں میرے ساتھ بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے تو میں نے کبھی بھی اپنی پرسنل پریشانی کی وجہ سے اپنا پروگرام خراب نہیں کیا یا اپنے موڈ کو پروگرام پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔"

★ "ایف ایم-91 صرف کراچی تک محدود ہے؟"

✳ "نہیں جی پورے پاکستان میں سنا جاتا ہے۔ اس کو انٹرنیٹ پر بھی سن سکتے ہیں لائیو کالز بھی لیتی ہوں اور لائیو کالز کے لیے ہر طرح کا تجربہ ہو گیا ہے۔ کچھ سامعین یا لڑکے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں (آر جے کو) کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔"

★ "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

✳ "میرے نانا نے ساری فیملی کو ایک عادت ڈالی ہوئی تھی کہ صبح دیر سے نہیں اٹھنا اور یہی عادت آگے ہماری امی نے بھی ڈالی اتوار کے دن بھی زیادہ سے زیادہ نو بجے تک سونے کی اجازت تھی۔ میں حیران ہوتی ہوں ان لوگوں پہ۔ جو اتوار کے دن یا عام چھٹی کے دن دوپہر 2-2 بجے تک سوتے رہتے ہیں۔ تو مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے اور آٹھ ساڑھے آٹھ تو میں آفس میں ہوتی ہوں اور شام چھ بجے تک گھر پہنچ جاتی ہوں کیونکہ جب میں نے کام کی شروعات کی تھی تو اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ شام کو دیر تک کام نہیں کرنا۔ شام اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی گزارنی ہے۔"

★ "اور سوتی کب ہیں؟"

✳ "یہی کوئی بارہ بجے۔ اتنا ٹائم تو ہو ہی جاتا ہے' کیونکہ کبھی کبھی فیملی کے ساتھ باہر کہیں گھومنے یا کھانا کھانے نکل جاتے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے بینش ناصر خان سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

✡ ✡

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۰
بیسویں قسط

یہ نام اس کی سماعتوں پہ کسی بم کی طرح پھٹا تھا۔
لیکن اس نے ایک ذہین اور سمجھ دار آفیسر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے تمام تاثرات لمحے کے ہزارویں حصے میں کنٹرول کرلیے تھے کیونکہ یہاں اس کا مشتعل ہونا خود اس کی ذات کو ہی نہیں اس گھر میں موجود اس کے ماں باپ اور مومنہ بی بی کو بھی کسی مشکل میں ڈال سکتا تھا کیونکہ اس وقت وہ اکیلی تھی اور سامنے کھڑے افراد مسلح تھے وہ ڈری نہیں تھی بس قدرے محتاط ہو گئی تھی ایسے ہزاروں کیسز سے روزانہ ان کا واسطہ پڑتا تھا جن میں الٹا خود پولیس آفیسرز کو یا پھر ان کے گھر والوں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا اس لیے وہ کسی عظیم نقصان کے خیال سے ہی کچھ دھیمی پڑ گئی۔
”اوہ! تو آپ ہیں ملک حق نواز صاحب؟“ اس نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا۔
”کیا بات ہے میڈم؟ کیا میرا نام پہلی بار سنا ہے آپ نے؟“ ملک حق نواز نے انسپکٹر شہناز کو گہری اور کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھا۔
”ارے نہیں ملک صاحب...! نام پہلی بار نہیں سنا‘ دیکھا پہلی بار ہے۔“ انسپکٹر شہناز کافی خوش اخلاقی سے بات کررہی تھی۔
”ہوں! تو پھر مجھے دیکھا ہے تو مجھے سمجھ بھی گئی ہوں گی آپ...؟“ ملک حق نواز جیسے انسپکٹر شہناز کو کچھ باور کروا رہا تھا اور نادان تو وہ بھی نہیں تھی‘ البتہ یہ الگ بات تھی کہ وہ نادان بن رہی تھی کیونکہ صورت حال ہی کچھ ایسی تھی۔
”جی‘ جی بالکل! بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں‘ آپ کی حیثیت‘ آپ کا مرتبہ سب سمجھ میں آچکا ہے‘ بس آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟“ انسپکٹر شہناز نے کافی عاجزی اور ملنساری سے کام لیتے ہوئے کہا۔
”دیکھیے میڈم شہناز! آپ نے شاید غور نہیں کیا...؟ میں اپنی عرض تو پہلے جملے میں ہی واضح کرچکا ہوں‘ لیکن کوئی بات نہیں ایک بار پھر سہی۔“ ملک حق نواز آج اپنے مزاج کے خلاف بڑے ٹھہراؤ سے بات کررہا تھا۔
”جی کہیے! میں سن رہی ہوں۔“ انسپکٹر شہناز نے اپنی ساری توجہ ملک حق نواز کی سمت مرکوز کررکھی تھی۔
”دل آور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملاقات کرنا چاہ رہا ہوں‘ لیکن دونوں ہی کہیں میسر نہیں آرہے‘ البتہ یہ سننے میں ضرور آیا ہے کہ ان دونوں کا آپ سے پرسنل کانٹیکٹ رہتا ہے اس لیے سوچا ہے کہ آپ سے ہی کہا جائے کہ ملاقات کی کوئی سبیل نکالیں‘ تاکہ کچھ وہ اپنی کہہ سن لیں اور کچھ میں اپنی کہہ سن لوں... کہیے کیا خیال ہے آپ کا؟“ ملک حق نواز بڑے طریقے سے بات کررہا تھا لیکن انسپکٹر شہناز سب سمجھتی تھی وہ ناسمجھ بچی نہیں تھی جو اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتی اس نے بھی کچھ بولنا تو تھا لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔
”دیکھیے ملک صاحب! دل آور شاہ ایک بہت اچھے‘ بہت ذہین اور سمجھ دار وکیل ہیں‘ میرا ان کے ساتھ کوئی پرسنل ریلیشن شپ نہیں ہے جس کی وجہ سے پرسنل کانٹیکٹ ہوگا‘ بس ہمارا پروفیشن ایسا ہے کہ کبھی کبھار آمنا سامنا ہوجاتا ہے‘ جس کی وجہ سے دعا سلام بھی ہوتی رہتی ہے‘ لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے‘ البتہ دل آور شاہ کے بارے میں اتنا ضرور پتا ہے کہ آج کل وہ اپنے کسی کیس کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے ہیں اور امید ہے کہ دو تین روز تک واپس لاہور آجائیں گے لیکن یہ بات پھر بھی کنفرم نہیں ہے‘ ہوسکتا ہے وہ لیٹ ہوجائیں یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جلدی واپس آجائیں اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا اور رہی بات مومنہ بی بی کی تو ان کے بارے میں بھی میری معلومات کچھ ایسی ہی ہیں کیونکہ مومنہ بی بی‘ دل آور شاہ کا کیس ہے‘ اس لیے ان کے بارے میں زیادہ معلومات دل آور شاہ کو ہی ہوگی‘ آپ ان کی واپسی کا انتظار کرلیں‘ آپ کا سارا مسئلہ حل ہو

جائے گا۔“ انسپکٹر شہناز نے مومنہ بی بی کے متعلق مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا تھا جس پہ ملک حق نواز کی پیشانی پہ ناگواری کے باعث بل پڑ گئے تھے۔
”انسپکٹر شہناز! آپ کی معلومات ناقص اور محدود ہوسکتی ہے لیکن ملک حق نواز کی نہیں‘ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ مجھے دیکھ کر مجھے سمجھ گئی ہوں گی‘ لیکن آپ تو کچھ بھی نہیں سمجھیں... ملک حق نواز آپ کے گھر کی اس چاردیواری میں بیٹھ کر اس چاردیواری تک ہی محدود نہیں ہے‘ بلکہ یہاں بیٹھ کر بھی آپ کے پورے گھر کے بارے میں بتا سکتا ہوں جس کے ثبوت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مومنہ بی بی اس وقت اسی چاردیواری میں موجود ہے‘ میں چاہوں تو ایک منٹ میں اسے نکال کے باہر لے آؤں... سمجھیں آپ...؟“ ملک حق نواز نے کافی سخت لہجے میں کہتے ہوئے انسپکٹر شہناز کے سامنے چٹکی بجائی تھی اور انسپکٹر شہناز نے خود کو ایسا کنٹرول کیا تھا کہ اپنا رنگ فق نہیں ہونے دیا ورنہ اگر یہاں اس کا رنگ فق ہوجاتا تو ساری بازی پلٹ جاتی‘ ملک حق نواز نے محض پتا پھینکا تھا کہ لگ گیا تو لگ گیا‘ نہ لگا تو نہ سہی۔
”ملک صاحب! میں نے بھی آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں آپ کی حیثیت‘ آپ کا مرتبہ سب سمجھ چکی ہوں‘ آپ کے اثر ورسوخ کا اندازہ بھی ہوچکا ہے پھر بھی سب کچھ دیکھتے ہوئے میں آپ سے جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں...؟ آپ اس وقت بااختیار ہیں‘ کچھ بھی کرسکتے ہیں‘ ایسے میں میں غلط بیانی سے کام لے کر معاملہ کیوں بگاڑوں گی بھلا...؟ میں بے وقوف نہیں ہوں‘ اس وقت میرے لیے آپ کی بات اہم ہے‘ آپ میرے گھر آئے ہیں‘ اچھے طریقے سے بات کررہے ہیں‘ کوئی غصہ نہیں ہے‘ کوئی دھمکی نہیں‘ پھر بھی اگر میں آپ کے ساتھ جھوٹ بولوں گی تو یہ الٹا میرے لیے نقصان دہ ہوگا آپ کے لیے نہیں... ہاں اگر آپ کو شک ہے کہ مومنہ بی بی میرے پاس ہے‘ میرے گھر میں ہے تو پلیز میں آپ سے کہوں گی کہ آپ اپنا شک دور کرلیں‘ میرا گھر کھلا پڑا ہے‘ آپ تلاشی لے سکتے ہیں‘ حالانکہ میرے گھر کی تلاشی لینے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے‘ آپ کے لیے قانوناً جرم ہے یہ لیکن پھر بھی آپ کو میری طرف سے اجازت ہے‘ آپ اپنی تسلی کرلیں۔“ انسپکٹر شہناز کے اعتماد کے آگے ملک حق نواز کا پھینکا گیا پتا بے کار گیا تھا وہ بھی خود پہ اعتماد رکھ کے اتنی بڑی بات کہہ گئی تھی کہ ملک حق نواز خاموش رہ گیا۔
”دیکھیے انسپکٹر شہناز! میں اس وقت آپ کے گھر کی تلاشی لینے کے ارادے سے نہیں آیا‘ میں تو آپ کو صرف یہ جتانے کے لیے آیا ہوں کہ مجھے انجان مت سمجھیے گا؟ میں انجان نہیں ہوں‘ دل آور شاہ سے کہیے گا کہ مجھ سے غافل مت رہے‘ کہیں مومنہ بی بی کو انصاف دلاتے دلاتے اپنا نقصان نہ کرلے کیونکہ دل آور شاہ کی وجہ سے یا پھر مومنہ بی بی کی وجہ سے میری ساکھ خراب ہوئی تو اچھا نہیں ہوگا‘ آج کل الیکشن کے دن ہیں‘ میری بدنامی سے میری پارٹی کو نقصان پہنچا تو سب کا انجام برا ہی ہوگا‘ اتنا برا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔“ ملک حق نواز نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تھی اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔
”اور ہاں! جو بھی اس معاملے میں شریک ہوگا سب لپیٹ میں آئیں گے‘ معافی کسی کے لیے بھی نہیں ہوگی۔“ اس نے جاتے جاتے ایک اور وارننگ دی اور اپنے گارڈز کو اشارہ کرتے ہوئے خود بھی قدم باہر کی سمت بڑھا دیے۔
”معاف کرنے والا تو دل آور شاہ بھی نہیں ہے ملک صاحب...“ انسپکٹر شہناز کی آواز پر ملک حق نواز کے قدم تھم گئے تھے‘ اس نے یکدم پلٹ کر انسپکٹر شہناز کی سمت دیکھا۔
”آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں...؟“ ملک حق نواز نے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔
”میں دھمکی نہیں دے رہی ملک صاحب! آپ کو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ اگر آپ بے قصور ہیں تو دل آور شاہ

کبھی آپ سے فکر نہیں لے گا اور اگر آپ واقعی قصوروار ہیں تو دل آور شاہ کے عتاب سے بچنا اتنا آسان نہیں ہو گا آپ کے لیے' میری یہ بات آپ بے شک لکھ کر رکھ لیں' معافی کی گنجائش ان کے پاس بھی نہیں ہوتی۔"
انسپکٹر شہناز نے ملک حق نواز کو دل آور شاہ کے متعلق تھوڑا بہت بتا دینا ہی مناسب سمجھا تھا کہ کہیں وہ دل آور شاہ کو اپنی غیری شخصیت ہی نہ سمجھتا پھرے۔
"یہ دھمکی نہیں تو اور کیا ہے.....؟" ملک حق نواز نے انسپکٹر شہناز کو کافی سخت نظروں سے دیکھا تھا۔
"اگر یہ اتنی سی بات آپ کو دھمکی لگ رہی ہے تو پھر دھمکی ہی سہی۔" اس نے کندھے اچکائے اور ملک حق نواز مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا کیونکہ ایک پولیس آفیسر کے گھر پہ ان کا کوئی ہنگامہ برپا کرنا بھی ان کے حق میں ٹھیک نہیں تھا لہٰذا ضبط ہی بہتر تھا۔
"ہوں! ٹھیک ہے پھر' اللہ حافظ۔" انسپکٹر شہناز کے تنے ہوئے اعصاب اور بھی تن گئے تھے ملک حق نواز کی نظریں چھید دینے والی تھیں لیکن پھر بھی وہ لب بھینچتی ہوئی زہر کا گھونٹ پی کے رہ گئی' وہ آج اگر ملک حق نواز کے سامنے خاموش ہوئی تھی تو محض مومنہ بی بی کی وجہ سے' کیونکہ وہ اپنے غصے اور اشتعال کی وجہ سے مومنہ بی بی کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی' ملک حق نواز آج کل اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے اسے جان سے بھی مار سکتا تھا' اسی لیے تو وہ جگہ جگہ اس کی بو سونگھتا پھر رہا تھا اور دوسری طرف دل آور شاہ نے مومنہ بی بی کی حفاظت کی ذمہ داری اسے سونپی ہوئی تھی اس لیے اسے یہ ذمہ داری ہر حال میں نبھانی تھی چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔
"شہناز! کیا بات ہے بیٹا.....؟ کون تھے یہ لوگ؟" قیوم رضوی کی آواز پہ انسپکٹر شہناز یکدم چونک گئی۔
"کیا ہوا ہے؟ پریشان لگ رہی ہو؟" انہوں نے دوبارہ استفسار کیا وہ بیٹی کے چہرے سے ہی پریشانی بھانپ چکے تھے۔
"کچھ نہیں ابی جان! بس وہ مومنہ بی بی کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی' ملک حق نواز میرے گھر تک پہنچ گیا ہے۔" انسپکٹر شہناز نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے متفکر سے انداز میں جواب دیا۔
"اچھا! تو یہ ملک حق نواز تھا.....؟" انہوں نے پرسوچ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا وہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے اور ملک حق نواز ان کے گھر سے نکل رہا تھا جسے دیکھ کر ان کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔
"جی ہاں! یہ وہی خبیث ہے۔" انسپکٹر شہناز غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔
"کیا بات ہے؟ اس نے کچھ کہا ہے کیا.....؟"
"جی ہاں! اسے شک ہو چکا ہے کہ مومنہ میرے پاس ہے اور میرا دل آور شاہ سے پرسنل کانٹیکٹ بھی ہے۔" انسپکٹر شہناز کبھی اپنی مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور کبھی پیشانی مسل رہی تھی۔
"اوہ! تو یہ مسئلہ ہے.....؟"
"جی یہی مسئلہ ہے اور اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ نہیں آ رہا۔" انسپکٹر شہناز پریشانی کے مارے ڈرائنگ روم میں دائیں سے بائیں ٹہل رہی تھی اسے مومنہ بی بی کے لیے کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔
"تو بیٹا! تم دل آور سے بات کرو نا' اسے ساری صورت حال سے آگاہ کرو' وہ یقیناً "کوئی حل سوچ لے گا۔" انہوں نے بیٹی کو مشورہ دیا۔ لیکن انسپکٹر شہناز کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ دل آور شاہ کو پریشان کرے' آخر وہ کیا سوچے گا کہ انسپکٹر شہناز اتنی جلدی ذمہ داری سے گھبرا گئی ہے.....؟
"نہیں ابی جان! میرا دل نہیں مان رہا' میں دل آور شاہ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"لیکن بیٹا! اس طرح تو مسئلہ حل نہیں ہو گا نا۔ اب تو مومنہ بی بی کے ساتھ ساتھ خود تمہاری زندگی کو بھی خطرہ

لاحق ہو چکا ہے' ملک حق نواز سامنے آ چکا ہے آخر؟" عبدالقیوم رضوی بیٹی کو ساری اونچ نیچ سمجھا رہے تھے۔
"لیکن ابی جان! آپ یہ بھی تو سوچیے کہ ملک حق نواز اگر میرے گھر تک پہنچ سکتا ہے تو وہ کہیں بھی پہنچ سکتا ہے' مومنہ بی بی نہ تو کسی دارالامان میں رہ سکتی ہے' نہ کسی ہاسٹل میں' اور نہ ہی کسی ہوٹل میں' کیونکہ ان جگہوں پہ وہ محفوظ نہیں رہ سکے گی اور رہی بات گھر میں رکھنے کی تو کوئی بھی اسے اپنے گھر میں نہیں رکھے گا' کیونکہ مومنہ بی بی کو اپنے گھر میں رکھنا اور پناہ دینا خطرے سے خالی نہیں ہے اور آج کل کسی اور کی وجہ سے کون خطرہ مول لیتا ہے بھلا؟" انسپکٹر شہناز حقیقتاً "پریشان ہو رہی تھی۔
"تو بیٹا! پھر چھوڑو اوروں کی بات' تم اسے رہنے دو' وہ یہیں رہے گی' ہم سمجھیں گے کہ ہماری ایک نہیں دو دنیاں ہیں۔" عبدالقیوم رضوی نے بڑی فراخدلی سے کہا تھا وہ ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے' بہت بہادر' وسیع ظرف اور رحمدل بھی' پہلے دن جب انسپکٹر شہناز نے ان کو مومنہ بی بی کے متعلق بتایا تھا تو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مومنہ بی بی کو خوش آمدید کہا تھا اور اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن آج ملک حق نواز آڑے آ گیا تھا۔
"نہیں ابی جان! اب مومنہ بی بی کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے' کیونکہ میں اور میرا گھر ملک حق نواز کی نظر میں آ چکے ہیں' وہ مجھ پہ اور میرے گھر پہ چیک رکھے گا' اسی لیے مومنہ بی بی کو کہیں اور شفٹ کرنا پڑے گا' جہاں اس کی سوچ بھی نہ جا سکے۔"
انسپکٹر شہناز اس کے لیے کسی محفوظ جگہ کا سوچ رہی تھی اور اس کی سوچیں' تفکرات' اور پریشانی باہر کھڑی مومنہ بی بی کو ندامت کے کنویں میں دھکیل گئی تھیں' اس کی وجہ سے سب پریشان ہو رہے تھے' وہ سب کے لیے مصیبت بن گئی تھی' کیوں اس نے اپنی وجہ سے دوسروں کو بھی آزمائش میں ڈال رکھا تھا.....؟ اس کی سوچیں اور خیالات اسے چپ کرا گئے تھے' اب اس نے چپ رہ کر ہی کچھ اور سوچنا تھا اور فیصلہ کرنا تھا' وہ دوسروں پہ بوجھ کب تک بنتی؟ آخر کب تک تنگ کرتی؟

☆ ☆ ☆

"عدیل عمر.....!" سوچتے سوچتے اچانک ایک کپکپی کی سی صورت میں اس کا نام اس کے لبوں سے ادا ہوا اور وہ اس نام پہ خود ہی چونک گئی۔
"عدیل عمر.....؟" اس نے اپنے آپ سے تصدیق کے لیے دوبارہ نام دہرایا اور دوبارہ بھی اسے یہی لگا کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہے..... اور دل سے ادا شدہ "عدیل عمر" مدحیہ حیات کو گم سم کر گیا تھا۔
وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہے تو کیوں ہوا ہے.....؟ وہ اپنے آپ کو ٹٹول رہی تھی' اپنے دل کو کھوج رہی تھی' اور جو سمجھ آ رہا تھا وہ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔
"تو کیا محبت.....؟" یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ سر تھام کے بیڈ پہ بیٹھ گئی اور اس کی سماعتوں میں دور دور تک اس کی اپنی ہی "نہیں نہیں" کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔
"کیا مدحیہ حیات کو کسی سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔" وہ خود اپنی ذات سے سوال کر رہی تھی اور جواباً "پھر اسے وہی گم سم سی خاموشی سنائی دے رہی تھی' چپ چپ اور حیران پریشان۔
"مدحیہ! تم ابھی تک جاگ رہی ہو بیٹا؟" فائزہ بیگم اس کے بیڈ روم کی لائٹ جلتی دیکھ کر اندر آ گئی تھیں اور مدحیہ کو بیڈ کی پائنتی کی طرف ایک کنارے پہ بیٹھے دیکھ کر انہیں اور بھی تشویش کا احساس ہوا تھا۔
"مدحیہ! اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟ کیا ہوا ہے؟" انہوں نے قریب آتے ہوئے مدحیہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مدحیہ چونک گئی اس نے یکدم سر اٹھا کر فائزہ بیگم کو جیسے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

"مدحیہ! تم ٹھیک تو ہو...؟ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو...؟" انہوں نے مدحیہ کی آنکھوں سے گھبرا کر پوچھا۔

"ک...کچھ نہیں ہوا مجھے۔" اس نے یکدم نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اس کی پیشانی پہ نامحسوس سے پسینے کے قطرے تھے جو اس نے دونوں ہاتھوں سے پونچھ ڈالے تھے۔

"رات کے اس پہر اس طرح کیوں بیٹھی ہو...؟ آخر کیا ہوا ہے تمہیں؟ تمہاری حالت اتنی غیر کیوں ہو رہی ہے؟" فائزہ بیگم اس کی حالت دیکھ کر دہل چکی تھیں ان کا دل مٹھی میں آگیا۔

"مام! میں نے کہا نا کچھ نہیں ہوا مجھے' بس سوچتے سوچتے نہ جانے دھیان کہاں چلا گیا تھا کہ میری کیفیت کنٹرول سے باہر ہونے لگی تھی۔" مدحیہ نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن فائزہ بیگم کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھیں۔

"آر یو شیور...؟"

"یس مام! ایم شیور' اینڈ پلیز لیو ی الون۔"

اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا اور فائزہ بیگم اسے دوبارہ اس کے مزاج میں دیکھ کر قدرے مطمئن ہو گئی تھیں اسی لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوکے! تم آرام کرو' گڈ نائٹ" وہ مدحیہ کا گال تھپک کر چلی گئیں اور مدحیہ عدیل عمر سے محبت کا ادراک لیے جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔ اور پھر نہ جانے کتنی دیر گزر گئی کہ وہ یکدم سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں ہو سکتا' یہ... یہ میرے دل کا پاگل پن ہے' یہ صرف میرے دماغ کا خلل ہے' ورنہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ میں کچھ بھی نہیں جانتی' محض ایک دو بار دیکھ لینے سے بھی کبھی محبت ہوئی ہے بھلا... محبت کے لیے تو ایک عمر چاہیے ہوتی ہے' یہ اک بار دیکھنے کا یا پھر اک بار ملنے کا کھیل تو نہیں ہے نا' یہ تو پوری زندگی کی بازی ہے' اور بازی اتنی آسانی سے تو نہیں لگ جاتی؟ بس مجھے اس کا ورکشاپ میں کام کرنا اچھا نہیں لگا' اس سے زیادہ تو اور کچھ نہیں... وہ مرے یا جیے میری بلا سے' مجھے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا... ؟ عدیل عمر صرف عدیل عمر ہے اور کچھ نہیں' کچھ نہیں' کچھ نہیں۔" اس نے بری طرح عدیل کی ذات کی نفی کرتے ہوئے سر دائیں بائیں جھٹکا تھا اور عدیل کا بھوت سر سے اتار پھینکا تھا' وہ جب سے عدیل کو ورکشاپ میں کام کرتے دیکھ کر آئی تھی تب سے مسلسل سوچوں میں اور اپنے آپ سے جنگ میں پھنسی ہوئی تھی لیکن اب اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک ڈالا تھا اور اپنے چہرے کی کیفیت مٹانے کی غرض سے واش روم میں گھس کر چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارنے لگی تاکہ اس کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ سکیں اور پھر پانچ منٹ بعد وہ واش روم سے نکل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی اور ابھی وہ تولیے سے اپنا چہرا خشک کر رہی تھی جب اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی سرخ رنگ کی مخملی ڈبیا پہ جا پڑی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ ڈبیا اٹھالی اور پھر آہستگی سے اس ڈبیا کو کھول بھی لیا تھا... اس ڈبیا میں جگمگاتی ڈائمنڈ رنگ مدحیہ کے لیے جبزی کی طرف سے ایک سوالیہ نشان تھا' ہاں یا نہ...؟

اور مدحیہ فی الحال اس ہاں یا نہ کا فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے اس نے سختی سے لب بھینچتے ہوئے وہ ڈبیا دوبارہ بند کی اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں پٹخ دی تھی اور بیڈ روم کی تمام لائٹس آف کر کے بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی۔

سناٹا ہر سو پھیل چکا تھا' رات گہری سے بھی گہری ہو رہی تھی' اندھیرا بھیگ رہا تھا اور خیال بھٹک رہے تھے' جا بجا' دل سے دماغ تک' یہاں سے وہاں تک' ورکشاپ سے اس کے بیڈ روم تک' اس کی ذات سے اس کی محبت تک' ہر طرف' ہر سو' بس خیال ہی خیال تھے' صرف اور صرف عدیل عمر کے... گویا وہ دماغ سے جھٹک دینے سے

بھی جھٹکا نہیں گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا دیکھ رہے ہو منصور حسین...؟" وہ کافی دیر سے روشنیوں میں ڈوبی حویلی کی مضبوط اور بلند عمارت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جب عارف نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا۔

"شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔" وہ واقعی دلہنوں کی طرح سجی حویلی کو حیرت اور اچنبھے سے دیکھ رہا تھا۔

حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو کل دیکھنا' جب علیزے بی بی کا برتھ ڈے ہوگا اور امیر کبیر لوگ اپنی بیگمات کے ساتھ یہاں وہاں ٹہلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔"

عارف حویلی کا کافی پرانا ملازم تھا اس لیے حویلی کی شان و شوکت سے بھی کافی اچھی طرح واقف تھا جبکہ منصور حسین نیا تھا اور اس کے لیے حویلی کی شان و شوکت بھی نئی تھی۔

"ہونہہ! حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو پرسوں دیکھنا' جب تمہیں یہاں وہاں کوئی بھی ٹہلتا ہوا دکھائی نہیں دے گا۔" منصور حسین نے کافی تمسخرانہ انداز میں کہا تھا جس پہ عارف کو کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

"کیا مطلب ہے منصور حسین...؟"

"مطلب ہے کہ جب کوئی فنکشن ہوتا ہے تو بڑی رونق ہوتی ہے' بڑی روشنیاں ہوتی ہیں' بڑی چہل پہل ہوتی ہے' لیکن جب فنکشن ختم ہو جاتا ہے تو ہر طرف سناٹے چھا جاتے ہیں' ویرانی اور بے رونقی سی ہو جاتی ہے' تب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا' اپنی شان و شوکت سے بھی بندہ اکتا جاتا ہے۔" منصور حسین نے اسے وضاحت سے بتایا اور عارف کو سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس سے اتفاق کرنا ہی پڑا تھا۔

"ہوں! ٹھیک کہہ رہے ہو یار! ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ارے! تم لوگ یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ اتنا نہیں سوچتے کہ آکر میرا ہاتھ ہی بٹا دو۔" مبارک خان گیٹ کی طرف جاتے جاتے ان دونوں کو دیکھ کر رک گیا۔

"کیا تم ہمارا ہاتھ بٹاتے ہو؟ کبھی عارف کی جگہ چوکیداری کی تم نے؟" کبھی میری جگہ ڈرائیوری کی تم نے... کبھی تمہیں ہماری تھکن کا احساس ہوا... نہیں نا؟ تو پھر ہم تمہارا احساس کیسے کریں؟ تمہارا ہاتھ کیوں بٹائیں ہم؟" منصور حسین نے مبارک خان کو کھری کھری سنائی تھی اور مبارک خان جھنجلا گیا۔

"یار! تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے' نہ جانے کس مٹی سے بنے ہو تم' روکھے اور سڑیل' سامنے والے کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔" مبارک خان بہت بدمزا ہوا۔

"اس زمانے میں کوئی کسی کا لحاظ نہیں کر رہا مبارک خان صاحب... یہاں سب کو اپنی پڑی ہے' کسی سے شکوہ کرنا سب سے بڑی غلطی ہے یہاں اور آئندہ اس غلطی سے پرہیز کرنا' کیونکہ یہاں سب نے اپنا اپنا کام خود کرنا ہے۔ اس لیے ہاتھ بٹانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی بڑے صاحب کے خاص ملازم تم ہو ہم نہیں' جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں بھلا...؟" منصور حسین تو بندے کا دماغ دھو کے رکھ دیتا تھا مبارک خان تو شکوہ کر کے پچھتایا۔

"منصور حسین...! منصور حسین۔" رجو دور سے ہی آوازیں دیتی ہوئی آ رہی تھی اس نے گردن موڑ کر اپنی طرف آتی رجو کو دیکھا۔

"فرمایئے کنیز! کیا پیغام لائی ہیں؟" منصور حسین کا انداز استہزائیہ تھا جس پہ مبارک خان نے اسے گھور کے دیکھا۔

"بڑے صاحب نے بلایا ہے تمہیں۔" رجو نے اپنی سانس ہموار کرتے ہوئے کہا۔
"اور کچھ.....؟"
"ان سے جاکر پوچھ لو' وہ بتاویں گے اور کچھ۔" رجو نے خفگی سے کہا۔
"ارے! کیا ہوگیا ہے تم سب کو.....؟ سب مجھ پہ ہی اکڑ رہے ہو.....؟ میرا قصور تو بتاؤ؟" منصور حسین نے حیرت سے کہا۔
"اپنے قصور بعد میں پوچھنا پہلے بڑے صاحب کی بات سن لو جاکر' وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" مبارک خان کا لہجہ بھی خفگی لیے ہوئے تھا منصور حسین کندھے اچکاتا ہوا کھڑا ہوگیا اور رجو پیغام دے کر خود کوارٹرز کی سمت بڑھ گئی۔
"پلیز آذر بھائی! آپ اس طرح نہیں جاسکتے' پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھ سے کس لیے ناراض ہیں۔" علیزے کی آواز پہ منصور حسین کے قدم ٹھہر گئے اس کی آواز بائیں طرف والے لان کے کونے سے آرہی تھی گویا اس کے ساتھ آذر بھی تھا۔
"میں تم سے ناراض نہیں ہوں یار' تم کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہو؟" یہ نرم سی آواز آذر کی تھی۔
"تو پھر آپ مجھ سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتے.....؟ جہاں میں ہوتی ہوں آپ چلے جاتے ہیں؟ ابھی بھی میں آئی ہوں اور آپ اندر جا رہے ہیں.....؟ یہ ناراضی نہیں تو اور کیا ہے؟" علیزے کی آواز بھیگ رہی تھی اور لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔
"یہ ناراضی نہیں ہے میری جان! ضروری نہیں کہ انسان اسی وقت کتراتا ہے جب ناراض ہوتا ہے' کسی سے کترانے کے لیے کچھ اور وجوہات بھی ہوسکتی ہیں' میرا تم سے کترانا تمہارے حق میں ہی بہتر ہوگا۔" منصور حسین دیکھ رہا تھا آذر' علیزے کو سمجھانے کی خاطر اس کے دونوں ہاتھ تھام کے نرمی سے تھپک رہا تھا کیونکہ چھوٹے سے دل کی علیزے' آذر کی ذرا سی بے رخی اور لاتعلقی پہ چھم چھم نیر بہا رہی تھی وہ کب سے آذر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی لیکن وہ اسے میسر ہی نہیں آرہا تھا اور جیسے ہی وہ اسے لان میں ٹہلتا ہوا دکھائی دیا وہ فوراً اس کے پیچھے لان میں آگئی تھی۔
"مجھے میرے حق میں ایسی بہتری نہیں چاہیے جو آپ کی لاتعلقی اور بے رخی کی وجہ سے آئے' آپ جیسے پہلے تھے آپ کو میرے ساتھ ویسا ہی رہنا ہے میں کبھی کسی کی بھی ناراضی اور لاتعلقی برداشت نہیں کرسکتی' آپ تو پھر آپ ہیں۔" علیزے آنسوؤں کے درمیان جھنجلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور آذر اس کی بات پہ اس کی اتنی محبت پہ اور اس کی معصومیت پہ بے ساختہ مسکرا دیا۔
"اوکے اوکے! نہیں ہوتا میں تم سے لاتعلق' بس تم اپنے یہ آنسو ختم کرو اور پیاری سی مسکراہٹ سے مسکرا دو۔" آذر نے پیار سے کہتے ہوئے اس کا گال تھپکا اور علیزے روتے روتے مسکرا دی تھی' وہ دونوں لان میں کھڑے تیز روشنیوں میں صاف دکھائی دے رہے تھے منصور حسین نے ان سے نظریں ہٹا کر سر جھٹکا اور قدم دوبارہ اندر کی طرف بڑھا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم!" اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کافی دھیمی آواز میں سلام کیا کیونکہ ڈرائنگ روم میں چھائی خاموشی اسے پہلے قدم پر ہی محسوس ہوگئی تھی۔
"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔" عبدالقیوم رضوی نے اسے سامنے والے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی! کہیے۔۔۔" انسپکٹر شہناز کا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے، جس کے لیے انہوں نے اسے فون کر کے وقت سے پہلے ہی گھر بلا لیا تھا۔

"یہ لیٹر ہے تمہارے لیے۔" انہوں نے ہاتھ پکڑا کاغذ بیٹی کی سمت بڑھا دیا۔

"میرے لیے لیٹر۔۔۔؟ کس نے بھیجا ہے؟" انسپکٹر شہناز کو اچنبھا ہوا۔

"خود دیکھ لو" وہ خود سے کچھ بھی نہیں بتانا چاہتے تھے اس لیے کاغذ ہی اسے تھمایا تھا اور اگلے پانچ سیکنڈ میں مختصر سی تحریر پہ نظر دوڑاتے ہوئے انسپکٹر شہناز یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"واٹ؟ مومنہ بی بی چلی گئی؟" انسپکٹر شہناز کو مومنہ بی بی کا لیٹر پڑھ کر شاک لگا تھا۔

"لیکن ابی جان! آپ نے اسے جانے کیوں دیا ہے؟" انسپکٹر شہناز کا پریشانی کے مارے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"وہ ہمیں بتا کر جاتی تو ہم اسے روکتے نا۔۔۔؟ اس نے ہمیں بتایا ہی نہیں، بس چپ چاپ بغیر کچھ بتائے اٹھ کر چلی گئی۔"

عبدالقیوم رضوی خود بھی بے حد پریشان اور متفکر نظر آ رہے تھے۔

"تو چوکیدار کہاں مر گیا تھا۔۔۔؟ وہ تو اسے روک سکتا تھا، یا پھر اسی وقت مجھے بتا سکتا تھا؟" انسپکٹر شہناز کا غصہ عود کے آیا تھا وہ یونہی کاغذ ہاتھ میں پکڑے دندناتی ہوئی باہر نکل آئی چوکیدار کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اسے پتا تھا کہ اس کی شامت ضرور آئے گی۔

"بی بی جی! مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ چلی جائیں گی، میں گیٹ بند کر کے نہانے کے لیے چلا گیا تھا، انہوں نے خود ہی گیٹ کھولا اور خود ہی چلی گئیں۔" چوکیدار نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"تو کیا چار گھنٹے تم نہاتے ہی رہے ہو کہ تمہیں پتا نہیں چلا۔۔۔؟"

انسپکٹر شہناز غصے سے بھڑک رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔

"نہیں بی بی جی! مجھے تو بس دس منٹ ہی لگے تھے اور دس منٹ بعد میں واپس آیا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔" چوکیدار اسے صفائی دے رہا تھا۔

"دس منٹ میں وہ کہاں تک جا سکتی تھی بھلا۔۔۔؟ تم نے اس کا پیچھا بھی نہیں کیا؟" انسپکٹر شہناز مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور چوکیدار پہ غرا رہی تھی وہ بے چارا برا پھنسا تھا۔

"ہمیں بتانے تک دس منٹ نہیں بلکہ بیس پچیس منٹ گزر چکے تھے اور بیس پچیس منٹ میں تم جانتی ہو کہ آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، اس لیے اس کا پیچھا کرنا فضول تھا، ہم نے ہی اسے اس کے پیچھے جانے سے روکا تھا۔" عبدالقیوم رضوی چوکیدار کے لیے ڈھال بن گئے تھے جبکہ انسپکٹر شہناز اپنے والد صاحب کی لاجک پہ اپنا سر پیٹ کے رہ گئی تھی۔

"ابی جان! یہ کیا کر دیا آپ نے۔۔۔؟ وہ بیس پچیس منٹ میں بھی کہیں نہیں جا سکتی تھی، کیونکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔" "ایک روپیہ بھی نہیں تھا، اس نے جہاں بھی جانا تھا، پیدل جانا تھا، اور پیدل چلنے والا اتنی دیر میں بھلا کہاں تک جا سکتا ہے۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز جھنجلا رہی تھی اور عبدالقیوم رضوی بھی اپنی اس غلطی پہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

"اب۔۔۔ اب میں اسے کہاں تلاش کروں۔۔۔؟ اور۔۔۔ اور دل آور شاہ کو کیا جواب دوں گی کہ ایک پولیس آفیسر ہونے کے باوجود مجھ سے ایک لڑکی تک نہیں سنبھالی گئی۔۔۔؟" انسپکٹر شہناز بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پاؤں پٹختی ہوئی گاڑی کی سمت بڑھی اور ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی

اور عبدالقیوم رضوی دیکھتے رہ گئے تھے۔

رات کو نو بجے کا ٹائم تھا، اندھیرے کا راج گہرا ہو چکا تھا اور اس اندھیرے کا غلام پورا شہر مصنوعی روشنیوں کے زیر اثر جگمگا رہا تھا، بے شک روشنیاں بہت تھیں لیکن رات بھی آخر رات تھی، اور اس رات میں کسی کو ڈھونڈنا آسان کب تھا بھلا۔۔۔؟ لیکن انسپکٹر شہناز پھر بھی یہ مشکل کام کرنے کے درپے تھی اور اس کام میں وہ چاہ کر بھی پولیس کی مدد نہیں لے سکتی تھی کیونکہ ساتھ ساتھ ملک حق نواز کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا اس لیے اسے یہ کام خاموش رہ کر کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کے سوا نو بجے کا وقت تھا جب اس نے ایک روڈ سے دوسرے روڈ پہ یوٹرن لیا تھا اور ساتھ ہی اسپیڈ بڑھا دی تھی، لیکن اگلے ہی پل اسے بریک پہ پاؤں رکھنا پڑ گیا اور گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے تھے کیونکہ کوئی اس کی گاڑی سے ٹکرا کر یکدم دور جا گرا تھا جس پہ نبیل حیات کا دماغ چکرا گیا تھا۔

"او مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟" نبیل حیات گھبرائے ہوئے انداز میں بہت عجلت کے ساتھ گاڑی سے نکل آیا تھا گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن تھیں اس لیے اسے دور سے ہی پتا چل گیا تھا کہ گاڑی سے ٹکرانے والی لڑکی ہے، اس نے کافی بڑی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی جو اس ایکسیڈنٹ سے گرنے کی وجہ سے اس کے اوپر سے سرک گئی تھی۔

"آپ۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟" نبیل نے ذرا جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے سیدھا کیا لیکن وہاں اتنی ہمت اور اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کے سوال کا جواب دیا جاتا، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی کیونکہ اس کے سر پہ شدید چوٹ آئی تھی۔

"ہیلو پلیز آنکھیں کھولیں۔" نبیل کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی سچویشن پہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"ارے صاحب! بے چاری کے چوٹ لگی ہے، مر جائے گی، فوراً ہسپتال لے جاؤ، ورنہ تختے پہ چڑھا دیے جاؤ گے۔" اس کے قریب سے دو آدمی گزرتے ہوئے ٹھہر گئے تھے انہوں نے نبیل کو اس حادثے کی سنگینی سے آگاہ کیا ورنہ کوئی اور لوگ ہوتے تو اتنا شور مچاتے کہ نبیل کی جان کو آجاتے، یہ دونوں آدمی اچھے تھے اس لیے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

"تھینک یو! میں ابھی انہیں ہسپتال لے جاتا ہوں۔" نبیل نے اس پہ جھکتے ہوئے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے گاڑی کی سمت بڑھا گاڑی کا ڈور بند تھا اس لیے ان دو آدمیوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کے ڈور کھولا اور اس لڑکی کو گاڑی میں ڈالنے کے لیے مدد دی تھی۔

"اور ہاں صاحب! آپ شکل سے شریف اور اس شہر سے انجان لگتے ہیں۔" "اس لیے آپ کے لیے ایک اور مشورہ ہے۔" اس آدمی نے ڈور بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی! کہیے۔۔۔" نبیل فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔"

"اس لڑکی کی حالت دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا، اس لیے ہسپتال میں ڈاکٹرز کی پوچھ پڑتال اور جھنجھٹ میں پڑنے سے بہتر ہے کہ آپ انہیں اپنے کسی پرسنل ڈاکٹر میرا مطلب ہے کہ فیملی ڈاکٹر سے ٹریٹ منٹ کروا لیں، ورنہ ہسپتال والے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔" اس آدمی نے ایک اور۔۔۔ مشورہ دیا جس پر نبیل واقعی اس آدمی کا مشکور ہوا اور ہاتھ گاڑی سے نکالتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

"تھینک یو سو مچ بھائی صاحب۔ بہت مدد کی آپ نے میری۔"

"وِش اوکے سر! انسانیت کے ناتے یہ سب کچھ بھی نہیں ہے؟" اس آدمی نے انکساری سے کہا اور پھر قدم پیچھے ہٹا لیے۔

"اللہ حافظ۔" نبیل نے اللہ حافظ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن اب اس آدمی کے مشورے پہ اس کا ہسپتال جانے کا ارادہ بدل گیا تھا' اس کا رخ اب گھر کی طرف تھا اس نے اسپیڈ مزید بڑھاتے ہوئے ذرا کی ذرا گردن ترچھی کر کے پچھلی سیٹ پہ پڑی اس لڑکی کو دیکھا تھا وہ ہلکی ہلکی آواز میں کراہ رہی تھی شاید اس کے سر پہ چوٹ آئی تھی اس لیے یقیناً اس کے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن بے ہوشی کے باعث وہ نہ تو کچھ دیکھ پا رہی تھی اور نہ ہی حرکت کر رہی تھی بس اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکل رہی تھی جس پہ نبیل کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی وہ کشمکش کا شکار ہونے لگا کہ اسے ہسپتال لے کر جائے یا پھر اپنے گھر؟

لیکن پھر اس آدمی کے مشورے کو ترجیح دیتے ہوئے اس نے گھر جانے کا ہی فیصلہ کیا اور اگلے پندرہ منٹ بعد وہ اپنے گھر کے پورچ میں گاڑی پارک کر چکا تھا اور گاڑی سے اتر کر تیزی سے پچھلی سیٹ کی طرف آیا اور ڈور کھول کر اس لڑکی کو گاڑی سے نکال کر اندر کی سمت قدم بڑھا دیے تھے۔ وہ راہداری سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا جب سامنے سے سیڑھیاں اترتی مدحیہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

"بھائی! یہ کیا ہوا ہے.....؟ کون ہے یہ لڑکی.....؟" مدحیہ پہلے رکی تھی پھر تیزی سے قریب آگئی لیکن نبیل کوئی بھی جواب دیے بغیر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اس لڑکی کو صوفے پہ ڈال دیا تھا۔

"بھائی! کون ہے یہ؟" مدحیہ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"یار! مجھے خود نہیں پتا کہ یہ کون ہے.....؟ بس میں گھر آ رہا تھا اور یہ لڑکی اچانک راستے میں میری گاڑی سے ٹکرا گئی' ابھی تو شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی ہے' ورنہ اس وقت کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جاتی۔" نبیل اپنے موبائل سے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے مدحیہ کو بھی بتا رہا تھا۔

"تو آپ اسے ہسپتال لے کر کیوں نہیں گئے.....؟"

"ہسپتال لے کر جانا خود مصیبت میں ٹانگ اڑانے کے مترادف ہے' اس لیے ڈاکٹر کو گھر بلا رہا ہوں۔" نبیل اس وقت اپنی عقل سے نہیں کسی اور کی عقل سے کام لے رہا تھا مدحیہ کو بڑی الجھن ہوئی تھی کہ وہ ایک چلتا پھرتا پولیس کیس اٹھا کر گھر لے آیا ہے کہیں کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے.....؟

"بھائی! مصیبت کیسی بھلا.....؟ اس لڑکی کی جان بچ گئی ہے' دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک ہے' پھر ہسپتال سے کترانے کی وجہ.....؟" مدحیہ کو جو بات اچھی نہیں لگی تھی وہ اس کی وضاحت چاہ رہی تھی۔

"وجہ یہ ہے کہ اس وقت رات کا وقت ہے اور یہ ایک لڑکی کا معاملہ ہے وہ لڑکی بے ہوش تھی اور میں اسے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو جب تک یہ لڑکی ہوش میں نہ آ جاتی ہاسپٹل والے مجھے وہاں سے ہلنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتے تھے' مجھے اس کے ساتھ وہاں ہی بندھ کے رہنا پڑتا اور دوسری بات کہ پتا نہیں جب یہ ہوش میں آتی تو اس ایکسیڈنٹ کا سارا الزام مجھ پہ رکھ دیتی اور پولیس والے میرے سر ہو جاتے' اور تیسری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ لڑکی بہت نڈھال اور تھکی تھکی لگ رہی تھی' اپنا پورا جسم اور چہرا ڈھانپ رکھا تھا اس نے' اور یہ خالی ہاتھ تھی اس کے پاس اپنے آپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا' جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے کسی مصیبت میں مبتلا تھی' ایسے میں اسے ڈاکٹرز یا پھر پولیس والوں کے حوالے کر دینا بھی ٹھیک نہیں تھا لہٰذا سب کچھ سوچنے کے بعد میں اسے گھر لے آیا ہوں' دیکھنے سے ہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ لڑکی بے ضرر ہے' ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی ڈونٹ وری۔" نبیل نے مدحیہ کو کافی اچھی طرح دلیل اور وضاحت سے سمجھایا تھا اور شکر تھا کہ وہ سمجھ گئی تھی اور سمجھنے کے ساتھ ہی اسے اس لڑکی

سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

"نبیل بیٹا! تم اتنے لیٹ کیوں.....؟" فائزہ بیگم کچھ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھیں لیکن صوفے پہ پڑی بے ہوش حالت لڑکی کو دیکھ کر ٹھہر گئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے جیسے تھوڑی دیر پہلے مدحیہ کے ہوئے تھے۔

"مدحیہ! تم ماما کو ساری بات بتاؤ' میں تب تک ڈاکٹر ہاشمی کو ریسیو کرتا ہوں۔" نبیل مدحیہ کا کندھا تھپک کر باہر نکل گیا اور دس منٹ بعد ڈاکٹر ہاشمی ان کے گیٹ پہ موجود تھے' نبیل انہیں اپنے ساتھ لیے اندر آ گیا ڈاکٹر ہاشمی نے اس لڑکی کا تفصیلی چیک اپ کیا اور درد کے انجکشن اور کچھ ٹیبلٹس دینے کے بعد چلے گئے تھے' نبیل نے ان کے سامنے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ لڑکی ان کی کزن ہے اور اچانک سیڑھیوں سے گر گئی ہے اسی لیے ڈاکٹر ہاشمی کی تسلی ہو گئی تھی اور ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ نبیل حیات' دل آور شاہ کا دوست ہے اور اس حوالے سے قابل اعتبار بھی ہے' نبیل ان کو رخصت کرنے کے بعد واپس آیا اور صوفے پہ ڈھے گیا۔

"اف! اتنی تھکن پورا دن اتنے کام نبٹاتے ہوئے نہیں ہوئی جتنی اس ایک گھنٹے میں ہو گئی ہے۔" نبیل نے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے۔

"چائے لیں گے.....؟" نہ جانے کیوں اور کیسے مدحیہ کو اس کی تھکن کا احساس ہوا تھا اور اس نے خود ہی اس سے چائے کا پوچھ لیا تھا۔

"ضرور لوں گا' لیکن اگر تم خود بنا کر لاؤ تو۔" نبیل نے آنکھیں کھولتے ہوئے ڈائریکٹ مدحیہ کی سمت دیکھا۔

"جی! ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" مدحیہ اٹھ کر چلی گئی۔

"دیکھو بیٹا! اس لڑکی کا اس طرح ڈرائنگ روم میں پڑے رہنا مناسب نہیں ہے' تم اسے کسی روم میں شفٹ کر دو۔" فائزہ بیگم کو اس لڑکی کا صوفے پہ پڑے رہنا کافی غیر مناسب اور معیوب لگا تھا اسی لیے کہہ بھی دیا۔

"گیسٹ روم میں شفٹ کر دوں.....؟"

"گیسٹ روم میں کیسے شفٹ کرو گے' گیسٹ روم کے دروازے کا لاک خراب ہے' چار پانچ روز ہو گئے ہیں میں نے چیک کیا تھا لاک ہی نہیں کھل رہا۔" فائزہ بیگم نے اسے پرابلم بتائی۔

"تو پھر کہاں شفٹ کرنا ہے اسے.....؟" نبیل ماں سے پوچھ رہا تھا۔

"میرے بیڈ روم کے ساتھ والا بیڈ روم خالی ہے' اسے وہاں شفٹ کر دیں' میں رات کو اس کے پاس ہی رہ لوں گی۔" مدحیہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ نبیل کو تھما دیا۔

"لیکن بیٹا! تم کیسے اس کے پاس رہ سکتی ہو؟ یہ پتا نہیں کون؟"

"اوہ کم آن ماما! ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن نہیں لینی چاہیے' کچھ نہیں ہوتا' یہ لڑکی خود زخمی ہے' بیمار حالت میں ہے اور ہمارے ہی رحم و کرم پہ ہے' یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ویسے بھی کسی نہ کسی نے تو اس کے پاس رہنا ہی ہے نا..... تو پھر یہی بہتر ہے کہ میں ہی رہ لوں' مجھے تو ویسے بھی رات گئے تک نیند نہیں آتی' میں آسانی سے جاگتی رہوں گی' اب یہ کام نبیل بھائی تو نہیں کر سکتے؟ وہ خود تھکے ہوئے آئے ہیں اب آرام کریں گے اور آپ بھی ماشاء اللہ اپنے ہزبینڈ کے ساتھ ہوتی ہیں اس لیے آپ کے رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لہٰذا گھوم پھر کے بات مجھ پر ہی آ جاتی ہے' سو میں حاضر ہوں۔" مدحیہ کے جواب پہ وہ دونوں ماں بیٹا دیکھتے رہ گئے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا ہے.....؟ کیا وہ اپنے علاوہ بھی دوسروں میں انٹرسٹ لے سکتی ہے.....؟

"اوکے! میں اس لڑکی کو وہاں ہی شفٹ کر دیتا ہوں' تم وہ بیڈ روم کھلوا دو.....۔" نبیل نے اس کی بات سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا اور اسے اجازت دیتے ہوئے چائے کے سپ لینے لگا۔

"ہوں! چائے بہت اسٹرانگ ہے۔" نبیل کو چائے کا کڑک ذائقہ پہلے سپ پہ ہی محسوس ہو گیا۔

"اسٹرانگ چائے اور اسٹرانگ چاہ
بندے کے دل و دماغ کے سارے کس بل نکال کے رکھ دیتی ہے 'بندہ فریش ہو کے رہ جاتا ہے۔" مدیحہ مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی۔

"یہ تو دل آور بے والی سوچ ہے....؟" نبیل ہلکے سے مسکرایا۔

"بالکل! سوچ انہی کی ہے 'بس بیان میں کر رہی ہوں۔" وہ بھی جواباً" مسکرا کر بولی۔

"کیوں....؟" وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ وہ اسٹرانگ چائے اس کے اعصاب کو واقعی تقویت پہنچا رہی تھی۔

"کیونکہ ان کی سوچ میری سوچ سے ملتی ہے۔"

"ہوں! یہ تو میں بھی مانتا ہوں۔" وہ کپ خالی کر کے رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور مدیحہ باہر نکل گئی اس نے ملازمہ کو بلا کر کمرا کھلوایا تھا اور بستر وغیرہ ٹھیک کروا کر نیچے آگئی پھر نبیل نے اس لڑکی کو اوپر مدیحہ کے ساتھ والے بیڈ روم میں شفٹ کر دیا اور خود اپنے بیڈ روم میں چلا گیا 'اب اس لڑکی کی ذمہ داری مدیحہ حیات پہ تھی۔ اب اس نے رات بھر جاگنا تھا اور اس لڑکی کی دیکھ بھال کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

"دانیال! کہاں جا رہے ہو تم....؟" آذر اندرونی مین ڈور کی سمت بڑھ رہا تھا لیکن انیکسی کی طرف سے نکل کر گاڑیوں کی سمت بڑھتے دانیال کو دیکھ کر قدم رک گئے۔

"مارکیٹ۔" دانیال نے گاڑی کی چابی لہراتے ہوئے اسے اشارہ دیا۔

"کیوں....؟ اس وقت کیوں جا رہے ہو؟" آذر کو اچنبھا ہوا۔

"ارے یار! اس وقت کو کیا ہوا ہے....؟ ابھی تو دس بجے ہیں۔" دانیال نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں! لیکن تم جا کیوں رہے ہو....؟" آذر نے بھی اپنی گھڑی سے ٹائم دیکھ لیا تھا اسی لیے حیرت قدرے کم ہو گئی تھی 'آج کل دراصل سرما کی لمبی راتیں شروع ہو چکی تھیں اس لیے رات کے دس گیارہ بجے بھی آدھی رات کا سا گمان ہوتا تھا۔

"آجاؤ 'بتاتا ہوں پھر...." دانیال گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے بولا۔

"میں کیوں آجاؤں؟ میرا کیا کام بھی بھلا....؟" آذر نے دور سے ہی انکار کر دیا۔

"ارے آجاؤ یار! اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر بھی تو بور ہی ہونا ہے تم نے....؟" دانیال نے ذرا خفگی سے کہا جس پہ نہ چاہتے ہوئے بھی آذر کو آنا ہی پڑا 'دانیال نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور آذر آکر اس کے برابر فرنٹ سیٹ پہ براجمان ہو گیا اور جیسے ہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں چوکیدار نے فوراً" گیٹ کھول دیا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ؟ کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟" گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی آذر نے سوال داغ دیا۔

"مارکیٹ جا رہا ہوں یار! علیزے کے لیے برتھ ڈے گفٹ لینے کے لیے...." دانیال نے کافی سکون سے جواب دیا تھا جبکہ آذر اس کے جواب پہ چپ ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟" دانیال نے قدرے توقف سے اسے دوبارہ متوجہ کیا تھا۔

"نہیں! کچھ نہیں...." اس نے آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیا تم نے گفٹ نہیں لیا علیزے کے لیے....؟" دانیال نہ جانے کیوں اسے کھوج رہا تھا۔

"میں اس کے لیے گفٹ لوں گا تو افسانہ بنے گا۔" آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"کوئی افسانوی بات ہو تو افسانہ بنتا ہے نا؟" دانیال نے ہلکے سے چوٹ کی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" آذر نے یکدم دانیال کی سمت دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ ہمارے گفٹس کا افسانہ کیوں نہیں بنتا....؟ صرف تمہارا ہی کیوں....؟" دانیال کا سوال بھی بجا تھا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ صرف میرا ہی افسانہ کیوں بنتا ہے....؟" آذر جھنجلا رہا تھا۔

"کیونکہ تمہاری ساری حرکتیں افسانوی سی لگتی ہیں 'تم اتنے ہینڈسم 'ڈیشنگ اور ریزرو سے ینگ مین ہو 'ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتے ہو 'سب کزنز سے بڑے ہو 'اس لیے کافی ذمہ دار اور سمجھ دار بھی ہو 'لیکن اس کے باوجود علیزے کی کیئر ایسے کرتے ہو جیسے تمہیں اور کوئی کام ہی نہ ہو 'ایسے میں دیکھنے اور سننے والوں کو تھوڑا دال میں کالا تو لگے گا نا....؟ آخر دیکھنے اور سننے والے بھی دماغ 'عقل اور سوچ رکھتے ہیں....؟ جس سے وہ کوئی بھی افسانہ بنا سکتے ہیں 'اس لیے ان کی سوچ اور افسانے کا قصور نہیں ہے یار.... بلکہ تمہارا اپنا قصور ہے۔" دانیال آج پھر اسٹارٹ ہو چکا تھا۔

"میرا قصور ہے....؟" آذر نے حیرت اور اچنبھے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"قصور ہے نا 'سارا قصور ہی تمہارا ہے 'وہ بات 'وہ راز 'وہ جذبات جو تم نہ جانے کب سے دل میں دبائے پھر رہے ہو 'وہ تمہیں بہت پہلے ظاہر کر دینے چاہیے تھے تاکہ دوسروں کو بھی تمہارے جذبات کا پتا چل جاتا اور کوئی تمہارے بارے میں سوچنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔" دانیال کا اشارہ کومل کی طرف تھا۔

"یار! ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم کہہ رہے ہو۔" آذر اب بھی انکاری تھا۔

"تو پھر قسم دو مجھے کہ ایسا کچھ نہیں ہے 'تمہارے دل میں علیزے کا خیال تک نہیں ہے.... تمہارے ہاتھ میں اگر کومل کا ہاتھ تھمایا جائے تو تم تھام لو گے....؟ تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہو گی؟" دانیال نے آذر کو بری طرح گھیرے میں لے لیا تھا وہ نہ ہاں کر سکتا تھا 'نہ نا کر سکتا تھا 'وہ ایک آزمائش 'ایک امتحان میں مبتلا ہو چکا تھا 'جواب دیتا بھی تو کیا دیتا....؟

"بتاؤ نا؟ تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہو گی....؟ کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہیں اور تمہارے دل کو؟"
دانیال اسے آزما رہا تھا اور آذر گہری سانس کھینچتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر رہ گیا۔

"دانیال! مجھے اور میرے دل کو فرق پڑے یا نہ پڑے لیکن ڈیڈ کو ضرور فرق پڑتا ہے 'کیونکہ ڈیڈ نے ہمیشہ علیزے کے ساتھ مجھے دیکھا ہے اور اسی چیز کا وہ کئی بار باتوں باتوں میں اظہار بھی کر چکے ہیں۔" آذر نے دانیال کو ڈیڈ کے ارادے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں 'لیکن یار اس وقت میں ڈیڈ کو فرق پڑنے کی نہیں 'تمہیں فرق پڑنے کی بات کر رہا ہوں.... تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر علیزے کو چاہتے ہو تو اس چاہت کو دل میں مت دباؤ 'بلکہ اظہار کرو 'صاف اور واضح اظہار۔" دانیال۔ اسے کسی ایک اور حتمی فیصلے پہ اکسا رہا تھا۔

"لیکن یار! کیسے اظہار کروں....؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے.... وہ ابھی اس چیز کو نہیں سمجھتی....؟ میں کیوں اس کی معصومیت کو داغ دار کروں؟" آذر خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"کیا کہا....؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے....؟ واہ! کیا کہنے ہیں تمہارے....؟ ارے محترم! ذرا عقل پہ زور دو تو تمہیں احساس ہو کہ علیزے آفندی آج رات بارہ بجے کے بعد پورے بیس سال کی ہو جائے گی 'اور بیس سال کی لڑکی ہو یا لڑکا ایسے جذبات سے بے بہرہ نہیں رہتا 'اٹھارہ سال کی لڑکی شادی کے قابل ہو جاتی ہے اور تم

بیس سال کی لڑکی کو محبت کے قابل نہیں سمجھ رہے؟ یہ تو عمر ہوتی ہے محبت کا بیج بونے کے لیے' اور تیس سال کی عمر تک یہ بیج پوری طرح سے پروان چڑھ جاتا ہے' اب تم خود سوچ لو کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ علیزے کو انجان رکھنا ہے؟ یا پھر خود کو ہی ل سے انجان رہنا ہے۔۔۔؟" دانیال کی باتیں خاصی گہری تھیں' آذر سوچنے پہ مجبور ہو گیا۔

"تو پھر کیا کروں۔۔۔؟"

"اظہار کرو بھائی! اظہار کرو۔"

"مگر کیسے۔۔۔؟" آذر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

"ارے یار! کل اس کا برتھ ڈے ہے' موقع اچھا ہے' تم کوئی ایسا گفٹ لو اس کے لیے کہ وہ سب کچھ خود بخود ہی سمجھ جائے۔" دانیال نے گاڑی شاپنگ مال کے سامنے پارک کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا گفٹ کیا ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔؟"

"اندر آجاؤ' بتاتا ہوں تمہیں۔" دانیال گاڑی سے اتر گیا اور اس کے پیچھے آذر بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں میرے ہے
لیکن لوہ میرے خواب' میرے خواب' میرے خواب

"آپ کی ہر بات بجا بی بی جان! لیکن آپ اگر سوچیں تو بیٹیاں بھی تو انسان ہی ہوتی ہیں نا۔۔۔؟ ان کے سینے میں بھی بد قسمتی سے دل ہی دھڑکتا ہے' اس دل میں ہزاروں حسرتیں ہوتی ہیں' ہزاروں خواہشیں' ہزاروں خواب ہوتے ہیں' اور ان ہزاروں خوابوں اور خواہشوں کو ایک دم سے گلا گھونٹ کر مار دینا اتنا آسان نہیں ہوتا' ان کو مارتے مارتے انسان خود مر جاتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں بھی مر جاؤں گی' ایک دن ایسا ہو کے ہی رہے گا۔" آج پھر زری کے لیے بی بی جان کا فون آیا ہوا تھا' وہ اس سے واپسی کا پوچھ رہی تھیں اور زری کے دل کی دھڑکنیں پھر سے لرزنے لگی تھیں اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا خوف پھر سے امڈ آیا تھا۔

"خدا کا خوف کرو لڑکی! کیسی باتیں کر رہی ہو۔۔۔؟" بی بی جان دہل گئیں۔

"بی بی جان! اگر یہی بات میں آپ سے کہوں تو۔۔۔؟ آپ لوگ خدا کا خوف کیوں نہیں کرتے۔۔۔ بیٹیوں کی زندگیوں سے بھی کھیلتے ہیں اور دلوں سے بھی؟"

نہ جانے آج کیا بات تھی کہ زری سے ضبط نہیں ہو رہا تھا وہ رخساروں پہ آنسوؤں کی طرح بکھر رہی تھی' اس کے حوصلے پگھل رہے تھے۔۔۔ آج کل اس کا دل بے وجہ ہی بے چین اور مضطرب رہنے لگا تھا۔۔۔ اس کے اندر ابال اٹھتے تھے' وہ اندر ہی اندر ہولنے لگتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پاکستان جانے کی بجائے کہیں صحراؤں کی طرف نکل جائے' جہاں صرف وہ ہوتی' اس کا دل ہوتا' اس کی ذات ہوتی اور اس کا عشق ہوتا۔۔۔ کوئی دوسرا بھی اس کی ذات اور اس کے عشق میں مداخلت نہ کر پاتا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو زری بیٹا؟" ریسیور میں سے بی بی جان کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بے آواز روتی ہوئی زری انہیں کوئی جواب نہیں دے پائی تھی اور ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا اور لاؤنج کی دہلیز میں کھڑا عبداللہ اندر آگیا۔

"زری۔۔۔" عبداللہ کی سنجیدہ' نپی تلی اور بھاری آواز زری کے بہت قریب سے ابھری تھی' زری یکدم گڑبڑا گئی۔

"عبداللہ بھائی آ۔۔۔ آپ؟" وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔

"بیٹھو۔۔۔" عبداللہ نے اسے اس کی سابقہ جگہ پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ج۔۔۔ جی؟" زری کی رنگت متغیر ہونے لگی تھی اس نے خود کو بمشکل کرسی پہ بیٹھنے کے قابل کیا تھا' ورنہ ٹانگوں کی جان تو پہلے مرحلے پہ ہی ٹوٹ چکی تھی۔

"کس کا فون تھا۔۔۔؟" وہ جانتا تھا مگر اس کے منہ سے سننے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

"بی بی جان کا۔۔۔" زری کی آواز بے حد دھیمی ہو چکی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔؟" عبداللہ کے انداز پہ زری کی جان نکل رہی تھی کہ نہ جانے اسے کیا ہوا ہے۔۔۔؟ نہ جانے اس نے کیا بات سنی ہے کہ وہ اس حد تک نپا تلا اور سرد و سپاٹ نظر آرہا ہے۔

"واپسی کا پوچھ رہی تھیں۔" زری نے سر جھکا رکھا تھا۔

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"یہی کہ ہم واپس آرہے ہیں۔"

"بس یہی کہا تم نے۔۔۔؟"

"جی۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر روئی کس بات پہ ہو۔۔۔؟" عبداللہ اپنے مطلب کے سوال پہ آگیا۔

"نن۔۔۔ نہیں کسی بات پہ نہیں روئی۔" اس نے فوراً نفی میں گردن ہلائی۔

"دیکھو زری! دل کی بات دل میں رکھنے والے لوگ خسارے میں رہ جاتے ہیں' اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی خسارے میں رہو' اس لیے بہتر ہے کہ تم بولو اور بتاؤ مجھے کہ تم کیوں روئی ہو۔۔۔؟" عبداللہ کو زری کی باتوں سے لگا تھا کہ اس کے دل میں کوئی ہے اور اس "کوئی" کو جاننے کے لیے وہ ساری نام نہاد عزت اور غیرت بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے پوچھنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

"اپنے نام کے ساتھ ملک حق نواز کا نام سن کر روئی ہوں' اور اس لیے روئی ہوں کہ میری ماں کو بھی میرا احساس نہیں ہے' وہ بھی مجھے ملک حق نواز کے ساتھ رخصت کرنے پہ خوش ہیں۔" زری کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔

"بس یہی بات تھی یا کوئی اور۔۔۔؟" عبداللہ اس کے جھکے ہوئے سر پہ نظریں جمائے بیٹھا تھا زری نے گھبرا کر عبداللہ کی سمت دیکھا اور پھر فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں زری۔۔۔؟ بس یہی بات تھی یا کوئی اور۔۔۔؟" عبداللہ نے پھر اپنی بات پہ زور دیا۔

"جی! بس یہی بات تھی۔" زری نے مرے مرے لہجے میں جواب دیا۔

"ہوں! ٹھیک ہے' یہ تو طے ہے کہ ملک حق نواز کا نام تمہارے نام کے ساتھ نہیں آئے گا' اس لیے اس بات پہ رونا فضول ہے۔ لیکن اگر کوئی اور بات ہے تو پھر یہ تمہارا مسئلہ ہے' بعد میں مجھے کوئی الزام مت دینا کہ عبداللہ بھائی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔" عبداللہ نے زری کے کسی اور مسئلے سے واضح لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں عبداللہ بھائی! آپ کو الزام دینے کا میں کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی' آپ نے تو ہمیشہ میرا ہی ساتھ دیا ہے' اتنا تو کوئی ماں باپ بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا' جتنا آپ نے میرا دیا ہے۔" زری کا لہجہ بے حد دھیما ہو رہا تھا۔

"میں نے تم پہ کوئی احسان نہیں کیا' یہ سب تمہارا حق ہے' تم میرے لیے بہن بھی ہو اور بیٹی بھی' میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہاری خوشی اور بہتری کی خاطر ہی میں اپنے خاندان والوں سے ٹکر لے رہا ہوں' ورنہ اور تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے' میرے اور ان کے درمیان۔۔۔؟ اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تمہیں کوئی مسئلہ رہے تو یہ اچھی بات نہیں ہے' تمہیں اپنے اندر کی بات صاف صاف

بتانی چاہیے' اگر نہیں بتاؤگی تو ذمہ دار تم خود ہوگی۔" عبداللہ اسے کرید رہا تھا۔

"نن.... نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے....." زری نے اپنے بے اختیار اور بے قابو دل کو دباتے ہوئے بمشکل اس حقیقت سے انکار کیا تھا' وقت سے پہلے ہی وہ اپنے بھائی کی عزت' غیرت اور انا کو آزمائش میں نہیں ڈال سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اس وقت اس سے کچھ پوچھ رہا ہے تو اپنی رگوں میں دوڑتی غیرت کو اپنے پاؤں تلے کچل کر پوچھ رہا ہے' ورنہ کون ایسا بھائی ہو سکتا تھا جو اپنی بہن سے اس کی پسند' اس کی محبت اور اس کے دل کی بات پوچھے.....؟ اور اگر پوچھ رہا تھا تو یہ اس کا اچھا پن تھا' نیکی تھی' بڑائی تھی اس کی' ورنہ وہ نہ بھی پوچھتا تو وہ کیا کر سکتی تھی بھلا.....؟

"ٹھیک ہے پھر! ختم کرو یہ رونا دھونا اور اپنی پیکنگ اور تیاری مکمل کرو' جو ہوگا چار دن بعد دیکھا جائے گا۔" عبداللہ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور زری کا سر تھپک کر باہر نکل گیا' زری جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔

آج سے چار دن بعد اٹھارہ نومبر کو ان کی فلائیٹ تھی' سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں' سارے بندوبست بھی ہو چکے تھے پھر بھی..... پھر بھی ایک وہ تھی کہ اس کا دل بس ڈوبتا ہی جا رہا تھا' اتنی تسلیاں' اتنے دلاسے' اتنے پختہ یقین کے بعد بھی وہ مایوس کی مایوس ہی تھی نہ جانے ایسا کون سا حوصلہ شکن احساس تھا جو اسے آس کی ڈور ہی نہیں تھامنے دے رہا تھا.....!

☆ ☆ ☆

"مریم.....!" "جی امی.....؟" عابدہ خاتون کی آواز پہ مریم بری طرح چونک کر متوجہ ہوئی۔

"دھیان کہاں ہے تمہارا.....؟" عابدہ خاتون نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا جس پہ مریم یکدم سٹپٹا گئی اور اپنے اڑے اور بکھرے ہوئے اعصاب کو یکجا کرنے کی فوری اور ناکام کوشش کی تھی۔

"کک..... کیا مطلب ہے آپ کا.....؟ میرا دھیان کہاں ہونا ہے بھلا.....؟"

مریم ماں کی نظروں کی کھوج سے بوکھلا گئی تھی وہ انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی' اگر جودت آفندی کے متعلق انہیں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ ساری مجبوریاں اور گھر کے حالات بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے فوراً" گھر بٹھا لیتیں' وہ ہر مشکل وقت میں صبر و شکر کرتے ہوئے گزارا کر سکتی تھیں' لیکن ان کی عزت پہ کوئی حرف آئے یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

"تم مجھے دو روز سے کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہو.....؟ اور میں اسی انتظار میں ہوں کہ تم مجھے اپنی پریشانی بتاؤ گی' لیکن نہیں! تم پریشانی بتانے کی بجائے الٹا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔" عابدہ خاتون نے بیٹی کا صحیح جائزہ لیا تھا اور مریم ان کے اتنے درست اندازے پہ مزید محتاط ہو گئی تھی۔

"نہیں امی! پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے' بس میں یہ سوچ رہی تھی کی فی الحال گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور مجھے جاب جوائن کیے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں.....؟ ایسے میں میں مسز رزاق سے اپنی تنخواہ کے لیے کہوں بھی تو کیسے.....؟ وہ کیا سوچیں گی آخر.....؟ اور ادھر پورا مہینہ پڑا ہے ابھی..... اتنے دن گزارا کیسے ہوگا بھلا؟" مریم نے جیسے تیسے ہی سہی کوئی بہانا بنا ہی لیا تھا اور اس کے جواب پہ عابدہ خاتون کی کھوجتی ہوئی جائزہ لیتی ہوئی نظریں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ "اللہ مالک ہے بیٹا سب اس کی ذات پہ چھوڑ دو' گزارہ کیسے ہوگا یہ اس کی ذات بہتر جانتی ہے' وہ مالک ہے ہمارا' ہم اس کے بندے ہیں' اسے ہماری فکر ہم سے بھی زیادہ ہوتی ہے' اس لیے ہمیں پریشان ہونے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے' جو بھی ہوگا اس کی مرضی اور اس کی رضا سے ہوگا' تم بس اس کا رحم اور اس کی رضا مانگو' ان شاء اللہ ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔" عابدہ خاتون نے مریم کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تھپکا اور اسے سمجھایا تھا' بس پہ حقیقتاً" تھوڑی دیر کے لیے مریم کا دل سنبھل گیا تھا ورنہ تو اسے جودت آفندی کی طرف سے دھڑکا ہی لگا ہوا تھا۔

"بس امی! آپ ہمارے لیے دعا کرتی رہا کریں۔" اس نے ماں کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"ارے بیٹا! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے.....؟" عابدہ خاتون نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ارے! یہ صبح صبح اتنا لاڈ پیار کیوں ہو رہا ہے.....؟ آج کوئی خاص دن تو نہیں؟ کوئی برتھ ڈے وغیرہ یا تہوار؟" عدیل ناشتا کرنے کی غرض سے باورچی خانے کی طرف آیا تو دہلیز میں ہی ٹھہر گیا اور کافی حیرت کا اظہار کیا تھا جس پہ مریم اور عابدہ خاتون بے ساختہ مسکرا اٹھیں۔

"اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے کیا کسی خاص دن یا تہوار کی ضرورت ہوتی ہے؟" عابدہ خاتون نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آج کل زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ اپنی اولاد اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے بھی لوگوں کو خاص دن کی ہی ضرورت ہوتی ہے' ورنہ عام دنوں میں تو وقت ہی نہیں ملتا۔" عدیل کا کہنا بھی بجا تھا لیکن غلط تو عابدہ خاتون بھی نہیں تھیں۔

"یہ امیر اور بڑے لوگوں کی باتیں ہیں بیٹا! ورنہ ہم غریب لوگوں کے پاس اولاد اور بچوں کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے؟ ہم دولت کو نہیں اولاد کو دیکھ دیکھ کر جینے والے لوگ ہیں کیونکہ ہماری جمع پونجی تو ہماری اولاد ہی ہوتی ہے۔" ان کے لہجے میں ——— ممتا بول رہی تھی عدیل آہستگی سے مسکرا دیا۔

"یہ تو آپ واقعی صحیح کہہ رہی ہیں' لیکن امی چند ایسے امیر اور بڑے لوگ بھی ہیں جو آج بھی دولت کو نہیں اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں' جن کی اولاد ہی ان کا سب کچھ ہے' ہمارے شہر کے بہت بڑے بزنس مین ہیں وقار آفندی' آفندی انڈسٹریز کے مالک' آج ان کی بیٹی کا برتھ ڈے ہے' آپ اس برتھ ڈے کی ارینج منٹ کا ہی سن لیں تو حیران رہ جائیں گی' ان کی بیٹی کے ڈرائیور سے ملاقات ہوئی تھی وہی ساری تفصیل بتا رہا تھا' وقار آفندی اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا' لوگ تو محاورتاً" کہتے ہیں نا کہ اولاد کو دیکھ دیکھ کر جینا' لیکن وہ تو حقیقتاً" اپنی بیٹی کو ہی دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔" عدیل کے ذہن میں منصور حسین کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

"بس بیٹا! ایسی محبت وہی کر سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ نوازا ہے' لیکن میں تو پھر بھی یہی سوچتی ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنی عاجزی میں ہی رکھے۔" عابدہ خاتون کافی عاجزی سے کہہ رہی تھیں اور عدیل ناشتا کرنے کے لیے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا لیکن عدیل کے لیے ناشتا گرم کرتی مریم کے ذہن میں ایک اور ریشم کا دھاگہ الجھ گیا تھا' وہ وقار آفندی اور جودت آفندی کی ادھیڑبن میں لگ گئی تھی' تو اس کا مطلب تھا کہ جودت آفندی اور وقار آفندی ایک ہی فیملی سے بی لانگ کرتے تھے؟ اور مریم سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ آخر وہ اتنے امیر کبیر فیملی اور اپر کلاس سے تعلق رکھنے والا لڑکا اس کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ اس کے لیے تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود تھی..... ماڈرن' اسٹائلش' خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکیاں' تو اسے بے شمار مل سکتی تھیں' پھر اس کی نظر انتخاب مریم پہ ہی کیوں ٹھہری تھی.....؟ وہ اسے ہی اس طرح کیوں دیکھتا تھا.....؟ اس کی نظریں اتنی بےباک ہوتی تھیں کہ مریم اندر ہی اندر سمٹ کے رہ جاتی تھی اور اب تو اسے اور بھی دھڑکا لگ گیا تھا کہ وہ جو ابھی ایک بار اس کے سامنے آیا ہے' اب وہ بار بار سامنے آئے گا اور بار بار اس کے راستے کی رکاوٹ بنے گا' اور وہ جو اپنے گھر کے حالات بہتر کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلی تھی اس کا کیا بنے گا آخر.....؟ اور اسی "آخر" پہ آکر اس کی پریشانی اور تفکرات کے سائے شروع ہو جاتے تھے جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتے تھے۔

☆ ☆ ☆

تیرہ نومبر اور چودہ نومبر کی درمیانی شب سے لے کر اب تک سب کزنز اسے باری باری وش کر رہے تھے۔

سب سے پہلے رات کے بارہ بجے اسے آذر نے وش کیا تھا اور سب سے پہلا گفٹ بھی آذر نے ہی دیا تھا' اس کے بعد وقار آفندی اور آسیہ آفندی اسے وش کرنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آئے تھے' ان کے جانے کے بعد باقی سب نے مل کر مدھم تالیوں کی دھن پہ اسے اتنے خوب صورت انداز میں وش کیا تھا کہ علیزے خوشی سے چہک اٹھی تھی۔

حرمت نے اس کے لیے کیک بیک کیا ہوا تھا اور رات سوا بارہ بجے اس نے وہی کیک کاٹ کر سب کا منہ میٹھا کروایا تھا' اور اسی طرح صبح وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں آئی تو ڈائننگ روم تازہ پھولوں سے سجا ہوا نظر آیا۔

"یہ میری طرف سے لولی' پریٹی' سویٹ اینڈ بیوٹی فل ڈارلنگ علیزے کے لیے۔" جودت نے اچانک سامنے آتے ہوئے ایک سرخ رنگ کا تازہ گلاب اس کے سامنے پیش کیا یوں جیسے کوئی بوائے فرینڈ بڑے اسٹائل سے اپنی گرل فرینڈ کو پیش کر رہا ہو' علیزے کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اس کے انداز پہ مسکرا دیے تھے۔

"تھینک یو' ہینڈسم' چارمنگ' اینڈ ڈیشنگ برادر۔۔۔" علیزے نے اسی کے سے اسٹائل میں کہتے ہوئے پھول اس کے ہاتھ سے تھام لیا جس پہ ڈائننگ روم میں موجود سبھی افراد یکدم قہقہہ لگا کر ہنسے تھے اور ان میں سب سے بلند قہقہہ وقار آفندی کا ہی تھا' وہ بیٹی کی شوخی و شرارت پہ بے پناہ خوش ہو رہے تھے اور ان سب کی انہی شوخیوں اور شرارتوں میں انہوں نے ناشتا کیا اور پھر سب اپنے اپنے کاموں اور اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔۔۔ ہر طرف گہما گہمی کا سا سماں تھا ملازمین کی الگ دوڑ لگی ہوئی تھی مبارک خان سب کے سر پہ سوار اپنی نگرانی میں کام کروا رہا تھا تاکہ کوئی کمی نہ رہ جائے' اور کوئی کوتاہی نہ ہو' وقار آفندی مبارک خان کے کام سے بہت خوش تھے وہ اپنا ہر کام محنت' لگن اور پورے دھیان سے مکمل کرتا تھا اور اس طرح کبھی کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

شام کو جیسے ہی فنکشن اسٹارٹ ہوا دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ رہ گئی تھیں' کئی کنال پہ پھیلی ہوئی وسیع و عریض بڑی حویلی اس وقت روشنیوں کا ایک پورا جہان لگ رہی تھی اور روشنیوں کا یہ جہان اس وقت صرف اور صرف شہزادی علیزے کی خوشی میں آباد تھا اور آج یہاں اس خوشی میں شہر کے بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں نے شرکت کرنی تھی اور اس کی شروعات ہو چکی تھی' سب سے پہلے آسیہ آفندی کی دوست مسز بدر اپنی فیملی کے ساتھ آئی تھیں عاصم' سائم' فاطمہ اور مسٹر بدر کمال بھی ساتھ تھے۔

"ہائے آنٹی! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟" فاطمہ آگے بڑھ کے آسیہ آفندی سے کافی شوق سے ملی تھی۔

فائن بیٹا! آپ سناؤ کہاں ہوتی ہو۔۔۔ بڑے عرصے بعد دکھا ہے؟" آسیہ آفندی نے پیار سے گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"بس! یونیورسٹی کی وجہ سے بہت بزی ہوتی ہوں' لیکن آج سوچا کہ علیزے کو ہی دیکھ آؤں' آج کے دن تو علیزے کی چھب دیکھنے والی ہوتی ہے۔" فاطمہ نے کھلے دل سے تعریف کی اور اس کی اس تعریف میں کوئی مبالغہ آرائی بھی نہیں تھی کیونکہ ہمیشہ سادہ رہنے والی علیزے جب اپنی برتھ ڈے کے روز اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے ہلکا پھلکا میک اپ کرتی تھی اور نازک سی جیولری پہنتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہزاروں سنگھار کر کے سامنے آ گئی ہو۔

"بس بیٹا! یہ تو تمہاری محبت ہے' ورنہ تم خود اتنی خوب صورت اتنی پیاری ہو۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور فاطمہ مسکرا دی۔

"اچھا تو علیزے اب کہاں ہے۔۔۔؟" فاطمہ علیزے کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

"اپنے بیڈ روم میں ہے' تھوڑی دیر تک آجائے گی۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔

"اوکے! لیکن کومل اور حرمت بھی نظر نہیں آ رہیں۔۔۔؟"

"تم اندر چلی جاؤ' تمہیں سب نظر آجائیں گی۔" آسیہ آفندی نے مسکرا کر اندر کی سمت اشارہ کیا اور فاطمہ بھی جواباً" مسکراتے ہوئے سر ہلا کر اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"ہوں! تو آج کل کیا مصروفیت ہے آپ لوگوں کی۔۔۔؟" آذر سائم اور جودت سے پوچھ رہا تھا جس پہ عاصم بے ساختہ مسکرا دیا کیونکہ اسے ان لوگوں کی مصروفیت کا تھوڑا بہت اندازہ پہلے سے ہی تھا اسی لیے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھساتے ہوئے ہلکے سے کھنکارا تھا۔

"ہماری مصروفیت وہی ہے جو پہلے تھی' یونیورسٹی' یونیورسٹی اور یونیورسٹی۔۔۔ بس اور تو کچھ نہیں۔" جودت نے کندھے اچکاتے ہوئے ذرا لاپروائی سے جواب دیا تھا جس پہ سائم نے چہرا جھکا لیا۔

"بس اور تو کچھ نہیں نا۔۔۔؟" آذر نے دہرا کے پوچھا کیونکہ آج وہ دونوں بڑے عرصے بعد اکٹھے نظر آئے تھے۔

"جی ہاں! اور کچھ نہیں۔" دونوں نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیوں عاصم صاحب! کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔؟" آذر نے عاصم کو مخاطب کیا۔

"اتنے اچھے انداز میں کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔۔۔؟" عاصم نے بھی جواباً" کندھے اچکائے تھے اور آذر بس دیکھ کے رہ گیا۔

"ارے آذر صاحب! جانے دیجیے' کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہیں۔۔۔؟ آج انہیں انجوائے کرنے دیں' یہ انویسٹی گیشن کل کے لیے رہنے دیں۔" عاصم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کی جان بخشی کروائی تھی اور وہ بڑی سہولت سے وہاں سے کھسک گئے تھے' اور اتنی سی دیر میں ہی ان کا پورا لان لوگوں سے بھر چکا تھا حویلی کے گیٹ سے لے کر اندر ڈرائنگ روم تک ریڈ کارپٹ بچھا ہوا تھا اور اس خوب صورت ارینج منٹ کو مدھم سروں میں بجتا میوزک اور بھی دلفریب اور سحر انگیز بنا رہا تھا ہمیشہ کی طرح آج بھی لوگوں کی نظروں میں ستائش تھی اور کئی لوگوں نے باقاعدہ سراہا بھی تھا۔۔۔ اور اس چیز کا سارا کریڈٹ مبارک خان کو جاتا تھا جس پہ وقار آفندی بھی خوش تھے اور مبارک خان بھی خوش تھا اتنے سارے لوگوں کی تعریف پہ اس کی ساری محنت وصول ہو گئی تھی۔

"مبارک خان! کیک آچکا ہے یا نہیں۔۔۔؟" آسیہ آفندی اچانک کچھ یاد آنے پہ اپنے قریب کھڑی خواتین سے ایکسکیوز کرتی ہوئی۔ مبارک خان کی طرف آگئی تھیں۔

"جی بیگم صاحبہ! کیک تو ایک گھنٹہ پہلے ہی منگوا لیا تھا میں نے۔" مبارک خان نے کافی احترام اور تابعداری سے جواب دیا تھا۔

"ہوں شاباش! میں نے سوچا کہ کہیں آرڈر لیٹ نہ ہو جائے۔" وہ نرمی سے بولی تھیں۔

"بڑی حویلی سے کوئی آرڈر ہو اور وہ لیٹ ہو جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ؟ میں کیک چیک کرنے کے لیے تین بار گیا ہوں' یوں سمجھیں کہ پاس کھڑے ہو کر تیار کروایا ہے' ان شاء اللہ سب مہمانوں کو پسند آئے گا۔۔۔" مبارک خان کو جیسے پورا یقین تھا۔

اور آسیہ آفندی جواباً" کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ احمد پاس آگیا تھا۔

"آنی! وہ کچھ خواتین آپ کو یاد کر رہی ہیں۔" احمد نے ایک ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا اور آسیہ آفندی نے فوراً" گردن موڑ کر دیکھا ان کی کچھ جاننے والی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں جنہیں ثروت بیگم کمپنی دے رہی تھیں۔

"اچھا! میں آ رہی ہوں' اور مبارک خان ٹھیک ہے تم جاؤ اپنا کام کرو۔" آسیہ آفندی کہتے ہوئے ان عورتوں کی سمت بڑھی تھیں انہوں نے آج گرے کلر کی خوب صورت نفیس اور انتہائی قیمتی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی

جس میں ان کی گریس فل شخصیت بہت متاثر کن لگ رہی تھی تھوڑی دیر پہلے وقار آفندی کے پہلو میں کھڑی بچ رہی تھیں اور فوٹو گرافر نے ان کی کئی تصویریں بناڈالی تھیں۔

”زری ــــ! زری بیٹا ــــ! ادھر آجاؤ' چوٹ لگ جائے گی۔“ یہ آواز آسیہ آفندی کی سماعتوں سے اچانک ٹکرائی تھی اور ان کے قدم بے ساختہ تھم گئے تھے انہوں نے اس آواز کی سمت تڑپ کر دیکھا ایک عورت اپنی تین چار سالہ بچی کو پکار رہی تھی جو لان میں کھیلتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی' آسیہ آفندی اس پیاری سی بچی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”زری ــــ؟“ انہوں نے دھیمے اور کھوئے ہوئے انداز میں زیر لب دہرایا تھا اور یوں لگا جیسے ان کا دل مٹھی میں آگیا ہو' زری کے نام پہ ان کے دل سے ہوک نکلی تھی۔

”آنی! دیکھیں علیزے آگئی ہے۔“ ان کے قریب ہی انوشہ بے تحاشا چہک کر بولی تھی اور آسیہ آفندی نے اس بچی سے نظریں ہٹا کر علیزے پہ مرکوز کردیں' علیزے انہی کی سمت آرہی تھی اور علیزے کے ایک ایک قدم پہ ہزاروں نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔

بلیک کلر کے جدید تراش خراش کے انتہائی قیمتی اور خوب صورت لباس میں ملبوس علیزے آفندی اس وقت ہزاروں نگاہوں کے نیچے بسنے والے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گئی تھی اور آذر آفندی کے سینے میں تو کئی ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھیں اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر آذر کے سینے میں دھڑکتے ایک جاندار نے کچھ بوکھلائی ہوئی حرکتیں سرزد کی تھیں ــــ بے اختیار اور اچانک ــــ! شاید اس لیے کہ آج وہ پہلی بار سیاہ رنگ پہن کر آئی تھی ــــ یا شاید اس لیے کہ وہ پہلی بار اتنے دل سے تیار ہو کر آئی تھی ــــ؟ لیکن جو بھی تھا سب کو مبہوت کرنے کے لیے کافی تھا' بلیک کلر کی لانگ شرٹ پہ بلیک دھاگے کا کافی نفیس کام کیا گیا تھا' سامنے دامن پہ اور بازوؤں کی پٹی پہ سلور کرسٹل کے نگ جڑے ہوئے تھے اور یہی نگ اس کے دوپٹے کی چاروں اطراف میں نظر آ رہے تھے' چوڑی دار پاجامے کے نیچے بلیک پنسل ہیل والے سینڈل اس کے خوب صورت اور متناسب سراپے کو اور بھی نمایاں دکھا رہے تھے' اسٹائلش اور یونیک سے ہیر اسٹائل کے باوجود علیزے نے دوپٹہ کافی سلیقے سے سر پہ اوڑھ رکھا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی وہ کبھی ننگے سر سامنے نہیں آتی تھی' البتہ اسے ننگے سر کسی نے دیکھا تھا تو وہ صرف منصور حسین تھا اسی لیے تو وہ اب کہیں نظر آجاتا تھا تو وہ نظریں چرا جاتی تھی۔

”مما! کیا دیکھ رہی ہیں؟“ علیزے نے پاس آکر ان کے ہاتھ تھام لیے تھے آسیہ آفندی یکدم چونک گئیں۔

”دیکھ رہی تھی کہ میری بیٹی ماشاءاللہ اب جوان ہوچکی ہے' شادی کے قابل ہوچکی ہے۔“ انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے علیزے کی نظر اتاری اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا علیزے بری طرح جھینپ گئی۔

”مما ــــ!“ اس نے خفگی کا اظہار کیا تھا۔

”اچھا! ادھر آؤ مہمانوں سے ملو' سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ آسیہ آفندی اسے ساتھ لے کر مہمانوں سے ملوانے لگیں اور رفتہ رفتہ کیک کاٹنے کا ٹائم بھی آن پہنچا تھا بڑے سے کیک پہ اس کا نام اور برتھ ڈے لکھا ہوا تھا' چھوٹی چھوٹی کیک کینڈلز کو گل کرتے ہی فضا میں ایک دم سے ہیپی برتھ ڈے اور تالیوں کی آواز گونجنے لگی یہاں تک کہ حویلی کے درودیوار بھی گنگنا اٹھے تھے۔

علیزے نے سب سے پہلے وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو کیک کھلایا تھا لیکن یہی کیک وقار آفندی کے حلق میں اٹک گیا تھا ان کے سیل پر ایک میسج موصول ہوا۔

”بیٹی کی سالگرہ مبارک ہو وقار آفندی' لیکن اتنا یاد رکھو آج تم اپنی بیٹی کی بیسویں اور آخری سالگرہ منا رہے ہو' آئندہ تمہیں موقع نہیں ملے گا ــــ ان شاءاللہ!

وقار آفندی کے ہاتھ میں موبائل لرز کے رہ گیا اور ان کے چہرے کی رنگت یک لخت زرد پڑ گئی لیکن اتنے سارے لوگوں میں اور اس ہنگامے میں کوئی بھی ان کی سمت متوجہ نہیں تھا وہ مرے مرے بے جان قدموں سے چلتے ہوئے مرکزی حصے سے تھوڑا ہٹ گئے تھے' لیکن ان کی ایسی شکستہ سی حالت دیکھ کر گیٹ کے پاس کھڑا منصور حسین فوراً لپک کے ان کے قریب آیا۔

”ارے صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں نا ــــ؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟“ اس نے وقار آفندی کو تھام کر قریبی کرسی پہ بٹھایا تھا۔

”ایک گلاس پانی لادو۔“ انہوں نے اپنی کنپٹی اور سینے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”جی ابھی لایا۔“ وہ فوراً گیا اور پانی لے آیا تھا ــــ وقار آفندی ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئے تھے۔

”اب ٹھیک ہیں آپ؟“ منصور حسین فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہوں ٹھیک ہوں۔“ وہ ابھی بھی اپنا سینہ سہلا رہے تھے اور اپنی کیفیت کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ اس وقت یہاں ہزاروں لوگ جمع تھے اور اتنے لوگوں میں ان کی ذرا سی بات بھی ایشو بن سکتی تھی اور رسوائی کے بھی بے پناہ امکان تھے اسی لیے ضبط کر جانا' اور خاموش ہو جانا ہی بہتر تھا' کیونکہ اس وقت کچھ بولنے کا یا ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ الٹا نقصان تھا۔

ان کی اپنی ہی جگ ہنسائی ہونی تھی کہ کسی نامعلوم اور ان دیکھے دشمن نے ان کی نیندیں اور ان کی زندگی حرام کر رکھی تھی اور وہ کچھ نہیں کرپا رہے تھے بلکہ اس کے سامنے ہر طرح سے بے بس تھے ــــ!

اور پھر فنکشن ختم ہونے تک وہ اسی طرح قدرے گم سم اور چپ چاپ سے رہے اور فنکشن ختم ہونے کے بعد بھی ان سب نے پوچھا تو طبیعت خرابی اور سردرد کا کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلے گئے تھے اس لیے باقی سب نے بھی خاموشی سے اپنے اپنے بیڈ رومز کا رخ کیا تھا اور ویسے بھی سب تھکے ہوئے تھے سب کو نیند آرہی تھی اس لیے کسی نے بھی اس مسئلے پہ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔

✡ ✡ ✡

”ہیپی ــــ برتھ ڈے ــــ ٹو یو
ہیپی ــــ برتھ ڈے ــــ ٹو یو
ہیپی ــــ برتھ ڈے ــــ ٹو یو
مائی ڈیئر علیزے ڈارلنگ!“

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھی اپنی جیولری اتار رہی تھی جب کوئی دھیمے سے گنگنا کر اسے وش کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا' علیزے نے چونک کر آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھا اور پھر یکدم اسے کرنٹ چھو گیا وہ ایک سیکنڈ میں تڑپ کر سیدھی ہوئی تھی۔

”ڈرائیور! تم یہاں ــــ؟ میرے بیڈ روم میں؟“ علیزے پہ تو جیسے حیرت اور اچنبھے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا رات کے اس پہر اپنے بیڈ روم میں کسی ملازم کو اتنے استحقاق سے داخل ہوتے دیکھنا بھی تو سر پہ پہاڑ ٹوٹنے کے ہی برابر تھا۔

”جی ہاں! میں یہاں ــــ شہزادی علیزے کی خواب گاہ میں۔“ اس نے کہتے ہوئے انتہائی سکون اور سہولت سے دروازے کا لاک لگا کر بولٹ بھی چڑھا دیا۔

”ڈرائیور! یہ ــــ یہ کیا کر رہے ہو تم ــــ؟ تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے بیڈ روم میں آنے کی۔“ علیزے

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اسے دروازہ بند کرتے دیکھ کر پاگل ہو اٹھی تھی لیکن ساتھ ہی اس پہ خوف بھی طاری ہو چکا تھا کیونکہ وہ مضبوط قدم اٹھاتا اس کی سمت آرہا تھا۔

"یہ جرات میں ہزاروں بار کر چکا ہوں جان ڈرائیور! جرات کا قصہ نہ چھیڑو۔" وہ بڑی دلکشی سے کہتا ہوا عین اس کے سامنے آرکا' علیزے اس کے تیور دیکھ کر برف کی مانند ٹھنڈی ہونے لگی تھی اس کی خوب صورت پیشانی پہ ٹھنڈے پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے کیونکہ منصور حسین آج منصور حسین نہیں کچھ اور ہی لگ رہا تھا صاف ستھرا' خوشبوؤں میں بسا ہوا' اس کی ڈریسنگ بھی بے تحاشا قیمتی نظر آرہی تھی اور علیزے کے چاروں اطراف خوف و خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں وہ یکدم کسی متوحش ہرنی کی مانند بدحواس ہو کر دروازے کی سمت بھاگی تھی لیکن دوسرے ہی پل اس کی کلائی جکڑ کر اسے بیڈ کی سمت دھکیل دیا گیا تھا وہ بری طرح چکرا گئی تھی۔

"ڈرائیور.....!" وہ چیخ اٹھی تھی۔

"میں ڈرائیور نہیں ہوں تمہارا۔" اس نے اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے سکون سے جواب دیا تھا۔

"تو پھر..... کک کون ہو تم؟" علیزے یکدم بیڈ سے اٹھ بیٹھی۔

"شوہر ہوں تمہارا۔" اس کا سکون ہنوز برقرار تھا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی تھی۔

"شوہر؟ کیا مطلب ہے تمہارا' کون ہو تم..... تم بتاتے کیوں نہیں۔" علیزے خود میں بمشکل ہمت پیدا کرتی ہوئی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگا تھا اور پھر گہرا کش لے کر دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑ دیا تھا۔

"دل آور شاہ!" اس نے دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی اس کے چہرے پہ پھونک دیا تھا۔

"دل آور شاہ.....؟"

"ہوں! دل آور شاہ..... اور تم دل آور شاہ کی بیوی ہو۔" اس نے کہتے ہوئے علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور پتھر کی مورتی کی طرح پتھرائی ہوئی علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

ڈرائیور' منصور حسین' دل آور شاہ' شوہر' بیوی یہ سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

☆ ☆

عائشہ ریاض خان

چاند کی تلاش

"توبہ ہے اتنی گرمی اور اوپر سے یہ بجلی کی آنکھ مچولی اور سونے پے سہاگہ خالہ صغراں کے سڑے ہوئے رشتے۔" ستارہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اماں آپ کوئی اور رشتے والی کیوں نہیں لگاتی ہیں۔"

"ارے چار چار رشتے والیاں لگائی ہیں۔ مگر یہ ناس پیٹیاں پیسے لے کر دوبارہ منہ دکھانا بھول جاتی ہیں۔ صغراں اچھی ہے جو بے چاری روز کوئی نہ کوئی رشتہ لے آتی ہے۔" اماں نے گویا صفائی دی۔

"ارے آپ لوگ کب آئے؟" چاندنی نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور سنائیں کیسا رہا آپ کا ٹور؟"

"ارے کیا بتائیں؟ ایک رشتہ بھی ایسا ہو جو اس خالہ صغراں نے اچھا دکھایا۔ کسی لڑکی کی آنکھیں اتنی چھوٹی جیسے بٹن تو کسی کی ناک اتنی بڑی کہ پورے چہرے پر صرف اور صرف ناک نظر آتی ہے۔ اور کوئی تو بالکل کالی بھجنگ ہوتی ہے۔" ستارہ نے ناک چڑا کے بتایا۔

"آپا کچھ خدا کا خوف کریں آپ خدا کی بنائی مخلوق کے بارے میں کس طرح بات کر رہی ہیں۔ اس دنیا کا ہر چہرہ خدا نے بہت پیار سے تخلیق کیا ہے۔ اور ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم خدا کی تخلیق کی اس طرح تحقیر کریں۔ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔" چاندنی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"بس بس اپنے لیکچر اپنے پاس ہی رکھا کرو میرا سر کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اگر ہمارا بھائی چاند سا ہے تو کیا ہمارا حق نہیں بنتا کہ چاند سی بھابھی لائیں۔" ستارہ نے غرور سے کہا۔

"آپا میری ایک بات یاد رکھیے گا کہ چاند میں بھی داغ ہوتا ہے۔ اب آگے کچھ بھی کہنا فضول ہے۔ اللہ ہی آپ کو عقل دے اور آپ کی اس مہم کو اختتام۔" چاندنی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

"پتا نہیں اس لڑکی کو علامہ بننے کا شوق کیوں چڑھا رہتا ہے؟" ستارہ غصے سے بڑبڑائی۔

☆ ☆ ☆

ستارہ، فہد اور چاندنی تین بہن بھائی تھے۔ ستارہ شادی شدہ تھی۔ ایک بیٹا شاہ ویز تھا جس کو بورڈنگ میں داخل کروا کر زیادہ تر وقت اماں کے گھر گزارتی تھی اور ان کے شوہر نامدار اسد بیوی کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض اول سمجھتے تھے۔ والد کا انتقال کچھ عرصہ قبل ہو چکا تھا۔ ستارہ کو اللہ نے اچھی شکل و صورت سے نوازا تھا جبکہ چاندنی نین نقش میں تو بہت اچھی تھی مگر رنگت ستارہ کی طرح چمکتی ہوئی نہ تھی۔ لیکن ذہین بلا کی تھی۔ جبکہ فہد ماں باپ کا اکلوتا فرزند تھا۔ اپنا اسپیئر پارٹس کا بزنس تھا۔ جو دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

آج کل اسی کی شادی کے لیے اماں اور ستارہ آپا لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں اور ان کی مطلوبہ لڑکی جیسے ناپید ہو چکی تھی۔ آج پھر آپا اور اماں کی شاہی سواری تیار تھی۔

"آپا آج کہاں کے ارادے ہیں؟" چاندنی نے تجسس سے پوچھا۔

"ارے ہم نے کہاں جانا ہے۔ بس خالہ نے رشتہ بتایا ہے۔ وہ ہی دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"آج میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔" چاندنی نے نہ جانے کس رو میں پوچھا۔ ورنہ وہ اس مہم سے دور ہی رہتی تھی۔ اور آپا نے خوشگوار حیرت کے ساتھ صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆ ☆ ☆

گئی تو چاندنی لڑکی دیکھنے تھی مگر لگ رہا تھا کہ وہ اپنی آپا کو بھی پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہے۔

جیسے ہی لڑکی اندر داخل ہوئی آپا نے اسے سر سے پیر تک ایسے دیکھا جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ پھر بیٹھتے ہی سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔ چاندنی آپا کے اس تفتیشی انداز پر حقیقتاً شرمندہ ہو رہی تھی جبکہ اماں خاموشی سے لڑکی کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اور وہ لڑکی چاندنی کو وہ ماہر پولیس آفیسر کے نرغے میں پھنسی کوئی مجرم لگ رہی تھی۔ جو اپنے ناکردہ جرم کی صفائی دے رہی تھی۔

پولیس اور مجرم کی سوچ پر چاندنی کے لبوں کو بے ساختہ مسکراہٹ نے چھو لیا۔

اٹھنے تک چاندنی کو پکا یقین ہو چکا تھا کہ ان کی طرف سے "تقریباً" رشتہ پکا ہو چکا ہے کیونکہ ناپسند کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مگر اس کی حیرت اور غصے کی انتہا نہ رہی جب آپا نے باہر آ کر کہا۔

"لڑکی تو ٹھیک تھی۔ مگر اس کی فیملی مجھے کچھ پینڈو سی لگی ہے۔ دیکھا تھا لڑکی کی ماں اور بڑی بہن کیسے کپڑے پہنے ہوئی تھیں۔ نہ بھئی مجھے تو اپنے بھائی کو ان پینڈو لوگوں میں نہیں پھنسانا۔" چاندنی نے اپنے لبوں کو بے ساختہ دانتوں تلے کچلا کہ کہیں کچھ تلخ نہ نکل جائے۔ اس کے بعد چاندنی نے ایسی کسی بھی مہم میں حصہ لینے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

☆ ☆ ☆

"آج جو لڑکی میں تمہیں دکھاؤں گی نا سمجھو ہیرا ہے ہیرا، رنگ دودھ کو مات دے۔ نین نقش بالکل تیکھے۔" خالہ صغراں زور و شور سے اپنے لائے گئے رشتے کی تعریفوں میں مگن تھیں۔

"وہ سب تو صحیح ہے خالہ پر یہ تو بتاؤ لڑکی کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ تعلیم کیا ہے؟ اب صرف شکل و صورت بھی نہیں دیکھی جاتی ہے اور بھی بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔" ستارہ نے خالہ کو درمیان میں ہی فل اسٹاپ لگایا۔

"ارے بیٹا خاندان ایک دم اعلا ہے اور لڑکی نے ماشاء اللہ بی۔ اے کیا ہوا ہے۔" خالہ نے جوش سے بتایا۔

"چلو پھر اس ہیرے کو آج دیکھ ہی لیتے ہیں۔" ستارہ نے رضامندی دی اور اس کی رضامندی میں اماں کی رضامندی تھی۔

☆ ☆ ☆

"چاندنی... ارے چاندنی کہاں ہے؟" اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔

"کیا ہوا؟ سب خیر تو ہے نا۔" چاندنی افتاں و خیزاں بھاگی آئی۔

"ارے خیر کے ساتھ ساتھ خوشخبری بھی ہے۔ ہمیں لڑکی پسند آ گئی ہے۔" ستارہ نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

"کیا... سچ... چلیں اللہ کا شکر ہے یہ معرکہ تو سر ہوا ورنہ مجھے لگتا تھا بھائی بڈھے ہو جائیں گے اور آپ کو ان کا چاند نہیں ملے گا۔" چاندنی نے مزاحیہ کہا۔

"چل چل زیادہ بکواس نہ کر اور اسکوائش بنا کر لا بہت گرمی ہے۔" اماں نے چاندنی کو دھپ لگاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

باقی کے معاملات اتنی تیزی سے طے ہوئے کہ وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور ایک سنہری شام حنا فہد کی زندگی میں خوشبو بکھیرنے چلی آئی۔ یوں تو حنا اخلاق کی بہت اچھی تھی مگر جہاں بات اس کے مزاج کے خلاف ہوتی تو وہ "فوراً" بھڑک جاتی تھی۔ اسے اپنے حسن پر ناز بھی بہت تھا۔ اس پر قسمت یہ کہ فہد بھی اس کے حسن میں دیوانہ ہو کر سوجھ بوجھ سے بے گانہ ہو گیا۔

اب ستارہ کی فہد کی زندگی میں مداخلت ختم ہو چکی تھی۔ کیونکہ مداخلت کرنے کے لیے وہ چاند سی بھابھی جو لے آئی تھیں۔ رہیں اماں اور چاندنی تو اماں نے تو دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے سب کچھ بہو بیگم کے سپرد کر دیا تھا۔ اور چاندنی تو تھی ہی بے ضرر اپنے آپ میں مگن۔ اس لیے حنا کو چاندنی سے کوئی بیر تھا بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

"اماں میں تو کہتی ہوں اب آپ چاندنی کے لیے بھی رشتہ دیکھنا شروع کریں۔ ماشاء اللہ سے بی۔ اے کر چکی ہے۔" ستارہ نے اماں کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں بھی کافی دن سے یہ ہی سوچ رہی ہوں۔

کل ہی صغراں کو بلا کر کہتی ہوں کہ کوئی اچھا رشتہ دکھائے۔" اماں نے بیٹی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"آپا.... آپا کہاں ہیں آپ؟ اسد بھائی آئے ہیں۔" چاندنی نے کچن سے آواز لگائی۔

"چلیں اماں ڈرائنگ روم میں ہی چلتے ہیں۔ آج اسد جلدی میں ہے۔ اس لیے زیادہ دیر بیٹھیں گے نہیں۔"

دوسرے دن ہی اماں نے خالہ صغراں سے چاندنی کے لیے رشتہ دکھانے کی بات کی اور آج خالہ اسی سلسلے میں کچھ لوگوں کو لے کر آرہی تھیں۔ چاندنی صبح سے گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ کیونکہ گھر کا کوئی بھی کام کرنا حنا کی شان کے خلاف شان تھا۔

شام میں ستارہ آپا آئیں تو اسے نہانے بھیجا اور خود مہمانوں کی تواضع کا انتظام دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر میں مہمان آگئے۔ مہمانوں کا حال احوال معلوم کرنے کے بعد ستارہ آپا چاندنی کو بلانے آگئیں۔

"آپا میں بہت کنفیوز ہورہی ہوں۔ دیکھیں میرے ہاتھ پاؤں بھی کانپ رہے ہیں۔ اور دل الگ زور' زور سے دھڑک رہا ہے۔" چاندنی نے منمناتے ہوئے کہا۔

"ارے پاگل کچھ نہیں ہوتا۔ کنفیوز ہونے کی بھلا کیا ضرورت ہے میری چاندنی میں کوئی کمی ہے جو کوئی انکار کرے گا بھلا۔" ستارہ نے دلاسے سے کہا۔ لیکن ستارہ کے کہے گئے الفاظ اس پر ہنس رہے ہیں یہ ستارہ کو نہیں پتا تھا۔

آنے والے لوگ انکار کر گئے تھے۔ وہ بھی بنا کسی وجہ کے۔ پھر یہ سلسلہ تو لگتا تھا طویل سے طویل تر ہوتا گیا کوئی وجہ بتا کر انکار کرتا اور کوئی بے وجہ۔ اور جو وجہ دیتا اس کی وجہ سن کر ہنستے ہنستے' آنکھوں سے صرف آنسو ہی بہہ سکتے تھے۔ اس تمام سلسلے کو تقریباً" سال ہونے کو آرہا تھا۔ جبکہ چاندنی اس نمائشی پروگرام سے اس حد تک ڈس ہارٹ ہوچکی تھی کہ رفتہ رفتہ اس کا اعتماد بھی ختم ہورہا تھا۔ ✡ ✡

"اماں میں آپ کو بتارہی ہوں۔ آج آخری دفعہ ہے اس کے بعد میں کبھی کسی کے سامنے نہیں آؤں گی۔ اور نہ ہی آپ کبھی دوبارہ زندگی میں اپنی قسم دے کر مجھے پابند کریں گی۔ میں اس روز روز کے جھنجھٹ سے تنگ آچکی ہوں۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔" چاندنی نے روہانسے لہجے میں اماں کو وارننگ دی۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے چل اٹھ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لے۔" اماں نے پچکارا۔

آج پھر کوئی مہمان چاندنی کو دیکھنے آرہے تھے۔ یہ مہمان آپا کے توسط سے آرہے تھے۔ اور انہیں پورا یقین تھا کہ وہ لوگ چاندنی کو پسند کرلیں گے۔ تقریباً" چھ بجے کے قریب وہ لوگ آئے۔ چاندنی مارے باندھے ان لوگوں کے پاس بیٹھی تھی۔ پھر بہانے سے باہر آگئی۔ کچھ دیر میں ستارہ بھی ناشتے کے برتن رکھنے باہر آگئیں۔

"ارے ستارہ تو کہہ رہی تھی میری بہن بہت پیاری ہے۔" ایک خاتون نے ستارہ کی نقل اتاری۔

"اگر اس کالی کلوٹی کو پیاری کہیں گے تو بھئی درحقیقت پیاری کو کیا کہیں گے۔" ایک اور خاتون نے دھڑلے سے چاندنی کے گندمی رنگ کو کالا بنا ڈالا۔

"اور نہیں تو کیا مجھے تو نین نقش بھی کچھ خاص اچھے نہیں لگے۔ اور نام ہے چاندنی۔" ایک اور خاتون نے استہزائیہ کہا۔ پھر تمام خواتین کی دبی دبی ہنسی نے اس کے بھونڈے مذاق کی تائید کی تھی۔

"ارے اب اگر ہمارا بھائی چاند سا ہے تو کیا ہمارا حق نہیں بنتا کہ چاند سی بھابھی لائیں۔" ایک خاتون نے بے ساختہ کہا۔ اور باہر کھڑی ستارہ کو لگا کہ اس جملے نے اسے زوردار طمانچہ رسید کرکے اس کے ماضی میں لے جا کھڑا کیا۔

وہ آہٹ پر مڑی تو چاندنی کی جھلملاتی شکوہ کناں نظروں سے نظریں ملانا دشوار ہوگیا۔ ماضی میں کی گئی تمام باتیں اسے مسلسل کچوکے لگارہی تھیں۔ "کل جو تو نے کہا آج ہونے لگا۔" کی عملی تفسیر بنی وہ ساکت کھڑی تھی۔

✡

عظمیٰ افتخار

وہی آگ ہے

"میں جان گیا زندگی واقعی جہدِ مسلسل ہے۔"

احد مہینے بھر کا کچن کا سامان اٹھائے اندر آیا تو اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ وہ ایک دم اچھل پڑا۔ بجلی غائب تھی اور جنریٹر بھی آج کل خراب پڑا تھا۔ اندازے سے چلتا ہوا وہ لاؤنج سے ملحقہ کچن تک آرہا تھا کہ آواز سن کر شاپر زاس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچے۔ کسی طور اس نے یہ سب سلیب پر ٹکایا اور پلٹ کر دیکھا۔ صوفے پر سے کسی کا موبائل نمودار ہوا جس کی اسکرین سے آتی ہوئی روشنی لکیر کی صورت میں فرش پر راستہ بنا رہی تھی اور پہچان گیا' وہ سعد تھا۔ جو موبائل کی روشنی میں کتاب پر نظریں جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو میرے بھائی۔" احد اس کے برابر میں ڈھے گیا۔

"آں۔ ستم مشق ستم ہے یہ سی ایس ایس کی مشکل ترین اردو اور وہ بھی گیس لیمپ یا موبائل کی روشنی میں۔"

اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی اور اپنا ماتھا احد کے شانے سے ٹکا دیا۔

"بکو مت۔ اور ذرا پرے ہٹ کر بیٹھو۔ تمہارے پسینے کی بو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔" احد نے اس کا سر اپنے کندھے پر سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"آہ' میرے بھائی یہ رشتوں میں دراڑ کیسی۔ آج بھائی کو بھائی کے پسینے کی بو ناگوار لگ رہی ہے۔ یاد کرو ہم تو ایک طرح کی نیکر پہن کر گھوما کرتے تھے۔ ایک ٹب میں نہاتے تھے۔ ایک سائیکل پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک پلیٹ میں کھاتے اور ایک ہی بستر پر سوتے تھے اور ایک۔۔۔۔"

"بس بس ہم اتنے بھی ایک نہیں تھے۔" احد نے اسے گھورا۔

"آہ۔ میرے بھائی تم نے تو آنکھیں پھیر لیں۔ نصیر کی ذمہ داری اپنے سر لے کر۔"

"تم اس گھر کی شبونہ سہی' نصیر تو بن ہی گئے ہو۔" سعد کی اداکاری اب تک ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ ٹھنڈی سانسوں اور مصنوعی آہوں کا سلسلہ جاری تھا۔

"میں نے کہا نا سعد۔ زیادہ بکواس نہ کرو اور اس نصیر کے بچے کو تو میں دیکھ لوں گا۔ ایسا گیا ہے گویا گدھے کے سر سے سینگ۔ دادی کے فرمان پہ دل و جان سے عمل کرنے والا۔" احد کو رہ رہ کر نصیر پر غصہ تھا۔

"اوہ۔ تو یہ سارا غصہ نصیر کے بچے کو نہ دیکھنے پر ہے۔ ڈونٹ وری برادر۔ پہلے وہ خود تو اپنے بچے کو دیکھ آئے۔ پھر تم بھی دیکھ لینا۔" سعد نے "ازراہِ مذاق" کہا اور احد نے اسی کی کتاب اس کے کندھے پر دے ماری۔

"آہ۔" سعد نے پھر ایک آہ بھری۔ مگر اب کے اس آہ میں سچائی تھی۔

"واہ میرے بھائی۔ اب تمہیں میری باتیں بکواس لگ رہی ہیں اور تھوڑی دیر پہلے جب میں خود آگاہی سے گزرتے ہوئے اپنے آپ سے ہمکلام تھا کہ زندگی ایک جہدِ مسلسل ہے۔ تب تو بڑا اتفاق کر رہے تھے۔"

سعد کا کل اردو کا پرچہ تھا۔ اس لیے وہ آج ہی ساری اردو دانی جھاڑنے کے چکر میں تھا۔

"اس لیے کہ مجھ پر بھی یہ انکشاف آج ہی ہوا ہے۔" احد نے کہا۔

"کیوں۔۔۔ کچن کے سامان میں مرچیں لانے کے بجائے راستے بھر خود چباتے آئے ہو۔" سعد نے جملہ اچھالا اور ذرا دور ہٹ کے بیٹھ گیا مبادا پھر کوئی کتاب اڑ کر آ لگے۔

"بس کرو تنگ آ گیا ہوں صبح سے یہ مہینے کے سامان کی رٹ سن سن کے۔ رائی' تیل' کلونجی' زیرہ' پسا دھنیا' مرچی' آٹا' چاول۔ اف میرے خدا۔ خود کو پنساری ہی سمجھنے لگا ہوں۔ میرے اندر کا احد عمر تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا۔ ویل آف' اسمارٹ' ایجوکیٹڈ' ڈیشنگ' جس پر ہر لڑکی مرتی ہے۔" احمد کا صدمے سے برا حال تھا۔

"کس نے کہا تھا برادر احد۔ اس ماہرو سے پنگا لو۔ دادی کی مشیر خاص ہے وہ۔ اس نے تم سے ادب اور سائنس کے حوالے سے مضمون مانگا تھا۔ تم بھول کیسے گئے؟" سعد نے اس کی ٹانگ کھینچی۔

"اور تم' تم بھی تو اردو کے پرچے کی تیاری کر رہے تھے۔ تم نہیں لکھ سکتے تھے؟" احد نے بھی اسے لتاڑا

" ٹکا سا جواب دے کر الگ ہو گئے تھے۔ میں نے ہی کرکٹ کا نائٹ میچ کھیل کر جب واپس آیا تو بیٹھ کر لکھا۔" احد چار دن پہلے کی بات یاد کر کے بولا۔

"ہاں! نیند کے جھونکوں میں' جس طرح تم نے بیٹھ کر مضمون لکھا تھا۔ اس سے تو کوئی آٹھویں کا بچہ ہی مقابلہ جیت سکتا تھا۔ سو وہ بھی ہار گئی اپنی دیرینہ حریف زوہا خاور سے۔"

"اوہ! تو یہ شاہی احکامات' ماہرہ کی سازش ہیں۔ ڈونٹ وری' اب ماہرہ ہی ہماری پوزیشن اور ریپوٹیشن دونوں بہتر کرے گی۔" احد نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"اور یہ نصیر ذرا واپس تو آئے اس سے میں اپنی جرابیں بیٹھ کے دھلواؤں گا۔" کہتے ہوئے احد نے اپنی شرٹ سونگھی۔ اسے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ فیورٹ پرفیوم کے بجائے اس کے پاس سے اچار کی خوشبو آ رہی ہے۔

✲ ✲ ✲

بیت الریاض (۱) اور بیت الریاض (۲) کی صرف دیوار سے دیوار ہی نہیں ملی ہوئی تھی بلکہ دل سے دل بھی جڑے ہوئے تھے اور یہ (۱) اور (۲) بھی احد اور سعد نے کندہ کروایا تھا کہ ہماری طرح یہ بھی جڑواں ہیں۔

ابراہیم ریاض کی موت کے بعد بیگم فاطمہ ریاض کا اثاثہ یہ تینوں بیٹے ہی تھے۔ سب سے بڑے عمر ریاض پھر احمر ریاض اور چھوٹے عدیل ریاض۔ بیٹیوں کی کمی کو بڑی دونوں بہوؤں فائزہ اور ثنا نے پورا کر دیا تھا۔ عمر ریاض' بیت الریاض (۱) میں اپنی اہلیہ فائزہ اور تینوں بیٹوں احد' سعد اور فہد کے ساتھ رہتے تھے۔ احد اور سعد دونوں جڑواں تھے اور دونوں کی پیدائش میں صرف ڈھائی منٹ کا فرق تھا۔ مگر چونکہ سعد اپنی پیدائش کے بعد کافی بیمار رہا تھا اس لیے وہ احد سے ڈھائی سال چھوٹا ہی لگتا تھا اور تعلیمی لحاظ سے بھی دو سال پیچھے تھا۔ احد ماس کمیونی کیشن کے چوتھے سال میں تھا اور بحیثیت (Internee) انٹرنی ایک معروف چینل میں نیوز اینالسٹ کے طور پر بھی کام کر رہا تھا۔ جبکہ سعد بی ایس سی کر رہا تھا اور فہد ان دونوں سے چار سال چھوٹا تھا اور میٹرک میں تھا۔ ماہرہ تو اسے اکثر کھرچن کہتی تھی۔

احمر ریاض' بیت الریاض (۲) میں رہتے تھے۔ اپنی اہلیہ ثنا اور اکلوتی بیٹی ماہرہ کے ساتھ ماہرہ مقامی گرلز کالج سے بی کام کر رہی تھی۔ چھوٹے بیٹے عدیل ریاض دس سال سے سان فرانسسکو میں تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ نئی جنریشن کو بس اتنا ہی پتا تھا کہ وہ اپنی منگیتر صوفیہ سے بے حد محبت کرتے تھے جو ان کی کلاس فیلو بھی تھی اور شادی کے بعد دونوں کا ارادہ باہر جا کر ایم ایس کرنے کا تھا۔ مگر شادی سے صرف دو مہینے قبل ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی موت ہو گئی اور وہ اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ بعد میں یہ ملک ہی چھوڑ دیا اور پردیس جا بسے۔

بیگم فاطمہ ریاض جنہیں ینگ جنریشن دادی کہتی

تھی ان کا ہولڈ بیت الریاض (۱) اور (۲) پہ ہی نہیں بلکہ امریکہ تک تھا۔ اپنے وقتوں میں انہوں نے بی اے کیا تھا جو ان کے زمانے میں بڑی تعلیم مانی جاتی تھی اور کافی عرصے تک وہ ایک مقامی اسکول میں اردو کی استاد بھی رہی تھیں۔ چھ مہینے وہ پاکستان میں اور چھ مہینے وہ عدیل کے ساتھ گزارتی تھیں۔ بقول احد کے دادی تو اوباما سے بھی زیادہ پاور فل ہیں۔ مگر اس دفعہ دادی کا امریکہ میں رہنے کا دورانیہ کافی طویل ہو گیا تھا۔ دو سال سے وہ پاکستان نہیں آئی تھیں۔ دادی جب پاکستان میں ہوتی تھیں تو بیت الریاض (۱) میں رہتی تھیں تاکہ اپنے تینوں پوتوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکیں اور جب امریکہ جاتیں تو اسکائپ (Skype) کے ذریعے کبھی ماہرو سے اور کبھی اپنی بہوؤں سے ایک ایک چیز کی رپورٹ لیتیں۔ گو کہ ماہرہ بھی احد' سعد اور فہد کے ہر کام اور ہر راز میں شریک ہوتی تھی۔ مگر اکلوتی ہونے اور پھر لڑکی ہونے کی وجہ سے اکثر صاف بچ نکلتی اور دادی کی مشیرہ خاص بن کر ہر خبر ان تک پہنچا دیتی اور دادی کی سزائیں ہمیشہ انوکھی ہوتی تھیں۔ انہوں نے بیت الریاض (۲) کے لاؤنج کی راہداری میں ایک نوٹس بورڈ لگا رکھا تھا۔ جس پر ان چاروں کی غلط سرگرمیوں' ان پر دی جانے والی سزاؤں اور روک دی جانے والی امداد کا احوال درج ہوتا تھا۔ اس معاملے میں نہ تو عمر ریاض اور احمر ریاض دخل دیتے تھے اور نہ ہی ثنا اور فائزہ۔ کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ ان کے بچے صحیح ہاتھوں میں ہیں۔

اس دفعہ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ ماہرہ کو انٹر کالجیٹ اردو مباحثے کا پہلا انعام ہر حال میں جیتنا تھا کیونکہ اس کے ساتھ زوہا خاور بھی حصہ لے رہی تھی جس سے ماہرہ کی کبھی نہ بنی تھی۔ تقریر کے لیے اس نے احد اور سعد دونوں کی مدد چاہی۔ مگر دونوں اپنے اپنے کاموں میں بھول گئے۔ جب یاد آیا تو گھڑی بارہ بجا رہی تھی۔ لگاتار جمائیوں کے درمیان احد سے جو بن پڑا اس نے لکھ دیا۔ ماہرہ کی اردو ویسے ہی کمزور تھی۔ جب ایک بجے رات کو تقریر اس کے ہاتھ میں آئی تو اسے یاد ہی نہ ہوئی اور زوہا خاور جیت گئی۔ نتیجتاً" ماہرو نے احد اور سعد کی ایک ایک اگلی پچھلی شکایت ویب کیم کے ذریعے دادی تک پہنچا دی کہ احد سارا وقت فیس بک آن کیے رہتا ہے اور اسے اپنے جی پی اے (GPA) کو مینٹین (Maintain) رکھنے کی بالکل فکر نہیں ہے اور سعد اپنے پیپرز کے دوران بھی اپنی پانچ پانچ سمز (Sims) کے ساتھ ہمیشہ People) Connecting) کا اشتہار بنا رہتا ہے۔ اگر آپ مزید دو سال نہ آئیں تو ان دونوں کا اللہ ہی حافظ ہے وغیرہ وغیرہ۔

اگلے ہی دن دادی نے امریکہ سے بیٹھے بیٹھے بس اک فون کر کے بڑی بہو فائزہ سے کہہ دیا کہ لاؤنج کے نوٹس بورڈ پر لگا دو کہ نصیر دو ہفتے کی چھٹی پر ہے لہٰذا اس کے حصے کا سارا کام احد اور سعد سنبھالیں گے اور سعد

کی ساری سمز (Sims) ضبط کرلو اور دونوں کو بتا دو جب تک کہ رزلٹ بہترین نہیں آ آتا نہ تو احد کو سونفٹ خریدنے کے لیے مجھ سے پیسے ملیں گے اور نہ ہی سعد کو آئی فون ملے گا۔ دیٹس مائی آرڈر۔۔۔ اور یوں ان پر دفعہ تین سو دو نافذ ہو گئی۔ مگر وہ احد ہی کیا جس کے پاس ہر تالے کی چابی نہ ہو اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☼ ☼ ☼

کمرے کے دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ ماہرہ کے ہاتھ کی بورڈ پر تیزی سے چل رہے تھے۔ دستک سن کر وہ ایک منٹ کے لیے رکی اور پھر کون ہے۔ آجاؤ، کہہ کر دوبارہ مصروف ہو گئی۔

"ماہی آپی۔" فہد اندر داخل ہوا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے نروٹھے پن سے کہا۔ ماہرہ کا آج کل تینوں احد برادرز سے بائیکاٹ تھا۔

"یہ آپ کے لیے۔" اس نے ایک گفٹ بڑھایا۔ مگر جب ماہرہ نے ہاتھ آگے نہ کیا تو اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"احد بھائی نے بھیجا ہے۔" اس نے جھکتے ہوئے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ماہرہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ اس پر ہی الٹا دیتی۔ اس کے جانے کے بعد ماہرہ کمپیوٹر چھوڑ کر بیڈ تک آئی اور گفٹ کھولنے لگی۔ اندر ایک سوری کا کارڈ تھا۔ ساتھ اپنی ایک تصویر جس میں وہ مسکرا رہا تھا ایک کٹ کیٹ (Kit Kat) چاکلیٹ کا پورا ڈبا تھا۔ اس نے ڈبا نیچے رکھا اور کارڈ کھولا۔ اندر لکھا تھا۔

"Smile and sorry can settle everything-"

(مسکراہٹ اور معذرت سے ہر چیز سنور جاتی ہے)

"اونہوں۔ اس دفعہ میں اس فارمولے کے جھانسے میں نہیں آنے والی احد صاحب! سنبھالیں دادی کی دی ہوئی سزا۔ نصیر کی ذمہ داری، ڈرائیونگ، گارڈننگ اینڈ کچن کیئرنگ۔" اس نے وہ پورا گفٹ اٹھایا اور آندھی طوفان کی طرح بیت الریاض (ا) پہنچی۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔ غصے میں لال بھبوکا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو؟ میں گفٹ لے کر دادی سے تمہاری سفارش کر دوں گی اور اس سعد کے بچے کی بھی جو تمہارا جڑواں بھائی بننے کی پوری کوشش کرتا ہے۔"

"مائی ڈیئر کزن وہ میرا جڑواں بھائی بننے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ غلطی سے ہے اور رہی بات گفٹ کی تو ٹھیک ہے مت لو۔ میں تو بس یہ دے کر صلح کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ تم بھی ہمارے ساتھ پکنک پر چلو۔ خیر سوچ لو احد نے اسے سوچنے پر اکسایا۔

"کامکس (Commecs) کی پکنک ہو اور مزا نہ آئے۔ بخاری، کریسنٹ، عزیز تبہ اور وہ سارے سیکشن ہوں گے۔ اور پھر جو تفریح ہو گی قسم سے مزا آجائے گا۔" احد کا انداز بڑا ڈرامائی تھا۔ اگرچہ کہ وہ اب یونیورسٹی میں تھا اور سعد بھی دوسرے کالج سے گریجویشن کر رہا تھا۔ مگر وہ اپنے انٹر کالج کے بیسٹ بوائز رہ چکے تھے اور اب بھی پابندی سے اپنے پرنسپل سے ملنے جاتے تھے اس لیے ہر سال کی طرح اس بار بھی انہیں پکنک پر جانے کے لیے انوائٹ کیا گیا تھا۔

احد یہ بات جانتا تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد ماہرہ کا کامکس (Commecs) میں جانے کا کتنا دل تھا۔ بلکہ اس نے تو ہر صورت دادی کو قائل کرنا چاہا تھا۔ مگر دادی ہرگز نہ مانی تھیں اور گرلز کالج میں ہی اس کا داخلہ کروایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس حقیقت سے اب تک بے خبر تھی کہ Commecs میں داخلہ نہ ہونے کی وجہ احد اور سعد ہی تھے کیونکہ وہ دونوں ہی نہیں چاہتے تھے کہ ماہرہ وہاں آئے اور گھر کی طرح کالج کی بھی ایک ایک بات دادی کے گوش گزار کر کے ان کی چغلیاں کھائے۔

"واؤ کامکس (Commecs) کی پکنک میں بھی

چلوں گی۔" وہ ایک منٹ میں ساری ناراضی بھول چکی تھی۔

"مگر دادی۔ وہ کیسے مانیں گی؟" ماہرہ نے منہ بسورا۔

"ان کو پتا چلا تو وہ ناراض ہو جائیں گی کہ میں تم لوگوں کے ساتھ پکنک پر گئی۔"

"یہ ٹاپ سیکرٹ ہے جو ہم دادی کو نہیں بتائیں گے۔ مگر اس سے پہلے تم دادی سے سفارش کر کے ہماری سزائیں ختم کرواؤ۔" احد فوراً مطلب پہ آیا۔

"اوکے۔ مگر میرا پکنک پر جانے کا دادی کو پلیز مت بتانا۔" اس نے ملتجی لہجے میں کہا اور احد مسکرا دیا۔

"بالکل نہیں بتاؤں گا۔ یہ راز تو مرتے دم تک میرے سینے میں رہے گا۔"

"اب تو تمہیں میری سوری اور اسمائل قبول ہے نا۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ایکٹنگ کی۔ ماہرہ نے گردن ہلائی۔

"اوکے تو پھر اپنا گفٹ لیتی جاؤ۔" احمد نے دوبارہ آگے بڑھ کر کارڈ اور چاکلیٹ کا ڈبا اس کی سمت بڑھایا۔ ماہرہ نے گفٹ ہاتھ میں تھاما اور بیت الریاض (۲) کی طرف دوڑ لگائی وہ اسکائپ (Skype) آن کر کے آئی تھی۔ اب تک تو دادی آن لائن آچکی ہوں گی۔ اب Commecs کی پکنک اٹینڈ کرنے کے لیے تو ان دونوں کی تعریفیں کرنی ہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"یار سعد اگر پیسے لے لیے ہوں تو میرا والٹ واپس کرو۔" احد نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے سعد سے کہا۔ جو جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا۔ سعد اسے دیکھ کر مسکرایا اور والٹ احد کی طرف اچھال دیا۔ احد نے فوراً "کیچ کیا۔

"آرام سے یار میری جان بند ہے۔ اس میں۔" احد نے کھول کر دیکھا اور پھر مسکرا کر پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"ہاں پیارے جانتا ہوں۔ تمہاری حسینہ عالم کی

تصویر ہے اس میں۔ ویسے کیا واقعی تم اس کے لیے سیریس ہو۔" سعد نے بال بناتے ہوئے آئینے میں دیکھ کر احد کو مخاطب کیا۔

"سو فیصد۔ احد عمر کوئی بھی فیصلہ صرف ایک بار لیتا ہے۔" احد نے ٹھوس لہجے میں کہا اور سعد اسے گڈ لک کا سائن دکھاتا ہوا باہر نکل آیا۔ بائیک اسٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ ماہرہ چلی آئی۔ وہ کالج یونیفارم میں ملبوس تھی۔

"سعد کالج جا رہے ہو؟"

"ڈیئر کزن۔ اس وقت نائٹ کلب تو جانے سے رہا۔" وہ بھی آخر سعد تھا۔

"تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔ میری وین نہیں آئی۔ اس لیے ادھر چلی آئی۔" ماہرہ بھی چڑ گئی۔

"تمہارا کالج تو میرے روڈ میں نہیں پڑتا۔ ایسا کرو احد کے ساتھ چلی جاؤ۔ ایک گھنٹے سے اندر تیار ہو رہا ہے۔" سعد نے اسے مشورہ دیا اور یہ جا وہ جا۔

ماہرہ احد کے کمرے میں دستک دے کر آئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ ماہرہ کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر ہی دھرا رہ گیا۔ نک سک سے تیار کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ کوئی دھڑکن جیسے مس ہوئی تھی۔ آج سے پہلے تو احد اسے اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ تو بچپن سے ہی اپنے ان سارے کزن کے ساتھ کھیلتی آ رہی تھی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ سعد کی نسبت وہ احد سے زیادہ قریب تھی کہ وہ اس کی کافی کیئر کرتا تھا۔

اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ بچپن میں کافی نک چڑھی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر منہ پھلا لیتی تھی۔ مگر احد ہمیشہ اسے سوری اور اسمائل کے ساتھ ایک چاکلیٹ کا ڈبا دے کر منا لیتا تھا۔

اس کے بعد بھی گزرتے ہوئے لمحوں میں کوئی مسئلہ آیا، اسکول کا ہوم ورک ہوتا، کوئی اسائنمنٹ یا تقریری مقابلہ۔ اسے احد سے زیادہ کوئی قابل اعتماد نہ لگتا۔ مگر جیسے احساسات آج تھے پہلے کبھی اس نے محسوس نہ کیے تھے۔

"ہیلو ڈیئر کزن۔ آؤ نا اندر۔ اسٹیچو کیوں بن گئیں۔ کیا زیادہ اچھا لگ رہا ہوں؟ نظر لگانے کا ارادہ ہے؟" احد نے شرارتی انداز سے کہا۔

"یہ تم پریزنٹیشن کے لیے جا رہے ہو یا بر دکھوے کے لیے۔" ماہرہ کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اتنا تیار ہو کے یونی ورسٹی جائے۔

"ماہرو جی۔ آپ کو کیا پتا یہ پریزنٹیشن بھی ایک طرح کا بر دکھوا ہی ہوتی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو؟ بڑے سے آڈیٹوریم میں سب ایک دوسرے کی تقریر سننے کے لیے جمع ہوتے ہیں ارے نہیں اس کام کے لیے تو ہمارے سیاستدان ہی کافی ہیں۔ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس میں کتنا ڈریسنگ سینس ہے۔ بالوں کا کون سا اسٹائل اپنایا ہوا ہے۔ کھڑے ہونے کا انداز کیسا ہے؟ کیا سمجھیں..... خیر یہ بتاؤ کیسے آئی ہو؟" وہ مکمل تیار ہو چکا تھا بائیک کی چابی اٹھاتے ہوئے پوچھا اور ماہرہ جو پریزنٹیشن پر دی گئی احد کی لاجک پر اش اش کر رہی تھی اسے یاد آیا کہ وہ کالج جانے کے لیے یہاں آئی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ۔ احد مجھے کالج جانا ہے۔ پلیز چھوڑ دو۔" اس نے کہا اور احد نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"یہ کیا ماہرو پلیز ایسے نہ بیٹھو۔ تم ٹام بوائے ہی ٹھیک ہو۔" آج پہلی بار اسے احد کی قربت سے جھجک ہو رہی تھی۔ وہ دونوں پیر ایک طرف کر کے خواتین کے انداز میں سمٹ کر بیٹھنے لگی تو احد نے ٹوک دیا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ مردانہ انداز میں بائیک پر بیٹھتی تھی۔ ایک پیر ایک طرف اور دوسرا پیر دوسری جانب اور اپنی انگلیاں احد کے کندھوں میں گھسا دیتی تھی کہ وہ ہمیشہ تیز بائیک چلاتا تھا۔ احد کے کہنے پر اسے ویسے ہی بیٹھنا پڑا۔

"کچھ دن کی بات ہے پھر میرے ساتھ سونفٹ میں بیٹھا کرنا۔" وہ احد کی شخصیت کے سحر میں کھوئی جا رہی تھی۔ جب احد نے اسے مخاطب کیا اور بائیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی احد اپنی چوائس کبھی نہیں بدلتا۔ جو سوچ لیتا ہے وہ کرتا ضرور ہے۔ اس کا یہ مانا تھا کہ چاہ کوئی بھی ہو ایک نہ ایک دن پوری ہو جاتی ہے۔

"جانے میں احد کی چوائسز (ترجیحات) میں ہوں بھی یا نہیں۔" ماہرہ کے اندر احد کے ساتھ کی خواہش ابھرنے لگی تھی۔ پھر کالج بھی آ گیا اور وہ اندر بھی چلی گئی مگر احد کا خیال سارا وقت ساتھ ساتھ رہا۔

☼ ☼ ☼

ہر ویک اینڈ پر رات کا کھانا عمر ریاض کے گھر ہوتا تھا۔ اس وقت بھی سب بیت الریاض (ا) میں جمع تھے۔

"آپ سب لوگوں کے لیے ایک خوشخبری ہے۔" عمر ریاض نے کھانے کے دوران سب کو ایک نظر دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔ انداز ایسا تھا کہ جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔

"پرسوں کی فلائٹ سے اماں بی آ رہی ہیں۔" عمر ریاض نے دھماکہ کیا اور سب کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی۔ یہ تو واقعی ہی خوشخبری تھی۔ گھر کا ہر شخص اماں بی سے بہت محبت کرتا تھا۔

"ان کے ساتھ ایک سرپرائز بھی ہے۔" عمر ریاض نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ اور ڈائننگ ٹیبل پر مختلف آوازیں ابھرنے لگیں۔

"یہ سب مجھے نہیں پتا۔ مگر اب جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ آپ چاروں سے متعلق ہے۔" عمر ریاض نے احد، سعد، فہد اور ماہرہ کو مخاطب کیا۔

"ماہرہ، اماں بی کی ہدایت ہے کہ نوٹس بورڈ کو اپ ڈیٹ کیا جائے انہیں آپ چاروں کی کارکردگی جاننی ہے۔" عمر ریاض نے ماہرہ کو مخاطب کیا اور ان تینوں کا منہ اتر گیا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ دادی ان کی زندگی سے اس نوٹس بورڈ کو بے دخل کر دیں۔ سب سے زیادہ تو سعد چڑتا تھا۔ بقول اس کے جو بیت گیا، سو بیت گیا۔ ان کے گھر تو جو بھی مہمان آتا وہ یہ نوٹس بورڈ پڑھتا بھی ضرور تھا۔ گھر نہ ہو گیا گویا اسکول ہو گیا۔

کھانے کے بعد تو پھر چاروں بڑے، چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ مگر یہ چاروں اسی سوچ میں الجھے تھے کہ آخر سرپرائز ہے کیا۔ جس کی وجہ سے دادی دو سال تک پاکستان نہیں آئیں۔ مگر جواب تو دادی کے آنے پر ہی مل سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماہرہ ڈیئر سارا کچھ ہمارے بارے میں ہی نہ لکھو۔ اپنا بھی تو بتاؤ۔ جولائی میں جو فہد کی برتھ ڈے پر کیک بنایا تھا وہ اتنا سخت تھا کہ بس ڈرون حملے ہی سہنے کا کام کر سکتا تھا حالانکہ دادی نے تمہیں وارننگ دی تھی کہ ان کے واپس آنے تک تمہیں بیکنگ میں طاق ہو جانا چاہیے۔" جب ماہرہ نے چوتھی بار بھی سعد کی پروگریس رپورٹ میں ایک اور سرگرمی لکھ کر کراس (X) کا نشان لگایا تو وہ چڑ گیا۔

"اچھا تو ذرا یاد کر کے بتاؤ تم نے دادی کے آسٹریلین برڈز کا خیال رکھا تھا۔ جس کی وہ تمہیں بطورِ خاص ہدایت دے کر گئی تھیں۔ ان کا خیال بھی میں۔۔۔ اور فہد ہی رکھتے تھے۔" ماہرہ نے حساب برابر کیا۔

"ایسی بات ہے تو پھر احد کا بھی لکھو کہ اس نے ایک دن بھی اپنا کمرہ خود صاف نہیں کیا یا تو نصیر کرتا تھا یا پھر میں اور اگر ہم دونوں نہ کریں تو ای کرتی تھیں۔" سعد کا احتجاج برقرار تھا۔ کیونکہ واحد اس کے نام کے آگے آٹھ کراس تھے۔ جبکہ احد کے پانچ، ماہرہ اور فہد کے تین تین تھے باقی سب اسٹارز تھے۔

"ارے بچوں اب ایک دوسرے کے بخیے ہی ادھیڑتے رہو گے یا ایئرپورٹ بھی چلو گے۔" ماہرہ کی امی ثنا ان کے پاس چلی آئیں۔ ماہرہ جلدی جلدی احد کی سرگرمی کا اندراج کرنے لگی۔

"تم میرا کمرہ نہیں صرف میرے والٹ پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔ آئی سمجھ بیٹا سعد۔" احد نے اسے باہر کی طرف دھکیلا، جس کی وجہ سے احد کی رپورٹ میں بھی ایک اور کراس کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"اچھا اگر والٹ کی بات کی تو حسینہ عالم کا ذکر بھی آ سکتا ہے۔" وہ بھی آخر سعد تھا۔ اور حسینہ عالم کے ذکر پر ماہرہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کس کا ذکر کر رہے ہو تم دونوں۔" ماہرہ نے دونوں کو گھورا۔

"کچھ نہیں ماہرہ ڈیئر۔ یہ سعد ہمیشہ بھول جاتا ہے۔ اس کو یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں اس سے ڈھائی منٹ بڑا ہوں۔ میرا ادب کیا کرے۔" احد نے چلتے ہوئے اس کے پیر پر پیر مارا۔ گویا وہ ڈھائی منٹ نہیں بلکہ ڈھائی سال بڑا ہو۔ سعد صرف کراہ کر رہ گیا۔

"اب کراہنا بند کرو اور ای اور فہد کو اپنی گاڑی میں ایئرپورٹ لے جاؤ میں ماہرہ اور چچی کو لاتا ہوں۔" احد اسے آرڈر سنا کر ماہرہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے نکل گیا۔ مبادا سعد جلن کے مارے ماہرہ سے لگائی بجھائی نہ کر دے۔

ایک گاڑی عمر ریاض نے آفس سے بھجوا دی تھی جبکہ ایک گھر میں ہی موجود رہتی تھی۔ جب یہ قافلہ دو گاڑیوں میں بھر کے ایئرپورٹ پہنچا تو دادی کی فلائٹ آ چکی تھی۔ ان سب میں بس عمر ریاض اور احمر ریاض موجود نہ تھے کہ آج ان کی ایک ضروری بزنس میٹنگ تھی۔ سامان کی کلیئرنس کروا کے جب دادی باہر آئیں تو سب سے پہلے فہد نے ایک زوردار چیخ ماری۔

"ماہی آپی' احد بھائی دیکھیں۔ دادی کا سرپرائز۔" اور واقعی ان کے ساتھ ساتھ ایک بہت پیاری سی مغلی نقوش کی حامل' مگر مشرقی لباس میں ملبوس لڑکی چلی آ رہی تھی۔

"دادی کیا آپ نے سیکریٹری رکھ لی۔" جیسے ہی دادی قریب آئیں سلام دعا اور گلے ملنے کے مراحل کے بعد سب سے پہلے سعد کی زبان میں کھجلی ہوئی فائزہ بیگم نے اسے ایک ٹھوکا دیا۔

وقت دیکھتا تھا نہ موقع محل بس شروع ہو جاتا تھا۔ دادی فقط مسکرا دیں۔

"میرا خیال ہے عدیل چاچو نے شادی کر لی ہے۔ ہے نا دادی۔ اس سال کا سب سے بڑا سرپرائز تو یہی ہو سکتا ہے۔" اب کے ماہرہ نے اپنا اندازہ ظاہر کیا اسے سو فیصد یقین تھا کہ یہی بات ہے اور فہد بھی زور زور سے گردن ہلانے لگا گویا متفق ہو۔ ان سب میں ایک احد تھا جو اب تک خاموشی سے دادی کے برابر میں کھڑی لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ خاص بات تھی اس کے چہرے پر۔

"بھئی جس طرح تم لوگ میرے پوتا پوتی ہو اور مجھے دادی کہتے ہو۔ اس طرح یہ بھی میری پوتی ہے۔ اور مجھے گرینی کہتی ہے۔" دادی نے اسے محبت سے گلے لگایا۔

"واہ دادی۔ پاکستان میں آپ دادی اور امریکہ جاتے ہی گرینی۔" فہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور سب ہنس پڑے۔ ان سب میں سب سے پہلے احد آگے بڑھا۔

"ہاؤ آر یو۔ آئی ایم احد۔"

"السلام و علیکم۔ میں عائشہ ہوں اور میں اچھی طرح جانتی ہوں آپ احد ہیں' یہ سعد' فہد اور یہ ماہرہ۔ آپ سب لوگوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے" عائشہ نے باری باری ان چاروں کی طرف اشارہ کر کے متانت سے کہا اور احد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنی صاف اردو سن کر۔ جبکہ سعد' ماہرہ اور فہد اپنی جگہ شرمندہ تھے کہ سعد اسے دادی کی سیکریٹری اور ماہرہ اسے عدیل چاچو کی وائف کہہ چکی تھی اور شرمندہ تو اپنی اپنی جگہ فائزہ اور ثنا بھی تھیں کہ عائشہ کیا سوچ رہی ہوگی کہ کتنے آؤٹ اسپوکن ہیں سب کے سب۔

"کیسی لگی تم لوگوں کو عائشہ اور عائشہ کی اردو۔ یہ وہ سرپرائز ہے جس پر میں نے پچھلے چھ مہینے محنت کی ہے۔" دادی نے تفاخر سے کہا۔ عائشہ کا لہجہ اور اردو دونوں ہم آہنگ تھے کہیں بھی انگریزی زدہ لہجے کی رمق نہ تھی۔ دادی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی بھی اردو کی استاد رہ چکی ہیں۔ سب نے دادی کو وکٹری کا نشان دکھایا۔ دادی اور عائشہ کا سامان احد نے اپنی گاڑی میں رکھا اور باقی سب سعد کی گاڑی کی طرف چل دیے ماہرہ نے پلٹ کر ایک ثانیے کے لیے دیکھا۔ احد فرنٹ ڈور کھولے عائشہ کے اندر بیٹھنے کا منتظر تھا۔ ماہرہ کے اس وقت عجیب سے احساسات تھے جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی اور پھر بعد میں بھی اس کی یہی کیفیت رہی۔

رات کے کھانے پر سب لوگ بیت الریاض (ا) میں تھے۔ سارا کھانا فائزہ اور ثنا نے بنایا تھا جب کہ کیک اور سویٹ ڈش ماہرہ کے ہاتھ کا کرشمہ تھی۔ دادی عمر ریاض اور احمر ریاض سے ان کے بزنس کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ پھر نصیر کو اپنے پاس بلایا جو کھانے کے وقت الرٹ کھڑا تھا تاکہ کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے۔

"کیسی ہے تمہاری بیٹی' کیا نام رکھا ہے؟" نصیر یہ سن کر شرما گیا۔

"جی اچھی ہے بہت۔ زلیخا پر گئی ہے اور جی نام تو ماہرہ بی بی نے بتایا تھا وہ رکھا ہے نادیہ نصیر۔" وہ شرماتے ہوئے بتانے لگا۔

"واہ نام تو بڑا پیارا ہے۔" دادی مسکرائیں۔

"ایک کام کرو نصیر وہاں نہ کھڑے رہو ایک اور کرسی لے آؤ اور ادھر آرام سے بیٹھ کر ہمارے ساتھ کھاؤ۔" دادی نے کہا اور نصیر نہ مانا حالانکہ وہ سب سے بہت بے تکلف تھا احد سے کوئی چار پانچ سال ہی بڑا تھا۔

"چلو پھر آرام سے کچن میں بیٹھ کے کھا لو۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ماہرہ لے آئے گی۔" دادی نے کہا اور نصیر سعادت مندی سے کچن کی طرف چل دیا۔

"اماں جی کیا عدیل کا اس دفعہ بھی پاکستان آنے کا دل نہیں ہے؟" عمر ریاض نے ماں کو مخاطب کیا۔

"کیا کہوں بیٹا بہت فخر محسوس کرتی ہوں جب تم لوگ میری ہر بات مانتے ہو اور خود عدیل بھی بہت فرماں بردار ہے۔ مگر بس جب بھی پاکستان چلنے کا کہوں خاموش ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے ماں۔ یہاں کی مشینی زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔ وہاں جاؤں گا تو ایسا نہ ہو کہ پھر سے جذبات زندہ ہو جائیں۔" بیگم فاطمہ ریاض نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

ان کا بھی بہت دل چاہتا تھا کہ ان کے سب بچے ایک ساتھ ایک جگہ ہوں مگر جوان اولاد پر بھلا کس کا بس چلتا ہے۔ بس اسی لیے ہر سال خود ہی مل آتی تھیں۔ ماحول تھوڑا بوجھل ہو گیا تھا۔ ماہرہ نے دادی کی توجہ اپنے بنائے ہوئے کیک کی طرف کر لی۔ دادی نے ماہرہ کو "شاندار" کا اشارہ کیا اور ماہرہ نے وہیں اپنی جگہ بیٹھے احد اور سعد کو انگوٹھا دکھایا جو اس کے کیک کو ہمیشہ ڈرون حملوں سے بچنے کا ہتھیار کہتے تھے۔

مجھ سے کہے اک جل پری
ڈوب جانے دو جل میں کہیں
سو جانے دو چھپ جانے دو
لہروں میں کہیں ڈوب جانے دو
شور نہ کرو یارو' آنکھ ہے لگی
بہل جانے دو یارو جل میں کہیں

رات کے کھانے کے بعد جب سبز چائے کا دور چلا تو احد نے اپنے گٹار پر دھن چھیڑی دی اور دادی کو مخاطب کر کے کہا۔

"دادی یہ خاص طور پر آپ کے آنر میں ہے۔" دادی فقط مسکرا دیں مگر سعد اور فہد پیچھے پڑ گئے کہ ہم سب سمجھتے ہیں دادی کے آنر کا تو صرف یہ بہانہ ہے اصل میں تو عائشہ کو متاثر کرنا ہے۔

ان سب میں ایک ماہرہ تھی جو قدرے چپ سی تھی۔ دادی وہاں سے سب کے لیے گفٹ لائی تھیں۔ عائشہ کی مدد سے انہوں نے سب کو گفٹ دیے۔ دادی نصیر اور اس کے بیوی بچی کے لیے بھی تحائف لائی تھیں۔ سب عائشہ کے گرد گھیرا ڈالے اس سے چھوٹے چھوٹے سوالات کر رہے تھے۔ وہ تھوڑی کم گو تھی۔ اس لیے ہر بار دادی کی طرف مدد کے لیے دیکھتی۔ دادی نے سب کو بتایا۔

"ابھی چھ مہینے تک تو عائشہ یہاں ان کے ساتھ ہے۔ وہ ایک سوشل ریفارمنگ سینٹر میں وہاں کام کرتی ہے جو یونیسف سے وابستہ ہے۔ وہ پاکستان بھی اسی سلسلے میں آئی تھی کہ یہاں کی شرح پسماندگی کی ایک حقیقی تجزیاتی رپورٹ یونیسف کو بھیجی جا سکے۔" اسی کے ساتھ دادی نے احد کو یہ ذمے داری سونپی کہ اس سلسلے میں وہ عائشہ کی ہر ممکن مدد کرے کیونکہ وہ خود بھی نیوز اینالسٹ ہے اور اس کا سبجیکٹ بھی ماس کمیونیکیشن ہے۔ احد نے دادی کی اس ذمہ داری پر سر

تسلیم خم کیا اور عائشہ کے قدرے قریب ہو کے اس سے بات کرنے لگا۔ ماہرہ بظاہر دادی کی طرف متوجہ تھی جو اب ثنا اور فائزہ کو عائشہ کے متعلق بتا رہی تھیں۔ اس نے چاہا کہ وہ سنے دادی کیا کہہ رہی ہیں مگر سارا دھیان گویا احد اور عائشہ پر آ کے ٹک گیا۔ جو دھیرے دھیرے نہ جانے کیا بات کر رہے تھے یا شاید پروجیکٹ کے سلسلے میں۔ ماہرہ سے دیکھا نہ گیا وہ چائے کے کپوں کو اٹھانے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماہرہ۔ یہ کپ بھی لے لو۔" احد نے آواز لگائی۔ وہ اس کو اپنا اور عائشہ کا کپ دے رہا تھا۔

"ارے نہیں ماہرہ! رہنے دو میں خود رکھ دوں گی۔" عائشہ شرمندہ سی ہوئی کہ سب اسے یہاں اتنا پروٹوکول دے رہے تھے۔ اسے کہاں عادت تھی اس چیز کی۔

"ارے عائش دے دیجیے نا۔ کبھی کبھی تو ماہرہ کام کرتی ہے۔" احد نے شرارت سے کہا یہ اور بات تھی کہ وہ اس کا شرارتی انداز محسوس نہ کر سکی۔ اس کی سوئی تو عائش کہنے پر ہی ٹک گئی تھی۔ اس نے احد کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"اتنی بے تکلفی..... مجھے تو کبھی ماہی نہ کہا۔" کچن میں آ کے بھی وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی اور کپوں کو پٹخ پٹخ کے دھو رہی تھی کہ احد چلا آیا۔

"ارے ماہی ڈیئر! اتنے پٹخ پٹخ کر دھوؤ گی تو چار دن بھی نہ چلیں گے۔ جب کہ امی تو یہ چاہتی ہیں کہ ان کے بہو کے آنے تک تو ان کے جہیز کے برتن ساتھ دیں۔" وہ سراسر مبالغہ آرائی سے کام لے رہا تھا۔ ماہرہ نے مزید اس کی طرف سے منہ موڑ لیا اور یوں کپ دھونے لگی کہ جیسے اس سے زیادہ کوئی اہم کام ہی نہ ہو اس وقت۔

"میں نے عائشہ کو عائش اس لیے کہا تاکہ وہ یہاں ہمارے درمیان ایزی فیل کرے، ہمارے گروپ کا ایک حصہ بن کر۔" احد نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔ ماہرہ حیران تھی کہ احد اس کی نگاہ کیسے پڑھ گیا۔

"تم منہ پھلا کے ہمارے گھر سے جاؤ گی تو مجھے رات بھر نیند نہ آئے گی۔ یہ لو چاکلیٹ۔" احد نے پینٹ کی جیب میں سے ڈارک چاکلیٹ نکالی۔ ڈارک چاکلیٹ کا ریپر اتارا اور اس کی سمت بڑھایا۔ "یو نو نا۔"

"Smile and sorry can settle every thing"

ماہرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پلیز مسکرا دو نا۔" احد نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

"یہ ہوئی نا بات۔ اب سنو ایک مزے کی خبر۔ ابھی باتوں باتوں میں میں نے پتا لگایا کہ عائشہ کو کس چیز سے ڈر لگتا ہے۔" ماہرہ نے آنکھیں پھاڑیں۔ یعنی "جوک آف دا ایئر" اف بے چاری عائشہ اس کا شکار بننے والی تھی۔

"اندھیرے سے۔" احد کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔

"نہیں احد دادی ناراض ہو جائیں گی۔" ماہرہ کو دادی کی ناراضی کا ڈر تھا۔

"فکر نہ کرو۔ اتوار کو تمہارے افضل ماموں کے گھر دعوت ہے اور ساری اولڈ پارٹی وہیں جائے گی۔ بس وہی دن ہمارے "جوک آف دا ایئر" کا ڈے ہو گا اور ابھی اتوار آنے میں دو دن باقی ہیں۔" جب سعد اور فہد کو پتا چلا تو وہ بھی پرجوش ہو گئے۔ ہر سال کسی نہ کسی کی شامت ضرور آتی تھی یہ اور بات کہ اولڈ جنریشن اس بات سے بے خبر رہتی تھی۔ ماہرہ ابھی بھی تذبذب کا شکار تھی۔ سب نے ماہرہ کو وارننگ دی اگر غلطی سے بھی دادی کی مشیرِ خاص بننے کا فریضہ سرانجام دیا تو وہ تمہارا گروپ میں آخری دن ہو گا۔ پھر تو ماہرہ کو چپ کرتے ہی بنی۔

☼ ☼ ☼

اگلا دن عام دنوں کی ہی طرح تھا۔ مگر عائشہ کو بہت روشن اور چمکیلا لگ رہا تھا۔ دادی نے محسوس کیا کہ وہ یہاں آ کے بے حد خوش ہے۔ انہیں وہ عائشہ یاد آئی جو اسلامی ریسرچ سینٹر سے ملحقہ مسجد کی سیڑھیوں پر علی الصبح، فجر کے وقت اپنے وجود سے بے گانہ ملی تھی

انہوں نے سوچنا چاہا کہ وہ کتنی بڑی ہو گی۔ یہی کوئی احد سے تین یا چار سال بڑی۔ مگر اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے کتنے دکھ جھیل لیے تھے۔ دادی یہاں اسے آسودہ دیکھ کر بے حد مطمئن تھیں۔

ماہرہ کے اگلے ہفتے سے بی کام فائنل کے پیپرز شروع ہونے والے تھے وہ اس لیے آج کل گھر پر تھی تاکہ آرام سے امتحانات کی تیاری کر سکے مگر یہ اور بات تھی کہ کسی نے ابھی تک اسے کتاب لے کر اسٹڈی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے عائشہ سے کہہ دیا تھا کہ میں ایک ہفتے تک تمہیں مزے کراؤں گی۔ پھر تم اپنا ریسرچ ورک کرنا اور میں اپنے امتحانات کی تیاری۔ اس وقت بھی وہ عائشہ کے ساتھ تھی۔ پہلے اس نے عائشہ کو پورا بیت الریاض (۲) دکھایا۔ پھر (۱) میں لے چلی آئی (۱) اور (۲) کے پیچھے کیا کہانی ہے اس نے وہ بھی سنائی۔ احد اور سعد کے کمروں میں داخل ہو کے اس نے جس طرح کمنٹری کی اور برجستہ فقرے کہے اس سے پورا وقت عائشہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری رہی۔ پھر وہ لاؤنج سے ملحقہ راہداری میں آئی تو وہاں موجود نوٹس بورڈ کو دیکھ کر حیران رہ گئی، جب اسے پتا چلا کہ یہ ان چاروں کی سالانہ رپورٹ کا گوشوارہ ہے تو ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

"یقین جانو، عائشہ یہاں جب بھی مہمان آتے ہیں ادھر رک کر ضرور اسے پڑھتے ہیں اور خوب ہی ہنستے ہیں۔ سعد تو برملا کہتا ہے، جو اپنے گھر میں کئی دن سے نہ ہنسا ہو وہ ہمارے گھر آ جایا کرے۔" ماہرہ کے چہرہ پر بھی مسکراہٹ تھی۔

"واقعی ماہرہ! یہ بہت مزے کی چیز ہے۔ گریٹ از ریئلی نائس۔" عائشہ ابھی بھی ہنس رہی تھی۔ پھر ماہرہ اسے لان میں لے آئی۔ دونوں گھروں کے درمیان اندر کی جانب کچن کی طرف سے ایک دروازہ تھا جو آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسی طرح دونوں گھروں کے لان کے درمیان بھی صرف باڑھ تھی۔ لان میں ایک بڑا سا جھولا تھا۔ ماہرہ نے عائشہ کو جھولے پر بٹھا دیا اور پینگیں دینے لگی۔ ساتھ ساتھ اسے وہ واقعہ بھی سنا رہی تھی جب دادی نے نصیر کو چھٹی پر بھیج کر ساری ذمہ داری احد اور سعد کو سونپ دی تھی۔ وہ کہتی جا رہی تھی اور عائشہ کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

عائشہ کو ڈوبتا سورج بہت اچھا لگتا تھا وہ ماہرہ کے کمرے سے ملحقہ ٹیرس پر اپنا چائے کا کپ لیے سورج کے اوجھل ہونے کا نظارہ کر رہی تھی۔ آسمان پر پھیلے ہلکے ہلکے نارنجی رنگ آنکھوں کو بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ چائے ختم کر کے وہ ٹیرس سے واپس کمرے میں آئی تو بجلی چلی گئی۔

"اوہ..." اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ٹیرس سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی اس لیے کمرے میں اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھول کے راہداری میں آئی گھپ اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔

"اتنی خاموشی۔ ماہرہ، ماہرہ کہاں ہو؟" اس کو اپنا سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آ رہی تھی۔ جو اتنی ہی تاریک اور گھپ تھی جب زندگی کا واحد رشتہ اس سے الگ ہوا تھا۔ اور کسی کے بھیانک چہرے کا راز اس پر کھلا تھا۔ وہ راہداری کی دیوار پر ہاتھ رکھتی کھسکتی جا رہی تھی تاکہ کسی طرح یہاں سے باہر نکل جائے۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ واپس کمرے میں چلی جاتی۔ وہ اندازے سے ہاتھ آگے بڑھاتی جا رہی تھی کہ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کوئی مردانہ ہاتھ تھا۔

"ایش۔" ایک بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔ گریٹی، گریٹی۔" اس کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ مردانہ ہاتھ نے فوراً اسے چھوڑ دیا اور وہ اندھا دھند راہداری میں بھاگی اور کسی سے ٹکرائی۔ ایک دلخراش چیخ اس کے حلق سے نکلی۔

"دکر بنی، وہاں، وہاں کوئی ہے۔"

"عائشہ، اٹس می ماہرہ۔" ماہرہ نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ عائشہ اس کے گلے لگ کر سسک سسک کر رونے لگی اور اسی وقت لائٹ آن ہو گئی پر تب تک عائشہ اس کے ہاتھوں میں بے ہوش ہو چکی تھی۔

"او مائی گاڈ۔ احد، احد کے بچے فہد، سعد جلدی آؤ۔" ماہرہ کے چلانے پر وہ تینوں قریب آ گئے۔

"دیکھو اپنا جوک آف دا ایئر۔" اس نے عائشہ کا بے ہوش چہرہ ان کی نظروں کے سامنے کیا۔

"فہد بھاگ کے پانی لاؤ۔" سعد نے فہد کو اشارہ کیا۔ احد اور ماہرہ اسے اٹھا کے ماہرہ کے بیڈ روم میں لائے۔ عائشہ، ماہرہ کے ساتھ ہی بیڈ روم شیئر کرتی تھی۔ حالانکہ ماہرہ کی ای ثنا نے تو اس کے لیے الگ سے کمرہ تیار کیا تھا۔ مگر اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ اسے اکیلے سونے کی عادت نہیں ہے..... فہد پانی لے کر آیا تو سعد نے عائشہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹیں مارے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی دعا کر رہا تھا کہ عائشہ جلدی ہوش میں آ جائے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دادی آ کر ان کے ہوش اڑا دیں۔

"عائشہ، عائشہ پلیز آنکھیں کھولیں۔" احد اسے آوازیں دے رہا تھا اور ماہرہ ہلکے ہلکے اس کے گال تھپتھپا رہی تھی۔ عائشہ کسمسائی۔

"تھینک گاڈ۔ وہ ہوش میں آ رہی ہے۔" کچھ لمحوں کے بعد اس نے پوری آنکھیں کھول دیں مگر کچھ دیر پہلے کے واقعے کا اثر تھا کہ پھر سے آنکھیں بند کر کے زور زور سے چیخنے لگی۔

"عائشہ دیکھو یہ ہم ہیں۔ میں ماہرہ، احد، سعد اور فہد۔" ماہرہ کے کہنے پر اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔

"ماہرہ ابھی ___ ابھی یہاں کوئی تھا۔ سم باڈی از ہیئر۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"سوری عائش۔ یہ ہم چاروں نے تمہارے ساتھ جوک آف دا ایئر کیا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ تمہیں اندھیرے سے ڈر لگتا ہے اس لیے لائٹ آف کر کے تمہیں ڈرایا۔" سعد نے وضاحت دی۔

"نہیں، اٹ واز ٹرو (It was true) سم ون ہولڈ مائی ہینڈ۔" (کسی نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا) وہ اپنی بات پر مصر تھی۔

"سوری عائشہ! وہ میں تھا۔ رئیلی اٹ واز جوک آف دا ایئر (وہ واقعی سال کا مذاق تھا)۔" احد بھی نادم تھا۔ عائشہ واقعی بہت بری طرح ڈری تھی۔ عائشہ نے ایک نظر اسے اور پھر باقی سب کو دیکھا۔

"شٹ اپ یو، لیو می الون۔ آئی سیڈ لیو می الون۔" وہ چیخے جا رہی تھی پھر زور زور سے رونے لگی۔ ماہرہ نے ان تینوں کو اشارہ کیا کہ باہر جائیں۔ وہ عائشہ کے ساتھ ہے۔ وہ سب عائشہ کو ایک نظر دیکھ کر باہر نکل گئے۔

عائشہ کافی دیر تک روتی رہی۔ پھر چپ ہو گئی مگر اس کی سسکیاں جا رہی تھیں۔ ماہرہ ہولے ہولے اس کی پشت سہلاتی رہی پھر فریج میں سے اس کے لیے ایپل جوس لے کر آئی اور نیند کی گولی کے ساتھ اسے دیا۔

"آئی ایم سوری عائشہ۔ یہ سب صرف ایک مذاق تھا۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں اندھیرے سے اتنا ڈر لگتا ہے۔ پلیز ہمیں معاف کر دو۔ دادی کو اگر پتا چلا وہ بہت ناراض ہوں گی۔" جو کچھ ہوا اس پہ ماہرہ بھی نادم تھی اور ہر صورت اسے منانا چاہتی تھی۔

"اٹس او کے۔ مگر پلیز لائٹ مت بند کرنا۔" یہ بات کہتے ہوئے اس کا انداز ملتجی ہو گیا تھا۔ ماہرہ کا دل کٹ کے رہ گیا تھا اس کے انداز پر۔ وہ اسے بیڈ پر لٹا کر کمبل اوڑھا کر خاموشی سے باہر نکل آئی اس دن ان چاروں میں سے کسی نے کھانا نہ کھایا۔ بس یہ شکر ہوا کہ اس دن سارے بڑے ماہرہ کے افضل ماموں کے گھر سے کافی دیر سے آئے اور آتے ہی اپنے کمروں میں چلے گئے اس لیے کوئی بھی اور خاص طور پر دادی، عائشہ کی آنکھوں کی سرخی نہ دیکھ سکیں ورنہ ضرور کچھ نہ کچھ جان جاتیں۔

اگلا دن بہت خاموشی سے گزرا۔ ہر کوئی اپنے کام میں لگا رہا۔ کسی نے کسی کو مخاطب نہ کیا۔ ان تینوں میں

سے نہ تو کوئی بیت الریاض (۲) آیا اور نہ ہی ماہرہ یا عائشہ ادھر گئیں۔ یہ جوک آف دا ایئر کے بعد کی تیسری رات تھی۔ عائشہ کمپیوٹر پر اپنا کام کر رہی تھی اور ماہرہ کچھ دیر پہلے کافی بنانے گئی تھی کہ پڑھائی کے دوران کی بھوک کو کیسے روکا جائے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس کم ان۔" عائشہ نے بن دیکھے جواب دیا۔ مگر جب کافی دیر تک کوئی آواز نہ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ احد کھڑا تھا، ہاتھ میں کوئی پیکٹ لیے۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اس کی آواز بھاری سی ہو رہی تھی شاید فلو تھا۔

"کیا پھر کوئی جوک کرنا ہے؟" عائشہ نے ہلکی سی آواز میں کہا اور کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے اس کی طرف رخ کیا۔ احد اس کی بات پر کچھ نہ کہہ سکا۔ فقط خاموش رہا۔ دو، تین منٹ کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"میں اپنی اس دن کی حرکت پر بے حد شرمندہ ہوں یہ میری زندگی کا پہلا جوک آف دا ایئر تھا۔ جس نے مجھے دو راتوں تک سونے نہیں دیا۔ اندھیرے سے ڈرنے والی بات میں نے خود چالاکی سے آپ کے منہ سے اگلوائی تھی اور پلان بھی سارا میرا تھا۔ مگر مذاق کب دل کے لیے تکلیف کا باعث بنتے ہیں یہ مجھے اس دن پتا چلا۔ کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گی؟" وہ سراپا سوال بنا کھڑا تھا۔

اسی وقت ماہرہ کچن سے نکل کر راہداری میں پہنچی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں عائشہ کسی سے بات کر رہی ہے۔ ماہرہ نے سوچا کہیں دادی ادھر نہ آ گئی ہوں اور عائشہ کہیں انہیں اس دن والی بات نہ بتا دے اس لیے تیزی سے کمرے تک آئی۔ مگر دروازے تک آ کے رک گئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے دیکھا عائشہ رو رہی تھی اور اس کے سامنے احد کھڑا تھا۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ وہ عائشہ کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کے آنسو اپنی ہتھیلی سے صاف کر رہا تھا۔ ماہرہ کو جھٹکا سا لگا۔

"عائش، اٹس فور یو۔" ایک پیکٹ احد نے اس کی طرف بڑھایا اور کھولنے پر اصرار کیا۔ عائشہ نے پیکٹ کھولا اس میں ڈیری ملک کریکل تھی اور ساتھ ایک سوری کا کارڈ تھا۔ جس پر نیلی روشنائی سے لکھا تھا۔

"Smile and Sorry can settle everything"

"یہ مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ میری سوری قبول کر لی گئی ہے۔" احد نے شوخی سے کہا۔ ماہرہ جو اتنی دیر سے اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ ایک دم اس کے وجود میں جنبش ہوئی اور وہ کافی کی ٹرے لیے واپس پلٹ گئی۔ واپس کچن میں آ کے اس نے دونوں کپوں کی کافی سنک میں انڈیل دی اور تیز نل کھول دیا۔ اور اپنے منہ پر تیزی سے پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا جلن ہو رہی تھی ___ جب دادی کے ساتھ عائشہ آئی تھی تو سب سے زیادہ خوشی اسے ہوئی تھی کہ ان کے گروپ میں ایک اور لڑکی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان تین کے مقابلے میں اسے بھی کوئی پارٹنر مل گیا تھا۔ مگر آج اسے عائشہ سے حسد محسوس ہو رہا تھا۔

اس طرح آنسو پونچھ کر منانا، چاکلیٹ گفٹ کرنا، اپنے ہاتھ سے خود کارڈ ڈیزائن کرنا یا پھر بازار سے سوری کا کارڈ لا کر خاص طور پر یہ لائن لکھ کر دینا۔ یہ سب، یہ سب تو احد صرف اس کے لیے کرتا تھا ___ "تو کیا آج، آج عائشہ نے میری جگہ لے لی۔" اس کی سوچوں نے گویا ایک ڈنک اس کی ذات پر مارا۔ سارا پچھلا منظر اس کی آنکھوں میں جیسے قید ہو گیا تھا۔

"احد، احد پلیز یوں نہ کرو۔ میری جگہ کسی کو نہ دو۔ آئی لو یو احد۔ آئی لو یو احد۔" وہ رو دیے گئی۔ جس احساس کو وہ کئی دنوں سے سمجھنا چاہ رہی تھی۔ آج اس پر آشکار ہو ہی گیا۔

بجز محبت کے یہ کوئی اور جذبہ نہیں تھا۔ وہ خود کلامی میں اتنی مگن تھی کہ نہیں جان پائی کہ کوئی بہت خاموشی سے اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا تھا۔ مگر سعد جان گیا تھا کہ ماہرہ کے دل میں احد کے لیے کیا ہے؟ وہ

احمر چاچو کو پاپا کے اہم کاغذات دینے بیت الریاض (۲) آیا تھا۔ بنا آہٹ کیے وہ جس خاموشی سے آیا تھا ویسے ہی لوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

امتحانات کا تو بہانہ تھا مگر ماہرہ کو تو فرار چاہیے تھا۔ اس لیے اس نے اپنے آپ کو پوری طرح کتابوں میں گم کر لیا۔ سب نے اس کی سنجیدگی کو فائنل کے ایگزامز سے تعبیر کیا۔ وہ دیکھتی تھی کہ احد اور عائشہ، اب دونوں کا وقت ہر وقت ساتھ گزرتا تھا۔ احد نیوز چینل سے واپس آتا تو عائشہ کے ساتھ نکل جاتا۔ کسی دن صبح سے ہی دونوں نکل جاتے۔ آگے بھی عائشہ کا منصوبہ ان علاقوں کا سروے کرنا تھا جہاں سیلاب نے تباہی مچائی تھی اور ان کی اوریجنل فوٹیج لینی تھی۔ ماہرہ دونوں کو ایک ساتھ، ایک جگہ باتیں کرتے دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ اس کے دل میں عائشہ کے لیے نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ جس نے اس کا بے حد اچھا دوست چھین لیا تھا بہت کم وقت میں عائشہ نے سب کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔

"ماما میں افضل ماموں کے گھر جانا چاہتی ہوں کچھ دنوں کے لیے۔" رات کے کھانے پر احمد ریاض، ثنا اور ماہرہ بیٹھے تھے تو ماہرہ نے ماں کو مخاطب کیا۔

"ارے یہ میرے گناہ گار کان کیا سن رہے ہیں۔ تم اور بھائی صاحب کے گھر جانا چاہتی ہو۔ ارے فضا بھابھی تو ہر دفعہ کہتی ہیں کہ ماہرہ کو تو لگتا ہے ددھیال ہی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مجال ہے جو کبھی ماموں کے گھر بھی آ جائے۔ میں ہی ہر دفعہ مختلف تاویلیں اور بہانے تمہاری طرف سے تراشتی رہتی ہوں۔" ثنا نے قدرے غصے میں کہا کیونکہ ماہرہ آخری بار بھی تین سال پہلے گئی تھی۔ جب اس کے ماموں زاد بھائی اسجد امریکہ سے ایم ایس کر کے آئے تو ماموں ممانی نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت رکھی تھی۔ اس کے بعد بھی ماموں ممانی نے کئی بار بلایا۔ مگر وہ ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے رک جاتی تھی۔ ماموں کے گھر نہ جانے کی اس کے پاس کئی وجوہات تھیں۔ اسے اپنے گروپ کے سوا کہیں مزا نہ آتا تھا۔ جتنا اس کا دل بیت الریاض (۱) میں لگتا تھا اتنا تو اپنے گھر میں بھی نہیں لگتا تھا۔ جبکہ ماموں کے گھر اس کا کوئی ہم عمر نہ تھا۔ ماموں کے دو ہی بچے تھے۔ بڑی رومانہ آپی اور پھر ان کے بعد اسجد بھائی۔ رومانہ آپی اس سے تقریباً" تیرہ سال بڑی تھیں اور پھر اسجد بھائی جو دس سال بڑے تھے۔ رومانہ آپی کی شادی کو چھ سال ہو چکے تھے۔ دوسرے اسے ممانی کی نیچر سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ نجیب الطرفین تھیں۔ انہیں اپنے میکے کی طرف سے خاندانی اور حسب نسب والی ہونے پر بڑا غرور تھا۔ پھر روپے پیسے کی بھی بڑی ریل پیل تھی۔ اس لیے ان کی نظروں میں کوئی کم ہی جچتا تھا۔ ممانی کے ساتھ رہتے رہتے ماموں کا زاویہ نظر بھی کچھ اسی طرح کا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ہر وقت اپنی دولت، حسب نسب، نام اور اعلا خون کو ڈسکس کرتے رہتے اور انہی چیزوں کے تقابل میں انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بھی کافی دیر سے کی تھی کہ اپنے معیار کا داماد بھی کافی تگ و دو کے بعد ملا تھا اور اب یہی حال اسجد کا تھا، دو سال ہوئے پڑھائی ختم کر کے وہ اپنے باپ کے امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کو سنبھال رہا تھا مگر ممانی کو بطور بہو جیسی لڑکی کی تلاش تھی وہ اب تک نہ ملی تھی۔

"ویسے بیٹا جی ہے تو حیرت کی بات کہ تم کچھ دنوں کے لیے افضل بھائی کے گھر جاؤ۔ کیا اپنے گروپ سے لڑائی ہو گئی ہے؟" پاپا نے اسے کریدنا چاہا وہ جانتے تھے کہ اپنے ٹولہ گروپ کے بغیر ماہرہ کا کہیں گزارا نہ تھا۔

"نہیں پاپا۔ لڑائی نہیں ہوئی۔ بس سب لوگ آج کل بہت مصروف جو ہیں اور پھر ممانی کا فون بھی آیا تھا وہ بہت اصرار کر رہی تھیں آنے کے لیے۔ بلکہ انہوں نے تو دھمکی دی کہ اگر اس بار نہیں آئیں تو سچ مچ ناراض ہو جاؤں گی۔ اس لیے اب وعدہ کیا ہے تو نبھانا تو پڑے گا نا۔" اس نے ممانی کے فون آنے کا جھوٹ گھڑا۔ ورنہ وہ تو بس یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی، چاہے کچھ دنوں کے لیے ہی سہی۔ ایک نامعلوم سی

وحشت تھی جس کا بوجھ وہ روز اٹھائے پھرتی تھی۔

"ہاں بیٹا جانی یہ تو ہے۔ وعدہ کیا ہے تو نبھانا تو پڑے گا نا۔ اوکے کل آپ دن میں اپنی پیکنگ کر لینا میں شام میں چھوڑ آؤں گا۔" پاپا نے پروگرام سے آگاہ کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب سعد اور فہد کو پتا چلا کہ وہ افضل ماموں کے گھر جا رہی ہے کچھ دنوں کے لیے، تو پانچ چھ دفعہ اس کی خیریت پوچھی بلکہ سعد نے تو باقاعدہ بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ بھی کی پھر فائزہ تائی کو ہی اس کی اوور ایکٹنگ پر ٹوکنا پڑا۔

شام میں وہ ماما کے دیے ہوئے تحائف اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی جو انہوں نے یہ کہہ کر ماموں، ممانی، رومانہ، اسجد اور رومانہ کے بچوں کے لیے دیے تھے کہ تین سال بعد رہنے جا رہی ہو تو کیا خالی ہاتھ جاتے اچھا لگے گا کہ سعد چلا آیا۔ وہ سیدھا آفس سے ادھر آ گیا تھا کہ احمر چاچو کچھ مصروف تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے ماہرہ کو ماموں کے گھر چھوڑ کر آنے کا کہا تھا۔

"ماہرہ۔ ایک دن اور رک جاتیں، کل یا پرسوں تو احد اور عائشہ آ ہی جاتے۔ احد کو پتا چلے گا تو خفا نہ ہو۔" سعد اس کے بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا اسے چیزیں سمیٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"احد نے یہ سوچا کہ ماہرہ کو کیسا لگے گا اس کے بغیر۔" ماہرہ نے ایک لمحے کو ہاتھ روکا اور دل گرفتگی سے کہا اور پھر سر جھٹک کر دوبارہ اپنی استعمال کی چیزیں رکھنے لگی۔ بہت اداس تھی وہ احد کے بنا اور پھر اس پر اس سوچ کا بار بار ذہن میں آنا کہ وہ اور عائشہ ایک دوسرے کے کتنا قریب ہوں گے۔ ایک دوسرے کے سنگت میں مزے کر رہے ہوں گے۔ بھلا احد کو اس کی یاد کہاں آ رہی ہو گی۔

"یار دو دن کی تو بات ہے آ جائیں گے۔ پھر دادی کا حکم تھا عائشہ کو مکمل طور پر اسٹڈی پروجیکٹ میں مدد کرنی ہے تو وہ ان کا کہنا کیسے ٹال سکتا تھا۔" سعد نے احد کو ڈیفینڈ کیا۔

"اٹس اوکے سعد۔ مجھے بھی ممانی نے بلایا ہے اس لیے جا رہی ہوں۔" ماہرہ نے اپنا لہجہ سرسری کرنا چاہا۔ یہ تو دل کا راز تھا وہ اسے کیوں سب پر آشکار کرتی۔ وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو عائشہ اور احد کو ایک ساتھ دیکھنے پر عجیب سی کیفیات کا شکار ہو جاتا تھا۔

"ممانی نے تو آج سے پہلے بھی بہت دفعہ بلایا ہے۔ مگر تم کبھی نہیں گئیں۔ یہ کہو نا کہ فرار چاہتی ہو۔" سعد نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"اس دن جب تم کچن میں کھڑی رو رہی تھیں اور روتے ہوئے اپنے آپ سے ہمکلام تھیں تو میں نے سب سن لیا تھا۔" وہ جوک آف دا ایئر والے واقعے کے بعد کی تیسری رات کا تذکرہ کر رہا تھا اور ماہرہ اپنی جگہ گنگ تھی۔

"جیسا تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے ماہرہ۔" سعد نے اسے یقین دلانا چاہا۔

"اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے سعد اس سے تم واقف نہیں ہو۔" اس کی آواز میں تھکن تھی۔

اس رات کا منظر آج بھی اس کی آنکھوں میں اسی طرح گھرا تھا۔ جب احد، عائشہ کے آنسو پونچھ رہا تھا اور عائشہ اس سے اپنے دکھ بانٹ رہی تھی۔ اتنی حساسیت تو کسی بہت قلبی تعلق میں ہی ہوتی ہے۔ اس نے سوچا مگر سعد سے نہ کہا۔

"ڈونٹ وری ماہرہ۔ میں احد سے بات کروں گا۔ آفٹر آل تم میری بہت سویٹ سسٹر ہو۔" ماہرہ تیار ہو چکی تھی۔ سعد بھی بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پلیز سعد ــــ احد سے کچھ مت کہنا ــــ اگر وہ عائشہ کے ساتھ خوش ہے تو ــــ" آگے ماہرہ سے کچھ بھی نہ بولا گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ سعد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر چپ ہو گیا۔ اب جو بھی کہنا تھا اسے احد سے ہی کہنا تھا۔ اس نے ماہرہ کا بیگ اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

ماموں کے گھر میں تین سالوں میں کافی کچھ بدل گیا تھا۔ مگر وہ چیزیں اب تک نہ بدلی تھیں۔ وہی خاموشی کا

راج تھا۔ بلکہ خاموشی اور بھی دبیز ہو گئی تھی ایک عجیب سی پراسراریت تھی اس میں اب اور دوسرا ممانی کا بات کرنے کا انداز۔

ماموں، ممانی دونوں اس کے آنے پر بے حد خوش تھے۔ ممانی نے اس کے لیے رات کے کھانے پر بے حد اہتمام کیا تھا۔ وہ ایک ایک چیز اسے نکال نکال کر پیش کر رہی تھیں۔ پر وہ صرف تھوڑا سا ہی کھا پائی۔ ابھی صرف دو گھنٹے گزرے تھے اور وہ بیت الریاض (۱) اور (۲) دونوں کو مس کر رہی تھی۔

"ممانی۔ اسجد بھائی کہاں ہیں نظر نہیں آ رہے؟"

"بس بیٹا۔ آفس کی ساری ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی ہے۔ تمہارے ماموں کو تو قریب قریب ریٹائرڈ ہی کر دیا ہے سمجھو۔ آفس کے کام سے لاہور گیا ہے۔ ایک دو دن میں آجائے گا۔" ان کا جواب سن کر وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی کہ احد اور عائشہ کی ضد میں وہ یہاں چلی تو آئی تھی مگر صرف ممانی کی سنگت میں ایک ہفتہ کیسے گزرے گا۔

اگلے دن صبح قدرے دیر سے آنکھ کھلی۔ ممانی نے اسے جو کمرہ دیا تھا اس کی کھڑکی لان میں کھلتی تھی وہ کھڑکی میں چلی آئی۔ نیچے لان بہت اچھا ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا دل نرم نرم سبز گھاس پر چلنے کے لیے مچلنے لگا۔ نیچے آکر کافی دیر تک وہ لان میں ٹہلتی رہی پھر ممانی کی ملازمہ کوثر اسے ناشتے کے لیے بلانے آگئی۔ ٹیبل پر ممانی پہلے سے موجود تھیں۔ اس نے انہیں سلام کیا اور ان کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ناشتے میں کافی کچھ تھا۔ ممانی رات کی طرح اب بھی ہر چیز اس کے سامنے رکھتی جا رہی تھیں۔ اس نے صرف سلائس لیا اور جیم اور مکھن لگانے لگی۔

"آپ کا لان بہت خوب صورت ہے ممانی جان۔" ماہرہ نے سلائس دانتوں سے کترتے ہوئے تعریف کی۔

"ہاں بیٹا۔ یہ سب اسجد کی محنت ہے۔ مالی بھی رکھوایا ہے اور خود بھی چھٹی والے دن لگا رہتا ہے۔ یہی نہیں گھر کی ساری سیٹنگ بھی اس نے ہی کروائی ہے۔" ممانی کے لہجے میں فخر تھا۔

"ممانی آپ اسجد بھائی کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں۔ بہو آئے گی تو نا صرف رونق ہو جائے گی بلکہ آپ کی تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔" اس نے خلوص سے مشورہ دیا اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"ارے بیٹا۔ میں تو خود یہی چاہتی ہوں۔ بیسیوں لڑکیاں دیکھی ہیں، خود روبانہ نے اپنے سسرال میں کافی دکھائی ہیں۔ مگر اچھی خاندانی، حسب نسب والی کوئی لڑکی ملے تو —— پھر تم گھر کی سجاوٹ سے ہی اسجد کی پسند ناپسند کا اندازہ لگالو۔ کم از کم لڑکی اس کے اسٹینڈرڈ کی تو ہو اور لازمی بات ہے کہ تعلیم یافتہ بھی ہو آخر کو میرا بیٹا اتنا ایجوکیٹڈ ہے۔" ممانی اپنے سابقہ انداز میں شروع ہو چکی تھیں۔ اس نے کان لپیٹ کر ناشتا کرنا شروع کر دیا۔ ناشتے کے بعد اس نے گھوم پھر کر پورا گھر دیکھا۔ نیچے کی منزل میں ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، گیسٹ روم، لاؤنج اور کچن تھا جبکہ اوپر کی منزل پر صرف بیڈ روم تھے۔ سب سے پہلے ماموں ممانی کا کمرہ پڑتا تھا اس کے بعد دو کمرے تھے۔ ایک اس میں سے ممانی نے ماہرہ کو دیا تھا۔ جب کہ دوسرا خالی تھا۔ روبانہ جب بچوں سمیت آتی تو اس میں ہی ٹھہرتی تھی۔ راہداری کے آخری سرے پر ایک اور کمرہ تھا۔ وہ اسجد کا تھا۔ بقول ممانی کے امریکہ میں تین چار سال رہا ہے اس لیے کافی تنہائی پسند ہو گیا ہے۔ اسجد کا کمرہ دیکھ کر ماہرہ دنگ رہ گئی۔ کمرے کی سجاوٹ شاہانہ تھی۔ ہر چیز نفاست، قرینے اور سلیقے سے اپنی جگہ موجود تھی۔ کھڑکیوں پر گہرے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ قدموں تلے جو قالین تھا۔ وہ اتنا نرم اور بیش قیمت تھا کہ ماہرہ کے پیر اس میں دھنسے جا رہے تھے۔ کمرے میں صرف تین چیزیں تھیں۔ ایک جہازی سائز بیڈ جس کے دونوں اطراف سائیڈ ٹیبل تھیں۔ بیڈ کے بالکل سامنے تھوڑے فاصلے پر ایک خوب صورت ڈریسنگ ٹیبل تھی جو انواع و اقسام کی خوشبویات، کریموں اور دوسری چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔ بیڈ کے دائیں جانب ایک بڑا سا صوفہ لگا تھا اور بائیں جانب دو دروازے تھے ایک ڈریسنگ روم کا جس کے ساتھ باتھ روم تھا اور دوسرا دروازہ اسٹڈی روم میں کھلتا تھا۔

ماہرہ نے دل ہی دل میں اسجد کی شخصیت کو سراہا۔ جس کا کمرہ اتنا اچھا تھا وہ خود کتنے اچھے ذوق کا مالک ہو گا۔ دو سال میں گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ کمرے کے سحر میں کھوئی رہی۔ اسے احد اور سعد کا کمرہ یاد آیا۔ جہاں سوائے بے ترتیبی کے کچھ نہیں ملتا تھا۔ اسٹڈی روم بھی اتنا ہی نفاست سے ترتیب دیا ہوا تھا۔ کمرے کی دو جانب دیوار گیر الماریاں نصب تھیں جن میں اوپر سے نیچے تک کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کو ان کے موضوعات کے حساب سے ترتیب دیا گیا تھا۔ تیسری دیوار کے ساتھ ایک رائٹنگ ٹیبل تھی اور اس کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک کمپیوٹر ٹیبل نصب تھی۔ جس پر کمپیوٹر مع تمام ضروریات کے موجود تھا۔

"اسجد بھائی واقعی کوئی زبردست چیز ہیں۔ اب تو ان سے ملنا پڑے گا۔" ماہرہ نے دل میں سوچا۔ کمپیوٹر اور ویب کیم دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ کم از کم اب وہ بور نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

آج اسے ماموں کے گھر آئے ہوئے چوتھا دن تھا۔ کل رات جب اس نے گھر پر فون کیا تو ثنا نے کہا کہ آج احد، عائشہ —— واپس آگئے ہیں اس لیے سب بیت الریاض (۱) میں جمع ہیں۔ کھانا چل رہا ہے اس لیے اگلے دن بات کروں گی اور پھر دو تین باتوں کے بعد انہوں نے فون رکھ دیا اور ماہرہ کتنی ہی دیر ہاتھ میں موبائل پکڑے بیٹھی رہی تھی۔

"کیسے سب ملے گلے میں مگن ہیں۔ کسی کو اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ ان میں موجود نہیں ہے اور سعد وہ تو جانتا تھا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں —— اس نے بھی چار دن میں ایک بار بھی فون کر کے یہ نہ کہا کہ ماہرہ واپس آجاؤ۔" وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

رات بھر ایسی ہی کیفیت رہی۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ، احد اور عائشہ سے کچھ دنوں کے لیے دور چلی جائے گی تو شاید اس کیفیت سے جسے وہ محبت کا نام دے رہی ہے باہر نکل آئے گی۔ مگر ان چار دنوں میں احد کی محبت اس کے دل کو اور بھی مضبوطی سے جکڑ چکی تھی۔

اور اب صبح تڑکے ہی اس کی آنکھ کھل چکی تھی۔ ابھی سورج نے بھی اپنی کرنوں کو دور تک نہیں بکھرایا تھا۔ وہ آہستگی سے بیڈ سے اتر کر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور اجالے اور اندھیرے کے سنگم پر اس نے اپنی نگاہیں جما دیں۔

"انسان کو پتا ہی نہیں چلتا محبت کب اپنے پر پھیلاتی ہے اور پھر بانہوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ جس کے دل میں گھر کرنا ہو محبت اسے کھوجتی ہے۔ ڈھونڈتی ہے اور پھر اسے پا لیتی ہے۔ وہ پورے کا پورا دل اپنے قبضے میں کر لیتی ہے۔ مگر جہاں ذرا سی بھی انا ہو وہاں یہ اپنے پر نہیں پھیلاتی کہ اس سے دوئی برداشت نہیں ہوتی۔ اس کو شراکت اچھی نہیں لگتی۔ جب یہ دل کو اپنا اسیر کر لیتی ہے تو جا کے عشق کے سرہانے بیٹھ جاتی ہے اور پھر عشق کے پیروں میں کھڑے اس شخص کو بھی سرہانے بلاتی ہے۔ محبت میں 'میں' اور 'تو' ہوتا ہے۔ مگر عشق میں سب مدغم ہو جاتا ہے۔ نہ طالب رہتا ہے نہ مطلوب۔ راستہ ہی منزل بن جاتا ہے۔ مگر عشق کے سرہانے بیٹھنا بھی تو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ اعزاز تو خوش نصیبوں کے حصے میں ہی آتا ہے۔" کوئی دھیرے دھیرے اسے محبت کے راز سے آگاہی دے رہا تھا۔ اسے تھپکی اور دلاسے دے رہا تھا۔ کتنا ہی وقت بیت گیا —— سورج پوری طرح اوٹ سے نکل آیا —— وہ ایک دم چونکی۔ جیسے کسی خواب سے جاگی ہو۔ اسے نماز کے قضا ہونے کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے وضو کرنے چل دی۔ نماز ادا کر کے وہ کتنی ہی دیر دعا مانگنے کے انداز میں ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہی۔

"یا اللہ جس طرح میرے دل کو تو نے اس کی محبت میں دھڑکنا سکھایا ہے اس طرح اس کی خوشی میں خوش رہنا بھی سکھا دے۔ اگر وہ عائشہ سے محبت کرتا ہے تو وہ

عائشہ کے ساتھ ہمیشہ خوش رہے۔" آنسو اس کے گالوں پر پھسلتے چلے جا رہے تھے مگر دل طمانیت سے بھرتا جا رہا تھا۔ جب انسان خود کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ تو اس کا ہر دکھ ہر سکھ بھی اللہ کے ذمے ہو جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ناشتا کرنے جانے کے لیے وہ سیڑھیاں اتر ہی رہی تھی کہ کسی اجنبی کے ڈانٹنے کی آواز پر اوپر سے تیسرے قدمچے پر ٹھٹک گئی۔ اس اجنبی کی ماہرہ کی طرف پشت تھی۔ نک سک سے تیار وہ کوثر کو پلیٹ دکھاتے ہوئے برس رہا تھا۔ اس کی سمجھ نہ آیا کہ وہ واپس پلٹ جائے یا ناشتے کے لیے ٹیبل پر آجائے۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ ممانی نے اسے آواز دی۔

"ارے ماہرہ! آؤ نا' وہاں کیوں رک گئیں۔ دیکھو اسجد بھی آگیا ہے۔ صبح سات بجے پہنچا ہے۔" ممانی کی آواز میں ایک جوش سا تھا۔ ماہرہ سے کہہ کر وہ کوثر کی طرف مڑیں۔

"جاؤ اور جا کر ڈھنگ سے پلیٹیں دھو کر لاؤ۔ کتنی بار کہا ہے ہر چیز قرینے سلیقے سے رکھا کرو۔" انہوں نے کوثر کو ڈانٹا۔ کوثر خاموشی سے ساری پلیٹیں اٹھا کر لے گئی۔

"بیٹھو اسجد۔۔۔ ابھی کوثر پلیٹیں صاف کر کے لے آتی ہے۔" انہوں نے اسجد کو کرسی پیش کی۔ وہ آکر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔

"آؤ' ماہرہ تم بھی آجاؤ بیٹا۔" انہوں نے ماہرہ کو دوبارہ مخاطب کیا۔ ماہرہ بھی آکر خاموشی سے اسجد کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے یوں اسجد کا کوثر کو ڈانٹنا اچھا نہ لگا تھا۔ اسے تو پورا ناشتا ہی قرینے اور سلیقے سے رکھا نظر آ رہا تھا۔ وہ امیج جو تین دن میں ممانی نے ماہرہ کے ذہن میں اسجد کا بنایا تھا۔ اس میں ہلکی سی دراڑ پڑی۔

"تم دونوں تو ایسے خاموش ہو جیسے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو۔۔۔ اسجد یہ ماہرہ ہے تمہاری پھپھو زاد اور ماہرہ' اسجد۔" ممانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ شاید وہ تھوڑی دیر پہلے ہونے والے ڈرامے کا اثر زائل کرنا چاہ رہی تھیں۔

"السلام علیکم اسجد بھائی کیسے ہیں آپ؟" ماہرہ نے سلام کرنے میں پہل کی۔ کوثر پلیٹیں لے کر آچکی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کافی بڑی ہو گئی ہو اور اسمارٹ بھی۔" اسجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر انداز میں ہنوز جھنجلاہٹ کا عنصر تھا۔

پھر وہ اس سے ثنا پھپھو اور احمر ریاض کی خیریت پوچھنے لگا۔ وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ اس کی باتوں کے جواب بھی دینے لگی۔ اس نے محسوس کیا اسجد کے انداز میں ناشتا کرتے ہوئے ایک عجلت سی تھی اور پھر بار بار ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

"چار دن سے تمہارا پوچھ رہی تھی۔ بس شام میں آفس سے آؤ تو اسے ڈنر پر لے جانا۔" ممانی نے اسجد کو مخاطب کیا۔ جبکہ ماہرہ حیران تھی کہ سات بجے وہ لاہور سے آیا تھا۔ ابھی آفس جا رہا ہے اور شام میں اس کو ڈنر کرانے کی ذمہ داری۔

"نہیں ممانی پلیز رہنے دیں۔ اسجد بھائی ابھی لاہور سے واپس آئے ہیں۔ انہیں یقیناً" آرام کی ضرورت ہو گی۔" اس نے جھجکتے ہوئے منع کر دیا۔

"جی نہیں بلکہ آرام کرنے سے میں بیمار ہو جاتا ہوں۔ تیار رہیے گا' شام میں باہر چلیں گے ابھی جو کچھ تیز آواز میں' میں نے کوثر بی بی کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ بھی یقیناً" آپ کی سماعت پر اچھا نہیں گزارا ہو گا۔" وہ ناشتا کر چکا تھا۔ ایکسکیوزمی کہتا۔ کرسی پیچھے دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں کو اللہ حافظ کہتا اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ ماہرہ نے دیکھا جاتے جاتے وہ بیرونی گلاس ڈور پر انگلیاں پھیر کر اس پر جمی گرد محسوس کرنا نہ بھولا تھا۔ ناشتے کے بعد کچھ ہی دیر گزری تھی کہ رومانہ آپی اپنے دونوں بچوں عمیر اور سمیر کے ساتھ چلی آئیں۔ عمیر پانچ

سال کا تھا اور سمیر چار سال کا۔ بہت عرصے بعد وہ رومانہ آپی سے مل رہی تھی۔ رومانہ آپی اس سے کافی گرمجوشی سے ملیں۔ سب کی خیر خیریت پوچھتی رہیں۔ مگر جب ان کا روئے سخن اپنے سسرال کی طرف ہوا تو وہ ممانی اور رومانہ آپی دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر عمیر اور سمیر کے ساتھ لان میں چلی آئی۔

"امی' ماہرہ کافی اچھی نہیں ہو گئی ہے۔ کیا خیال ہے اگر ہم ثنا پھپھو سے اسجد کے لیے ماہرہ کا ہاتھ مانگ لیں۔۔۔ اگر ثنا پھوپھو نے اس کی بات طے نہ کی ہو تو۔" رومانہ نے اپنے دل کی بات ان سے کہی۔

"ہاں' رومانہ دل تو میرا بھی بہت کرتا ہے۔ مگر اسجد کو تو تم جانتی ہو۔ اس سے پوچھے بنا کوئی بات آگے نہیں بڑھا سکتی۔" ممانی بھی یہی چاہتی تھیں۔

"اگر اسجد کی مرضی پر آپ نے یہ فیصلہ ڈالا تو پھر مشکل ہے شادی ہونا۔" رومانہ نے جواباً" کہا۔

"تم تو خود آگاہ ہو۔ کتنی مشکل سے تو وہ سنبھلا ہے۔ دنیا جہاں کے لڑکے محبتیں بھی کرتے ہیں اور دل بھی لگاتے ہیں۔ مگر ایسا دیکھا نہ سنا۔ اس آوارہ بدچلن کے پیچھے بدحال ہی ہو گیا۔ نہ جانے کہاں سے چمٹ گئی تھی ڈائن۔ گندے خون والی۔" ممانی کے لہجے اور انداز دونوں میں نفرت اور کراہیت تھی۔

"چار دن سے ماہرہ کے سامنے تعریفیں کر رہی ہوں اسجد کی۔ اس کے اعلا ذوق کی۔۔۔ صرف اسی لیے کہ میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ ماہرہ اس گھر میں آئے۔ اگر اس کا اسسٹنٹ علی اس کے ساتھ نہ ہو تو وہ آفس کا کام بھی ڈھنگ سے نہ کر پائے۔"

"اب تو اسجد کو فٹس (Fits) نہیں پڑتے۔" رومانہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں بس کبھی کبھار' پڑتے تو ہیں۔" ممانی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"آپ کوشش کریں کہ ماہرہ سے اس کی شادی ہو جائے۔ شادی کے بعد آپ دیکھیے گا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" رومانہ نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ممانی کسی گہری سوچ میں تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے؟ کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" سعد نے احد سے پوچھا جو اپنے سامان میں گھسا ہوا تھا۔

"یار میرے والٹ میں سے وہ تصویر غائب ہے۔ کہیں تم نے تو نہیں نکالی۔" احد نے کہتے ہوئے سعد کو گھورا۔

"احد میں تمہیں اس صدی کا دیوداس بننے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم اسے بتا کیوں نہیں دیتے۔ کب تک اس کی تصویر سے باتیں کرتے رہو گے یا پھر مجھے اس کو بتانے دو۔" سعد چڑ گیا۔ وہ کبھی کبھی سمجھ نہیں پاتا تھا کہ احد کیا سوچ رہا ہے۔

"خبردار جو تم نے اسے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں خود اسے مناسب وقت آنے پر کہہ دوں گا۔ ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ تاکہ اس کی ہر فرمائش اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کر سکوں۔ یاد ہے سعد۔۔۔ بچپن میں وہ کس طرح ہر بات مجھ سے آکے کہتی تھی۔ جیسے میں ہی اس کے لیے سب کچھ ہوں۔۔۔ میں ہمیشہ اس کا سب کچھ بنے رہنا چاہتا ہوں۔ جو مان وہ مجھ پر کرتی آئی ہے۔ وہ مان میرے دل میں اس کی محبت بن کے اتر گیا ہے۔" احد کے لہجے کی مضبوطی اور سچائی سعد کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے اپنے سے ڈھائی منٹ بڑے بھائی کو سینے سے لگا لیا۔

"واقعی تم ہی حسینہ عالم کے قابل ہو۔ مگر سچ میں تصویر میں نے نہیں نکالی ہے۔" وہ شرارت سے گویا ہوا تو احد بھی ہنس پڑا۔ شاید تصویر ٹریولنگ کے دوران والٹ میں سے کچھ نکالتے ہوئے گر گئی تھی۔ اسے کچھ کمی سی محسوس ہونے لگی۔

☼ ☼ ☼

ماہرہ اس وقت اسجد کے کمرے میں ملحقہ اسٹڈی روم میں موجود تھی۔ اسجد گھر پر موجود نہیں تھا۔ رومانہ اور بچے دو چھٹیاں گزار کے جا چکے تھے۔ دو دن جس طرح مزے میں عمیر اور سمیر کے سنگ گزرے

تھے۔ اب اس کے بعد مزید تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے گھڑی کی سمت دیکھا نو بج رہے تھے۔ وہ ہی ویو پر کھینچی جانے والی تصاویر اپ لوڈ کرنے لگی۔ آٹھ بجے کے وقت سعد کا موبائل پر ٹیکسٹ آیا تھا کہ "وہ دس بجے اسکائپ آن کرنا ہم سب تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" اس نے اوکے کر دیا تھا۔ دس بجے سعد اور فہد آن لائن ہوئے۔

"تمہارے لیے ایک چونکا دینے والی خبر ہے۔" سعد نے سنسنی پھیلائی۔

"کیا ہے جلدی بتاؤ؟" ماہرہ بھی پرجوش ہوئی۔

"دادی نے عائشہ کی شادی طے کر دی ہے۔ پاپا' امی' چاچو' چاچی سب ایک دم راضی ہیں اور تو اور دولہا میاں بھی دل و جان سے راضی ہیں۔"

"کیا واقعی؟" ماہرہ حیران تھی۔ مگر آواز اور انداز دونوں کا جوش و خروش مدھم پڑ چکا تھا۔

"کیا عائشہ خوش ہیں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"ایسی ویسی خوش ......" سعد نے پکڑ کر عائشہ کو آگے کیا۔ ماہرہ اسے دیکھے گئی۔ ان دس پندرہ دنوں میں وہ اور بھی خوب صورت ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ امریکہ جیسے ملک میں پلی بڑھی ہے۔

"کس سے طے کی ہے؟" ماہرہ نے عائشہ کی سمت دیکھا...... وہ احد کو دیکھنے کی متمنی تھی مگر ان تینوں میں وہ موجود نہیں تھا...... ماہرہ کے سوال پر عائشہ نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سعد نے اسے جواب دیا۔

"فکر نہ کرو۔ گھر کا ہی لڑکا ہے۔"

"سچ میں ماہی آپی آئی ایم سو ہیپی۔"

"عائشہ بہنیا...... بنے گی دلہنیا۔" فہد بھی جوش میں آ گیا۔ ماہرہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ اس کے ذہن میں تو بس سعد کے جملے کی ہی تکرار تھی۔ "گھر کا ہی لڑکا ہے۔" بھلا احد کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

"ماہرہ۔ وی آر مسنگ یو' پلیز کم سون۔" عائشہ نے اپنی من موہنی آواز میں کہا۔

"می ٹو عائشہ...... آئی ول کم سون۔" اس کی آواز میں برسوں کی تھکن تھی۔ مگر اپنے جوش و خروش میں ان سب کا دھیان اس کے لہجے کی طرف نہ تھا۔

"احد کہاں ہے؟ سعد۔" ماہرہ کو احد کا نام لیتے ہوئے گلے میں پھندا لگ رہا تھا۔

"ارے وہ تو نکا "کام والا بچہ" ہو گیا ہے۔ اسے پیسے کمانے کی دھن لگ گئی ہے۔ کسی کے سارے ارمان پورے کرنا چاہتا ہے وہ۔" سعد نے مزے سے احد کا نقشہ کھینچا۔ ماہرہ کو چپ سی لگ گئی۔ وہ آگے سے کیا پوچھتی یقیناً "جس سے شادی کر رہا تھا اسی کے ارمان پورا کرنے کی لگن ہو گی اسے......"

"اچھا سعد اب میں جا رہی ہوں۔ نیند آ رہی ہے مجھے۔" دو تین باتوں کے بعد اس نے مصنوعی جماہی لی اور سائن آف ہو گئی۔ مگر اس کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ وہ تو آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ پھر وہ آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے...... وہ تو خود احد کی خوشی چاہتی تھی۔ پھر کیوں اس کے دل کو تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے کمپیوٹر بند کر دیا اور اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ کبھی کبھی اندھیرا بھی نعمت لگتا ہے۔ سوچتے ہوئے اس نے ٹیبل پر سر ٹکا دیا...... جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی...... کافی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی...... اسجد کے بیڈ روم میں کچھ کھٹ پٹ سی ہو رہی تھی۔ اس نے چونک کر گھڑی میں وقت دیکھا۔

"اوہ بارہ بج رہے ہیں۔ میں کتنی دیر سے یہیں ہوں۔" اس نے سوچا وہ نو بجے رات کا کھانا کھا کر اسٹڈی روم میں آئی تھی۔ لائٹ بھی آ چکی تھی۔ وہ اسٹڈی روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اسجد کے واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔

"اوہ اسجد بھائی آ گئے...... کیا سوچیں گے وہ کہ میں اب تک ان کے کمرے میں ہوں۔" ماہرہ نے سوچا اور دبے قدموں ان کے واش روم کے آگے سے گزرنا چاہا...... مگر جانے کون سا احساس تھا جس نے اسے آگے

بڑھنے نہ دیا۔ واش روم میں سے عجیب بڑبڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھا کے دیکھا۔ وہ واش بیسن پر پوری طرح جھکے اپنے ہاتھ دھونے میں مگن تھے۔ "ایک بار...... دو بار...... جب تیسری بار بھی انہوں نے لیکوئیڈ (Liquid) سوپ سے ہاتھ دھوئے تو ماہرہ کی سمجھ نہ آیا۔ ایسی کیا گندگی سمیٹ لائے ہیں اسجد بھائی جو ہاتھ دھونا ہی ختم نہیں ہو رہا...... اوپر سے عجیب سی بڑبڑاہٹ...... یہ کیسا صفائی کا خبط ہے۔ اسے عجیب سی وحشت ہونے لگی وہ باہر کے دروازے کی طرف لپکی۔ مگر پیچھے سے آواز سن کر رک گئی......

"کون لیزا؟" اسجد نے واش روم کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر آواز دی۔ وہ نہ پلٹی۔ بلکہ اور تیزی سے باہر جانے کے لیے دروازے کی سمت بڑھنے لگی۔

"لیزا...... لیزا رک جاؤ۔" اسجد نے اس سے بھی زیادہ تیزی دکھائی اور اسے کندھوں سے پکڑ لیا ان کی گرفت بے حد سخت تھی۔ ماہرہ اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔

"لیزا پلیز مت جاؤ...... دیکھو دو سال سے اپنے وجود سے گندگی مٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نہیں مٹتی...... تم نے دی ہے مجھے بد دعا...... بتاؤ' بتاؤ تم نے دی ہے مجھے بد دعا۔" اسجد کی انگلیاں ماہرہ کے کندھوں میں گڑی جا رہی تھیں۔ اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ اسجد سے چھڑایا۔

"اسجد بھائی ہوش میں آئیں۔ میں ہوں ماہرہ۔" اس نے تیز آواز میں کہا۔

"نہیں تم لیزا ہو۔ پتا ہے مجھے...... اب چہرے بھی بدلنے آ گئے ہیں تمہیں...... کتنا بھگاؤ گی اپنے پیچھے...... یہ دیکھو میرا چہرہ۔ کتنا کریہہ ہو گیا ہے۔" وہ ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے چہرے کو نوچنے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں اسجد بھائی۔" وہ چیختے ہوئے رونے لگی۔ مگر اسجد تو اس کی سن ہی نہیں رہے تھے وہ تو اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

"یہ کمرہ دیکھا ہے۔ غور سے دیکھو۔ یہاں بچے کے رونے کی آواز آتی ہے مجھے۔ سو نہیں پاتا میں' یہ دیکھو دیکھو۔" وہ اسے کھینچتے ہوئے دراز کے قریب آئے اور اندر سے ایک سرنج نکالی اور ساتھ ہی ایک انجکشن...... ماہرہ ڈر گئی کہ کہیں وہ اسے یہ انجکشن نہ لگا دیں۔ پورے زور سے اس نے اپنا بازو ان سے چھڑایا۔ انہوں نے چھوڑ بھی دیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ انہوں نے سرنج میں انجکشن بھرا اور اپنے ہاتھ کی نس میں لگا لیا۔ "مجھے معاف کر دو لیزا۔ پلیز مجھے معاف کر دو...... میری نیندیں روٹھ گئی ہیں۔ بے خوابی کا مریض ہو گیا ہوں میں۔ یہ نیند کا انجکشن لگاتا ہوں سونے کے لیے۔" وہ دھم سے بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹ گئے...... ان پر غنودگی چھا رہی تھی۔ وہ اپنا دوپٹہ اپنے حلق میں ٹھونستی' اپنی چیخوں کو دباتی ہوئی باہر نکل آئی اور دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں گئی۔ باتھ روم میں بند ہو کر وہ بے تحاشا روتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جو اس نے دیکھا وہ خواب تھا' واہمہ تھا یا حقیقت ایسی ہولناک' سفاک حقیقت کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اسے تو یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کی گرفت سے نکل کر آ چکی ہے۔ اس نے دوبارہ کمرے کے لاک کی طرف سے اطمینان کیا۔ بیڈ پر واپس آتے ہی اس کے دل میں آیا وہ بھاگ کر ماموں' ممانی کے پاس جائے اور انہیں سب کچھ بتا دے...... مگر کیا وہ اس کی بات پر یقین کر لیں گے؟ اگر اسے بھی کوئی اس طرح بتاتا تو خود اسے بھی یقین نہ آتا۔ بھلا دن کی روشنی میں مہذب نظر آنے والا رات کے اندھیرے میں اتنا وحشی کیسے ہو سکتا ہے؟ بڑے بڑے سوالیہ نشان تھے جو اس کے گرد چکرا رہے تھے۔

"میں اک پل یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے جانا ہو گا۔ مجھے جانا ہو گا۔" اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اس نے اپنا موبائل بیڈ پر سے اٹھایا۔ شکر تھا کہ وہ موبائل کمرے میں ہی رکھ گئی تھی۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اس نے احد کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ تین چار دفعہ بجنے کے

بعد احد نے موبائل اٹھایا۔
"ہیلو..... ماہرو..... کیا ہوا۔ تم ٹھیک ہو نا' سوری میں واش روم میں تھا۔" اس کا لہجہ بے حد پریشان سا تھا۔
"پلیز احد! مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" کسی بہت اپنے کی آواز سن کر وہ رونے لگی۔
"ہوا کیا ہے ماہرو..... یہ تو بتاؤ پلیز۔"
"میں نے..... میں نے بہت برا سپنا دیکھا ہے۔ کوئی مجھے پکڑ کر لے جا رہا ہے۔ پلیز مجھے لے جاؤ۔ مجھے گھر بہت یاد آ رہا ہے۔ تم سب بہت یاد آ رہے ہو۔ ماما بہت یاد آ رہی ہیں۔" وہ ہچکیوں سمیت روتے ہوئے اسے کہتی جا رہی تھی۔
"پلیز ماہی یوں مت رو۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ دیکھو پریشان مت ہو۔ ریلیکس' صرف خواب تھا وہ۔ کوئی حقیقت تھوڑی تھی۔ اس وقت ایک بج رہا ہے اگر میں تمہیں۔ اس وقت وہاں لینے آیا تو دونوں گھروں میں بھی کھلبلی مچ جائے گی اور تمہارے ماموں' ممانی بھی پریشان ہو جائیں گے۔ آئی پرامس میں صبح نو بجے وہاں موجود ہوں گا۔ چلو آرام سے لیٹو شاباش۔ کمبل اوڑھو۔" وہ نہایت نرم اور دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا اور ماہرو کا سارا خوف دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا تھا۔
"مگر احد..... مجھے نیند نہیں آ رہی۔"
"آ جائے گی نیند۔ میری ہدایات پر عمل کرو۔ شاباش لیٹو۔ کمبل اوڑھو۔" اس نے پھر پیار سے کہا اور ماہرو نے ویسے ہی کیا۔ پھر جب تک وہ سو نہ گئی وہ اس سے دھیرے دھیرے باتیں کرتا رہا۔ لایعنی' بے معنی' چھوٹی چھوٹی۔ اس کے اور اپنے بچپن کی باتیں۔ اور جب دوسری جانب سے اسے کوئی جواب نہ ملا تو اسے معلوم ہو گیا کہ ماہرو سو چکی ہے اس نے بھی آہستگی سے رابطہ منقطع کر دیا۔
صبح آٹھ بجے ہی ماہرہ کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو کافی دیر تک اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ کس چیز سے اس کی آنکھ کھلی ہے کیونکہ اس کا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ پھر اس کی اپنے موبائل پر نظر پڑی۔ احد کالنگ آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھانا چاہا۔ مگر فون بند ہو گیا اور اسی کے ایک لمحے بعد احد کا میسج آ گیا۔
"آئی ہوپ کہ تم اٹھ گئی ہو گی۔ گیٹ اپ آئی ایم کمنگ ایٹ نائن۔" اس نے جواباً "یس" لکھ کر بھیج دیا اور اسی کے ساتھ ہی ماہرو کو رات کو جو کچھ بیتا وہ آہستہ آہستہ یاد آنے لگا۔ مگر یہ وقت سوچنے کا نہیں تیزی سے ہاتھ چلانے کا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی اس نے ڈریسنگ پر سے چیزیں اٹھا کر اپنے لیدر بیگ میں رکھیں پھر اس نے وارڈ روب میں سے کپڑے نکال کر وہ بھی بیگ میں رکھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنا ایک سوٹ اٹھا کر تیار ہونے چل دی۔ تیار ہو کر وہ اپنا بیگ اٹھا کر نیچے آ گئی۔ ناشتے کی ٹیبل پر ممانی ماموں کو ناشتا نکال کر دے رہی تھیں۔
"ارے ماہرہ۔ یہ کیا؟ صبح صبح کہاں جا رہی ہو اور یہ بیگ؟" فضل ماموں حیران تھے۔
"وہ ماموں اصل میں دادی کی طبیعت صحیح نہیں ہے نا۔ تو وہ مجھے بہت یاد کر رہی ہیں۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے احد کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے لینے آ رہا ہے۔" اس نے جلدی جلدی گھڑا گھڑایا جھوٹ بول دیا تھا۔
"ارے بیٹا ایسے کیسے؟" ممانی بھی چونک کر سیدھی ہوئیں۔
"بس ممانی۔ میں بھی دادی اور باقی سب کو بہت یاد کر رہی ہوں اور ویسے بھی اتنے سارے دن تو رہ لی ہوں میں۔ اب جانے دیں۔" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں وہ اسجد کو بالکل بھی ممانی اور ماموں سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ آج کے بعد اس کا یہاں آنے کا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا۔ ممانی نے دل سے اسے اجازت دے دی تھی وہ تو اور بھی کئی سارے دن ماہرہ کو روکنا چاہتی تھیں تاکہ اسجد اور ماہرہ ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔ ماہرو نے چائے کے ساتھ دو سلائس لیے۔ چائے کا آخری سپ لے ہی رہی تھی جب احد نے گیٹ پر بیل دی۔ وہ

اسے مقررہ وقت پر لینے آ گیا تھا۔ اس نے ماموں ممانی دونوں سے اجازت مانگی اور اس کے ہمراہ باہر نکل آئی۔ باہر آ کر اسے یوں لگا کہ جیسے وہ قفس سے آزاد ہوئی ہو۔
"تھینک یو احد۔" گاڑی میں بیٹھ کر اس نے دھیرے سے احد کا شکریہ ادا کیا۔ کتنے دن بعد وہ جان سے پیارا شخص اتنے قریب تھا۔ ہمیشہ کی طرح ڈیشنگ اور اسمارٹ..... اس کی ایک پکار پر اس کی مدد کے لیے دوڑ کر آنے والا..... اس کا دل چاہا وہ بنا پلکیں جھپکے احد کو دیکھتی رہے۔
"اوہوں..... نو تھینکس۔ غیروں جیسے جملے بولنے کی ضرورت نہیں۔" احد نے نرمی سے اسے مسکرا کر دیکھا اور گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔

☆ ☆ ☆

ماہرہ کے گھر پہنچتے ہی بیت الریاض (۱) اور (۲) دونوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دادی' فائزہ تائی' ماما' عائشہ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ "اتنی صبح ہی صبح احد کو کیوں بلوا لیا؟ کوئی بات ہو گئی وہاں پہ؟ طبیعت وغیرہ تو ٹھیک ہے؟"
سوالوں کی ایک بوچھاڑ تھی۔ رہی سہی کسر ممانی کے فون نے پوری کر دی جو انہوں نے ماہرہ کے احد کے ساتھ گھر سے نکلتے ہی ثنا کو کر دیا تھا بیگم فاطمہ ریاض کی خیریت پوچھنے کے لیے کہ ماہرہ صبح ہی صبح برائے نام ناشتا کرکے عجلت میں احد کے ساتھ نکل گئی ہے اور ثنا نے بھی اماں جان کی طبیعت کا بمشکل جھوٹ بولا کہ اماں جان تو بالکل خیریت سے تھیں۔
"جی میری پیاری دادی' تائی جان اور ماما جان میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں آپ سب کو بہت مس کر رہی تھی اس لیے دادی کی طبیعت کا بہانہ ممانی سے کر کے آ گئی۔ ورنہ وہ مجھے مزید روک لیتیں۔" کہتے ہوئے ماہرہ نے جھوٹ گھڑنے پر ان تینوں اور خصوصاً دادی جان کے سامنے معذرت خواہانہ انداز میں ہاتھ جوڑے کہ دادی کو جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ مگر ماہرہ کو اس جھوٹ کا سہارا لینا مجبوری ٹھہرا تھا کیونکہ نہ تو وہ ممانی کے سامنے اسجد کی حالت اور کیفیت کو بیان کر سکتی تھی اور نہ ہی ان لوگوں سے کہنے کا حوصلہ تھا۔ ابھی تک تو وہ خود حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ کل رات وہ جس اسجد سے متعارف ہوئی وہ واقعی اس کا کزن تھا؟ مگر دن میں کمپوزڈ نظر آنے والا شخص رات میں کیوں الوژن (illusion) کا شکار لگ رہا تھا؟
"اور یہ لیزا یہ کون ہے جس کا اسجد کی زندگی پر اتنا گہرا اثر ہے اور کیا ماموں' ممانی اور روبانہ آپی' اسجد بھائی کی اس کیفیت اور بیماری سے آگاہ ہیں؟ کیا اسجد بھائی کو ایسے دورے صرف رات میں پڑتے ہیں یا پھر وہ کسی نفسیاتی عارضے کا شکار ہیں اور دوہری مزاج والی شخصیت کا روپ دھار چکے ہیں؟" سوالوں کی ایک لمبی قطار تھی اور جواب کوئی نہیں' ماموں کے گھر سے آنے کے بعد اس نے پورا دن یہی سوچتے ہوئے گزار دیا تھا۔ اور ابھی بھی وہ اپنا پی سی آن کیے ساحل سمندر پر کھینچی جانے والی تصاویر دیکھ رہی تھی۔ جس میں وہ خود' اسجد بھائی اور بچے تھے۔ اسے وہ شام یاد آنے لگی۔ جب وہ ساحل سمندر پر بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اسجد بھائی اسے گھورے جا رہے تھے۔ مگر ان نگاہوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔ ایک خالی الذہنی کی کیفیت تھی بس تبھی وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی پانی میں لے آئی تھی۔
"میرا خیال ہے مجھے خود اسجد بھائی سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔" اس نے ان کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ پرسوں رات وہ جس ڈر کی کیفیت میں تھی اب اس سے نکل آئی تھی اور اب اس ڈر کی جگہ ترس اور ہمدردی نے لے لی تھی۔ مگر سوال ان کے موبائل نمبر کو حاصل کرنے کا تھا اور ممانی سے لینے کا رسک وہ لے نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ ممانی کے سوال جواب کرنے کی عادت سے الرجک تھی۔ اس کے ذہن میں روبانہ آپی کا خیال آیا۔ انہوں نے چلتے وقت اپنے گھر کا نمبر دیا تھا کہ رابطے میں رہنا۔ اب

رابطے میں رہنے کا بہانہ بھی تھا اور باتوں باتوں میں ان سے اسجد بھائی کا نمبر بھی لیا جاسکتا تھا۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔ اور اسی وقت عائشہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے۔ کل کا پورا دن تو سب نے ماہرہ کے ساتھ ہی گزارا تھا۔ مگر آج فائزہ تائی اور عائشہ دوپہر کے بعد سے شاپنگ کرنے کے لیے نکلے تھے اور اب سات بجے کے قریب گھر آئے تھے۔

"تھک گئی میں تو۔" عائشہ کہتے ہوئے اپنے بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

"شادی کی شاپنگ ہے یہ؟" ماہرہ نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں' یار شادی کی شاپنگ' مجھے نہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں شادی کرنا اتنا مشکل کام ہے؟" عائشہ ہر چند کہ تھکی ہوئی تھی مگر اس کے چہرے کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

"اوپر سے فائزہ آنٹی! ایک ایک چیز نا صرف مجھے دکھا رہی تھیں بلکہ لینے پر بھی اصرار کر رہی تھیں۔ بس ویڈنگ ڈریس رہ گیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ماہرہ اور احد کو ساتھ لے جانا۔ انہیں جدید فیشن کا زیادہ پتا ہے۔" وہ کہتی جارہی تھی اور سوٹوں کے ڈبے نکال نکال کر کھول کے ماہرہ کے سامنے رکھ رہی تھی۔ تمام سوٹ ہی واقعی قابل دید تھے۔ ایک سیاہ رنگ کے سوٹ پر اس کی نظر ٹھہر سی گئی۔ سفید پرل سے گلا بنا ہوا تھا۔

"ماہی' تم بلیک کلر پہنا کرو۔ یوں لگتا ہے کہ بنا ہی تمہارے لیے ہے۔" احد کی سرسراتی ہوئی آواز ماضی کے جھونکوں سے لے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ بڑی ہلچل ہوئی۔ مگر اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ جب سب کچھ بالا ہی بالا ہو چکا تھا تو وہ کس چیز کا واویلا کرتی۔

"سب سوٹ ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں۔ اللہ تمہیں یہ سب برتنا نصیب کرے۔" اس نے بہت دل سے عائشہ کو دعا دی۔ عائشہ بھرپور طریقے سے مسکرا دی۔

اسی وقت عائشہ کی نظر کمپیوٹر اسکرین پر پڑی۔

"یہ..... یہ کون ہے ماہرہ؟" عائشہ کا چونکنا بڑا غیر فطری سا تھا۔ کمپیوٹر پر اسجد کی تصویر فوکس تھی۔

"یہ میرے ماموں زاد کزن ہیں اسجد بھائی۔" کہتے ہوئے عائشہ نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرنا چاہا۔

"یہ..... تمہارے کزن کیسے ہو سکتے ہیں؟" عائشہ کی آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے وہ کسی کھائی میں گر گئی ہو۔ استعجاب' حیرت' صدمہ بہت کچھ تھا اس کے لہجے میں۔

"کیا مطلب عائشہ؟ آف کورس افضل ماموں کے بیٹے ہیں۔ کیا تم انہیں جانتی ہو۔" ماہرہ نے کہتے ہوئے سرسری انداز اپنایا۔ عائشہ کی طرف سے اس کی پشت تھی۔

"نہیں۔" عائشہ کے لہجے میں قطعیت تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما ہوا تھا۔

"کیا ہوا عائش..... آر یو اوکے؟" اس کا بلڈ پریشر اکثر کم رہتا تھا۔ جیسے ہی وہ عائشہ کی سمت پلٹی اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر ماہرہ کو فکر ہوئی۔

"چکر آرہے ہیں شاید..... بہت تھکن ہو گئی۔ کٹھن مسافت تھی۔" وہ آہستگی سے کہتی ہوئی بیڈ پر ڈھے سی گئی۔ وہ بے ہوشی کی کیفیت میں تھی مگر بے ہوش نہیں تھی۔ ماہرہ فوراً بھاگ کر پانی میں گلوکوز ڈال کر لے آئی اور عائشہ کو اپنے ہاتھ کے سہارے سے اٹھا کر گھونٹ گھونٹ پانی پلایا پھر تکیہ اونچا کر کے اسے تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔

"دن بھر سے کچھ کھایا یا نہیں۔" اس نے عائشہ کی ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"ہاں..... ایک سینڈوچ۔"

"اف عائش آپ بھی نا۔ بھلا ایک سینڈوچ سے بھی کچھ ہوتا ہے۔ میں آپ کے لیے ابھی سیب کاٹ کر لاتی ہوں پھر تھوڑی دیر بعد آپ نے رات کا کھانا کھانا ہے۔" وہ تنبیہی انداز میں کہتی کمرے سے باہر نکل گئی اور اس کے جانے کے بعد عائشہ نے آنکھیں

موند لیں۔ ماہرہ کی فکرمندی اپنی جگہ تھی مگر وہ عائشہ کی تھکن کا اصل سبب جاننے سے قاصر تھی۔

☆ ☆ ☆

اتوار کا دن بیت الریاض (۱) اور (۲) میں واقعی چھٹی کا دن ہوتا تھا۔ صبح کا ناشتا قدرے دیر سے اور عمر ریاض کے گھر پر ہوتا تھا۔ پھر دوپہر کا کھانا گول کر دیا جاتا۔ اس کے بعد رات کا کھانا احمر ریاض کے گھر پر ہوتا تھا۔ آج تو فائزہ نے عائشہ کی مدد سے خصوصی طور پر' حلوہ چھولوں کا سالن اور پوریاں بنائی تھیں کہ آج احد بھی گھر پر موجود تھا۔ ورنہ پچھلے دو ہفتوں سے تو وہ اتنا مصروف تھا کہ صبح کا گیا رات میں ہی گھر لوٹتا تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر سوائے ماہرہ کے سب موجود تھے۔

"ارے ثنا بہو' یہ ماہرہ کہاں ہے؟ کیا ابھی تک سو رہی ہے؟" دادی نے گھڑی کی طرف نگاہ کی جہاں اب بارہ بج رہے تھے۔

"نہیں اماں جی۔ وہ تو آج جلدی اٹھ گئی تھی۔ حمنی اسے آکے لے گئی ہے کہ وہ دونوں آج منال کے گھر سارا دن گزاریں گی۔" حمنی اور منال' ماہرہ کی بہترین سہیلیاں تھیں بلکہ اس نے تو سعد کو بھی تھوڑی دیر قبل میسج کر دیا تھا کہ رات نو بجے سے پہلے مجھے پک نہ کرے۔ ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو چلتی رہی۔ ناشتے کے بعد سب لاؤنج میں آ گئے۔

احد کشن کے سہارے نیم دراز اپنے موبائل میں غرق تھا۔ سعد بھی کھسک کے اس کے برابر میں آگیا۔

"یقیناً" کسی کو مس کر رہے ہو' ہے نا۔" سعد نے شرارت سے جملہ اچھالا۔

"ہاں! اس پورے منظر میں ایک کمی سی ہے۔" احد نے برملا اعتراف کیا۔

"یقیناً" حسینہ عالم کی۔" سعد ہنسا تو احد بھی مسکرا دیا۔

"ہاں یار۔ پہلے والٹ میں سے تصویر غائب اور آج اتنے دن بعد گھر پر ہوں تو وہ منظر سے غائب۔"

"اس کو اپنی محبت کا یقین دلاؤ' پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سعد نے مشورہ دیا۔

"ڈونٹ وری۔ وہ مجھ سے کبھی دور نہیں جاسکتی۔ وہ صرف میری ہے۔" احد کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

"تم بھی اپنی خوش فہمی دور کر لو تو زیادہ بہتر ہے۔" سعد کو احد کے سکون سے چڑ ہوئی تھی۔ احد نے کچھ نہ کہا صرف ہنستا رہا۔ اس کی نظریں عائشہ پر تھیں جو اپنی شادی کی تیاریوں کے ذکر پر کھلی پڑ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

دوپہر تک راوی چین ہی لکھتا رہا۔ مگر سہ پہر میں افضل ماموں اور فضا ممانی کی مٹھائی سمیت آمد نے سب کو حیران کر دیا۔ وہ اسجد کے لیے ماہرہ کا ہاتھ مانگنے آئی تھیں۔

"بس ثنا! تم ماہرہ کو میرے گھر کی بہو بنا دو' بہار آجائے گی میرے گھر میں ارے مجھے تو کبھی خیال ہی نہ آتا مگر رومانہ نے اس طرف میری توجہ دلائی۔ اسے بڑی چاہ ہے کہ ماہرہ اس کی بھابھی بنے۔"

"صحیح کہتی ہوں بھائی صاحب! راج کرے گی ماہرہ۔ میرا اسجد تو لاکھوں میں ایک ہے۔" اب ممانی کا روئے سخن احمد ریاض کی طرف تھا اور افضل ماموں ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

"آپ کی بات بجا بھابھی اسجد اچھا بچہ ہے' مگر بات یہ ہے کہ ہم نے ماہرہ کے لیے ابھی ایسا کچھ سوچا نہیں' وہ کچھ اتنی بڑی بھی نہیں ہے اور پھر اسے تو ابھی مزید تعلیم حاصل کرنی ہے۔" احمد ریاض نے سبھاؤ سے بات کا جواب دیا۔

"ارے بھائی صاحب میں کون سا فوری شادی کے لیے کہہ رہی ہوں۔ اکلوتا بیٹا ہے میرا' خوب ہی ارمان نکالوں گی اور پھر آج کل کے بچے تو بالا ہی بالا سب ہی طے کر لیتے ہیں تب کہیں جا کر بڑوں کی باری آتی ہے۔ ماہرہ نے تو رومانہ سے اسجد کا موبائل نمبر لیا ہوا ہے۔ بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ دونوں کی پسندیدگی ہے ایک دوسرے کی جانب' جبھی تو میں آئی ہوں۔" ممانی

کا انداز بہت ٹھوس تھا۔ وہاں موجود سب شاک کی کیفیت میں تھے۔ دادی، فائزہ بہو اور عمر ریاض تو بالکل خاموش تھے۔ ثنا احد تھیں جن کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا جبکہ احمر ریاض نے ناگواری سے پہلو بدلا تھا۔

"فضا بھائی، ہم آپ کو سوچ کر جواب دیں گے۔" احمر ریاض نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بھئی ثنا تمہارے میکے میں کوئی دو، چار رشتے تو ہیں نہیں، اکلوتا بھائی ہوں، اس لیے جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے۔" افضل ماموں نے بھی جتاتے ہوئے ثنا کو مخاطب کیا۔

"فکر نہ کریں بھائی صاحب، جو بھی ہو گا، اچھا ہی ہو گا۔" ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان چاروں کے کانوں تک بھی ساری گفتگو پہنچ چکی تھی۔ عائشہ اگر ساکت تھی تو سعد اور فہد بھی اپنی جگہ خاموش تھے۔ رہی بات احد کی تو وہ بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔ جو کچھ فضا ممانی کہہ کر گئی تھیں کیا وہ سچ ہے؟ ماہرہ اسجد کو کیسے پسند کر سکتی ہے۔ وہ اپنی بائیک نکال کر روڈ پر لے آیا۔

"اتنی بدگمان ہو گئیں تم ماہرہ مجھ سے کہ راستہ ہی بدل لیا۔" نہ منزل کا پتا تھا نہ راستے کا بس وہ چلا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دادی کے کمرے میں اس وقت دونوں بیٹے اور بہوئیں موجود تھیں اور اسجد کے رشتے پر گفت و شنید ہو رہی تھی۔

"ثنا بہو، بے شک جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ مگر پھر بھی افضل اور فضا کا رشتہ لے کر آنا تھوڑا عجیب لگا۔ اسجد ہماری ماہرہ سے تقریباً دس سال بڑا ہے اور عمروں میں اتنا فرق کافی معنی رکھتا ہے۔" دادی ثنا سے مخاطب ہوئیں۔

"اور اماں میں نے تو ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ ماہرہ میرے گھر کی دلہن بنے گی، کہا اب تک اس لیے نہیں کہ بچے پڑھ رہے ہیں ان کے کچے ذہنوں پر کوئی بار نہ پڑے۔" فائزہ ایک افسوس کی سی کیفیت میں تھیں۔ بیگم فاطمہ، فائزہ کی بات سے متفق تھیں وہ خود بھی یہی چاہتی تھیں۔

"میرا تو خیال ہے کہ ثنا تم فضا کو منع کر دو۔ گھر کی بچی گھر میں ہی رہے اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" بیگم فاطمہ کا انداز حتمی تھا۔ ثنا اندر ہی اندر سلگ اٹھی مانا کہ بچوں کی تربیت میں ان کا بھی بڑا ہاتھ تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ ہر فیصلہ وہی کریں ثنا فی الوقت خاموشی سے ساس اور جٹھانی کی بات سن رہی تھیں۔

اسجد ان کا اکلوتا بھانجا تھا اور بے حد پڑھا لکھا تھا اور پھر افضل بھائی کی ساری جائیداد کا وارث تھا۔ جبکہ احد اور سعد کو تو عملی زندگی میں سیٹ ہونے کے لیے کافی وقت درکار تھا انہیں ماہرہ کے لیے یہ رشتہ ہر لحاظ سے بہتر لگ رہا تھا اور جس طرح فضا بھابھی وثوق سے باتیں کر کے گئی تھیں اس سے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اسجد تو راضی ہے ہی، ماہرہ کو بھی یقیناً کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اس سے تو بس سرسری سا پوچھنا ہی بہت تھا۔ اصل مسئلہ تو احمر ریاض کی طرف سے تھا جو اس وقت بیگم فاطمہ کے گھٹنے سے لگے ان کا ایک ایک حرف بغور سن رہے تھے۔

"دیکھو احمر چاہتا تو میں بھی یہی ہوں کہ تمہاری بیٹی ہمیشہ کے لیے میری بیٹی بن جائے، مگر ہمیں خود سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے ماہرہ کی مرضی جاننی چاہیے۔" عمر ریاض جو کافی دیر سے خاموش تھے۔ پہلی بار انہوں نے اس پوری گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ احمد ریاض بھی یہی چاہتے تھے۔

"ہاں اماں میرا بھی یہی خیال ہے۔ پہلے مجھے ماہرہ سے پوچھ لینے دیں، ہو سکتا ہے بات واقعی پسندیدگی تک پہنچ گئی ہو جب ہی تو اسے نمبر لینے کی حاجت ہوئی ورنہ یہی ماہرہ تھی جو ماموں کے گھر جانے سے بدکتی تھی۔" ثنا یہ رشتہ ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے رسانیت بھرے لہجے میں ساس سے گویا ہوئیں، آج پہلی بار وہ رشتوں کو دولت کے ترازو میں پرکھ رہی تھیں۔ ان کی نظروں کے سامنے بھائی کے گھر کے ٹھاٹ باٹ گھوم گئے۔

بیگم فاطمہ ریاض نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہ کیے تھے۔ ان کی زندگی تجربات کا نچوڑ تھی۔ ثنا کے انداز سے وہ جان گئی تھیں کہ چھوٹی بہو کا جھکاؤ کس طرف ہے۔

"ٹھیک ہے ثنا بہو۔ تم ماہرہ کی مرضی معلوم کر لو۔ مگر یاد رکھنا اگر وہ رضامند نہ ہوئی تو تم اس پر زبردستی نہیں کر سکتیں۔" بیگم فاطمہ کا انداز فیصلہ کن تھا۔ جس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

ماہرہ سعد کے ساتھ نو بجے گھر آ چکی تھی۔ سعد نے پورے راستے خاموشی سے ڈرائیونگ کی تھی۔ وہ احد کے لیے فکرمند تھا جو بنا جائے سردی میں بغیر کسی گرم کپڑے کے یونہی باہر نکل گیا تھا۔ اس کا سیل فون بھی بند جا رہا تھا۔ ماہرہ نے سعد کی خاموشی کو محسوس نہ کیا۔ سارا دن وہ سہیلیوں کے ساتھ اتنا بولتی رہی تھی کہ اب منہ بھی کھولنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ گھر آ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ موبائل کے ذریعے کھینچی جانے والی تصاویر دیکھیں جو اس نے منال کے گھر لی تھیں۔ پھر اپنے چہرے کا مساج کیا اس کے بعد آرام دہ انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی اور کولڈ کریم کا اپنے پیروں پر مساج کرنے لگی۔ سردیاں شروع ہوتے ہی اسے اپنی حساس جلد کی فکر پڑ جاتی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ ان لاک تھا۔ اس نے آ جاؤ کہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ یا تو ماما ہوں گی یا عائشہ۔

مگر توقع کے برعکس دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو احد کو سامنے کھڑا پایا۔ اس کا انداز جارحانہ تھا۔

"احد تم؟" وہ ایک دم اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔ کولڈ کریم کی بوتل اس کی گود سے پھسل کر کارپٹ پر گرتی چلی گئی۔ یہ شخص کسی اور کا ہونے جا رہا تھا۔ یہ احساس اس کا دل چیر دیتا تھا۔ آج چھٹی کے دن اس کا احد سے کم سے کم سامنا ہو، اس لیے اس نے پورا دن منال کے گھر گزار دیا تھا۔

"میں سمجھتا تھا ماہرہ کہ وقت آنے پر تم میرے ہر جذبے سے روشناس ہو جاؤ گی کہ سچائی اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ اور اگر وہ سچائی محبت کی ہو تو پھر اسے کسی اظہار کی ضرورت نہیں رہتی بہت دفعہ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا، کئی دفعہ میرے دل نے یہ مجھے باور کرایا کہ ماہرہ احمر کے دل میں بھی میری محبت کی کونپل پھوٹ گئی ہے..... مگر آج مجھے معلوم ہوا میں غلط تھا میں غلط ہوں۔ کیوں ماہرہ کیوں۔

تم کسی غلط فہمی کا شکار تھیں تو مجھ سے کہا ہوتا، مجھ سے پوچھا ہوتا۔ مگر یوں راستہ تو نہ بدلتیں۔" کہتے کہتے اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

"کیا ہو گیا ہے احد؟ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔" اس کا روپ ہی نہیں، انداز اور الفاظ بھی ماہرہ کو حیران کر رہے تھے۔

"صحیح کہہ رہا ہوں ماہرہ..... اب بھلا تمہیں میری باتیں کیوں سمجھ آئیں گی..... اب تم وہ ماہرہ احمر تھوڑی ہو جو ہر بات کے لیے میری طرف دیکھتی تھی۔ اب تو تم اسجد افضل کی بننے جا رہی ہو۔" احد نے اسے کندھوں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں ماہرہ کے کندھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

"واٹ..... دماغ صحیح ہے تمہارا احد عمر، چھوڑو مجھے، میں کیوں کسی اسجد افضل سے شادی کروں گی۔" اس نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں پر سے ہٹائے۔

"تو پھر تمہارے ماموں ممانی کیوں آئے تھے یہاں آج اسجد کا رشتہ لے کر؟ بولو جواب دو۔ اور تمہاری فضا ممانی، ان کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ تم اسجد سے موبائل پر بات کرتی رہی ہو، تمہاری اس کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔ جب ہی وہ یہاں تمہارے لیے رشتہ لے کر آئے ہیں۔" احد نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

"یہ..... یہ سب ممانی نے کہا ہے؟" یہ انکشاف سن کر وہ شاکڈ رہ گئی۔

"یہ غلط ہے' جھوٹ ہے بکواس ہے۔ میں نے رومانہ آپی سے اسجد بھائی کا نمبر ضرور لیا تھا۔ اور ایک ہی بار میری ان سے بات ہوئی ہے۔ مگر اس مقصد سے میں نے انہیں فون نہیں کیا تھا کہ میں ان کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی بڑھاؤں۔" وہ پوری قوت سے چلائی۔ عائشہ جو کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی' ٹھٹک گئی۔ وہ کافی دیر سے گرینی کے پاس تھی۔ گرینی آج بہت چپ چپ سی تھیں اور ان کی چپ سے وہ باخبر تھی۔ ماہرہ کے ماموں' ممانی کی مٹھائی کے ٹوکرے سمیت آمد نے اس کو بھی شاکڈ کر دیا تھا۔

"اسجد اور ماہرہ' ماہرہ اور اسجد' نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" جو راز اس نے سوچا تھا کہ ایک شخص کے بعد کبھی کسی پر ظاہر نہ کرے گی کہ اسے اپنی بہن کی عزت بہت عزیز تھی' آج ماہرہ کو بتانے کا وقت آ گیا تھا۔ پھر ماہرہ جو بھی فیصلہ لیتی یہ اس کی مرضی پر منحصر تھا۔

"اور تم' تم کون ہوتے ہو احد عمر مجھ سے یہ سارے سوال جواب کرنے والے۔ تمہیں کیا پروا ہے کہ میں اسجد سے شادی کروں یا کسی اور سے تم تو خوش ہونا۔ تم نے جو چاہا وہ پا لیا۔ شادی کر رہے ہو عائشہ سے' مجھ سے محبت کے دعوے ہیں' بہترین دوست سمجھتے تھے مجھے اپنا' اور میں ماموں کے گھر کیا گئی تم نے بالا ہی بالا سب طے کر لیا۔" کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

"واٹ..... تم سے کس نے کہا کہ میں عائشہ سے شادی کر رہا ہوں۔" احد کو جھٹکا لگا۔ عائشہ بھی دروازے پر آ کر رک گئی۔ اسے بھی ماہرہ کے جملے نے ساکت کر دیا تھا۔

"کیا میں نہیں جانتی کہ جوک آف دا ایئر کے بعد والی رات جب تم عائشہ کے پاس آئے تھے۔ اس کی دلجوئی کرنا' اس کے آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھنا' اس کو چاکلیٹ دینا یہ سب کیا تھا اور پھر جس طرح بعد میں تم اس کا سایہ بنے رہے ہو' احد' عائشہ' احد' عائشہ' ہر چیز میں اسے فوقیت دینا' اس کی تعریف و ستائش کرنا اور پھر سعد نے مجھے خود بتایا کہ عائش کی شادی ہو رہی ہے۔ اور لڑکا بھی گھر کا ہی ہے..... بولو تمہارے سوا کون ہو سکتا ہے احد عمر۔" ماہرہ روتے ہوئے اونچی آواز سے کہے چلی جا رہی تھی۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ سب سوچنے کی۔" احد نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

"تم جانتی ہو عائشہ کون ہے میرے لیے؟" احد کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ماہرہ کی سسکی نکل گئی۔ اسی وقت عائشہ اندر داخل ہوئی۔ وہ خود کو ان کے درمیان آنے سے روک نہ پائی تھی۔

"احد چھوڑ دو۔ واٹ آر یو ڈوئنگ؟ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ احد کی گرفت سے ماہرہ کا ہاتھ چھڑانے لگی۔

"تو پھر اس کی غلط فہمی دور کر دو۔" کہتے ہوئے احد نے ایک جھٹکے سے اسے بیڈ پر گرا دیا احد کا یہ روپ عائشہ کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس نے تو آج تک ہنستے مسکراتے احد کو ہی دیکھا تھا۔

"اگر عائشہ درمیان میں نہ آ جاتی تو پتا نہیں ماہرہ میں تمہیں کیسے ٹریٹ کرتا۔

"وہ میرے لیے بہن کی طرح ہے۔ کیا ہوا جو سگی بہن نہیں ہے مگر مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے۔ شرم آ رہی ہے مجھے تمہاری سوچ پر' تم وہ ہستی ہو جس سے میں نے محبت کی۔ جس کو میں نے بچپن سے لے کر اب تک ہر لمحہ چاہا۔ جس کے سارے ارمان پورے کرنے کے لیے میں ہر پل سوچتا رہتا ہوں۔" اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ہارے ہوئے شخص کی طرح وہ ماہرہ کے کمرے سے باہر نکلا تھا۔

اس کے دل نے کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا کہ جب پہلی بار وہ ماہرہ کے روبرو اظہار محبت کرے گا تو کون کون سے لفظ چن کر نہ لائے گا۔ کسی پھولوں سے بھرے گوشے میں بیٹھ کر وہ اس کے سامنے اپنا دل پیش کرے گا تو کیسے کیسے تشبیہات و استعارات اپنی گفتگو میں ٹانکے گا۔ اسے بتائے گا کہ وہ اسے پہلی بار کب اچھی لگی تھی۔ اور آج جب اظہار محبت کیا تو کس انداز میں.....

وہ جا چکا تھا۔ عائشہ خاموش کھڑی تھی اور ماہرہ بیڈ پر سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ سے بیڈ کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی اور دونوں پیروں کے انگوٹھے قالین کے ڈیزائن میں کبھے ہوئے تھے۔ پھر پہلے عائشہ کی خاموشی ٹوٹی' وہ ماہرہ کے نزدیک کھڑی تھی اس کے برابر میں بیڈ پر ٹک گئی اور جیسے ہی اس نے ماہرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ عائشہ نے اسے رونے دیا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ ماہرہ کس ذہنی کیفیت سے اس وقت گزری ہوگی۔ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی اس کے بعد سے اس کی اور احد کی جو ذہنی ہم آہنگی میں اضافہ ہوا تھا یقیناً" اس نے ماہرہ کو تب سے اکیلا اور تنہا کر دیا تھا اور آج جب محبت کی حقیقت کا انکشاف ہوا بھی تو کس انداز سے..... اس پر افضل ماموں اور ممانی کا اسجد کا رشتہ ماہرہ کے لیے لے کر آنا اور یہ تاثر دینا کہ سب کچھ اسجد اور ماہرہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔

"ماہرہ..... بس کرو۔ کتنا روؤ گی۔" عائشہ نے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کیا۔

"مجھے معاف کر دیں عائش۔ میں نے سب غلط سمجھا' آپ کے اور احد کے مابین تعلق کو نہ سمجھ سکی۔" وہ عائشہ کے گلے سے لگی یہی کہتی جا رہی تھی اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"میں تم سے بالکل بھی ناراض نہیں ہوں ماہرہ۔ میں جانتی ہوں یہ ایک غلط فہمی تھی جو غلط رنگ اختیار کر گئی۔" عائشہ نے نرمی سے ماہرہ کو تسلی دی۔

"مگر احد..... وہ تو مجھ سے ناراض ہے نا..... اس نے بھی تو غلط سمجھا کہ میں اور اسجد بھائی..... جبکہ میں نے ان کا موبائل نمبر اس لیے لیا تھا تاکہ میں ان سے خود ان کے متعلق بات کر سکوں وہ شاید کسی..... ذہنی الجھن کا شکار ہیں۔" ماہرہ کہتے کہتے جھجک گئی۔

"ممانی نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ میں نے اسجد بھائی کا نمبر کسی پسندیدگی کی وجہ سے نہیں لیا تھا..... میں تو احد کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی..... اور مجھے تو یہ سوچ سوچ کر بھی دکھ ہو رہا ہے کہ ماما' پاپا بھی میرے متعلق کیا سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے بالا ہی بالا سب کچھ کر لیا۔" وہ بہت دل گرفتہ تھی۔

پھر عائشہ کا محبت بھرا لمس پا کر وہ سب کچھ کہتی چلی گئی۔ جوک آف دا ایئر کے بعد احد کا عائشہ پر مہربان ہونا' اس کی غلط فہمی' ماموں کے گھر جانا اور آخر میں اسجد کی ذہنی حالت۔ اس نے عائشہ کی سمت دیکھا کہ شاید اسجد کے متعلق سن کر اسے کچھ حیرت یا استعجاب ہو جیسے خود ماہرہ کو ہوا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر حد درجہ سکون تھا۔

"مجھے یقین آ گیا ماہرہ! خدا واقعی سمیع و بصیر ہے۔ وہ دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مانگنے والا کون ہے اور کس مکتبہ فکر سے ہے..... یہودی ہے' عیسائی ہے یا مسلمان۔ بس وہ پھیلے ہوئے ہاتھ اور دل کی سچائی کو پرکھتا ہے۔" عائشہ آہستہ آہستہ کہتی جا رہی تھی۔ ماہرہ کی سوالیہ نظریں عائشہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

"لوگ خدا کے گھر جا کر دعا مانگتے ہیں اور میں نے' میں نے پہلی بار مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر مانگا بھی تو کیا..... تمہارے کزن اسجد کے لیے بددعا..... اور دیکھو اس نے وہ بھی سن لی۔" عائشہ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔

"تو کیا؟..... آپ' آپ لیزا ہیں؟" ماہرہ کی پوری حیرت اس ایک جملے میں سمٹ آئی تھی۔ اس کی نگاہوں کے آگے اسجد کی فرسٹریشن گھوم گئی۔

"نہیں' لیزا میری سویٹ سسٹر تھی۔ مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑی اور میرا نام عائشہ سے پہلے ماریانہ تھا۔ یہ نام تو اسلام قبول کرنے کے بعد گرینی نے دیا ہے مجھے۔

لوگ جب امریکہ کا تصور کرتے ہیں تو ان کے دھیان میں ایک پر تعیش زندگی آ جاتی ہے۔ جہاں جانے کا ہر کوئی خواب دیکھتا ہے۔ جہاں کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وہ سرد لوگوں کا ملک ہے۔ مگر کسی نے آج تک یہ نہیں جانا کہ ان سرد چہروں کے پیچھے جذبات سے دھڑکتے دل بھی ہوں گے۔

ہم فرینڈ اسمتھ کی بیٹیاں ہیں۔ مگر میں نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا کہ ہمارے گھر کوئی فیملی فوٹو نہ تھا۔ وہ میری پیدائش سے چند ہفتے قبل ہمارے گھر کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ میری مدر بہت بیوٹی فل وومن تھیں اور لیزا ان کا ہو بہو عکس' میرے فادر کے جانے کے بعد میری مدر کی ہم پر سے توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ وہ دن رات ڈرنک کرنے لگیں اور اس کے باعث ایک دن ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس وقت لیزا اے لیول میں تھی اور میں سکستھ اسٹینڈرڈ میں۔ لیزا نے اپنی اسٹڈی چھوڑ دی۔ مگر وہ چاہتی تھی میں ضرور پڑھوں۔ اس لیے اس نے ہر رنگ اپنے وجود سے الگ کر کے رکھ دیا اور صرف مجھ پر اپنی توجہ فوکس کر دی۔

پہلے اس نے دو ایک چھوٹی نوکریاں کیں۔ پھر کیتی کے پاپا کی مدد سے اسے کیرین ایڈور ٹائزنگ میں اسائنلشٹ کی جاب مل گئی۔ کیتی نیویارک میں ہمارے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ وہ وہاں تعلیم کی غرض سے مقیم تھی جبکہ اس کی فیملی سان فرانسسکو میں تھی۔ لیزا کو اسائنلشٹ کی جاب ملنے کے بعد ہم بھی نیویارک سے سان فرانسسکو آ گئے۔ یہاں ہمیں سوائے کیتی کی فیملی کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ کیتی کو اردو بولنا آتی تھی وہ ایک انڈین فیملی سے تھی۔ اس سے دوستی کے بعد لیزا کو بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بولنا آ گئی۔

سان فرانسسکو' مرینا (marina) میں ہم نے ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا تھا۔ جہاں سے کوسٹ (coast) کا نظارہ بڑا دلفریب لگتا تھا۔ لیزا اور میں اکثر بیچ (Beach) پر چلے جاتے اور ایک دوسرے کی سنگت سے لطف اندوز ہوتے اور شاید زندگی اسی خوب صورتی کے سنگ بیت جاتی اگر ہم دونوں کے درمیان کوئی تیسرا نہ آ جاتا۔

ان دنوں میں آکنامکس میں گریجویٹ کر رہی تھی اور ساتھ ہی ایک پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہی تھی۔ کیونکہ اب میں لیزا کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتی تھی۔ نیو ایئر آنے والا تھا اور اس دوران بہت کچھ سستے داموں پر مل جاتا تھا۔ ہم نے بھی اپنی پرانی گاڑی بیچ دی تھی۔ اور ایک نیلام گھر Auction سے سیکنڈ ہینڈ مگر بہترین کنڈیشن کی کار خرید لی تھی۔ وہ دن ہم دونوں کے لیے بہت خوب صورت دن تھے۔

پھر ایک دن کیتی کی کال آئی۔ Yacht club میں نیو ایئر پارٹی تھی۔ وہ چاہتی تھی لیزا بھی وہاں آئے۔ کیتی ایک فلائنگ برڈ (Flying bird) تھی اور اس کے سارے دوست جن کے ساتھ وہ پڑھتی تھی وہ بھی کم و بیش اس کے جیسے تھے۔ پہلے وہ نیویارک میں تھی اور آج کل نیو ہیون میں۔ مگر فیملی کے ساتھ نیو ایئر سیلی بریٹ کرنے سان فرانسسکو آئی تھی۔ ساتھ اس کے کچھ دوست بھی تھے۔ میں نے اس رات لیزا سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی فرینڈ کی پارٹی میں جائے میں میں سیلف پارٹی (self party) کروں گی۔ لیزا اس رات yacht club کی پارٹی میں گئی تو میری بہن تھی۔ مگر جب واپس آئی تو اس کے ہونٹوں پر ایک ہی شخص کا نام تھا۔ سیج (Saje) وہ کیتی کا فرینڈ تھا اور کیتی کے انوی ٹیشن پر نیو ہیون سے آیا تھا' کسی بزنس اسکول میں تھا اور یہ اس کا لاسٹ سمسٹر تھا۔ یہ سب مجھے لیزا نے بتایا میں خوش تھی کہ وہ اپنی زندگی جینا شروع کر رہی ہے۔ اپنی زندگی کے کئی سال اس نے مجھے سنوارنے میں گزار دیے تھے امریکہ جیسے ملک میں یہ بڑی انوکھی بات تھی۔ جہاں بالغ ہوتے ہی بچے اپنے ماں باپ کے بھی نہیں رہتے۔ وہاں ہم دونوں کے درمیان سسٹر ریلیشن شپ ہی سب کچھ تھا۔"

عائشہ چند ثانیوں کے لیے چپ سی ہو گئی اور ماہرہ کو لگا کہ یہ لمحے گویا صدیاں بن گئے ہوں۔ اس کا پورا جسم کان بنا ہوا تھا۔ یہ تو اسے اندازہ ہو تا جا رہا تھا کہ ماریانہ اور لیزا کی زندگی میں کوئی انہونی ہوئی تھی۔ جس کا اسجد بھائی سے گہرا تعلق تھا۔ مگر اس انہونی کی انتہا کیا تھی۔ یہ صرف عائشہ بتا سکتی تھی۔

" ماریانہ تم نے ٹچ می ناٹ (Touch me not) کا پلانٹ دیکھا ہے۔ کیسے چھونے کے احساس کو سمیٹ کر اپنا آپ بند کر لیتا ہے۔ میرا بھی سیج کی محبت میں یہی حال ہے۔" لیزا ہر روز اس سے ملتی اور ہر دن کا ایک نیا حال سناتی۔ پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ "وہ کچھ دنوں کے لیے نیو ہیون جانا چاہتی ہے۔ "سیج" نے اسے انوائٹ کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے میں اس کے ساتھ چلوں۔ کین یو گو ودمی ؟ (کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟) اس کے انداز میں ایک جھجک تھی۔ وہ مجھ سے پانچ سال بڑی تھی' وہ اپنے فیصلے لے سکتی تھی۔ مگر وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی' مجھے بتا رہی تھی۔ میرا خیال کر رہی تھی۔

میں نے بخوشی اس سے کہا کہ وہ چلی جائے' اس کے ساتھ انجوائے کرے۔۔۔ اب میں بڑی ہو چکی ہوں۔ وہ راضی نہ تھی مگر میرے اصرار پر چلی گئی۔ جانے سے ایک رات پہلے اس نے سیج کو ہمارے مرینا کے چھوٹے سے فلیٹ پر انوائٹ کیا۔ مجھے بھی وہ دراز قد اسمارٹ سا ایشین اپنی بہن کے لیے اچھا لگا۔

نیو ہیون سے واپس آ کر میری بہن پھول کی طرح کھلی کھلی نظر آنے لگی تھی۔ اس کی خوب صورتی' جوبن پر تھی۔ وہاں وہ دونوں خوب گھومے پھرے' جگہ جگہ تصاویر بنوائی تھیں۔

" ماریانہ سیج پاکستان جا رہا ہے' اس نے کہا کہ وہ اپنے فیملی سے ہماری شادی کی بات کرے گا۔" تین مہینے بعد وہ مجھے بتا رہی تھی۔ وہ سیج سے شادی کرنا چاہتی تھی کیونکہ نیو ہیون میں گزارے خوب صورت لمحوں نے انہیں ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا تھا۔ ایک ننھی سی روح اس کے اندر آ بسی تھی۔ ہمارے لیے وہ لٹل اینجل (Little angle) بہت قیمتی تھا۔ سیج کے جانے کے بعد وہ اکثر کیتی کی مدر کے پاس چلی جاتی اور ان کے ساتھ خوب اردو بولنے کی پریکٹس کرتی اور جب جب سیج سے رابطہ ہوتا۔ اس سے اردو میں بات کرنے کی کوشش کرتی۔ ڈلیوری کے دن قریب آنے لگے۔ لیزا کا شادی کا تقاضا بڑھنے لگا۔ وہ اپنے پیرنٹس کی فیملی لائف دیکھ چکی تھی وہ اپنے بچے کو ویسی لائف نہیں دینا چاہتی تھی۔ مگر نہ جانے کیا ہوا سیج نے اپنا سیل نمبر چینج کر دیا یا جانے آف کر دیا تھا اس پر not respond آ رہا تھا۔

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح مرینا کے چھوٹے سے فلیٹ کے چکر کاٹتی رہتی۔ اس نے اپنی جاب بھی چھوڑ دی تھی۔ ہر وقت کوسٹ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھی رہتی۔

مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ میں نے کسی طرح کیتی سے رابطہ کیا۔ اسے ساری صورت حال بتائی اور سیج سے رابطے کا کوئی اور ذریعہ مانگا۔ اتفاقاً" کیتی کے پاس سیج کا لینڈ لائن نمبر تھا۔

جس دن وہ نمبر ملا میں بے حد خوش تھی کہ لیزا آج سیج سے بات کر سکے گی۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتی تھی اور یہی سرپرائز اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

رات دس بجے کا وقت تھا۔ ویک اینڈ نائٹ تھی۔ میں نے اپنے موبائل سے سیج کے گھر کے نمبر پر کال کرنا شروع کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ جب سیج مجھ سے بات کرنا شروع کرتا تو اس کی آواز۔۔۔ پورے کمرے میں پھیل جاتی اور لیزا کی سماعتوں سے بھی ٹکراتی جو کھڑکی کے پاس موجود کوسٹ کی روشنیوں کو جلتے بجھتے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا اتنے دن بعد لیزا سیج کی آواز سن کر خوشی سے پھولی نہ سمائے گی۔

لیزا کو اردو آتی تھی۔ وہ بول بھی سکتی تھی اور سمجھ بھی سکتی تھی۔ پر مجھے نہ اردو بولنی آتی تھی نہ سمجھ آتی تھی۔ صرف چند ٹوٹے پھوٹے جملے جو میں لیزا کی زبان سے سن سن کر جان گئی تھی۔ فون کسی خاتون نے اٹھایا تھا۔ میرے انگریزی میں تعارف کرانے پر ان کے جو منہ میں آیا وہ بولتی چلی گئیں۔ پھر ان خاتون نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور فون اس کو تھما دیا۔

"سیج میں ماریانہ ہوں۔"

"میں سیج نہیں ہوں' میں اسجد افضل ہوں۔"

"سیج' جلدی آ جاؤ' لیزا تمہارا انتظار کر رہی ہے' اسے تمہاری ضرورت ہے۔"

" تم جانتی ہو ماہرہ اس نے کیا کہا۔" عائشہ نے ماہرہ کی سمت نظر کی ماہرہ نے اس کی طرف دیکھا۔ عائشہ کی آنکھیں بہت سرخ تھیں۔

اس نے کہا۔ "وہ تو سب میرا پاس ٹائم (وقت گزاری کا ذریعہ) تھا۔ ایسی عیاشیاں تو میں نے نیوہیون میں بہت کی ہیں۔ اور ویسے بھی لیزا میرے لیے مناسب نہیں۔ اگر میں نے اسے اپنایا تو میری ماں مجھ سے چھوٹ جائے گی۔ وہ خود کشی کرلے گی۔ وہ کسی اپنے سے کمتر، جس کے باپ کا بھی پتا نہ ہو، میری شادی نہیں کر سکتی۔"

"اور اس بچے کا کیا ہوگا۔" میری آواز میں لرزش تھی۔

"جب میری ماں لیزا کو قبول نہیں کر سکتی تو اس بچے کو کیسے کرے گی۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وہ میرا ہی بچہ ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے اور لوگوں سے بھی تعلقات ہوں۔" اسجد کے لہجے میں سفاکی تھی۔ وہ نیوہیون میں گزارے سارے دن بھول چکا تھا۔

"اگر وہ اس بچے کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی تو کسی یتیم خانے میں ڈال دے۔ اللہ حافظ۔"

"سیج عرف اسجد افضل، اس نے مجھے گڈبائے کہا اور لیزا نے زندگی کو۔۔۔ جو میں نہیں سمجھی تھی وہ سب بھی سمجھ گئی تھی۔۔۔ اسجد کی مدر کی ساری گفتگو اور پھر اسجد کا کہا ایک ایک لفظ۔۔۔ وہ مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ ماں کے جانے کے بعد سے وہ میرا سایہ بنی رہی تھی مگر عدم کو جاتے ہوئے اس نے مجھے پانچ منٹ بھی نہ دیے۔۔۔ اس کا دل اسجد کے پاس تھا۔ جب اسجد نے اسے مایوس کیا تو وہ دل لیزا کے کام کا بھی نہیں رہا۔ لیزا کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔۔۔ اور وہ ننھا سا وجود جسے میں دن میں کئی بار مخاطب کرتی تھی اور جس کے لمس کو محسوس کرتی تھی۔ جو کچھ دنوں بعد ہمارے مرینا کے فلیٹ میں رنگ بھرنے والا تھا۔۔۔ وہ بھی لیزا کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اسجد کی آواز نے سارے رنگ اجاڑ دیے۔ کوسٹ کی بتیاں بجھ گئیں۔ سارا عرش خالی ہو گیا۔ وہ رات میری زندگی کی بھیانک رات تھی۔ باہر پھیلی تاریکی اور اندر کمرے میں میری بہن کا سرد جسم۔" اتنا کہہ کر عائشہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔ ماہرہ گنگ تھی۔ ایسی محبت، اتنا درد اور یہ انجام۔ اسے اب سمجھ آیا تھا عائشہ اس رات اندھیرے سے کیوں ڈر گئی تھی اور اسے اکیلے رہنے پر بھی کیوں ڈر لگتا تھا۔ وہ عائشہ سے لپٹ گئی اور خود بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔

"بہت روئی ہوں میں ماہرہ بہت۔۔۔ لمحہ لمحہ پل پل۔۔۔ اور پھر ایک دن میں یونہی اسلامی ریسرچ سینٹر چلی آئی اور اس سے ملحقہ مسجد کی سیڑھیوں کے ٹھنڈے فرش پر جانے کتنی دیر بیٹھی رہی یہاں تک کہ مغرب کی اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ تب میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھول کر پھیلا لیے اور سیج کو بددعا دی۔ دل سے، بے تحاشا بہت ساری۔

میں نے کہا۔ "اے خدا تو سیج کو سزا دے کہ اسے اپنے وجود سے گھن آئے۔ وہ اپنے چہرے سے نفرت کرے۔ لیزا کو اس نے صرف وقت گزاری کا ذریعہ سمجھا تھا نا۔ اسے سچ مچ لیزا سے محبت ہو جائے۔ ہر ایک کے روپ میں اسے وہی نظر آئے۔ وہ اکیلا، تنہا رہ جائے اور اس کی یہ تنہائی اس کے ماں باپ کو خوار کر دے۔ وہ زندہ رہے۔۔۔ مگر زندگی نہ جیے۔" ماہرہ کو عائشہ کے کہے لفظوں پر جھرجھری آگئی۔۔۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ سیج عرف اسجد کے لیے ماریانہ کے دل میں صرف نفرت ہی ہو سکتی تھی۔

"جیسے جیسے میں اپنے الفاظ دہراتی گئی۔ پرسکون ہوتی گئی اور پھر وہیں ٹیک لگا کر ستون سے بیٹھی رہی۔ اس کے بعد مجھے خبر نہیں۔ سردی کی شدت اور تیز بخار نے مجھے دنیا سے بے خبر کر دیا۔ مگر خدا مجھ سے بے خبر نہیں تھا۔ گریٹی کو میں وہاں فجر کے وقت ملی۔ ان کا اپارٹمنٹ مسجد سے کافی قریب تھا۔ جب میں ہوش میں واپس آئی تو ان کے اپارٹمنٹ میں تھی۔

گریٹی اور عدیل نے مجھے بہت سنبھالا۔ مجھے دوبارہ سے تعلیم مکمل کرنے پر زور دیا۔ گرین نے مجھے بہت پیار دیا۔ گریٹی سے ضد کر کے میں نے اردو بولنا سیکھی۔ میں ایک بار پاکستان آکر اس شخص کو ڈھونڈنا چاہتی تھی، دیکھنا چاہتی تھی کہ کسی کی زندگی اجاڑ کر وہ کتنا مطمئن ہے۔ یہاں آکر جہاں مجھے بہت سارا پیار ملا۔ وہاں احد جیسا پیارا بھائی بھی ملا۔ جوک آف دا ایئر والے واقعے کے بعد جبکہ میں دل گرفتہ تھی اس نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے مجھے سسٹر کہہ کر پکارا تھا تو مجھے لیزا بہت یاد آئی۔ تب میں نے اسے لیزا کے بارے میں بتایا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے عزیز رکھتا ہے۔"

عائشہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

ماہرہ مجرم نہ تھی مگر شرمندہ تھی۔ اسجد نے اس کی بہن کے ساتھ برا سلوک کیا تھا اور خود اس نے عائشہ اور احد کے رشتے کی پاکیزگی پر شک کیا تھا۔ عائشہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دراز تک گئی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کچھ تصویریں تھیں۔ اس نے وہ ماہرہ کے ہاتھ میں تھما دیں۔ وہ لیزا اور سیج کی نیوہیون کی تصویریں تھیں۔ وہ واقعی پری چہرہ تھی۔ کتنی ہی دیر تک ماہرہ ان تصویروں پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ پھر دوبارہ عائشہ کے گلے لگ گئی۔

"عائش مجھے معاف کر دیں۔ پلیز۔۔۔ آپ میری وجہ سے بھی ہرٹ ہوئی ہیں نا۔"

"ارے ماہرہ کم آن۔۔۔ وہ تو غلط فہمی تھی نا۔ اب تو دور ہو گئی۔ ویسے بھی اس گھر سے مجھے بہت پیار ملا ہے۔" عائشہ نے مسکرا کر اس کے گال پر پیار کیا۔

"ایک بات ابھی بھی میری سمجھ نہیں آئی۔ آپ کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔ سعد تو کہہ رہا تھا کہ گھر کا لڑکا ہے۔ احد ہے نہیں، سعد ہو نہیں سکتا اور فہد تو بہت چھوٹا ہے۔ تو پھر کون ہے؟" ماہرہ ابھی بھی کنفیوز تھی۔

"سوچو۔" عائشہ مسکائی۔

"ہے تو گھر کا لڑکا۔۔۔ مگر اب لڑکا کہنے کی عمر سے تجاوز کر گیا ہے۔" عائشہ نے سرپرائز کو تھوڑا سا کھولا۔

"یو مین؟ عدیل چاچو۔۔۔ مطلب آپ ہماری چاچی بننے جا رہی ہیں۔ واؤ۔" ماہرہ زور سے اچھلی اور پھر اس سے لپٹ گئی۔

"گریٹ نیوز۔۔۔ مگر عدیل چاچو، وہ تو آپ سے چھ سات سال تو بڑے ہوں گے نا۔"

"ہاں! مگر انڈر اسٹینڈنگ کے آگے عمر کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انہوں نے مجھ سے چلتے وقت کہا تھا کہ "عائشہ وقت ہر گھاؤ مندمل کر دیتا ہے۔ صوفیہ کی موت کے بعد مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اب کسی کے لیے محبت کے جذبات محسوس نہ کر پاؤں گا۔ مگر آج لگ رہا ہے کہ میں آپ کو بہت مس کروں گا۔ مجھے آپ میں صوفیہ کا عکس نظر آتا ہے۔"

"تب میں نے ان سے کہا تھا کہ زندگی کے جس لمحے بھی آپ مجھے مس کریں۔ مجھے آواز دے دیجیے گا۔" عائشہ کے چہرے پر سکون تھا۔

"جیو چاچی یعنی لڑکا، لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" ماہرہ ایک بار پھر اس کے گلے کا ہار بن گئی۔

"اب لپٹنا چھوڑو اور ہونے والی چاچی کا آرڈر سنو۔ جاکے اپنے محبوب کو مناؤ۔"

"میں اور احد کے کمرے میں جاؤں نہ۔ اس وقت تو وہ خونخوار بلا بنا ہوا ہے۔" اس کے اندر سے پرانی والی ماہرہ نکل کے آئی۔

"یہ تصویر یاد ہے۔" عائشہ نے ایک اور تصویر اپنی دراز سے نکال کر اس کی نظروں کے سامنے کی یہ اس کے بچپن کی تصویر تھی وہ اسکول یونیفارم پہنے، دو چوٹیاں باندھے، منہ بسورے کھڑی تھی۔

"یہ تو میں ہوں پر یہ تو بہت پرانی تصویر ہے۔ آپ کے پاس کیسے آئی؟ یہ تو دادی کے فوٹو البم میں تھی۔" ماہرہ حیران سی تھی۔

"میرے پاس تو بڑی مشقتوں سے آئی ہے کسی کے والٹ کی زینت بنی ہوئی تھی۔ بقول سعد کے یہ احد کی حسینہ عالم ہے۔ اس تصویر کی وہ جان سے زیادہ حفاظت کرتا تھا۔" عائشہ مسکراتے ہوئے کہے جا رہی تھی۔

"یہ۔۔۔ احد کے والٹ میں تھی۔" ماہرہ کو شاک لگا۔

"یقین کرلو کہ وہ تمہیں کتنا چاہتا ہے، ہم جب بھی ساتھ ہوتے تھے وہ تمہاری ہی بات کرتا تھا اور تمہارا ہی ذکر کرتا تھا۔" عائشہ نے اس کا محبت سے ہاتھ دبایا اور اس کے ذہن میں احد اور سعد کے درمیان ہونے والی گفتگو چلنے لگی۔ جس میں اکثر حسینہ عالم کا ذکر ہوتا تھا۔

"تو اس کا مطلب سعد بھی سب کچھ جانتا تھا۔"

"صرف وہی نہیں گھر بھی اور فائزہ تائی بھی۔"

"تو کیا ایک صرف میں ہی بے خبر تھی۔" اسے ملال نے آگھیرا۔

"کسی حد تک یہ بات درست ہے کہ تم احد کی محبت سے بے خبر تھیں۔ مگر اس کی محبت کی سچائی نے تمہارے اندر بھی تو اپنی جڑیں پھیلانا شروع کردی تھیں نا۔" عائشہ نے اس سے پوچھا اور اس کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

"جب حقیقت سورج کی طرح اپنی کرنیں پھیلا دے تو پھر اس کا اقرار کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اسے منالو..... وہ روٹھا نہیں ہے۔ بس منہ موڑ کے بیٹھ گیا ہے۔ ہر دفعہ وہ تمہیں اسمائل اور سوری پیش کرتا ہے آج تم یہ فارمولا آزماؤ۔" عائشہ کے سمجھانے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک بات میں بھی آپ سے کہنا چاہتی ہوں عائشہ۔" ماہرہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

"میں جانتی ہوں اسجد بھائی آپ کے اور لیزا کے مجرم ہیں۔ مگر آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ انہیں معاف کردیں' میں نے دیکھا ہے وہ بہت مشکل میں ہیں۔ صرف یہی سوچ کر معاف کردیں کہ لیزا نے ان سے بے حد محبت کی ہے پلیز۔" وہ عائشہ کے ہاتھ تھامے ملتجی انداز میں کہہ رہی تھی۔

شاید مستند ڈاکٹر بھی کبھی یہ نہ مان پائیں کہ یہ بیماری کسی بددعا کا شاخسانہ ہے مگر ماہرہ جانتی تھی کہ مظلوم کے اٹھے ہوئے ہاتھ عرش ہلا دیتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

احد کا دروازہ بند تھا۔ مگر لاک نہیں تھا۔ وہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ احد کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور نظریں آسمان پر تھیں۔ آسمان ٹمٹماتے ستاروں سے روشن تھا۔

"کیا اپنے نام کا ستارہ ڈھونڈ رہے ہو؟" وہ آہستہ روی سے چلتی احد کے برابر میں جا کھڑی ہوئی۔ احد نے باہر کے منظر سے نظریں ہٹا کر ماہرہ کے صبیح چہرے پر نظریں جما دیں۔

"تم روتی رہی ہو نا۔" ماہرہ کی آنکھیں رونے سے سرخ اور پپوٹوں کے غلاف بھاری ہو رہے تھے۔

"تم بھی تو روئے ہو۔" ماہرہ اپنی نرم و نازک انگلیاں اس کی آنکھوں پر پھیرنے لگی۔ اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک احد کی روح میں سرائیت کرتی جارہی تھی۔

پھر اس نے اپنے سویٹر کی جیب میں سے چاکلیٹ نکالی۔ اس کا ریپر اتار کر احد کی طرف بڑھایا۔

"ہر دفعہ تم مجھے مناتے تھے نا۔ آج میں تمہیں منانے آئی ہوں۔ اپنی حسینہ عالم کو معاف نہ کرو گے؟"

"ایک شرط پر۔" احد نے اسے اپنے روبرو کیا۔

"جب میری حسینہ عالم مجھے معاف کردے گی تب میں یہ چاکلیٹ کھاؤں گا۔"

"میں احد سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی؟" ماہرہ نے آہستگی سے کہا۔

"احد بھی کبھی اپنی ماہرہ سے نہیں روٹھ سکتا..... میں نے آسمان پر کبھی اپنا ستارہ نہیں ڈھونڈا۔ کیونکہ میری محبت کا ستارہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے اور وہ صرف تم ہو ماہرہ۔ تمہاری محبت کے جگنوؤں سے میری ہر رات روشن رہتی ہے اور ہر صبح میں تازہ دم اٹھتا ہوں۔" اس نے منہ کھول کر آدھے سے زیادہ چاکلیٹ کھالی اور باقی ماہرہ کے منہ میں ڈال دی۔ اب ماہرہ کے ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھے۔

"کٹ' کٹ۔ اس سے زیادہ جذباتی سین اور ڈائیلاگ تب ادا کیے جائیں گے جب والدی حضور شہزادہ عالم اور حسینہ عالم دونوں کو ایک دوسرے کے نام کی انگوٹھی پہنائیں گی۔" دروازہ دھاڑ سے کھلا اور سعد نے انٹری دی۔ ماہرہ نے احد کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اس کا ہاتھ تھامے رہا۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میں تم سے ڈھائی منٹ بڑا ہوں۔ میرا ادب کیا کرو۔" احد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"احد برادر مجھے بعد میں گھور لینا۔ پہلے ذرا

دروازے کی سمت دوبارہ نظر کرلو اور بھی معزز ہستیاں ہیں۔" سعد نے اس کی گھوری کو ہوا میں اڑایا۔ دروازے سے عائشہ' فہد اور دادی داخل ہو رہے تھے احد نے فوراً" ماہرہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جواباً" سعد کا قہقہہ جاندار تھا اور ماہرہ کے ہونٹوں پر جھینپی جھینپی مسکراہٹ تھی۔

دادی نے دونوں کو آگے بڑھ کر اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ انہیں یقین تھا کہ اس نئے سال میں ان کے گھر میں ایک نہیں دو خوشیاں دستک دینے والی ہیں اور اس خوش کن احساس نے ان کے بوڑھے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیت الریاض (۲) میں ایک خوب صورت شام کا منظر اترا ہوا تھا۔ عدیل بھی کل شام کی فلائیٹ سے پاکستان آچکے تھے۔ سب لوگ لان میں جمع تھے۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ اس لیے احد نے بڑے آرٹسٹک طریقے سے کوئلے کی انگیٹھیوں کو لان میں مختلف انداز میں رکھا ہوا تھا۔ سعد نے لاؤنج کی راہداری میں پورا میوزک سسٹم ترتیب دیا ہوا تھا۔ گویا یوں لگ رہا تھا کہ دیواروں سے موسیقی پھوٹ رہی ہو۔

سعد' احد اور ماہرہ اپنے عدیل چاچو کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے اور یہ اگلوانے میں مصروف تھے کہ آخر کیوپڈ کا تیر ان کے جگر کے پار کیسے ہوا اور عدیل صرف ہنسنے میں مصروف تھے فہد نوٹس بورڈ باہر لے آیا تھا ساری شکایتیں اس پر سے صاف کرنے کے بعد اب جلی حروف میں شادی مبارک کا دعوت نامہ لکھنے میں مگن تھا۔

عائشہ ان کے درمیان موجود نہ تھی۔ سب نے اسے اتنا چھیڑا تھا کہ وہ چائے بنانے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اولڈ پارٹی ان سب سے قدرے دور بیٹھی شادی کے متعلق تیاریوں کو موضوع بحث بنائے ہوئے تھی۔

عائشہ اور عدیل دونوں کی یہی متفقہ رائے تھی کہ فضول رسومات میں پیسے ضائع کرنے کے بجائے شادی سادگی سے کی جائے۔ کیونکہ عائشہ اپنی بہن لیزا کے نام پر بے گھر بچوں کے لیے پاکستان میں ایک ٹرسٹ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اور عدیل اس کا ہمنوا تھا اور عائشہ اور عدیل کے ولیمہ والے دن احد اور ماہرہ کی منگنی ہونا قرار پائی تھی۔ ماہرہ کی فضا ممانی کو اسجد کے لیے انکار کہلوا دیا گیا تھا اور یہ کام کسی اور نے نہیں بلکہ خود شا نے کیا تھا۔ وہ جب ماہرہ سے احد یا اسجد دونوں کے متعلق رائے لینے اس کے کمرے میں آئیں تو ماہرہ کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھی لیزا اور اسجد کی ایک تصویر پر ان کی نظر پڑ گئی۔ جو بھولے سے وہیں رہ گئی تھی۔ تصویر دیکھ کر وہ بری طرح چونکی تھیں اور پھر ان کے بہت اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی ماہرہ کو سب کچھ ان کے گوش گزار کرنا پڑا۔

کہتے ہیں واپسی کا راستہ آسان ہوتا ہے۔ مگر وہ خود

بہت دقتوں سے ماہرہ کے کمرے سے اپنے کمرے میں آئی تھیں۔ گو کہ انہیں بہت اچھا سسرال ملا تھا مگر اکثریت کی طرح وہ بھی اپنے میکے کی طرف جھکاؤ رکھتی تھیں۔ بھائی بھاوج کے گھر دولت کی ریل پیل بھانجے کی اعلا تعلیم اور ترقی کرتا کاروبار' بھائی کے میکے کی طرف سے معزز ہونے کی سند نے ان کی آنکھوں کے آگے سب بہت اچھا ہے۔ کی چادر تان دی تھی۔ وہ عجیب سے احساسات سے دوچار تھیں اور یہ احساسات وہ احمر ریاض سے بھی چھپانا چاہتی تھیں۔ جن سے وہ ماہرہ کے پاس آنے سے پہلے کافی دیر تک احد کی نسبت اسجد کی حمایت میں بحث کرتی رہی تھیں۔ وہ خدا کی بے حد شکر گزار تھیں اور خدا کے بعد عائشہ تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک غلط فیصلہ کرنے سے بچ گئی تھیں اور اس رات انہوں نے بہت دیر تک اپنے سب بچوں کے لیے بہت دل سے دعا کی تھی اور اسجد کے لیے بھی جس نے محبت کی قدر نہ کی اور ماں کی جذباتیت اور اعلا حسب نسب کے زعم کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فون کی بیل متواتر بج رہی تھی۔ عائشہ چائے کے تھرماس اور کپوں کی ٹرے تھامے باہر جانے ہی والی تھی۔ مگر فون سننے کے لیے رک گئی۔ جیسے ہی اس نے فون اٹھایا اور ہیلو کہا۔ دوسری جانب سے کوئی بے تابی سے شروع ہو چکا تھا۔ بنا یہ جانے کہ دوسری طرف سننے والا مطلوبہ شخص ہے یا نہیں۔

"ہیلو۔ کون ماہرہ؟ پلیز جواب دو۔"

"جی ماہرہ۔" عائشہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ وہ اسجد تھا۔ یہ آواز وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی جبکہ اسجد بس اتنا ہی جانتا تھا کہ بیت الریاض (۲) میں صرف ایک ہی لڑکی رہتی ہے اور وہ ماہرہ ہے۔ وہ عائشہ کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔

"امی کو میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ میرا رشتہ تمہارے لیے لے کر جائیں۔ پتا نہیں کیوں' وہ چاہتی ہیں کہ میں ہر جگہ سے ٹھکرایا جاؤں۔ میں خود تمہارے تو کیا کسی کے قابل نہیں پاتا۔ کبھی بہت ناز خود پر اب تو صرف اپنے آپ سے گھن آتی ہے۔

تم نے میرا گھر دیکھا ہے نا اور میرا کمرہ بھی کتنا سجا ہے۔ پتا ہے کیوں؟ تاکہ کوئی مجھے نہ جان پائے۔ میں چیزوں کو صاف کرتا رہتا ہوں۔ اجلا کرنے میں لگا رہتا ہوں۔ اس طرح اپنے میلے پن کا دھیان مجھے کم ستاتا ہے۔ مگر جب تنہائی ہوتی ہے تو وہ آجاتی ہے۔ لیزا۔ چھم سے اور جیسے کوئی ماضی کی فلم پھر سے ری پلے کر دے۔ وہ کسی اور کا مجھے ہونے نہ دے گی۔ یہاں سب جگہ اس کا قبضہ ہے۔ پورا اسجد افضل اس کا ہے۔"

اسجد کی آواز میں بہت تھکن تھی۔ پھر فون بند ہو گیا۔ عائشہ بے جان ہوئے ریسیور کو ہاتھ میں پکڑے دیکھتی رہی۔ اس نے باہر کی طرف ذرا کی ذرا نگاہ کی ایک خوب صورت شام کا منظر اس کا منتظر تھا۔

"میں نے آپ کو معاف کیا اسجد' لیزا نے بھی آپ کو معاف کیا اور اسی ننھی جان نے بھی جو اس دنیا میں ابھی نہ پائی تھی۔ مجھے خوشی ہے میری بہن نے جس شخص کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ وہ اس کے بعد پھر کسی کا نہ ہو سکا۔

مگر آج میں آپ کو دل سے دعا دیتی ہوں کہ آپ اپنی زندگی بھرپور طریقے سے گزاریں۔" عائشہ نے دل ہی دل میں اسجد کو مخاطب کیا اور ریسیور آہستگی سے کریڈل پر رکھ دیا۔ پوری چنڈال چوکڑی "چائے چائے" کے نعرے لگا رہی تھی اور چائے کے بعد ان سب کا احد کی سونفٹ میں لانگ ڈرائیو کا مزا بھی لینا تھا۔ عائشہ نے ٹرے واپس اپنے ہاتھوں میں اٹھائی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے کہ اس خوب صورت منظر میں بس ایک اسی کی کمی تھی۔

انسان کی کی کیا بساط کہ وہ کسی دوسرے انسان لیے سزا اور جزا کے فیصلے کرے۔ خدا خود سب سے منصف ہے اور وہی لکھتا سب کے نصیب ہے۔

☆

ناولٹ

مری جان

سحر ساجد

"جی فرمائیے کس سے ملنا ہے آپ کو؟" وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بے حد پروفیشنل انداز میں بولا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر "اسے" دیکھا۔

"محترمہ! میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کس سے ملنا ہے آپ کو؟" اب کے اس کا انداز طنزیہ تھا۔ وہ چند لمحے تک اسے دیکھتی رہی۔

"اپنے بیٹے سے۔" پھر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے، بے حد مدھم آواز میں کہا تھا۔

"اچھا! تو آپ کا کوئی بیٹا بھی ہے! بڑی معذرت کے ساتھ بیگم صاحبہ یہاں تو ایڈووکیٹ فیضان شاکر یا پھر محمد شاکر کا بیٹا بیٹھا ہے۔ آپ کا بیٹا تو یہاں نہیں بیٹھا۔ آپ اسے کہیں اور تلاش کریں۔" اس نے فیضان کو دکھ سے دیکھا تھا۔ اس کی زبان میں زہر بھرا تھا۔

"وہ ایسا تو نہیں تھا وہ تو بہت معصوم اور نرم دل سا بچہ تھا۔ ہاں! تب وہ "بچہ" تھا مگر اب وہ اٹھائیس سال کا نوجوان ہے۔" بے اختیار اس نے گہرا سانس بھر کر سوچا وہ چند لمحے بنا پلکیں جھکائے اسے دیکھتی رہی یوں جیسے وہ صدیوں کی پیاس بجھانا چاہتی ہو۔

"اینف مسز اقبال۔"

"مسز اقبال۔" اس نے کرب سے آنکھیں بند کی تھیں۔

"اب اتنے سالوں بعد آپ یہاں کیا لینے آئی ہیں؟ اگر آپ اپنے بیٹے سے ملنے آئی ہیں تو اتنے سالوں سے آپ کی ممتا کہاں تھی؟ یا پھر اب آپ کو بڑھاپے کا سہارا چاہیے ہے۔ جبکہ آپ کا شوہر بھی نہیں ہے۔" وہ خاموش رہی تھی وہ خاموش رہنے کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی بات میں حق بجانب تھا۔

"فیضی! کچھ اور نہیں اتنا تو یہ جان کر ہی کہ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ چند لمحے مجھے عطا کر دو میں صرف تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ بہت شکستہ لہجے میں بولی تھی۔

"کیوں؟ اب کیوں؟ یہ بات تو تب آپ کو سوچنی چاہیے تھی جب آپ اپنے پانچ سال کے بیٹے کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں، کسی اور کے ساتھ۔ اور اس کے لیے آپ نے اپنے اتنے پیار کرنے والے شوہر کو بھی چھوڑ دیا۔"

"بھاگ گئی تھیں۔" اس دفعہ اس نے اپنے لہو کو کسی تیزاب میں بدلتے ہوئے محسوس کیا۔ جو اس کے پورے بدن کو جھلسا رہا تھا، خاک کر رہا تھا۔

"میں آپ کا احترام کروں؟ تو کس حوالے سے؟ اس حوالے سے... کہ آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں گھر سے بھاگ گئیں یا پھر اس حوالے سے کہ...." وہ یکدم چپ ہوا تھا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ چند لمحے وہ منہ پھیر کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے رخ موڑ کر اپنے سامنے بیٹھی اس عورت کو دیکھا۔

جس کے چہرے پر آج بھی ملال کا سایہ تک نہ تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا... بے تاثر تھا یوں جیسے ان سب باتوں سے اسے فرق ہی نہ پڑتا ہو، جیسے بہت سال پہلے اس کو چھوڑتے ہوئے اسے ان سب باتوں کی پروا نہیں تھی۔ وہ آج بھی اتنی ہی لاپروا تھی۔

"آپ اچھی ماں بن سکیں اور نہ ہی اچھی بیوی آپ ایک "بری ماں" ہیں "بری ماں"۔" اچانک وہ اشتعال سے پھٹ پڑا... اور اب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ، وہاں سے چلی گئی تھی۔

"آپ آج بھی نہیں بدلیں۔ آپ نے تو کوئی تلافی کرنے کی کوشش ہی نہیں حتیٰ کہ اپنی غلطی تک تسلیم نہیں کی۔ آپ واقعی بری ماں ہیں۔" اس کے جانے کے بعد فیضان نے بے حد تلخی سے سوچا۔

☆ ☆ ☆

ویگن سے اتر کر وہ بہت تیزی سے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے اس کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بار بار دوپٹے کے پلو سے اپنا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ گھر پہنچ کر اس نے ان بچوں کو ڈیل کرنا تھا جو کہ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے بلکہ بعض اوقات تو اسے کھانا

کھانے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ ٹیوشن پڑھاتی تھی، اسی لیے اس کی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچ سکے۔

تنگ سی گلیوں میں گزرتے ہوئے، وہ بہت تیزی سے چل رہی تھی۔ ایک گلی کا موڑ کاٹتے ہوئے وہ اچانک رکی۔ ایسا سامنے سے آنے والے شخص کو دیکھ کر ہوا تھا۔ ایک گرمی کی وجہ سے اس کا دماغ پہلے ہی تپا ہوا تھا، رہی سہی کسر اس شخص نے پوری کر دی تھی۔ اس کا پارہ اور ہائی ہوا تھا۔ وہاں... گلیاں اس قدر تنگ تھیں کہ کوئی بھی شخص باآسانی کسی بھی دوسرے شخص کا راستہ روک کر کھڑا ہو سکتا تھا۔

"راستہ دو مجھے۔" حتیٰ الامکان اس نے لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اپنے لہجے کی کڑواہٹ پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"نہ رانی نہ۔ نہ اس طرح دیکھ، دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔" وہ شخص دل و جان سے اس پر فدا ہوتے ہوئے بولا۔

"تیرے دل کو تو "کچھ" ہو ہی جانا چاہیے بالے! پتا نہیں تو اب تک زمین پر کیا کر رہا ہے۔" اب کے ہر لفظ کو چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"اوئے! زبان سنبھال کر بول! اچھی لگتی ہے تو مجھ کو اس لیے تیری یہ زبان درازی برداشت کر لیتا ہوں ورنہ... بالے کو کوئی پھول بھی مارے تو یہ بھی اسے گوارا نہیں۔" قمیص کے کالر کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ بولا۔

"بالے یہ تماشا بند کر دے ورنہ جس دن شاکر کو بتا دیا نا تو وہ حال ہو گا تیرا کہ...."

"اوئے کیوں تنگ کرتی ہے اس مسکین سے بندے کو، پڑھائی کا شیدائی ہے وہ پڑھنے دے اسے کھویا رہنے دے اسے کتابوں میں۔ اور ویسے بھی اس سے بیاہ کر کے تیرے جیسی حسین لڑکی کو کیا ملے گا؟ وہ ہی بھوک۔ وہ ہی تنگی اور زیادہ سے زیادہ ہوا بدلی ہوئی بھی تو وہ تجھے منہ دکھائی میں کتابوں کا سیٹ تحفہ دے دے گا اور تو وہ کچھ دینے کے قابل نہیں ہے۔ میری مان مجھ سے بیاہ کر لے۔ سونے میں لاد دوں گا تجھے۔ جان سے بڑھ کر چاہوں گا۔" وہ بہت پیار سے، بڑے رازدارانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔ رانیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تیرے اور تیری اس دولت دونوں پر لعنت! مجھے منہ دکھائی میں وہ کتابوں کا سیٹ نہ بھی دے تو مجھے گوارا ہے۔ پر مجھے یہ گوارا نہیں کہ تجھ جیسے کمینے کے پیسے کی پرچھائی بھی مجھ پر پڑے۔ راستہ دیتا ہے یا آواز دوں کسی کو۔" وہ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بولی۔ وہ بہت اشتعال میں تھی۔

"جان من! اس طرح غصے سے کیوں دیکھتی ہے جاتا ہوں۔ جاتا ہوں۔" اور پھر نصیبو لعل کا گھٹیا سا گانا گاتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رانیہ چند لمحوں تک بے بسی سے وہیں کھڑی رہی۔ وہ بالے کے سامنے زبان چلانے کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ وہیں سر پکڑ کر روئے۔

یہ ہر دوسرے تیسرے روز کا معمول بن چکا تھا۔ بہت تھکے تھکے انداز میں وہ گھر میں داخل ہوئی... اور وہاں موجود بچوں کو دیکھ کر اس کی بدمزگی میں اور اضافہ ہوا تھا۔ وہ انہیں چھٹی بھی نہیں دے سکتی تھی اگر وہ انہیں چھٹی دے دیتی تو ان سب کی مائیں باری باری آ کر اس پر چڑھائی کر دیتیں یوں جیسے فیس میں وہ اسے "روپے" نہیں "ڈالرز" دیتی تھیں۔

"زندگی میں پہلے ہی عذاب کم تھے جو ایک اور شامل ہو گیا۔" بے حد آزردگی سے اس نے سوچا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے اتنی چپ کیوں بیٹھی ہو؟" شاکر اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ شاکر اس کا خالہ زاد اور منگیتر تھا۔ اور ان دونوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ ابھی بھی وہ دیوار پھلانگ کر رانیہ کی چھت پر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"تو نے بتایا نہیں کہ کیوں اتنی چپ چپ ہے؟"

شاکر نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی۔" تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا تھا۔

پہلے اس کا دل چاہا کہ وہ شاکر کو بتا دے مگر پھر وہ یہ سوچ کر خاموش رہی کہ اس کے امتحان ہونے والے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ذرا سا بھی ڈسٹرب ہو۔

"نہیں۔۔۔ کچھ تو ہے جو چھپائی ہے مجھ سے۔" رانیہ نے شاکر کی اس بات پر شاکر کو غور سے دیکھا۔۔۔ چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کو یونہی دیکھتے رہے اور رانیہ ہنس دی تھی۔

"کیسی ہو رہی ہے تیری تیاری؟"

"ہوں۔ اپنی طرف سے تو پوری کوشش ہے۔" شاکر نے جواب دیا تھا۔

"تو دعا کرنا۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"تجھے لگتا ہے کہ میں نہیں کرتی۔" وہ بڑے ناز سے بولی تھی۔ شاکر نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔۔۔ اور رانیہ نے بات بدل جانے پر شکر ادا کیا تھا۔

رانیہ اور شاکر بچپن ہی سے ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ شاکر ایک ذہین طالب علم تھا اور ماسٹر ڈگری لینا اس کا خواب تھا۔ جس کے لیے وہ سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

اس کے گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ پڑھائی کا خرچہ افورڈ کر سکتا اس لیے وہ جگہ جگہ ٹیوشنز پڑھا کر اپنا خرچہ پورا کرتا تھا' نا صرف وہ ٹیوشنز پڑھاتا تھا بلکہ کاغذ کے لفافے بھی بناتا تھا۔ وہ پری انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا جہاں تک رانیہ کا تعلق تھا تو وہ بھی پڑھنا چاہتی تھی مگر پھر وہی حالات کا مسئلہ۔۔۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ کالج سے گھر آئی تو اس کے گھر میں چند خواتین صحن میں بیٹھی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہیں' بہرحال وہ انہیں سلام کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ ابھی اس نے سکھ کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ اچانک اسے ایک خاتون کی آواز سنائی دی تھی۔

"رانیہ کو کس چیز کی کمی ہو گی ہمارے گھر' عیش کرے گی عیش۔۔۔ اقبال بہت چاہتا ہے اس کو۔" اس عورت کی آواز میں تکبر جھلک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی اور اسے صورت حال سمجھنے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں لگی۔۔۔ وہ بے دم ہو کر بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ خواتین اقبال کا رشتہ لے کر آئی تھیں یہ جاننے کے باوجود کہ وہ منگنی شدہ تھی۔

"اتنا کمینہ ہو سکتا ہے یہ شخص' اقبال! رانیہ اتنی کمزور نہیں جتنا تو نے اسے سمجھ لیا ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھی تھی اور دوبارہ سر پر چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ وہ نہیں جانتی۔۔۔ تھی کہ اس کی ماں ان خواتین کو کس طرح سے ٹالنے والی تھی بہرحال یہ ایک مشکل کام تھا اور یہ مشکل کام اسے خود ہی آسان بنانا تھا۔

"رانیہ! کہاں جا رہی ہے؟" اس کی ماں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آ رہی ہوں۔" وہ جلدی میں کہتے ہوئے وہاں سے نکل آئی تھی۔

گھر سے باہر نکل کر اس کا رخ سیدھا اقبال کے ٹھکانے کی طرف تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے کہاں ملے گا۔ وہ جب وہاں پہنچی تو وہ حسب معمول دوستوں کے ساتھ پان کھانے اور ٹھٹھے لگانے میں مشغول تھا۔

"بالے!" اتنے سارے مردوں کا لحاظ کیے بغیر وہ اونچی آواز میں بولی۔ اس کے اندر آگ ہی ایسی لگی تھی۔ بالے سمیت باقی افراد نے بھی کافی حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"تو یہاں کیوں آئی ہے؟" بالا اس کے پاس آ کر غصے سے بولا۔

"عقل ٹھکانے لگانی ہے تیری۔" وہ زہرخند لہجے میں بولی۔

"چل نکل ادھر سے۔" وہ اسے لے کر ایک سائیڈ پر ہو گیا۔

"بول اب! کیا کہنا ہے تجھے؟" اب کے وہ اسے تمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تجھے ابھی پتا نہیں کہ میں تجھے کتنا ناپسند کرتی ہوں اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تو اس بات سے بھی بے خبر ہے کہ میں شاکر کو کتنا پیار کرتی ہوں۔ چل آج تجھے میں بتاتی ہوں کہ میں تجھے کتنا ناپسند اور شاکر کو کتنا پسند کرتی ہوں۔ سن بالے! اگر کوئی میرے گلے پر چھری رکھ کر کہے نا کہ تجھ سے شادی کر لوں میں اپنی بوٹی بوٹی کروا لوں گی پر تجھ سے شادی نہیں کروں گی اور اگر کوئی ساری دنیا کے خزانے دے کر بھی مجھ سے شاکر کو مانگے تو میں وہ سارے خزانے اسی کے منہ پر دے ماروں گی۔ اب تو تجھے پتا لگ گیا نا! اب اپنی اماں کو میرے گھر نہ بھیجنا۔ سمجھا تو۔" بالا خاموشی سے اسے آگ بگولا ہوتا دیکھ رہا تھا۔

"اور تجھے سب کچھ پتا بھی تھا۔ پر پھر بھی تو نے یہ حرکت کی۔ پر نہیں! تو ایسی گھٹیا حرکت نہیں کرے گا تو پھر پتا کیسے چلے گا کہ تو "بالا" ہے۔" اس کا لہجہ زہر سے زیادہ کڑوا تھا۔

"اوہ! بس کر۔۔۔ جانتا ہوں کہ تو کتنا ناپسند کرتی ہے مجھے اور کتنا چاہتی ہے شاکر کو پر اس دل کا کیا کروں؟ بول رانی!۔۔۔ کیا کروں؟" وہ دل پر ہاتھ رکھے بے بس لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں شاکر کو چھوڑ کر تیرے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اتنی سی بات تیری کھوپڑی میں نہیں آتی۔" اب کے وہ زچ ہو کر بولی تھی۔

"اوئے! اڑا کر رکھ دوں گا میں شاکر کو بھی اور تجھے بھی' سو گولیاں اتاروں گا اس سالے کے سینے میں پھر دیکھوں گا کہ کیسے نہیں مانتی تو۔" وہ اچانک ہی اپنی ٹون میں آیا تھا۔

"تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تو رانیہ کو مجبور کر سکتا ہے؟ تو مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ تو کیا سمجھتا ہے تیری ان دھمکیوں سے میں مان جاؤں گی۔ اتنا یاد رکھنا بالے! شاکر نہ بھی رہا تو رانیہ پھر بھی تیری نہیں ہو گی۔ میں وہ نہیں ہوں جو "مجبور" ہو جاؤں۔ موت تو آنی ہی ہے۔ چاہے کل آئے یا آج۔ شاکر کی زندگی اگر اللہ نے کم لکھی ہے تو میں اسے زیادہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ البتہ ایک بات کا اختیار ہے میرے پاس اور وہ ہے دعا کا۔ میں دعا کر سکتی ہوں۔۔۔ وہ بھی تیری موت کی۔ سمجھا تو۔" وہ یوں بھڑک کر بول رہی تھی جیسے کہ کسی نے آگ پر تیل پھینک دیا ہو۔ اس کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ بالا اسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

"مجبور تو تجھے میں کر سکتا ہوں رانی۔۔۔ پر یہ بات سمجھنے میں تجھے دیر لگے گی۔ دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔ جو گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے اس کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔" منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑبڑایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اوئے! کون ہے؟" رانیہ کے ابا مؤذن تھے اور وہ روزانہ صبح فجر کی اذان دیا کرتے تھے۔ آج بھی جب وہ اذان دینے کے لیے آئے تو مسجد کے دروازے پر انہیں کوئی چادر لپیٹے بیٹھا نظر آیا۔ ان کی آواز سن کر وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی نہیں ہے جی! ایک راندہ درگاہ بندہ ہے۔ جس کی ہمت نہیں ہو رہی کہ رب کے حضور جا کر معافی ہی مانگ لے۔ اسی لیے چوکھٹ پر پڑا ہوں۔" وہ شخص بہت کرب سے بولا تھا۔ اس کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔ رانیہ کے ابا دم بخود رہ گئے تھے۔

"تو نے ایسا کیا کیا ہے جو تیری اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔" اب کے وہ نرمی سے بولے تھے۔

"یہ پوچھیں کہ کیا نہیں کیا میں نے۔" وہ شخص ابھی بھی بہت دکھ سے بولا تھا۔

"اوئے جھلیا! رب سوہنا تو انتظار میں ہوتا ہے کہ کون اس کے پاس ندامت سے جھکا ہوا سر پشیمانی سے بھرا ہوا دل لے کر آئے اور پھر وہ رب سے معافی مانگے اور وہ اسے معاف کر دے۔ تو نے سنا نہیں کہ وہ سوہنا تو "التواب" (توبہ قبول کرنے والا) ہے۔۔۔ تو پھر تو اندر کیوں نہیں جاتا۔" وہ اس شخص کے کندھے پر ہاتھ

رکھتے ہوئے اُسے سمجھاتے ہوئے بولے۔
"آپ میری اس سے سفارش کردو جی! کہہ دو جی کہ میں آئندہ کوئی گناہ نہیں کروں گا۔" رخ موڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
"اوئے کانوں کو ہتھ لگا! میری کیا مجال کہ میں سفارش کروں۔۔۔ میں تو خود اس کے حضور اپنی سفارش نہیں کر سکتا۔ چل اندر آجا شاباش۔" وہ اسے بازو سے پکڑتے ہوئے بولے تھے۔
"نہیں جی! وہ مجھے دھتکار دے گا۔" وہ شخص اب روتے ہوئے بولا۔
"اوئے پاگل ہوا ہے۔ چل اندر آ۔" وہ زبردستی اسے اندر لے گئے تھے۔
اندر جانے کے بعد وہ شخص دروازے کے پاس ہی ایک ستون کے قریب بیٹھ گیا - جبکہ رانیہ کے ابا نے پہلے مسجد میں جھاڑو دی' موٹر چلا کر پانی بھرا اور پھر وضو کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اذان دی تھی۔
اذان دینے کے کچھ لمحے بعد ہی نمازی مسجد میں آنا شروع ہوگئے تھے اور وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔ نماز اور قرآن کی تلاوت سے جب وہ فارغ ہوئے تو انہیں اس شخص کا خیال آیا - وہ اٹھ کر مسجد کے دروازے کی طرف گئے - وہ شخص وہاں نہیں تھا۔
"اللہ جانے! کون ہے۔" وہ سوچتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے۔

☼ ☼ ☼

"سلام خالہ!" اقبال نے بہت تمیز سے رانیہ کی ماں کو سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام۔" انہوں نے گھٹے گھٹے انداز میں جواب دیا۔
"خالہ کہاں اتنی گرمی میں جا رہی ہے۔ میں چھوڑ دیتا ہوں تمہیں۔" اس نے کہا تھا۔
"نہیں چلی جاؤں گی میں۔"
"خالہ! تو میری ماں جیسی ہے اور میری ماں اگر اتنی دوپہر میں یوں جاتی تو کیا میں جانے دیتا۔ آجا میں چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ زبردستی رانیہ کی ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔
اتنی گرمی میں پیدل جانے سے بہتر تھا کہ وہ اقبال کی آفر قبول کر لیتی۔ یہی سوچتے ہوئے کچھ ٹال مٹول کرنے کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔
"نئی گاڑی لی ہے تو نے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ بہت اشتیاق سے بولی تھی۔
"ہاں خالہ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔
"تیری اس کرم نوازی کی وجہ جانتی ہوں میں۔" وہ اچانک سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔ بالے نے گاڑی روک لی۔
"خالہ! ٹھیک کہتی ہے تو! دیکھو بندہ جب بیمار ہوتا ہے تو ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ میرے مرض کا علاج بھی تیرے پاس ہے۔ خالہ! میں تیری رانیہ کو "پھول" کی طرح ہتھیلی پر سجا کر رکھوں گا۔ اس شاکر سے شادی کر کے کیا ملے گا اسے! وہی بھوک۔۔۔ وہی تنگی۔۔۔ وہی افلاس۔ نہ کر اتنا ظلم اپنی بیٹی پر۔ اتنی خوبصورت۔ اتنی نازک سی ہے تیری بیٹی! میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت خوش رکھوں گا اسے ہاتھ جوڑتا ہوں میں تیرے سامنے۔" وہ واقعی - میں ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔
"بالے! وہ تو سب ٹھیک ہے پر تیرا پیشہ بہت گندا ہے رانیہ کا باپ کبھی نہیں مانے گا۔" رانیہ کی ماں شش و پنج کا شکار ہوتے ہوئے بولی -
"میں چھوڑ دوں گا سب کچھ! تجھے تو پتا ہے خالہ اتنے مربع زمین ہے ہماری یہ سب نہ بھی کروں تو عیش ہیں ہمارے! تیری رانیہ تو ڈبیا میں بند رکھنے کے لائق ہے اور شاکر سے شادی کر کے رل جائے گی وہ نمانی۔" اس نے ابھی تک ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔
"چل اب یہ ہتھ تو کھول۔" وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر کھولتے ہوئے بولی -
"پہلے تو وعدہ کر تو میرا ساتھ دے گی۔"
"دیکھ بالے! اگر تو یہ سب کچھ چھوڑ دے تا پھر ہو سکتا ہے کچھ ہو سکے۔"

"خالہ! تو میرے ساتھ ہے تو پھر سب کچھ ہو جائے گا۔ چل میں تجھے گھر چھوڑ دوں راستے میں کولڈ ڈرنک بھی پلاؤں گا۔" اب کے وہ خوش ہو کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا تھا۔
وہ کہتے ہیں نا کہ زہر کو زہر ہی مارتا ہے سو اقبال نے بھی یہی کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رانیہ کی ماں حسرتوں میں گھری عورت تھی اور اگر وہ کسی کو آسانی کے ساتھ ٹریپ کر سکتا تھا تو وہ اس کی "ماں" ہی تھی۔
"اب دیکھتا ہوں رانی! کیسے مجبور نہیں ہوتی تو۔" واپس جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر بہت مکارانہ مسکراہٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

آج وہ شخص انہیں اسی ستون کے قریب بیٹھا ملا تھا۔ جہاں وہ کل اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ آج بھی اس کا چہرہ چادر میں لپٹا تھا۔
"تو آگے کیوں نہیں بڑھتا۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے بولے۔
"یہاں تک تو لے کر آیا چاچا!۔۔۔ اب آگے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔" وہ شخص بہت اداسی سے بولا تھا۔
"تو ترا جھلا ہی ہے اٹھ کھڑا ہو۔ وضو کر اور رب کو یاد کر۔" وہ اسے کھڑا کرتے ہوئے بولے۔
"وضو!" اس نے گھبرا کر کہا۔
"کیوں! کیا نہیں کرنا آتا۔" وہ اس کی گھبراہٹ سے یہی سمجھے تھے۔
"آتا ہے۔"
"تو پھر؟"
"رب کے سامنے تو شرمسار ہوں۔ تیرے سامنے بھی شرمسار ہونے سے ڈرتا ہوں چاچا۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولا۔
"بھلا تو کیوں شرمسار ہو گا میرے سامنے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"چل وضو کر۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے وضو والی جگہ کے پاس لے آئے -
وہ شخص چند لمحے تو یونہی کھڑا رہا اور پھر ہچکچاتے ہوئے اس نے چادر اتاری تھی۔ رانیہ کے ابا اُسے دیکھ کر حیران پریشان رہ گئے تھے۔ کتنے ہی لمحے وہ کچھ کہہ ہی نہ سکے تھے۔
"اقبال تو۔" چند لمحوں بعد وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اٹھ جا بالے! دیکھ دھوپ سر پر چڑھ آئی ہے رات پتا نہیں کہاں آوارہ گردی کرتا ہے اور پھر صبح آکر سویا رہتا ہے۔" بالے کی ماں اسے جگاتے ہوئے بولی تھی۔
"اماں! سونے دے مجھے اور دیکھ رات میں آوارہ گردی نہیں کرتا۔۔۔ اس سالے کا دل جیتنے جاتا ہوں۔" وہ بگڑ کر بولا۔
"کیا بات کرتا ہے۔۔۔ تیری بات میری سمجھ سے تو باہر ہے۔"
"تو اپنی سمجھ کو نہ ہی استعمال کر تو بہتر ہے اور جا۔۔۔ جا یہاں سے سونے دے مجھے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر اپنی ماں سے بولا
"سالا بڑا مولوی بنا پھرتا ہے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مولوی بنائے گا۔ راتوں کی نیند حرام کر دی ایک دفعہ رانیہ مل جائے پھر کون سی مسجد اور کیسی نماز!" بڑبڑاتے ہوئے وہ دوبارہ چادر تان کر سو گیا۔

☼ ☼ ☼

"رانیہ کے ابا! اتنے چپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟"
ہاجرہ (رانیہ کی ماں) نے چائے دیتے ہوئے پوچھا۔
"سوچتا ہوں! رب سوہنا بھی کیا کیا کمال کرتا ہے' کافر کو مسلمان۔۔۔ اور مسلمان کو مومن بنا دیتا ہے صرف اک لمحے کی دیر ہوتی ہے اور بس۔ اللہ اکبر۔" وہ بہت سنجیدگی سے بولے۔
"ایسا کیا ہوا ہے جی؟ جو آپ اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔" ہاجرہ کچھ حیرت سے بولی تھی - وہ ہلکا سا مسکرائے

"اقبال کو جانتی ہے؟... بالا... وہ جاوید کا بیٹا۔"

"ہاں... ہاں جانتی ہوں۔" وہ یکدم گھبرا گئی — کیونکہ رانیہ کے لیے اس کے رشتے والی بات ہاجرہ نے ان سے نہیں کی تھی۔

"ہاں! اللہ جسے ہدایت دے۔ آج کل وہ مجھ سے پہلے مسجد میں موجود ہوتا ہے۔ جھاڑو لگاتا ہے، پانی بھرتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور قرآن سیکھتا ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں اسے دیکھ کر... ایسے ایسے کمال ہوتے ہیں اس دنیا میں، ورنہ وہ اور اس کا باپ... اللہ اس کے باپ کو بھی ہدایت دے۔" رانیہ کے ابا اپنی جون میں ہی بولے جا رہے تھے۔

"میں سب کچھ چھوڑ دوں گا خالہ۔" جبکہ ہاجرہ کے کان میں بار بار اقبال کے یہی الفاظ گونج رہے تھے۔

"میری رانیہ عیش کرے گی۔" چند لمحوں بعد وہ بڑبڑائی — اور اس کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک ابھری تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ مغرب کی نماز پڑھ کر اٹھی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی اس کی اماں نے دروازہ کھول دیا۔ یوں جیسے وہ کسی کے انتظار میں ہوں۔

دعاؤں کا ورد کرتے ہوئے، وہ جائے نماز تہہ کرنے لگی۔ وہ جائے نماز رکھ کر مڑی ہی تھی کہ ہاجرہ ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"جا رانیہ جا کر چائے بنا اور کچھ چیزیں میں نے منگوا کر رکھی ہیں وہ لے آنا چائے کے ساتھ۔" وہ بہت جوش سے بولی۔

"کون ہے اماں؟"

"تو جانا... جا کر چائے بنا۔" وہ حیران ہوتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اور جب وہ چائے دینے کے لیے گئی تو اسے لگا کر ٹرے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گی۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا۔ وہ اقبال کی ماں تھی۔

اقبال کی ماں کا آنا اس کی سمجھ میں آتا تھا مگر اپنی ماں کی خوشی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ چائے رکھ کر واپس آگئی — اک الجھن سی تھی جو اس پر سوار ہو گئی تھی اور وہ اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ بہت بے چینی سے چکر کاٹ رہی تھی۔

"کیوں آئی تھیں وہ؟" اس کے جاتے ہی وہ تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلی۔

"یہ برتن سمیٹ اور انہیں صاف کر دے۔" اس کی ماں نے سخت لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ اور وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"اماں!"

"سنا نہیں چل جا کر برتن صاف کر۔" اب کے وہ اسے جھاڑ پلاتے ہوئے بولی — پتا نہیں کیوں مگر اس کا دل یکدم رونے کو چاہا تھا۔ آنسو بہاتے ہوئے وہ خموشی سے برتن اٹھانے لگی۔ پیاس کے احساس کے تحت اس کی آنکھ کھلی تھی اور وہ پانی پینے باورچی خانے میں آئی تھی۔ اسے اماں ابا کے باتیں کرنے کی آواز آئی تھی۔

رات کے اس وقت وہ تھوڑا حیران ہوئی تھی۔

"ہو سکتا ہے کوئی ضروری بات ہو۔" پانی پیتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ واپس جاتے ہوئے وہ یکدم ٹھٹک کر رکی تھی۔ اس کے رکنے کی وجہ اس کا اپنا "نام" تھا جو ان دونوں کی گفتگو میں آیا تھا۔

"ہاں! بدل تو وہ کافی چکا ہے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے اور تو اور لوگوں کی رائے بھی اس کے بارے میں بدلنے لگی ہے۔" اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی تھی۔ فوری طور پر وہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہے ہیں۔

"ایک دن راستے میں ملا تھا وہ مجھے... بڑی عزت کی اس نے میری۔ منت کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ خالہ سب کچھ چھوڑ دوں گا۔" رانیہ کی دلچسپی اچانک ہی بڑھی تھی۔

"پر ہاجرہ! خدا سے ڈر لگتا ہے رانیہ کی بچپن کی منگنی ہے اور منگنی وعدہ ہوتی ہے۔ میں وعدہ خلافی سے ڈرتا ہوں۔" یہ اس کا باپ کیا کہہ رہا تھا۔

"مولوی صاحب! ہر کوئی اپنا بھلا سوچتا ہے آج کل اور آپ وعدہ پورا کرنے کے چکروں میں اپنی ہیرو ں جیسی بیٹی کو رول دیں گے۔" اس کی ماں تیکھے انداز میں بولی تھی۔ رانیہ کے لیے اب کھڑا ہونا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا تھا... کیا کر رہے تھے اس کے ماں باپ" صورت حال ابھی پوری طرح سے اس پر واضح نہیں ہوئی تھی۔

"پر یہ بھی سوچ آتی ہے ذہن میں کہ رانیہ کی وجہ سے ایک انسان ہدایت کے راستے پر آگیا... اور اگر اس کی مراد پوری نہ ہوئی تو وہ پھر بھٹک سکتا ہے... باغی ہو سکتا ہے۔" مولوی صاحب پرسوچ انداز میں بولے تھے۔

"ہاں کہہ دیجیے مولوی صاحب! رانیہ کا تو دین اور دنیا دونوں کا نفع ہے پھر دیر کیسی؟ اقبال جیسا رشتہ دوبارہ نہیں ملے گا اور وہ شاکر وہ تو نمازیں بھی پوری نہیں پڑھتا۔" ہاجرہ نے زور دے کر کہا۔

"جو اللہ کو منظور میں شاکر کے باپ سے بات کر کے دیکھتا ہوں، اگر وہ مان گئے تو سو بسم اللہ... نہیں تو پھر یہ منگنی توڑنی پڑے گی۔"

"بات کرنے کی کیا ضرورت ہے، سیدھے سیدھے رانیہ اور اقبال کی منگنی کی مٹھائی بھیج دیں گے۔" ہاجرہ بے تحاشا خوش ہو کر بولی۔

"خدا کا خوف کر ہاجرہ! کسی کا دل دکھا کر کیا ملے گا تجھے؟" مولوی صاحب گرجے تھے۔

رات کے اس پہر... جب سارے سکون سے سوئے ہوئے تھے۔ کسی کا سکون لٹ گیا تھا۔ کوئی برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

"کیا چال چلی تھی بالے نے۔ جہاں پر اس کی سوچ ختم ہوئی تھی وہیں سے اقبال کی شروع ہوئی تھی۔"

وہ رانیہ کی شہ رگ پر چھری پھیر دیتا تو شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ مگر وہ تو اسے چھری تلے لے آیا تھا۔ اور ذبح کرنے والے ہاتھ اس کے اپنے ماں باپ کے تھے۔ اور یہ تکلیف ہر چیز سے بڑھ کر تھی۔

وہ کیسے اپنے ماں باپ کو سمجھاتی کہ یہ اس کی چال تھی... صرف ایک چال...

☼ ☼ ☼

"رانیہ! کدھر جا رہی ہے؟" اسے گھر سے باہر نکلتا دیکھ کر اس کی ماں نے کڑک کر پوچھا۔

"ادھر ہی ہوں اماں! بس ذرا خالہ کے گھر..."

"کوئی ضرورت نہیں خالہ کے گھر جانے کی آرام سے بیٹھ گھر پر۔" ہاجرہ نے پہلے سے بھی زیادہ سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"مگر کیوں اماں؟ میں پہلے بھی تو جاتی تھی۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔"

"کیوں اب ایسا کیا ہو گیا جو مجھے وہاں جانے سے روک رہی ہے۔" رانیہ بھی غصے سے بولی۔

"دیکھ رانیہ! چپ کر کے میری بات مان جا اور اندر دفع ہو۔" ہاجرہ کا غصہ اشتعال میں بدلنے لگا۔

"اماں! مجھے سمجھ نہیں آ رہی تو کیوں روک رہی ہے مجھے؟" اب کے رانیہ نے زچ ہو کر کہا۔

"تجھے ایسے سکون نہیں آئے گا۔ ہم تیری منگنی توڑ رہے ہیں شاکر سے۔ اقبال کے لیے ہاں کہہ دی ہے ہم نے۔" اگرچہ یہ بات وہ پہلے سے بھی جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کیا سوچ کر بیٹھے ہیں مگر پھر یوں ماں کے منہ سے سن کر ایسا لگا جیسے کہ کوئی انہونی ہو گئی ہو۔

وہ ننگے پاؤں کسی صحرا میں کھڑی ہو اور ریت کے گرم بگولے اسے جھلسا رہے ہوں سرتاپیر، بدن تا روح، وہ دکھ سے اپنی ماں کو دیکھتی رہی۔

"آپ ایسا کیسے کر سکتی ہے اماں؟ میں بچپن سے منسوب ہوں اس کے ساتھ۔ یہ ظلم تو مت کر۔" بے اختیار وہ رو پڑی۔

"دیکھو رانیہ! ہم تمہارا برا تو سوچیں گے نہیں۔ اقبال بدل چکا ہے۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ روز تیرے ابا کے ساتھ مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے اور۔۔۔"

"دھوکہ دے رہا ہے وہ آپ کو اور ابا کو بھی۔۔۔ آپ کس کی باتوں میں آ گئے ہیں۔" وہ اپنی ماں کی بات کاٹتے ہوئے دبے دبے اشتعال انگیز لہجے میں بولی۔

"خدا کا خوف کر رانیہ! کوئی جھوٹ موٹ کی نماز بھی پڑھتا ہے اور وہ بھی اتنے عرصے تک۔"

"یہاں پر تو لوگ خدا کو دھوکہ دینے سے باز نہیں آتے' اور تم نماز کی بات کرتی ہو اماں۔" وہ بے بس ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

"مجھ سے زیادہ بحث نہ کر۔ جو کہہ دیا۔۔۔ وہ تو نے سن لیا اور بس۔" اس کی ماں کے لہجے سے بے زاری چھلک رہی تھی۔

"تجھے اب کیا سمجھ آئے گی اماں! تیری آنکھوں پر تو دولت نے وہ پردہ ڈال دیا ہے، جو اب تجھے اپنے پرائے' کھرے کھوٹے کی پہچان ہی نہیں کرنے دے گا۔" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"زیادہ بکواس نہ کر میرے ساتھ۔" اپنی اماں کا رویہ دیکھ کر رانیہ کو یکدم ہی غصہ آیا تھا۔

"جہاں میری اتنی بکواس سنی ہے وہاں تھوڑی سی اور بھی سن لے شاکر کے علاوہ' دوسرا کوئی بھی مرد حرام ہے میرے لیے اور اگر تو نے زبردستی کی نا تو کچھ کھا کر مرنا بہت آسان ہے میرے لیے بانسبت اس کے کہ میں "اقبال" سے شادی کروں۔" آگ برساتے لہجے میں کہہ کر وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

"اچھا ہے کچھ کھا کر مر جا! ایک دفعہ ہی رو لیں گے۔ تجھے شاکر کے ساتھ تو ساری عمر رونا ہے۔" اس کی ماں نے جواب میں بہت پرسکون لہجے میں کہا تھا۔ رانیہ نے حیرت سے مڑ کر ماں کو دیکھا۔ اسے ماں کے الفاظ سے زیادہ' اس کے لہجے پر حیرت ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مولوی صاحب نے شاکر کے باپ سے بات کی تھی۔ حسب توقع وہ بھڑک اٹھا۔

مولوی صاحب کا خیال تھا کہ یہ نیکی کا کام ہے مگر وہ ان کی نیکی کو دولت کا لالچ قرار دے رہا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ جب وہ ان کی بات کو سمجھ ہی نہیں رہے تھے۔ تو بات کرنا ہی فضول تھی۔

اور انہوں نے بڑے مناسب الفاظ میں معذرت کر لی تھی یہ بات شاکر تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ پریشان سے زیادہ حیران ہوا تھا۔

رانیہ نے تو اس سے ایسی کسی بات کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور اقبال۔۔۔ اقبال کا رشتہ رانیہ کے لیے۔۔۔ اس کی حیرت تھی کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ رانیہ اس رشتے پر کبھی بھی رضامند نہیں ہوگی اور اسے یہ بھی تسلی تھی کہ رانیہ کے انکار سے مولوی صاحب بھی ایسا نہیں کریں گے۔ مگر یہ سب اس کی بھول تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اقبال نے کس طرح سے رانیہ کے ماں باپ کو ٹریپ کیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ حالات کس قدر سنگین ہو چکے ہیں۔ اسی لیے تو وہ رانیہ کے گھر چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی ہاجرہ کے ماتھے پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

"کیسی ہے خالہ؟" وہ آتے ہی بڑی بے تکلفی سے صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ غصہ تو ہاجرہ کو بہت آیا تھا مگر وہ ضبط کر گئی۔

"کیا لینے آیا ہے؟" کڑے تیوروں کے ساتھ اس نے پوچھا۔

"رانیہ پڑھنے نہیں آ رہی کافی دنوں سے تو میں نے سوچا پتا کر آؤں۔" وہ بغور خالہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"بڑا ہی بے غیرت ہے تو شاکر! اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی تو یوں منہ اٹھا کر رانیہ کا پوچھ رہا ہے۔ پر ہم بے غیرت نہیں۔۔۔ رشتہ ختم تو سب کچھ ختم۔" شاکر کا منہ سرخ ہو گیا۔

"رشتہ ختم ہونے سے رشتہ داری تو ختم نہیں ہوتی خالہ۔" وہ بہت تحمل سے بولا۔

"ہماری ہو گئی ہے۔" ہاجرہ نخوت سے بولی تھی۔

باتوں کی آواز سن کر رانیہ کو لگا کہ باہر شاکر ہے۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر جانے لگی۔ مگر جتنی تیزی سے وہ اٹھی تھی۔ اتنی ہی تیزی کے ساتھ اس نے اپنے قدم روکے تھے۔ وہ جانتی تھی اگر وہ باہر گئی تو اماں اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ اور اسے شاکر سے بات کرنی تھی۔ اس کے دماغ نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"خالہ! میرے پاس دولت نہیں ہے۔۔۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دولت ہوگی بھی نہیں۔ اللہ کا کرم ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ میں ماسٹر کر لوں گا تو۔۔۔"

"دیکھ شاکر! آج کل تو ڈبل ایم اے والے رل رہے ہیں تو۔۔۔ تو کون سا تیر مار لے گا اور تیرے ماسٹر کے انتظار میں اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے جانے دوں۔۔۔ کملی لگتی ہوں تجھے میں؟" ہاجرہ کا انداز ابھی بھی نہیں بدلا تھا۔ جبکہ شاکر کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح رانیہ کو دیکھ لے اسی لیے وہ بات کو طول دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خالہ اب اسے رانیہ سے کبھی بھی ملنے نہیں دے گی۔

"دولت بہت کچھ ہوتی ہے خالہ! پھر بھی سب کچھ نہیں ہوتی۔ تو نے رانیہ سے تو پوچھا ہوگا۔" وہ بہت برداشت سے بات کر رہا تھا ادھر رانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے شاکر سے بات کرے' چاہے وہ اشاروں میں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بہت بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں سے بھی شاکر کو کوئی اشارہ وغیرہ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ کمرے کی کھڑکی عین اماں کے منہ کے سامنے تھی۔ چکر لگاتے لگاتے یکدم اس کی نظر دروازے پر پڑی تھی جس کا دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا مگر اسے کافی عرصے سے بند کر دیا گیا تھا کیونکہ اس کے آگے میز رکھ دی گئی تھی۔ اس کے رکھنے کی کوئی اور جگہ نہیں تھی گھر میں رانیہ بجلی کی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر اس سے پہلے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔

اور پھر کم سے کم شور پیدا کرتے ہوئے وہ میز کو اتنا ہٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی جس سے وہ دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں جا سکے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد دروازہ بھی کھل گیا۔

اسے یہ بھی ڈر تھا یہ نہ ہو کہ شاکر ہی چلا جائے۔ وہ کمرہ اس طرح سے دوسرے کمرے کے ساتھ متصل تھا کہ اس کا بیرونی دروازہ اس کی ماں کی پشت پر کھلتا جہاں اس وقت اس کی ماں کھڑی تھی۔

بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کی ماں شاکر کے بخیے ادھیڑنے میں مشغول تھی اور بہت زور زور سے بول رہی تھی۔ اسی وجہ سے اسے رانیہ کی کارروائی کا علم نہیں ہوا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر شاکر پر پڑی شاکر نے بھی اسے دیکھ لیا تھا' مگر اس نے فوراً" اپنی نظریں اس پر سے ہٹائیں۔ اگر وہ کسی قسم کے رد عمل کا اظہار کرتا تو خالہ کے رد عمل سے بخوبی واقف تھا۔

"خالہ! تو جانتی ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں پھر بھی تو۔۔۔" شاکر نے ہاجرہ کو مزید باتوں میں الجھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چور نظروں سے رانیہ کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے کوئی اشارہ کر رہی تھی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"نہیں خالہ نہیں' مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تو ایسا کیوں چاہ رہی ہے؟" کہا تو اس نے ہاجرہ کو تھا مگر دراصل یہ رانیہ کے لیے تھا۔ رانیہ کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔ وہ شاکر کو کہنا چاہ رہی تھی کہ وہ اسے کالج میں ملے۔ وہ دوبارہ کمرے میں واپس مڑی تھی۔ وہاں پر اسے کوئی پنسل کاغذ نہیں ملا تھا جس پر لکھ کر وہ اپنی بات اسے سمجھا سکے۔ اس کی پریشانی اب غصے میں بدلنے لگی تھی۔ پنسل کاغذ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے ہاتھ اپنی ایک کتاب لگی ۔۔۔ ایک خیال بجلی کی تیزی سے اس کے دماغ میں کوندا تھا۔ وہ جلدی سے دروازے میں آئی۔ کتاب سامنے کرتے ہوئے وہ بولی "کالج۔۔۔ کالج اور یہ سب کچھ بہت جلدی میں ہو رہا تھا۔ پہلے تو شاکر کو سمجھ نہیں آیا مگر جب اس نے کتاب پر وہ غور کیا تو اسے یاد آیا تھا کہ یہ رانیہ کی انگلش کی کتاب تھی۔

"انگلش کی کتاب مجھے کیوں دکھا رہی ہے۔" وہ

الجھا تھا۔

"تو جاتا کیوں نہیں ہے یہاں سے شاکر! دفع ہوتا ہے یا پھر بلاؤں مولوی صاحب کو۔ مسلسل دماغ کھا رہا ہے میرا۔" ہاجرہ تنگ آ کر بولی۔ اور اب کی بار شاکر نے کسی بھی نتیجہ کی پروا کیے بغیر رانیہ کی طرف کھل کر دیکھا تھا وہ کتاب کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"کالج۔" یکدم اسے سمجھ میں آگیا۔

"ادھر کیا دیکھ رہا ہے۔" ہاجرہ نے فوراً ہی اس کی نظروں کو بھانپ لیا۔ اور اس نے مڑ کر ادھر دیکھا تھا جہاں پر شاکر دیکھ رہا تھا۔ وہاں پر کچھ نہیں تھا۔ رانیہ ماں کے مڑنے سے پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔

"خالہ! میں سمجھ گیا ہوں تیری بات! تو ٹھیک کہتی ہے دولت ہی سب کچھ ہے۔" اور یہ الفاظ "میں سمجھ گیا" رانیہ کے لیے تھے جسے رانیہ نے بھی بخوبی سمجھ لیا تھا۔ بے اختیار اس نے ایک گہرا سانس بھرا۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح ہی کالج پہنچ گیا تھا اور رانیہ کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ لمحے بعد اسے رانیہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہاں اسے سب لڑکیوں کے سامنے وہ بلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اس طرف چلنا شروع کر دیا تھا جس طرف سے رانیہ آ رہی تھی۔ رانیہ اسے دیکھ چکی تھی۔ شاکر سر جھکائے اس کے پاس سے گزر گیا اور تھوڑی دور جا کر رک گیا۔

رانیہ خاموشی سے چلتی رہی۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں تھیں جن کے ساتھ وہ کالج آتی جاتی تھی۔ اس لیے وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتی رہی اور جب وہ کالج میں داخل ہونے لگی — تو وہ اس بھیڑ میں شامل ہو گئی جو اس وقت کالج کے دروازے پر تھی۔

مختلف لڑکیاں اس وقت آ رہی تھیں اس لیے رانیہ کی دوستوں کو معلوم نہیں ہو سکا کہ رانیہ ان سے الگ ہو چکی ہے۔

ویسے بھی اس وقت وہ رات کو دیکھے جانے والی فلم کے بارے میں تبصرہ کرنے میں مصروف تھیں۔ رانیہ الٹے پاؤں واپس مڑی۔ اور بالآخر وہ شاکر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بے اختیار وہ رو پڑی۔

"پاگل نہ بن! چل نکل ادھر سے۔" شاکر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا — اور پھر وہ اسے ایک سستے سے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ سارے راستے رانیہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

"پانی پی! اور چپ ہو جا! کیوں پکڑوائے گی مجھے؟" شاکر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ رانیہ نقاب میں تھی۔

"شاکر! اماں میری شادی زبردستی کر رہی ہے۔"

"میں خود خالو سے بات کروں گا۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"اور تجھے لگتا ہے کہ تیرے بات کرنے سے وہ مان جائیں گے۔

شاکر! تو سمجھ نہیں رہا ہے کہ اقبال نے کیا کیا ہے اس نے اماں اور ابا دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ ایک پر دولت کی اور دوسرے پر دین کی۔"

"تو کیا کہہ رہی ہے رانیہ! میں سمجھا نہیں۔" شاکر الجھتے ہوئے بولا تھا۔ اور پھر رانیہ نے شاکر کو ساری بات بتا دی۔ اقبال کے تنگ کرنے سے لے کر اس کے رشتہ بھیجنے تک۔

"اور تو رانیہ۔ تو اب مجھے بتا رہی ہے۔" شاکر یکدم غصے میں آگیا تھا۔

"اب اس بات سے کیا فائدہ! میں مر جاؤں گی شاکر! حرام موت گلے لگا لوں گی پر اس "بالے" کمینے سے شادی نہیں کروں گی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"خالہ اور خالو تیری شادی مجھ سے کریں گے نہیں اور کوئی راستہ۔۔۔"

"کسی کو دین کا لالچ ہے اور کسی کو دولت کا۔۔۔ ہر کوئی اپنے اپنے لالچ کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔" وہ شاکر کی بات کاٹ کر کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر سے گئے تھے۔ شاکر کو دیکھ

کر بے ساختہ تکلیف ہوئی تھی۔

"رانیہ! میری بات غور سے سن۔۔۔ اب ہمارے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا ہے۔"

"کیا؟" رانیہ نے چونک کر پوچھا۔ شاکر چند لمحے تک اسے دیکھتا رہا۔

"کورٹ میرج۔" اس نے کہا — رانیہ کو محسوس ہوا کہ وہ الفاظ نہیں تھے کوئی بم تھا جو عین اس کے سر کے اوپر پھٹا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شاکر کو دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

پورے ایک ماہ بعد جب اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ وہ کالج رول نمبر سلپ لینے کے بہانے آئی تھی۔ اور پھر لوٹ کر گھر واپس نہیں گئی۔ اس طرح کے موقع پر جو کچھ ہوتا ہے وہی کچھ ہوا تھا۔ شاکر کے گھر والوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔ اقبال نے ان دونوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مل سکے۔

رانیہ اور شاکر گھر سے بھاگنے کے بعد لاہور آئے تھے، وہاں پر انہوں نے کورٹ میرج کی اور پھر وہ راولپنڈی کی طرف نکل گئے۔ وہ اپنے علاقے سے اتنا دور جانا چاہتا ہے کہ کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

وہ راولپنڈی میں بھی نہیں ٹھہرے تھے بلکہ وہاں سے وہ پشاور کے ایک پسماندہ سے علاقے میں جا بسے۔ وہاں آ کر شاکر نے محنت مزدوری کرنی شروع کر دی اور رانیہ نے سلائی کڑھائی کر کے گزارا کرنا شروع کر دیا۔

ان کے حالات بہت ابتر تھے۔ شروع شروع میں تو نوبت اکثر فاقوں تک جا پہنچتی تھی۔ پھر شاکر کا F.S.C کا رزلٹ آؤٹ ہوا اور اسے ایک اسکول میں جونیئر کلرک کی ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت سے کچھ فرق پڑا تھا اور اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ مگر رانیہ کی کوئی اولاد نہیں ہو سکی تھی۔ اور پانچ سال بعد اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ محمد فیضان شاکر۔

☼ ☼ ☼

"شاکر! تو نے فیضی کو دیکھا اس کا رنگ کتنا پیلا ہوتا جا رہا ہے۔" رانیہ کی نظریں فیضان پر تھیں اور وہ بڑی فکرمندی سے شاکر سے کہہ رہی تھی۔

"او! تجھے وہم رہتا ہے اس کے بارے میں۔ اللہ نے اولاد تجھے دیر سے جو دی ہے۔" شاکر نے ایک نظر فیضی کو دیکھنے کے بعد کہا۔

"نہیں! شاکر یہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کھاتا پیتا بھی کچھ نہیں۔" اس کی فکرمندی دور ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"چل اٹھ! تیرا تو وہم دور کروں میں۔" شاکر اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں؟"

"ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں اسے، تاکہ تیری فکرمندی ختم ہو۔" شاکر چپل پہنتے ہوئے بولا۔ اور پھر وہ دونوں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے چند وٹامن کی گولیاں اور کچھ انرجی سیرپ لکھ دیے تھے۔ اس کے مطابق فیضی کو کوئی خاص بیماری نہیں تھی بس کمزوری تھی۔

کاش کہ ڈاکٹر کا کہا سچ ہوتا۔
کاش کہ ایسا ہی ہوتا مگر۔۔۔

☼ ☼ ☼

"امی میرے پیٹ میں بہت درد ہے۔" آج تیسرا دن تک فیضی مسلسل یہی شکایت کر رہا تھا۔

ساتھ میں اسے الٹیاں اور موشنز بھی لگے ہوئے تھے، اس نے دوائی کی ایک اور خوراک فیضی کو دی مگر اس کی قے رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ادھر وہ اس کے منہ میں پانی کے چند گھونٹ ڈالتی ادھر وہ قے کر دیتا۔

اس کے پیٹ میں کوئی چیز ٹک ہی نہیں رہی تھی اس صورت حال نے رانیہ سمیت شاکر کو بھی پریشان کر دیا — وہ روزانہ اس کا ڈاکٹر بدلتے مگر افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ پھر کچھ دن بعد فیضی کی طبیعت قدرے

سنبھلی تھی تو شاکر اپنے دفتر چلا گیا ورنہ اس نے چھٹیاں لے رکھی تھیں۔۔۔ سہ پہر کے قریب فیضی کی حالت پھر بگڑنا شروع ہو گئی۔ وہ بہت بری طرح سے قے کر رہا تھا۔ رانیہ گھبرا گئی۔ فیضی کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"فیضی! فیضی۔" اس نے گھبراہٹ میں اس کے منہ پر ہلکے ہلکے سے تھپڑ مارے۔ مگر وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ رانیہ نے اسے اٹھایا چپل پہنی اور باہر نکل آئی۔ پریشانی میں اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اسے یہ تک یاد نہیں رہا تھا کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہ یونہی فیضی کو اٹھائے مین سڑک پر آ گئی۔ اس نے ہاتھ دے کر ایک رکشا روکا وہ فوراً اس میں بیٹھنے لگی۔

"اوہ! باجی پہلے بتاؤ تو سہی جانا کہاں ہے؟"

"اسپتال۔۔۔ اسپتال۔" اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

"کون سے اسپتال؟" رکشا والے نے پوچھا تھا۔

"کسی بھی نزدیکی اسپتال لے چلو۔۔۔ جلدی کرو۔" وہ رکشا میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ادھر سے سب سے نزدیک سول اسپتال ہے اور وہاں جانے کا 100 روپے لوں گا میں۔" وہ رکشا اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"پیسے۔۔۔ میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"پیسے نہیں ہے۔۔۔ تو پھر بیٹھی کیوں ہے؟"

"اترو نیچے۔" رکشا والا اتر کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

"بھائی! میرا بچہ۔۔۔ میرا بچہ بہت بیمار ہے۔۔۔ رحم کرو مجھ پر۔" رانیہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

"تم ہم پر رحم کرو۔ ہمارے بھی بچے ہیں۔۔۔ انہیں ہم کھلاتا پلاتا انہی پیسوں سے ہے۔" اس نے رانیہ کا بازو پکڑ کر اسے رکشے سے اتار دیا۔ رانیہ کی منتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور وہ رکشا اسٹارٹ کر کے چلا گیا۔ اس نے فیضی کو دیکھا۔

وہ اب مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ رانیہ وہیں سڑک کے کنارے بیٹھتی چلی گئی۔

"فیضی!۔۔۔ فیضی۔۔۔ آنکھیں کھول میری جان۔" وہ مسلسل اس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔ اس نے کئی ایک گاڑیوں کو ہاتھ دے کر روکنا چاہا مگر کوئی بھی نہیں رکا۔ اس کے پاس تو رونے کے لیے آنسو بھی نہیں بچے تھے۔ اس نے ایک بلیک کرولا کو آتے دیکھا۔ ایک آخری امید کے طور پر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مگر وہ گاڑی بھی گزر گئی تھی۔

"میرے خدا! میری جان لے لے مگر میرا فیضی۔" اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ اس کا اپنا سر گھوم رہا تھا۔ وہ گاڑی جو ابھی اس کے پاس سے گزری تھی کچھ دور جا کر اس نے بریک لگایا۔

"کیا میرا وہم ہے یہ۔۔۔ وہ عورت۔" گاڑی چلانے والا شخص ہلکے سے بڑبڑایا اور پھر اس نے گاڑی بیک کی تھی اور رانیہ کے پاس لا کر روک دی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر شاک میں تھا۔

"رانیہ۔" اس کے لبوں نے خاموش سرگوشی کی تھی وہ عورت اپنے بچے پر جھکی رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا ہے اسے؟" وہ شخص گاڑی سے نکل کر اس کے پاس آیا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ آنکھیں نہیں کھول رہا ہے۔۔۔ فیضی۔۔۔ میری جان۔۔۔ فیضی۔۔۔" وہ اب اسے چیختے ہوئے پکار رہی تھی۔ کیونکہ اب اس کی سانس بھی بہت مدھم سی چل رہی تھی۔ اس شخص نے رانیہ کی گود سے بچہ لے لیا۔

"چلو۔۔۔ میرے ساتھ چلو۔" وہ اسے کہتے ہوئے بہت تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے پہلے رانیہ کو بیٹھنے کا کہا اور پھر بچہ اس کی گود میں دے دیا تھا۔

"پانی دو اسے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس شخص نے پانی کی بوتل رانیہ کو پکڑائی تھی۔

رانیہ اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی اس

وقت اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ کس کی گاڑی میں بیٹھی ہے اور وہ شخص کون تھا۔ اس کے لیے یہ کافی تھا کہ کوئی اس کے بچے کو اسپتال لے کر جا رہا تھا۔ وہ شخص اس وقت کسی "فرشتے" سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہسپتال پہنچتے ہی فیضی کو فوراً ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ اور وہاں سے بھی اسے ICU میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے جسم کا پانی ختم ہو چکا تھا اور اس کا بی پی خطرناک حد تک لو تھا۔ ڈاکٹر نرس کو ڈرپ لگانے کی ہدایات دے رہا تھا۔ رانیہ کو ICU میں داخل نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ وہ وہیں باہر بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم بے جان ہو رہا تھا اور وہ کپکپا رہی تھی۔

"میرے خدا! میری ممتا کی آزمائش مت لے! رحم کر مجھ پر۔" بے ساختہ اس کے لبوں سے دعا تھی۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے وہیں اس بینچ پر بیٹھی رہی، اس نے ابھی تک اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ اسے ہسپتال لانے والا شخص کون تھا۔ اسے اپنے بیٹے کے علاوہ کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ نرسز اور ڈاکٹرز ICU میں آجا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر انہیں دیکھ لیتی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچے کی حالت کے بارے میں پوچھ سکتی وہ فیضی کے حوالے سے کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتی تھی۔ کون دوائیوں کا بندوبست کر رہا تھا؟ کس نے ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے چارجز بھرے وہ کون تھا؟ اس وقت اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ شخص ہی سب کچھ کر رہا تھا۔ وہ تو بس کانپتے وجود کے ساتھ ایک ہی دعا کر رہی تھی۔

"اے خدا! میری ممتا کی آزمائش مت لینا۔"

اچانک وہ بہت بری طرح سے چونکی تھی۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا تھا۔ اسے اس طرح بیٹھے کتنے گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ شخص اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت لگا کر سننے کی کوشش کی تھی۔

"تمہارا بیٹا۔" چند لمحوں بعد اسے اتنا سمجھ آیا تھا۔

"میرا بیٹا۔۔۔ کیا ہوا اسے؟ وہ ٹھیک ہے۔" وہ بہت بری طرح سے گھبرا گئی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے وہ۔ خطرے سے باہر ہے اب۔" وہ شخص اسے کسی بچے کی طرح پچکارتے ہوئے بولا۔

"فیضی ٹھیک ہے۔" وہ بڑبڑائی تھی اور پھر اس نے یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔۔۔ وہ مسلسل یہی کہہ رہی تھی۔

"اے خدا! میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں۔" جان کنی کے عالم میں فیضی نہیں وہ خود تھی اور اب اس کی حالت اس طرح تھی جیسے اسے زندگی کی نوید ملی ہو۔ جیسے کسی نے قطرہ قطرہ کر کے اس کے پور پور میں آب حیات انڈیلا ہو۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ اور اس "مہربان" شخص کا اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

خدا نے اس کی ممتا کی آزمائش ابھی نہیں لی تھی۔ وہ بہت تھکے تھکے سے انداز میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

"رانیہ! جوس پی لو۔" اسے وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر پوری طرح سے اس شخص کو دیکھا۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا سا تھا۔ اس نے دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ "چہرہ" اس کے لیے بھولنے والا ہرگز نہیں تھا مگر جن حالات میں وہ تھی ایسے حالات میں اسے پہچاننے میں مشکل ہوئی تھی۔ ایک اسپارک سا ہوا تھا اور اسے یاد آگیا تھا۔

"اقبال۔" اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ بے ساختہ کھڑے ہو کر وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ اور اقبال نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹرز کے لیے سب سے بڑا مسئلہ فیضان کے جسم میں پانی کی مقدار کو پورا کرنا تھا۔ اب وہ اس کے مختلف

ٹیسٹ وغیرہ لے رہے تھے تاکہ پتا چلایا جاسکے کہ اس کی حالات کیوں اتنی بگڑ گئی تھی رانیہ نے فون کرکے شاکر کو بھی اسپتال بلالیا تھا۔

رات کے دس بجنے والے تھے اور اقبال مسلسل ان کے ساتھ تھا۔ وہ شاکر کو تمام صورت حال بتا چکی تھی۔ رانیہ کے لبوں سے مسلسل اقبال کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں کیونکہ وہی تھا جو سارا خرچ اٹھا رہا تھا۔

وہ اگر آج نہ ہوتا تو وہ یقیناً" اتنی آسانی کے ساتھ فیضان کا علاج نہ کرواسکتے تھے۔ شاکر کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اتنے مہنگے ہسپتال کا خرچہ اٹھا سکتا۔ وہ تو سول اسپتال کا خرچہ بھی بمشکل پورا کرپاتا۔ فیضان کو اب ایمرجنسی وارڈ میں منتقل کردیا گیا تھا۔

رانیہ نے زبردستی اقبال کو گھر بھیجا ۔ وہ گھر جانے پر راضی ہوگیا تھا مگر پہلے اس نے ان دونوں کو کھانا کھلایا اور پھر کچھ رقم شاکر کو دینے کے بعد وہ گھر گیا تھا۔

رانیہ اور شاکر دونوں ہی اس کے بے حد شکر گزار تھے۔ رانیہ کے روم روم سے اس کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اقبال کے لیے جملہ خیر کہا تھا اور زندگی میں پہلی بار ہی اقبال نے کسی سے دعالی تھی۔

"کتنا بدل گیا ہے نا اقبال۔" اس کے جانے کے بعد وہ فیضان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"ہاں! قدرت ہے خدا کی! انسان نہیں فرشتہ لگتا ہے۔" شاکر نے ایک گہرا سانس بھرا۔

"قسم سے شاکر! اگر آج وہ نہ ہوتا تو..." اس سے آگے وہ جملہ مکمل نہیں کرپائی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"خدا اسے لمبی عمر دے۔ ہر مراد پوری کرے۔" رانیہ نے بہت دل سے دعا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

فیضان کی ٹیسٹ رپورٹس رانیہ اور شاکر کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھیں۔

فیضان کا ایک گردہ ناکارہ ہوچکا تھا۔ پیدائشی طور پر اس کی یورین کی وین تنگ تھی اسی وجہ سے اس کا یورین ایک گردہ سے مکمل طور پر خارج نہ ہوسکا تھا اور وہ گردے کے اندر ہی گرتا رہا جس کی وجہ اب اس کا ایک گردہ ناکارہ ہوچکا تھا۔ فیضان کا آئے روز بیمار ہونا اسی وجہ سے تھا۔

اس مسئلے کا فوری حل کڈنی تھراپی تھی مگر تھراپی کے لیے ان دونوں کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ دونوں بہت بری طرح سے پریشان ہوگئے تھے۔ یہ بہت مہنگا علاج تھا۔ رانیہ کی تو بھوک پیاس اڑ کر رہ گئی تھی۔

دوسرے دن اقبال ہسپتال آیا تو ان دونوں کے چہرے دیکھ کر ہی اقبال کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی پریشانی والی بات ہے۔

"سب ٹھیک ہے نا شاکر۔" شاکر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کاش کہ سب کچھ ٹھیک ہوتا۔" شاکر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا — رانیہ نے رونا شروع کردیا۔

"ہوا کیا ہے؟"

"بالے! فیضی کا ایک گردہ ناکارہ ہے۔" ایک لمحے کے لیے اقبال بھی چپ ہوگیا۔ جبکہ رانیہ کے رونے میں بھی تیزی آگئی تھی۔

"اوئے کیوں روتی ہے رانی؟ تو شکر کر کہ تیرے بیٹے کو خدانا خواستہ ایسا کوئی مرض نہیں جس کا علاج نہ ہو۔ او! یہ تو قابل علاج ہے۔ لوگ تو ایک گردے پر بھی زندہ رہتے ہیں۔ کیوں گھبراتی ہے۔" اس نے رانیہ کو تسلی دی تھی۔ رانیہ اسے بتا نہیں سکی کہ اس کے رونے کی وجہ کیا تھی۔ وہ بس شاکر کو دیکھ کر رہ گئی۔

"تو ٹھیک کہتا ہے بالے! پر یہ جو غریب بندہ ہوتا نا! اس کے لیے زندہ رہنا سانس لینا کسی مشقت سے کم نہیں ہوتا۔ اک ہی بیٹا دیا ہے خدا نے اس پر بھی یہ آفت ٹوٹ پڑی۔" شاکر بات کرتے کرتے رو پڑا۔

"اوئے یار کیا کرتا ہے؟ کیوں دل برا کرتا ہے' میں ہوں نا... کس مرض کی دوا ہوں میں؟ میں کراؤں گا تیرے بیٹے کا علاج اللہ نے اتنا دیا ہے کچھ تیرے کام آجائے گا تو کیا فرق پڑے گا مجھے؟" شاکر نے رونا بھول کر اس کی طرف دیکھا

"یقین نہیں آتا تو وہ ہی بالا ہے۔ کل تک ہم دونوں کے خون کا پیاسا تھا... اور آج..." شاکر بے یقین لہجے میں بولا۔ اقبال کے چہرے کا رنگ بدلا تھا مگر اس نے فوراً" خود پر قابو پالیا۔

"پرانی باتیں چھوڑ۔ رپورٹیں دکھا مجھے' میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔" وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

"ہم بہت غریب ہیں دیکھ ہمارے پاس تو تجھے دینے کے لیے دعاؤں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔" شاکر نے اسے رپورٹس پکڑاتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہ کر یار۔ نہ کر رب سب اچھا کرے گا۔" اسے گلے سے لگاتے ہوئے تسلی دی۔

"اللہ بھلا کرے تیرا۔ گرم ہوا نہ لگے تجھے۔" شاکر اسے دعائیں دے رہا تھا۔ اور رانیہ اس کے تو روم روم سے اس "فرشتہ صفت" انسان کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

تھراپی کی تیاری مکمل ہوچکی تھی فیضی کو تھراپی روم میں لے جایا گیا تھا۔ رانیہ مسلسل قرآنی آیتوں اور دعاؤں کا ورد کررہی تھی۔ تھراپی بہت تکلیف دہ عمل تھا اور زندگی موت کا مسئلہ بھی۔ شاکر انتہائی پریشانی میں ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا۔

"ایک بوتل خون کی چاہیے۔ اس کا بندوبست کردیں۔" نرس نے آکر کہا تھا۔ شاکر فوراً" ہسپتال کے بلڈ بینک سے بلڈ کا پتا کرنے چلا گیا۔ اقبال چند لمحے رانیہ کو دیکھتا رہا تھا۔

"اس پر سائن کردو۔" اچانک ایک پیپر اس کے سامنے کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"کیوں... کس لیے؟ ابھی تو کروائے ہیں ڈاکٹر نے سائن۔ اب اور کون سے سائن کرنے ہیں۔" وہ ناسمجھی کے عالم میں اقبال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ان سکنیچرز کا تعلق تیرے بیٹے سے نہیں ہے۔ یہ میرے اور تیرے متعلق ہے۔" وہ ہلکا سے مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" اس نے الجھ کر پیپر اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ اسٹامپ پیپر تھا۔ اس نے کھول کر پڑھنا شروع کیا

جوں جوں وہ پڑھتی جارہی تھی اس کے پیروں سے زمین نکلتی جارہی تھی۔ اس کاغذ کی تحریر ختم ہوچکی تھی اور رانیہ کو محسوس ہورہا تھا کہ اس کے وجود میں سے زندگی نامی چیز بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ وہ بے حس وحرکت اس کاغذ کو تھامے کھڑی تھی۔

"سائن کرو... تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" اچانک رانیہ نے اس "فرشتہ صفت" انسان کی سفاک آواز سنی۔

"اور اگر نہ کروں تو؟" وہ کافی دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اگر تو سائن نہیں کرے گی تو کیا ہوگا؟ چلو... میں بتاتا ہوں شاکر خون لینے گیا ہے۔ بلڈ بینک والا تب تک اس کو خون نہیں دے گا جب تک میں اسے کال نہیں کروں گا۔ وجہ کیا ہے پیسہ۔ جو کہ میں اسے دے کر آیا ہوں۔ اندر... تھراپی روم میں ڈاکٹر تھراپی شروع کرچکا ہے۔ ڈاکٹر کو تو پتا ہے اس کی فیس ادا ہوچکی ہے مگر دراصل وہ ادا نہیں ہوئی۔ ابھی کچھ ہی دیر میں کیشئر ڈاکٹر تک یہ بات پہنچادے گا... کب؟ جب میں اسے فون کروں گا۔ اور کب؟ جب تو سائن نہیں کرے گی۔ وجہ کیا ہے پیسہ۔

اور جب یہ بات ڈاکٹر کو پتا چلے گی تو وہ آپریشن چھوڑ دے گا اور کہے گا کہ پہلے فیس ادا کرو پھر وجہ کیا ہوئی پیسہ... سوچ تیرا بیٹا اندر موت سے لڑ رہا ہے... اسے تھراپی کی ضرورت ہے۔ اسے خون کی ضرورت ہے اور جب یہ دونوں اسے نہیں ملے گا تو کیا

ہو گا۔ چچ۔۔۔ چچ دیکھو میں اتنا ظالم نہیں کہ ایک بچے کو مرتا ہوا دیکھ سکوں۔ چل شاباش! سائن کر اس پر۔" رانیہ سانس روکے اس کی باتیں سن رہی تھی وہ فرشتہ صفت انسان اب اپنی صفات کا مظاہرہ بہت اچھی طرح سے کر رہا تھا۔ اتنے میں اقبال کے فون کی گھنٹی بجی تھی۔

"اوہ ہو۔۔۔ کس کا فون آگیا؟" وہ پاکٹ سے فون نکالتے ہوئے بڑبڑایا۔

"کیشئر کا ہے۔ یقیناً" اس نے مجھ سے پوچھنا ہے کہ وہ ڈاکٹر کو بتائے یا نہیں۔ تو پھر میں اسے کیا کہوں؟" نہایت خباثت سے کہتے ہوئے اس نے رانیہ سے پوچھا۔ اتنے میں نرس دوبارہ آئی تھی۔

"او بی بی! تمہیں اپنے بچے کی زندگی پیاری ہے یا نہیں۔ خون کا بندوبست کرو نہیں تو بچے کو کچھ ہو گیا تو ہم ذمہ دار نہیں۔" وہ کرخت لہجے میں کہتے ہوئے چلی گئی۔ رانیہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس نے اقبال کی طرف دیکھا۔ اور اقبال نے مسکرا کر کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ وہ بے حس و حرکت کاغذ کو ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اقبال کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ چند لمحے رانیہ کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے فون ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے؟ بتا دو ڈاکٹر کو۔" رانیہ اب بھی بے حس و حرکت تھی۔ اندر اس کا بیٹا موت کی کشمکش میں تھا اس کا ایک سائن اس کے بیٹے کی زندگی کو بچا سکتا اور یہی ایک سائن اس کی اپنی زندگی برباد کر سکتا تھا۔ اور وہ ماں تھی۔

"پین دو۔" چند لمحوں بعد اقبال نے رانیہ کی آواز سنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے رانیہ؟ اس طرح سے ادھر کیوں بیٹھی ہے؟ اب تو فیضی کا آپریشن بھی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے تو پھر تجھے کیا پریشانی ہے۔" شاکر اسے ہسپتال کے لان میں بینچ پر بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس آیا تھا۔

"کیا حال بنا لیا ہے تو نے اپنا؟" شاکر اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے۔۔۔ تو بس اکیلا چھوڑ دے مجھے۔" وہ اس پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اب کیوں اس طرح سے پریشان ہوتی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔" وہ مسلسل سامنے دیکھ رہی تھی یوں جیسے شاکر یا پھر شاکر کی باتوں سے اسے غرض ہی نہ ہو۔ اچانک ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کے سر پر پڑی چادر اتار گیا۔۔۔ اس نے چونک کر کندھوں پر گرنے والی چادر کو دیکھا اور پھر شاکر کو وہ شاکر کو تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دے کچھ دیر کے لیے۔" وہ دونوں پاؤں اوپر کر کے گھٹنوں میں سر دیتے ہوئے بولی۔

"رانیہ!"

"تھک گئی ہوں شاکر۔۔۔ میں بہت تھک گئی ہوں مجھے اکیلا چھوڑ دے۔" شاکر نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر رانیہ کو دیکھا۔ وہ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بے جان لگی۔۔۔ بے حس و حرکت۔ بہت اجنبی سی۔ اسے شک گزرا کہ شاید وہ سانس نہیں لے رہی شاکر کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاس جائے اور محسوس کرے کہ وہ سانس لے بھی رہی ہے یا نہیں۔۔۔ بے اختیار وہ چند قدم واپس بڑھا تھا اور پھر یہ سوچ کر کہ شاید اسے سکون کی ضرورت ہے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ سکون تو اب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا چین، سکھ، آرام، یہ سب لفظ بے معنی ہو چکے تھے۔ نا صرف رانیہ کے لیے بلکہ شاکر کے لیے بھی۔ مگر ابھی وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سوئے ہوئے فیضی کے سرہانے بیٹھی مسلسل اسے دیکھ رہی تھی اور اس کام میں وہ بری طرح سے محو تھی۔ اتنی کہ اسے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔ اقبال چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا وہ آج بھی اتنی ہی خوبصورت تھی۔ وہ کسی گلاب کی طرح تھی مگر مرجھایا ہوا۔۔۔

"رول دیا تو نے خود کو شاکر کے پیچھے کیا ہاتھ آیا تیرے۔" وہ بولتا ہوا اس کے پاس آیا۔ رانیہ بری طرح چونکی تھی۔ وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔

"میرے ہاتھ کیا آیا؟ یہ تو نہیں جان سکتا۔" وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے اک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ایسی مسکراہٹ جسے کم از کم اقبال نہیں سمجھ سکا تھا۔

"تو نے کبھی خود کو دیکھا ہے۔ کسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگ رہی ہے۔"

"ہاں! مہک بھی نہیں ہے تو پھر اس پھول کا تو کیا کرے گا۔ چھوڑ دے اسے مت توڑ۔" ٹوٹے ہوئے لہجے ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں گا اس پھول کا؟ اس پھول کی شبنم سے اپنے دل کی آگ بجھاؤں گا جو کہ چھ سال سے جل رہی ہے۔ چھ سال سے۔" اچانک ہی وہ بھڑکا تھا۔ رانیہ نے بہت بے بس نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے سامنے سے ہٹ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں نہیں کر سکتی۔" کھڑکی کے چوکھٹے پر وہ دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر بولی تھی۔

"تو سائن کر چکی ہے۔"

"کیا اہمیت ہے اس کی؟ کوئی گواہ نہیں ہے۔۔۔"

"لگتا ہے تجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی کہ پیسے سے کیا کچھ خریدا جا سکتا ہے۔" وہ اچانک اس کی بات کاٹ کر بولا۔۔۔ رانیہ گم سم ہو کر رہ گئی۔

وہ اس کی بات کا عملی مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔

"اور اگر تو نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی یا پھر کورٹ سے رابطہ کیا تو یاد رکھنا میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا اور نہ ہی شاکر کو۔"

"یہ!" اس نے فیضی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اسے۔۔۔ اسے ختم کر دوں گا۔" اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں تھا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔

"تو کیا اس کے بیٹے کی زندگی کی ضمانت اب بھی نہیں تھی؟" وہ وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

وہ کر سکتا تھا وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ یہ سوچ کسی گدھ کی طرح اسے کھائے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ جائے نماز پر نوافل کی نیت سے بیٹھی تھی مگر وہ بھول گئی تھی اسے کیا کرنا ہے۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے، مسلسل خلا میں گھور رہی تھی۔

"رانیہ!" شاکر نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"رانیہ!"

"ہاں۔" وہ بری طرح سے چونکی

"کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"شاکر!" وہ یکدم اس کے۔۔۔ ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"مجھے چھپا لے۔۔۔ چھپا لے مجھے کسی ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی خوف، کوئی ڈر نہ ہو۔ خدا کے لیے مجھے چھپا دے۔ میں۔۔۔ میں۔" اس نے پاگلوں کی طرح اپنے سر کو پکڑا تھا۔

"رانیہ۔۔۔ رانیہ۔۔۔ ہوش کر، کیا ہوا ہے تجھے۔" شاکر نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ اور وہ جیسے اچانک ہی ہوش میں آئی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے؟ اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے پھر کیوں اپنی ایسی حالت بنائی ہے۔" وہ بہت پیار سے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولا تھا۔ وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ کچھ نہیں کہا تھا اس نے۔ کوئی آنسو نہیں بہایا تھا۔ بس اک جامد سی خاموشی طاری ہو گئی تھی اس پر اور یہ خموشی شاکر کو اپنی رگ رگ میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گزشتہ سالوں میں رانیہ اور شاکر کے اپنے ماں اور باپ سے تعلقات بحال ہو چکے تھے۔ رانیہ کے والدین

اس عرصے میں اقبال کی چال سمجھ چکے تھے۔ ان پر سب کچھ عیاں ہو چکا تھا۔ سو رانیہ کو بے قصور سمجھتے ہوئے معاف کر دیا گیا۔ فیضان کے آپریشن کا سن کر رانیہ کی ماں اس کے پاس آنے والی تھی۔

اقبال، رانیہ کے والدین کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد رانیہ اور اس کے درمیان معاملات طے پا جائیں مگر اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔

اور یہ موقع اس کے ہاتھ لگ ہی گیا --- فیضان کو ہسپتال سے چھٹی ہو چکی تھی۔ شاکر اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر گاڑی تک چھوڑنے گیا تھا۔ رانیہ کمرے میں سے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ اسی پل اقبال ـ کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا سوچا ہے تو نے؟" وہ سخت لہجے میں بولا تھا۔

"سوچتے تو وہ ہیں جن کے پاس دماغ ہوتا ہے اور میرے پاس تو نے چھوڑا کیا ہے؟ میرے بیٹے کی زندگی کے بدلے تو نے مجھے خریدا ہے۔ اور زر خرید غلام بھی کبھی سوچتے ہیں؟" وہ تلخ سی ہنسی ہنس دی۔

"وہ تو حکم کے غلام ہوتے ہیں۔ کسی پتلی کی مانند ہوتے ہیں۔ جیسے تو نچائے گا... ناچوں گی۔" وہ تھک کر دیوار سے ٹیک لگا کر بولی

"تجھے پتا ہے بچپن میں ابا نے مجھے چابی والی گڑیا لا کر دی تھی اور میں حیران ہوتی تھی کہ یہ گڑیا چابی بھرنے سے کیسے ناچتی رہتی ہے؟ تو جانتا ہے آج اس وقت اس بات کو سمجھنے والا میرے سے بہتر شخص اور کوئی نہیں ہوگا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے وہ کھڑکی کے پٹ پر ڈالا گیا تولیہ اتارنے لگی --- کہ اچانک اس کی نظر باہر سے آتے شاکر پر پڑی تھی وہ یقیناً" سامان لینے کے لیے کمرے میں آنے والا تھا۔ اور کمرے میں وہ اور اقبال تھے۔ دونوں اکیلے تھے۔ اور اس سین میں ذرا سی جان ڈالی جائے تو۔ یہ خیال بجلی کی تیزی سے اس کے دماغ میں کوندا تھا اور اسے بری طرح سے زخمی کر گیا وہ گھوم کر اقبال کی ---- طرف آئی تھی۔

"میں تیرا فلسفہ سننے نہیں آیا۔" اقبال بہت نفرت سے بولا ۔ وہ یہ سمجھا تھا کہ رانیہ دوسری طرف سے چیزیں اکٹھی کرنے گئی تھی۔ مگر وہ اس کے پیچھے کھڑی شاکر کے قدم گن رہی تھی۔ اس کی گنتی جاری تھی۔ وہ نہیں سن رہی تھی کہ اقبال کیا کہہ رہا تھا۔

"اور اب وہ دروازے سے چند قدم دور ہوگا۔" اس نے سوچا تھا اور پھر۔ بے اختیار ہی اس کے آنسو بہنے لگے

"سن رانیہ... مجھے اپنی۔" اقبال اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا اور شاکر نے دروازہ کھولا تھا۔

"خدا کے لیے اقبال! مجھے نکال کر لے چل یہاں سے تنگ آگئی ہوں میں اس زندگی سے، میں مانتی ہوں میں نے غلطی کی شاکر سے شادی کر کے آج تو نہ ہوتا تو میرا بچہ تو مر جاتا۔" وہ اس کی پشت پر سر رکھے کہہ رہی تھی۔ شاکر دروازے میں ہی منجمد ہو گیا۔ وہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مان نہیں سکتا تھا۔ اس کی اتنے پیار کرنے والی جان چھڑکنے والی بیوی وہ یہ سب اسی کے منہ سے سن رہا تھا۔ کیا اس کے کان اسے دھوکا دے رہے تھے یا پھر آنکھیں؟؟؟

آنکھوں دیکھا غلط نہیں ہوتا مگر اس وقت اس ہارے ہوئے شخص نے شدت سے دعا کی تھی کہ وہ غلط ہو جائے۔ مگر وہ غلط نہیں تھا۔ وہ سچ تھا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہ سچ تھا۔ روز روشن کی طرح....

"میں اور مجبوری کی زندگی نہیں جی سکتی۔" اس نے رانیہ کے الفاظ سنے تھے۔ وہ اور کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اور کچھ سننے کے لیے بچا ہی کیا تھا؟ وہ مڑ گیا وہاں سے چلا گیا تھا اور شاید ہمیشہ کے لیے۔ اقبال حیرت سے مڑا تھا۔ رانیہ ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہوئی تھی وہ بھاگ کر دروازے تک آئی تھی۔ مگر وہ جا چکا تھا۔ اور وہ اسے روکنے کا اختیار کھو چکی تھی۔ بلکہ وہ تو تمام تر اختیارات کھو چکی تھی۔

"شاکر!" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی

"کاش کہ وہ مڑ کر دیکھ لیتا... اور اگر وہ دیکھ لیتا تو... تو جان لیتا سچ کیا ہے؟" وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر تڑپ تڑپ کر روئی تھی اور رو رو کر تڑپی تھی۔ اور اگر وہ دیکھ لیتا تو وہ ان آنسوؤں پر جان قربان کر دیتا۔ اور اس کے پاس کھڑا شخص... وہ ان آنسوؤں کو اپنی محبت سمجھ رہا تھا۔ کاش کہ وہ شخص اس کے دل میں جھانک سکتا۔ کاش کہ وہ دیکھ سکتا۔ اس عورت کی آنکھوں میں جمنے والی راکھ کی تہ جسے نمی بھی ہٹا نہیں پا رہی تھی۔ جسے اب کوئی چیز نہیں صاف کر سکتی تھی۔

مجھے آرزوئے سحر رہی
یونہی رات بھر بڑی دیر تک
نہ بکھر سکا نہ سمٹ سکا
یونہی رات بھر بڑی دیر تک
ہیں بہت عذاب اور اکیلا میں
شب غم بھی میری طویل تر
رہی زندگی بھی سراب اور
رہی آنکھ نم بڑی دیر تک
مجھے زندگی ہے عزیز تر
اسی واسطے میرے ہم سفر
مجھے قطرہ قطرہ پلا زہر
جو اثر کرے بڑی دیر تک

☼ ☼ ☼

"پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے خالہ! اتنے سالوں میں مجھے یہ بات نہیں سمجھ آئی۔ پر اک لمحہ صرف ایک لمحہ لگا اس بات کو سمجھنے میں۔" وہ اندر فیضی کی دوائیں رکھنے آئی تھی جب اس نے شاکر کو اپنی ماں سے کہتے سنا۔ اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑا تھا۔ وہ شاکر کا ہارا ہوا انداز نہیں دیکھ سکتی تھی، دنیا میں اسے سب سے عزیز تھا وہ شخص اور اس شخص کو اس نے اپنے ہاتھوں سے تکلیف پہنچائی تھی۔

"یہ تکلیف کیا کم تھی؟ کاش کہ مرنا آسان ہوتا۔" بے ساختہ اس نے خواہش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چھت پر شام سے کھڑی تھی اور اب رات ہونے والی تھی۔ اس کی ماں اسے کتنی آوازیں دے چکی تھی مگر وہ سنی ان سنی کرتی رہی۔

رات کی پھیلنے والی سیاہی میں اپنا گم ہوتا وجود دیکھ کر اسے عجیب سا سکون مل رہا تھا۔

اچانک سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ بنا مڑے، بنا دیکھے وہ جانتی تھی کہ اس وقت اوپر آنے والا کون تھا۔ کتنے دنوں بعد وہ اس کی طرف آیا تھا۔

"کیا کہنے؟... کیا کرنے؟" اس کا دل بے اختیار سہما تھا۔

وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کیا چیز زیادہ تکلیف دہ تھی اس شخص کی بے رخی برداشت کرنا یا اس سے بے رخی برتنا وہ اندازہ ہی نہیں کر سکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس سے ذرا سے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔

اس کے پاس اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود سے اسے مخاطب کرتی اور شاید دوسری طرف بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔

"اک عرصے تک میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ خوش نصیب وہ ہوتا ہے جو جس چیز کی خواہش کرے وہ اسے مل جائے اور آج اس جگہ پر کھڑا ہو کر میں حیران ہوں کہ میری غلط فہمی کس طرح سے دور ہوئی ہے۔" رانیہ نے بے ساختہ آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بچا ہی کب تھا؟

"تمہیں پتا ہے رانیہ! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" اچانک اس نے پوچھا تھا۔ بہت مشکل تھا ضبط کرنا، بہت مشکل۔ کاش کہ اس کا دل پھٹ جاتا۔ کاش کہ اس کے وجود میں جان نامی چیز باقی نہ رہتی یہ سب آسان ہوتا بہت آسان اس چیز سے جو کہ ابھی، اس وقت اس کے سامنے بیان کی جا رہی تھی۔

ان میں سے کسی بھی چیز کی اذیت اس سے زیادہ نہیں تھی۔

"ضروری نہیں خودکشی کرنے کے لیے آپ چھت سے کود جائیں، گلے میں پھندا ڈالیں، چھری سے نبض

کاٹ لیں یا پھر زہریلی گولیاں نگل لیں۔

خودکشی تو تب بھی ہوتی ہے جب کسی بہت اپنے کو جو حیات کی بقا ہو' جو جسم میں دل اور دل میں دھڑکن کا باعث ہو' جو کہ زندگی ہو کسی ایسے کو خود اپنے ہاتھوں سے آپ اپنی زندگی سے بے دخل کردیں۔ یوں کہ دوبارہ آنکھوں میں بسنے والے اس چہرے کو دیکھ ہی نہ سکیں۔ ایسے کہ اس کے خیال کی پرچھائی تک ذہن میں نہ ہو کیا یہ خودکشی نہیں ہے؟" رانیہ کو لگا جیسے کہ وہ رو رہا ہو اب کے اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا جو کہ کرب بن کر اس کے وجود میں پھیل رہے تھے۔ رات کی تاریکی کا ایک فائدہ تو ہوا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا جس نے میرے لیے دنیا کو چھوڑا۔ آج وہ دنیا کے لیے مجھے۔۔۔" وہ اس کے آگے بول نہیں سکا تھا۔

"موت تو آنی ہی ہے وہ ابھی کیوں نہیں آجاتی۔" اذیت سے سوچتے رانیہ نے خواہش کی تھی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس کی اور اپنی دنیا فیضان کے لیے اسے چھوڑ رہی تھی۔

"میں شاکر علی ولد علی احمد تمہیں طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔" رانیہ نے دنیا کی تاریکی کو کچھ اور گہرا ہوتے دیکھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہوئی تھی۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا ایک لمحے کے لیے اسے لگا تھا کہ جیسے اس کا وجود اتنا ہلکا ہو گیا تھا جیسے کہ وہ بے جان ہو۔ اور پھر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ کیا سب کچھ ختم ہونا اتنا آسان تھا۔ اس قدر آسان تھا یہ سب کچھ۔۔۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔

وہ شخص جو کہ اس کی زندگی تھا۔ وہ اب اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ کیا واقعی ایسا ہی تھا۔ بس اک لمحہ۔۔۔ اک پل۔۔۔ یا پھر ایک ساعت۔۔۔ اور سب کچھ ختم۔ وہ جا چکا تھا۔ کوئی حیرت سی حیرت تھی جو کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ نہیں تھا تو کیا بچا تھا زندگی میں۔ کیا کچھ تھا؟ کیسے جیے گی وہ؟ کیسے؟

☼ ☼ ☼

کتنی دیر سے وہ گم سم فیضان کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔

کتنی خواہش کی تھی اس نے یہ گزرتا ہوا وقت تھم جائے۔ کس قدر چاہا تھا اس نے کہ یہ لمحہ' یہ پل اس کی زندگی میں کبھی نہ آئے۔ مگر اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ جو طے تھا۔۔۔ وہ ہو کر رہنا تھا۔

طلاق کے بعد عدت کے ماہ گزارتے ہوئے اس نے ہر پل' ہر لمحہ ایک ہی دعا مانگی تھی کہ اسے اس لمحے کی اذیت سے بچالیا جائے مگر۔۔۔ کاش کہ اس کی زندگی کہ وہ چند ماہ اور طویل ہو سکتے۔ کاش کہ وقت تھم سکتا۔ کاش کہ وہ پر لگا کر گزرتے ہوئے وقت کو روک سکتی مگر وہ ان میں سے ایک کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کسی ایک چیز کا بھی اختیار اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر بے بس تھی۔ طلاق کے بعد وہ فیضان کو لے کر اپنی ماں کے ساتھ ہی واپس چلی آئی تھی۔

اس کے گھر والوں میں سے کوئی بات یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے اور شاکر کے مابین کیا ہو چکا۔ شاکر نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ وقت آنے پر سب کو خبر ہو جانی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ وقت آئے۔ مگر اس "وقت" کا آنا طے تھا۔ وہ کسی طریقے سے ٹل نہیں سکتا تھا۔ اور وہ آچکا تھا۔

رات کے تیسرے پہر سوئے ہوئے فیضان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کہ اس کی کوکھ اجڑ چکی ہو جیسے کہ وہ راکھ کا ڈھیر ہو۔

وہ اس کے چہرے کو چومنا چاہتی تھی' اسے پیار کرنا' چھونا چاہتی تھی۔

مگر وہ خود پر پہرے بٹھائے گم سم اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ جانتی تھی اگر اس نے فیضی کو چوم لیا' چھو لیا یا پھر پیار کر لیا تو وہ لمس ساری عمر کسی بچھو کی طرح اسے ڈنگ مارتا رہے گا۔ آگ کی طرح اس کے ہاتھوں پر جلتا رہے گا۔

اور اب پیاس بن کر اس کی ہونٹوں پر پپڑی بن کر

جما رہے گا۔

وہ آگے کیا کم عذاب سہہ رہی تھی رات کے اس پہر' اس جامد خموشی میں اچانک ایک گاڑی کا ہارن زور سے بجا۔

اور وہ یوں چونکی جیسے وہ ہارن' ہارن نہیں تھا صور اسرافیل تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ حشر کے دن کیا ہونا تھا مگر آج یہ وقت' یہ پل' یہ لمحہ کسی حشر سے کم تو نہیں تھا۔

اس نے شدت سے موت کی خواہش کی تھی۔ ہارن ایک دفعہ پھر بجا تھا۔ اب کی بار وہ اٹھ گئی۔ اس کے پاس بہانے کے لیے کوئی آنسو نہیں تھا۔ بین کرنے کے لیے لفظ نہیں تھے۔ اس کا تو پورا وجود ہی روتا ہوا' ماتم کرتا ہوا لگ رہا تھا۔

ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اس گھر کی دہلیز یونہی رات کے اندھیرے میں پار کی تھی اور آج۔۔۔ اتنے سالوں بعد تاریخ اپنے آپ کو دہرا ضرور رہی تھی مگر تب میں اور اب میں جو فرق تھا۔ وہ زمین اور آسمان کے فرق سے بھی زیادہ تھا۔ وہ دروازے سے باہر نکلی۔ اس کے پاؤں اسے چلنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے اس کا دل اس کے پیروں کی زنجیر بنا جا رہا تھا مگر اسے جانا تھا۔ اور یہ دماغ کا فیصلہ تھا۔ اس نے مڑ کر فیضی کو دیکھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے اس طرح جانے کے بعد لوگ اسے کن الفاظ میں یاد کرنے والے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فیضی اسے کس حوالے سے یاد رکھے گا مگر پھر بھی بہت ساری خواہشوں پر ایک خواہش بہت شدت سے غالب آئی تھی۔

"مجھے کبھی "بری ماں" مت سمجھنا فیضی۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

اور پھر رات کے اس گھپ اندھیرے میں ایک شخص کی بیوی اور ایک بچے کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔

اور یہ وہ حوالہ تھا جو دنیا نے رانیہ کے لیے مختص کیا تھا اور جسے فیضان شاکر نے اپنی ساری عمر' اپنی ماں کے

نام کے ساتھ ساتھ سنا تھا۔

✲ ✲ ✲

شاکر علی' رانیہ کو طلاق دینے کے کچھ عرصہ بعد غیر قانونی طریقے سے یونان چلا گیا جہاں سے تین سال تک اس کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ تین سال بعد اس کے گھر والوں کو پتا چلا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

اور وہ بچہ جو رانیہ اور شاکر کی جان تھی کبھی ننھیال اور کبھی ددھیال میں پلتا رہا اور ان دونوں خاندانوں نے اس کے دل میں رانیہ کے لیے اگر کچھ بھرا تھا تو وہ صرف نفرت تھی۔

یونان جانے کی وجہ سے شاکر کے حالات بہت اچھے ہو گئے اور فیضان اچھے اسکول میں پڑھنے لگا۔

اور آج وہ ایڈووکیٹ فیضان شاکر تھا۔ اسے اپنے باپ پر ہمیشہ حیرت ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کے ہر فرد سے اور ہر اس شخص سے جس کا رانیہ سے ذرا سا بھی تعلق رہا ہو' ہمیشہ رانیہ کے لیے برے الفاظ ہی سنے تھے۔

مگر وہ شخص جو کہ اس کا باپ تھا۔ وہ عجیب آدمی تھی۔ عجیب محبت تھی اس کی۔

وہ کہتا تھا کہ اس کی ماں اچھی عورت تھی۔ بہت اچھی ماں تھی بس پریشانیوں سے گھبرا گئی تھی۔

اسے اس بات سے ہمیشہ اختلاف رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ عورت کبھی اچھی ہو ہی نہیں سکتی جو اپنے اتنے پیار کرنے والے شوہر اور بچے کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ بھاگ جائے۔ یقیناً" وہ ایک بری ماں تھی۔ بری ماں۔

✲ ✲ ✲

"فیضی۔" اس آواز نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت' تیزی سے چلتے ہوئے اس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ شاپنگ کرنے آیا تھا۔ اور اس عورت کو دیکھ کر وہ جی بھر کر بدمزا ہوا۔

"یہ... یہ تمہاری بیوی... اور اور بچہ ہے۔" وہ عورت خوشی کی زیادتی کی وجہ سے بول نہیں پا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا وہ عورت اس کی بیوی سے اس کے بچے کو لے کر بے تحاشا اور والہانہ انداز میں چومنے لگی۔ اس کی بیوی حیران ہو کر کبھی اس عورت کو اور کبھی فیضان کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا بدتمیزی ہے۔" وہ بے زاری سے بڑبڑایا۔

"میری جان... میں ماں ہوں تیری۔" وہ اس بچے کو چوم رہی تھی۔ اور لفظ "ماں" سنتے ہی فیضان کو آگ لگی تھی۔

"سٹاپ! اسٹاپ دس۔" وہ دھاڑا۔ اور ایک جھپٹا مار کر اس نے بچے کو رانیہ سے لے لیا۔

"گاڑی میں جاؤ تم۔" وہ اپنی بیوی سے بولا۔

"مگر فیضان یہ..."

"سنا نہیں کیا کہا ہے؟ گاڑی میں جاؤ۔" وہ بیوی کے اگر مگر کرنے پر مشتعل ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی وہاں سے فوراً" چلی گئی۔

"فیضی... اس طرح تو نہ کر۔" رانیہ بہت ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

"کیا چاہتی ہیں آپ اب؟" وہ بہت غصے سے بول رہا تھا۔

"اس طرح میرے پیچھے آ کر' پیار جتا کر کیا ظاہر کرنا چاہتی ہیں آپ؟ مجھے سمجھ نہیں آتی اتنے سالوں بعد آپ زندہ ہو کر کہاں سے آ گئیں؟ نہیں ہے مجھے اب آپ کی ضرورت۔ اب میں وہ پانچ چھ سال کا بچہ نہیں رہا۔ دیکھیے! کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر دونوں بازو پھیلا کر بولا۔

"28 سال کا ہو چکا ہوں اور اب بھی آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کو یاد کر کے روتا ہوں گا' بلکتا ہوں گا' ہر دن کا آغاز اسی امید پر کرتا ہوں گا کہ کہیں سے میری ماں آ جائے۔ آپ کو لگتا ہے اب بھی ایسا ہی ہے...؟"

اس کی باتوں کی کاٹ سے رانیہ کو اپنا وجود کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"مسز اقبال! ہر وقت کی ایک ضرورت ہوتی ہے اور

ہر ضرورت کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اور آپ دونوں مواقع گنوا چکیں۔ میرے پیچھے مت آئیں... کچھ نہیں دوں گا میں آپ کو۔ وہی لوٹاؤں گا جو آپ نے مجھے دیا تھا۔ دکھ' درد' انتظار۔" اس کے رویے میں کہیں بھی لچک نہیں تھی۔

"فیضی میری جان! تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی تو غلط ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک پر میں مجبور تھی۔ بہت مجبور۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ پھر یکدم اس نے فیضان کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"تجھے یاد ہے جب تیرا آپریشن ہوا تھا' تب ہمارے پاس تیرے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے اور اقبال نے مجھے بلیک میل کر کے مجھ سے اسٹامپ پیپر پر دستخط کروا لیے تھے اور تجھے... تجھے مارنے کی دھمکی دی تھی اس نے میں مجبور ہو گئی تھی ورنہ..."

"میرا باپ ہمیشہ مجھ سے یہی کہتا رہا کہ تیری ماں ایک اچھی عورت تھی مگر افسوس' میرا باپ غلط تھا کس قدر' کس قدر چالاک ہیں آپ' ایک لمحے میں آپ نے ایک نئی کہانی بُن لی... ایک نیا جھوٹ گھڑ لیا۔ افسوس کہ میرا باپ نہیں جانتا کہ میری ماں ایک اچھی عورت نہیں ہے۔ کیا سمجھتی ہیں آپ کہ میں آپ کی اس دکھ بھری داستان پر ایمان لے آؤں گا اور آپ کو خوشی خوشی اپنے ساتھ لے جاؤں اور اس اسٹوری کا Happy Happy End ہو جائے گا تو... نیور۔ کیا سمجھتی ہیں آپ مجھے؟... کاٹھ کا الو یا پھر بے وقوف گدھا۔" رانیہ دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"مسز اقبال! ایک بات کان کھول کر سن لیں آپ کا حوالہ میرے لیے معتبر نہ کبھی تھا' نہ ہے اور نہ ہی ہو گا میں زیادہ سخت الفاظ استعمال کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ اس سے میرے باپ کی تربیت پر حرف آئے گا۔

اس لیے براہ مہربانی آئندہ اگر آپ نے میرا راستہ روکنے یا پھر مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا شخص آپ کی زندگی میں کوئی نہیں ہو گا۔ سمجھیں آپ۔" انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا تھا۔

"ساری زندگی آپ کی وجہ سے گالیاں سنی ہیں میں نے اور آپ... کاش کہ آپ نے مجھے پیدا نہ کیا ہوتا۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

"یہ میرا فیضی ہے۔ فیضان۔" وہ بے یقین تھی۔

کتنا مشکل ہے ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھنا' بے زاری دیکھنا' کتنا مشکل تھا۔ کاش کہ کوئی جان سکتا۔

"کتنی آسانی سے وہ میری ہر بات کو ایک کہانی کہہ گیا۔" 23 سالوں میں جتنا وہ روئی تھی اب تو اس کی آنکھوں کو اندھا ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ سلامت تھیں۔

کیا یہ سب دیکھنے کے لیے' آنسو تھے کہ اب بھی ایک تسلسل کے ساتھ بہے جا رہے تھے۔

"ہاں! 23 سالوں بعد جب اسے آ کر میں یہ بتاؤں گی تو وہ تو اسے کہانی ہی سمجھے گا نا۔ اس کے لیے اس کی ماں... ایک کہانی ہے۔ ایک بری عورت ہے... بری ماں ہے۔" سوچوں کی بھرمار تھی اس کے ذہن میں۔ اسے پروا نہیں تھی کہ وہ شاپنگ مال میں کھڑی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی کہ لوگ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اقبال تیرے مرنے سے بھی میرے عذاب کم نہیں ہوئے۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

"میری ماں ایک اچھی عورت نہیں ہے۔"

"کاش کہ آپ نے مجھے پیدا نہ کیا ہوتا۔" مختلف جملے تھے جو کہ اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔

"میں بری عورت... بری عورت... بری ماں۔" یکدم اس نے چلنا شروع کر دیا تھا۔

اس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے' اس کی چادر سر سے ڈھلک کر کندھوں پر آ گری تھی اور اس کا ایک کونا زمین پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ ایک نظر میں وہ کوئی خستہ حال عورت لگ رہی تھی اور وہ دو ہی لفظ بڑبڑائے جا رہی تھی۔

"بری ماں"۔

✲ ✲

نادیہ امین

تیز چیخ وپکار نے اس کے کانوں کے پردے گویا پھاڑ دیے تھے۔ مندی آنکھوں سے اٹھتے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے ان چیخوں سے فرار چاہی تھی' مگر بے سود تھا' زین گلا پھاڑے ماں پر چیختا چلاتا شاید چلا گیا تھا کہ تمام آوازیں تھم گئی تھیں۔

کسلمندی سے اٹھتے ہوئے پاؤں میں چپل اڑسے قدرے ڈھیلی چال سے وہ کچن میں آئی۔ ماں زین کے جانے کے بعد رونے میں مصروف تھی۔ کچن میں ڈرے سہمے بہن' بھائی سوکھی روٹی کے ساتھ چائے پینے میں مصروف تھے۔ ماں کی حالت دیکھ کر تو گویا ہر قسم کی بھوک ہی مٹ گئی تھی۔ وہ پلٹنے لگی کہ اماں پکار بیٹھی۔

"ناشتا نہیں کرو گی۔" ان کی رندھی ہوئی آواز میں کتنا درد تھا۔

"نہیں۔" وہ کچن سے آکر اپنے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔

یہ روز کا ڈرامہ تھا' روز زین چیختا چلاتا مزدوری پر جاتا۔ وہ شاید تھکنے لگا تھا۔ یہ مزدوری اس طرح اس کی قسمت میں لکھ دی جائے گی۔ ان میں سے کسی کو بھی گمان تک نہ تھا۔ بستر جھاڑ کر جھاڑو لگا کر وہ اپنے ابا کے پاس چلی آئی۔ وہ چادر اوڑھے گہری نیند سو رہے تھے۔ اتنا شور شرابا بھی انہیں جگا نہ پایا تھا۔ رات کی نشے کی دوائی نے بالکل بے سدھ کر دیا تھا۔ اک دکھ بھری نظر اپنے باپ پر ڈال کر وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

اپنے سب بہن' بھائیوں میں وہ دوسرے نمبر پر تھی' پہلے زین تھا' پھر ناظمہ' شگفتہ' تصور اور پھر زلیخا تھی' زلیخا کو ہر مہینہ خون چڑھتا' اسے تھیلیسیما مرض لاحق تھا ہر مہینہ الگ سے خون کے لیے خواری کرنا پڑتی۔

غربت نے کبھی ان کے گھر کا منہ نہیں دیکھا تھا شمس الدین پہلے سعودیہ میں ایک اچھی ملازمت پر فائز تھے۔ گھر میں پیسوں کی ریل پیل تھی۔ ان کا گھر اچھے فرنیچر اور آلات سے لدا تھا' لیکن جوں ہی شمس الدین بیمار ہو کر واپس چلے آئے' بے روزگاری اور بیماری نے گھر میں غربت کچھ اس طرح ڈال دی کہ دن بہ دن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ زین جو پہلے پہل پڑھتا تھا' اس نے پڑھائی ترک کر کے مزدوری شروع کر دی' لیکن اتنے بڑے کنبے کو تنہا کھلا نہیں سکتا تھا' وہ جو ان سب میں بہت حساس تھی' اسے شدید احساس تھا' اس گھر کی مجبوریوں کا' میٹرک سائنس میں کر کے وہ گھر پر ہی تھی۔ باقی بہن بھائی بھی تعلیمی سلسلہ موقوف کر چکے تھے۔

ان نامساعد حالات کو دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے کو تھا۔ ان کی ماں بہت سخت رعب و دبدبے والی تھیں' پورے محلے میں ان کا طنطنہ مشہور تھا' مگر اب وہ دن رات جیسے مصائب کی چکی میں پستی جا رہی تھیں۔

رات جب وہ ابا جان کو دوائی کھلا رہی تھی' تو اس نے اپنے دل کی بات زبان سے بیان کر دی۔

"ابا جان! میں ٹیوشن پڑھاؤں' دو' چار پیسے ہی گھر آ جایا کریں گے۔ اس محلے میں کتنے گھروں نے مجھ سے بات کی ہے۔ آپ اجازت دیں نا' اکیلا بھائی ہی تو دستوار نہیں' کچھ ہمیں بھی اس کی مدد کرنی چاہیے' پھر! جہاں دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے کہ محنت سے خود کمایا جائے۔"

"پر بیٹا تمہاری ماں نہیں مانے گی۔" وہ تذبذب میں پڑ گئے۔

"اس کی فکر نہ کریں' میں انہیں منا لوں گی۔" اس نے قدرے جوش سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' اپنی ماں کو منا لو' میری طرف سے اجازت ہے۔" وہ خوش ہو کر ماں کے پاس چلی آئی۔

صحن میں تخت پر بیٹھے وہ چاول صاف کر رہی تھیں۔

"اماں اک بات کروں آپ سے' غصہ تو نہیں کریں گی۔" کچھ ڈرے' سہمے لہجہ میں کہتی' وہ انہیں استفہامی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

"بولو۔" انہوں نے بنا کچھ خاص رد عمل کے کہا۔

"میں ٹیوشنز پڑھاؤں' ابا جان نے اجازت دے دی ہے۔" اپنی بات کہہ کر اس نے اماں کے تاثرات پڑھنا شروع کیے۔

"نہیں۔" ماں کے دوٹوک انداز نے اسے تلملا سا دیا۔

"پر کیوں؟" وہ جھنجلائی۔

"سب کیا کہیں گے؟"

"اگر سب کو فکر ہے ہماری تو پھر ہمارے گھر میں راشن ڈال کے جایا کریں نا' ہماری پڑھائی کا خرچہ' دیگر اخراجات پورے کیا کریں' خالی فکر سے کیا ہوگا۔"

ماں نے کچھ اس انداز سے گھورا کہ قدرے متامل ہو کر ایک بار پھر کہنے لگی۔

"امی یقین کریں' کوئی کسی کا نہیں' خود اپنے لیے جینا پڑتا ہے' خود اپنا کھانا پڑتا ہے' اوروں کی فکر چھوڑیں' ہم سب کی فکر کریں۔ تھوڑا موقع دیں ہمیں کہ ہم خود اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو جائیں۔ زلیخا کا سوچیں۔" وہ منت سماجت پر اتری تھی۔

وہ گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ محنت میں تو کوئی قباحت نہیں' پھر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر تھا کہ اپنا کمایا اور کھایا جائے' ایک فیصلے پر پہنچ کر انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے کر لو اپنی من مانی۔" وہ اٹھیں اور کچن میں چاول بنانے چلی گئیں۔ وہ خوش خوش اٹھ کر ناظمہ کو بتانے چلی گئی۔ پھر اس نے ایسے ہی کیا' وہ ٹیوشنز پڑھانے لگی۔ اس نے ایف اے پرائیویٹ میں داخلہ لیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک پرائیویٹ اسکول جوائن کر لیا۔ گھر میں کچھ پیسے آنے لگے تو اماں بھی کچھ مطمئن سی ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ کلاس لے رہی تھی' جب آیا اس کے پاس آئی۔

"آپ کو سر جی بلا رہے ہیں۔"

وہ آفس آئی۔

"آئیں مس سحرش' بیٹھیں۔" وہ بیٹھ گئی۔

"کلاس کیسی جا رہی ہے آپ کی۔" سر کے بارے میں کچھ باتیں مشہور تھیں جن میں سے ایک تو یہ تھی کہ وہ حسین خواتین پر فوراً "لٹو ہو جاتے ہیں۔ اور اس عنایت کے بدلے وہ اس خاتون یا لڑکی کو بہت مراعات دیتے" اسے اس انکل نما سر سے کوئی لگاؤ نہ تھا' بس مراعات چاہتی تھی' اس لیے وہ ان کے ہاں میں ہاں ضرور ملاتی۔

"میں نے چائے منگوائی ہے' ساتھ پی لیتے ہیں۔" سر نے کچھ اس لگاوٹ سے کہا کہ دل ہی دل میں ان پر لعنت بھیجتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔

"تھینک یو سر۔"

"کوئی شکایت تو نہیں نا' سیلری یا کسی بھی حوالے سے کچھ شکایت ہو تو ڈائریکٹ مجھ سے کہنا۔" ان کی حلیمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بس وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"اگر پے کچھ بڑھ جاتی تو' باقی تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ آپ کی تنخواہ میں میں نے ہزار بڑھا دیے' اب خوش۔" خباثت سے کہتے ہوئے انہوں نے عینک اتار کر ٹیبل پر رکھ دی۔ سر کے ساتھ بیٹھ کر اس نے چائے پی لی تھی اور ایک دو اشعار سن کر وہ باہر آئی اور قدرے گہرے سانس لے کر اپنی کلاس میں آگئی۔

تمام ٹیچرز اس سے جلنے لگی تھیں۔ سر کیا مہربان ہوئے کہ اس کے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے ایف اے کے بعد بی اے میں ایڈمیشن لیا۔ اب وہ ٹیچرز کی ہیڈ بنا دی گئی تھی۔

زلیخا کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ انہی دنوں جب وہ امتحانات کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی مصروف تھی کہ اسکول میں اسے چھوٹے بھائی تصور کی کال موصول ہوئی۔

"زلیخا فوت ہو گئی ہے۔" وہ رو رہا تھا۔

لڑکھڑاتے قدموں سے فون بند کر کے وہ آفس سے نکلی اور رکشا کر کے گھر چلی آئی۔ گھر میں اک کہرام سا مچا تھا' لوگ بڑی تعداد میں آئے بیٹھے تھے۔ ماں رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھیں' دل سخت کر کے اس نے چھوٹی بہنوں کو گلے لگائے اتنا کہا۔

"اس کے لیے موت بہتر تھی۔"

گھر میں اک سوگوار سی کیفیت تھی۔ ابا جان الگ اس اداس سے بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اماں کانی دنوں سے منہ کو قفل لگائے بس اک روبوٹ کی مانند کام کر رہی تھیں' چھوٹی بہنیں سرکاری اسکول جانے لگی تھیں' تصور بھی پڑھنے لگا تھا۔ زین مستقل مزدوری سے وابستہ تھا۔ دن بہ دن اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ اب تو وہ اسموکنگ بھی کرنے لگا تھا۔ شدید فاقہ اور ناساعد حالات نے اس کے ذہن پر کچھ اس طرح سے اثر ڈالا کہ اس کی ذہنی کیفیت دگرگوں سی ہو گئی تھی۔ مخدوش حالات کے باعث وہ چیختا چلاتا' سب کو پریشان کرتا' دن بہ دن وہ خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا تھا۔

سر ابراہیم کی عنایتیں جاری و ساری تھیں۔ رشتہ دار اور محلے والے تو اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ چچی' فردوس بیگم سے کہہ رہی تھیں۔

"سب باتیں بنا رہے ہیں باجی۔" وہ سب انہیں باجی کہتی تھیں۔

"جوان لڑکی کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے' ایسی ایسی باتیں توبہ۔" جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے چچی کانوں کو ہاتھ لگائے بولیں۔

"جب فاقوں سے مر رہے تھے اس وقت تو کوئی نوالہ منہ میں ڈالنے نہ آیا' اب ایسی کیا قیامت' اب ہم بھوکے نہیں سوتے' تب ہی سب کے دل میں درد ہو رہا ہے۔" فردوس بیگم اسے ہی سنا رہی تھیں' چچی پہلو بدل کر رہ گئیں۔ رشتہ دار' محلے والے' سب زین کے کان بھرنے لگے تھے۔ فہیم نے تو اک دن زین سے یہ تک کہہ دیا تھا۔

"یار اس اسکول کے پرنسپل کی ریپوٹیشن صحیح نہیں۔ تمہاری بہن کے بارے میں سب غلط باتیں کرتے ہیں۔"

اب تو فردوس بیگم نے لوگوں کی باتوں کی پروا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ صبح کے لیے رات سے ہی آٹا گوندھ کر کچن سمیٹ کر اس نے کچن کی لائٹ بند کر کے دروازہ بند کر دیا اور صحن میں پڑے تخت کی طرف آئی۔ آج چونکہ چودھویں کا چاند تھا' پورے صحن میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ تخت پر بیٹھ کر وہ آسمان کو تکنے لگی۔ آسمان پر تارے ہی تارے تھے۔ جانے کیوں سوچ کی وسعتیں زلیخا کی جانب کھنچی چلی گئی تھیں۔ غربت نے کچھ اس طرح انہیں گھیرا تھا کہ زلیخا کا پورا کا پورا وجود نگل گئی۔ زلیخا کا چہرہ اس کی نظروں میں آ سمایا۔ دو قطرے آنکھوں سے اس طرح گرے کہ پھر گرتے ہی چلے گئے۔ ہلکی ہلکی سردی لپیٹ میں لینے لگی' لیکن وہ ہنوز بیٹھی رہی۔ شگفتہ جو کسی کام سے باہر آئی تھی' اس کو دیکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

"آپی کیا کر رہی ہو' سردی بڑھنے لگی ہے' کمرے میں آؤ۔"

"ہاں۔۔۔ تم چلو میں آ رہی ہوں۔" اک ٹھنڈی گہری سانس لے کر وہ اٹھی۔ شگفتہ اور ناظمہ پڑھ رہی تھیں۔ وہ بستر پر دراز خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھتی سوچ میں گم رہی۔ پھر خود پر چادر ڈال کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ نیند کی آغوش میں تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح جلدی سے تیار ہو کر وہ اسکول چلی گئی۔ راستہ تیز تیز قدموں سے طے کرتے ہوئے وہ آس پاس سے غافل تھی۔ کچھ غیر محسوس کیفیت سی تھی' ایک دم سے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ محلے کا اکرم اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔۔۔ اس نے قدم تیز تیز اٹھانا شروع کیے۔ اسکول کے گیٹ تک پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا اکرم گلی کے نکڑ پر کھڑا چند پل کے لیے اسے دیکھتا مڑ کر چلا گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ خوف سے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کر کے وہ اندر داخل ہوئی۔ اسٹاف روم تک آتے آتے بھی خوف کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اکرم کیوں اس کا پیچھا کرنے لگا۔ یہ حیرت' غصے میں تبدیل ہوئی' چادر اتار کر اس نے الماری میں رکھی اور اپنے اندر کے اشتعال پر قابو پانے کی خاطر' ٹیبل پر

دھرے گلاس کو اٹھا کر جگ سے پانی انڈیلتی وہ اسی کو سوچ رہی تھی۔ پانی پی کر اس نے اپنے حواس بحال کرنے چاہے۔

"تو گویا یہ لوگ اب میرا پیچھا اس لیے کرتے ہیں کہ یہ دیکھ سکیں کہ میں کہاں کہاں جاتی ہوں اور کیا کچھ کرتی ہوں۔" سلگتے بھڑکتے ہوئے سوچتی وہ مزید آگ بگولا ہو رہی تھی۔ وہ سارا دن اشتعال میں ہی گزرا تھا۔ گھر آکر بھی موڈ آف ہی رہا۔

شام کے لیے کھانا بناتے وہ اکرم کے دماغ کو ٹھکانے لگانے کا پورا تہیہ کر چکی تھی۔

"امی بھوک لگی ہے، کھانا بننے میں کتنی دیر ہے۔" شگفتہ نے آکر اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا۔

"بس تھوڑی دیر، روٹیاں ڈالتی ہوں۔" فردوس بیگم کسی عزیز کے گھر گئی ہوئی تھیں، آج سارا کام اسے کرنا پڑا تھا۔ بہن بھائیوں کو کھانا دے کر وہ ابا جان کے پاس چلی آئی۔

"ابا جان آپ کھانا نہیں کھائیں گے۔" ان کے سرہانے بیٹھ کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"نہیں بیٹا دل نہیں چاہ رہا، تمہاری ماں کہاں ہے؟" انہوں نے بوجھل آواز میں پوچھا تو وہ بولی۔

"وہ حفیظ انکل کے گھر گئی ہیں، بس آنے والی ہوں گی۔"

وہ کتابیں اٹھائے باہر صحن میں چلی آئی۔ اس کا ماسٹرز پرائیویٹ کرنے کا ارادہ تھا، آج کل پڑھائی کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ایک تو اسکول، پھر ٹیوشنز کے بچے اور پھر گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہ ہوتی۔ کچھ دیر تک ورق گردانی کرتی رہی، پھر کتابیں بند کر کے اسکول کے بچوں کے ٹیسٹ چیک کرنے لگی۔

اگلے دن جب وہ بچوں کو روٹین ورک کروا رہی تھی کہ آفس سے سر نے بلوا لیا۔ وہ گئی تو آفس میں سر کے ساتھ کسی اور بندے کو دیکھ کر کچھ پل کے لیے دروازے میں رک سی گئی۔

"آئیں مس سحرش۔" سر کی اجازت پر وہ اندر آئی۔

"بیٹھیں۔" وہ بیٹھی سامنے بیٹھے شخص کی نظریں اس کے سراپے میں الجھ کر رہ گئیں، وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرا کزن ہے، اس کے بھتیجے کا ایڈمیشن کرنا ہے، کلاس ففتھ میں۔"

"جی سر۔"

"یہ کام کر دیں آپ، مس رفعت کو بھیج دیں۔"

وہ آفس سے نکلی، مس رفعت کو بھیج کر وہ واپس کلاس میں آئی۔ مس ترنم کلاس لے رہی تھیں، تسلی کر کے وہ فارم وغیرہ اسی شخص سے فل کرا کے بچے کو ایڈمٹ کر چکی تھی، کچھ دن بعد وہ بندہ پھر اسکول آیا۔

"یہ بکس صحیح ہیں، مگر ان کی ٹیچران میں سے کچھ چینج کرنے کا کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں یہ دو آپ چینج کر دیں، آپ کو میں لکھ دیتی ہوں کہ کون سی چاہئیں۔"

ایک پرچی پر لکھ کر اس نے بکس کے نام دیے۔ کچھ دن بعد وہ پھر آ گیا۔ اب کی بار پرنسپل صاحب نہیں تھے تو ناچار اسے ہی بیٹھنا پڑا۔

"ابراہیم بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ میٹنگ میں گئے ہیں، آج پرائیویٹ اسکولز کی میٹنگ ہو رہی ہے۔"

"کیا سیلری ملتی ہے آپ کو یہاں؟" اس کا اگلا سوال کچھ زیادہ ہی پرسنل تھا۔

"فائیو تھاؤزنڈ۔" اس نے سچ بتایا۔

"اگر میں آپ کو اک جاب آفر کروں اور ٹوئنٹی تھاؤزنڈ ہو تو۔" اس کے جملے نے اس کے گلے کو خشک کر دیا۔ تھوک کو نگلتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ اک این جی او ہے۔ وہاں ایک ویکنسی ہے، اگر تم چاہو تو تم آج جوائن کر سکتی ہو۔" اس کی آفر نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گی، ام۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میں گھر میں مشورہ کر لوں۔" اس نے بلا تردد کہا۔

"بالکل۔۔۔ پھر مجھے دو دن کے اندر اندر جواب دے دیں۔" اپنا فون نمبر دے کر وہ چلا گیا۔ وہ خوشی سے پاگل ہوتی وہاں سے اٹھ گئی۔ گھر آکر اس نے ماں کو بتایا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

"کیا سچ کہہ رہی ہو۔"

"ہاں۔۔۔ اماں ایسا موقع بار بار نہیں ملتا، کیا کروں۔"

"بالکل۔۔۔ یہ موقع نہ گنوانا۔"

اگلے ہی دن اس نے ہامی بھری اور ذیشان نے اسے کل ہی آنے کو کہا۔ وہ ملازمت شروع ہوئے کوئی پندرہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ اک ناگہانی موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ اس کا باپ خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

تخت پر پاؤں پسارے وہ اپنی حرماں نصیبی پر ماتم کناں تھی۔ جانے دکھوں نے اس گھر کو کیوں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، جتنا دکھوں سے، حالات سے لڑنے کی تیاری کرتی تو کچھ اور دکھ نصیب میں لکھ دیے جاتے۔

باپ کی فوتگی کی تعزیت کرنے ذیشان بھی آیا تھا۔ زیادہ چھٹیوں سے حرج ہو رہا تھا، اس لیے جلد ہی اس نے جاب پر جانا شروع کر دیا۔ اس کی ماں بھی کچھ عرصہ تک چھپکے چھپکے آنسو بہانے کے بعد گویا صبر کر چکی تھی۔ اس اندوہناک سانحہ نے در و دیوار کو اداس کر دیا تھا۔ گھر کی فضا بہت زیادہ بوجھل ہو کر رہ گئی تھی۔

تائی سلطانہ آج صبح ہی صبح نازل ہوئی تھیں۔ چائے کے سپ لیتی وہ فردوس بیگم کے صبر کا امتحان لیتی بولیں۔

"سنا ہے وہ لڑکا بھی آیا تھا جو سحرش کے ساتھ کام کرتا ہے۔ بھئی سچ پوچھو تو تایا بہت ناراض ہو رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ پرایا لڑکا گھر تک آ گیا۔"

"دیکھو آپا! اگر ان باتوں کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو کہو، اب اس موضوع پر میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔" فردوس بیگم جو سبزی کی ٹوکری میں پڑے آلو چھیل رہی تھیں، دو ٹوک انداز میں بولیں۔

تائی تو گویا اچھل پڑیں۔

"اے بی بی اور کیا بات کروں آج کل سب کی زبانوں پر یہیں اک بات ہے، اتنی بے حیائی تو دیکھی نہ سنی۔"

"ہاں تو جاؤ اپنے گھر، نہ دیکھو۔" فردوس بیگم نے قدرے سکون سے کہا۔

وہ تو کرنٹ کھا کر اٹھیں اور یہ جا اور وہ جا۔

"آ جاتے ہیں منہ اٹھا کر۔ کبھی سوچا کہ ہم کیا کھاتے ہیں، کیا پیتے ہیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی آلو کاٹنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

ذیشان اور وہ بہت کلوز ہو گئے تھے۔ وہ سارا دن اس کے پاس ہوتی، اگر دور دراز کے علاقوں کا وزٹ کرتا ہوتا تو بھی وہ اس کے ساتھ ہی ہوتی۔ وہ اس پر بہت نوازشات کرنے لگا تھا۔ وہ بھی ان نوازشوں کا خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اب اس کے لباس اٹھنے بیٹھنے، حتیٰ کہ ہیر اسٹائل تک میں تبدیلی آ چکی تھی۔ جدید قسم کے لباس اور خوب صورت ہیر اسٹائل نے اسے حسین سے حسین تر بنا دیا تھا۔ ذیشان آج اس کے حسین سراپے کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا یہ حسین سراپا، تمہاری یہ کالی ناگن جیسی آنکھیں، یہ ریشمی گیسو، دیکھ کر کوئی بھی کافر مسلمان ہو سکتا ہے۔" اس کی لگاوٹ آمیز مسکراہٹ دیکھ کر اس کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ در آئی۔

"یقین کرو کہ ایسا حسن میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا۔" اس کا ہاتھ تھامے وہ بڑے جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"اچھا جناب! اب کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔" اس نے چٹکی بجاتے جیسے اسے ہوش دلایا۔

ذیشان بڑے جذبے لٹاتا وہ جان گئی تھی کہ وہ پور پور اس کی محبت کے نشے میں ڈوب چکا ہے۔ وہ بھی اسے یہی احساس دلانا چاہتی تھی' اگرچہ گھر والوں کے لیے وہ بے لوث تھی۔ وہ جو کماتی اس کا زیادہ حصہ ماں کو ہی دیتی ۔ وہ یہ سب اپنے بہن' بھائیوں کے لیے ہی کررہی تھی۔ لیکن اب غیر محسوس انداز میں اک عجیب سا زعم و تفاخر اس کی شخصیت میں در آیا تھا۔ بہت زیادہ مصروفیت کے باعث وہ گھر کے کاموں سے جیسے کٹ کر رہ گئی تھی۔ اور فردوس بیگم بھی اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں۔

"تھک گئی ہو بیٹا آرام کرو' میں کرلوں گی۔" ہمیشہ یہ جملے ان کے لبوں پر ہوتے۔

ناظمہ ہومیو پیتھک کالج میں چلی گئی' جبکہ شگفتہ میٹرک کررہی تھی۔ وہ ماسٹرز کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی کہ اس دوران یہ انکشاف ہوا کہ زین نشہ کرنے لگا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ جیسے ٹرانس کی کیفیت میں تھی۔ اماں الگ رونے دھونے میں مصروف تھیں۔ جب اس نے زین کو سمجھانا چاہا تو وہ الٹا ان پر چڑھ دوڑا۔

"مجھے مت سمجھاؤ۔ اپنی اس بیٹی کو سمجھاؤ۔ جو آج کل اس لڑکے سے چپکی ہر جگہ دکھائی دے رہی ہے اس کے ساتھ۔"

پھر اس کی شان میں وہ بہت کچھ کہتا رہا تھا۔

زین مزدوری ترک کرچکا تھا' اب سارا دن آوارہ پھرتا رہتا۔ البتہ تصور بہت ذہین تھا' وہ دل و جان سے پڑھنا چاہتا تھا۔ وہ بہت دلجمعی سے پڑھتا تھا' ہر کلاس میں اول آتا۔ سحرش کو بھی تصور سے بہت محبت تھی' اسے بہت امیدیں تھیں تصور سے۔ فطرتاً" بھی وہ قدرے سلجھا ہوا تھا۔

آج وہ ذیشان کے ساتھ ریسٹورنٹ میں آئی تھی۔ آئس کریم کھانے کے بعد وہ اٹھے اور گاڑی کی طرف آئے' اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی کہ غیر ارادی طور پر اس کی نظریں دور کھڑے زین پر پڑیں' ابھی تک زین کی نظریں اس پر نہیں پڑی تھیں' کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گئی اور چادر سے منہ کو ڈھانپ لیا' ذیشان اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیرت زدہ تھا۔

"بھائی ہے' تمہیں تو پتا ہے نا کہ وہ بات کا بتنگڑ بناتا ہے۔ چلو گاڑی اسٹارٹ کرو۔" اپنے خوف کو کم کرنے کے لیے گہری سانس لے کر وہ مڑ کر اطمینان کرکے بولی۔

"شکر ہے دیکھا نہیں' ورنہ تو....." ذیشان مسکراتا ہوا بولا۔

"تو کیا ہوتا' یہی کہتا کہ کتنا ہینڈسم لڑکا ساتھ بیٹھا ہے۔"

"جی اتنا بھی نہیں۔" اس نے شرارت سے کہا تو وہ مسکرایا۔ گھر آئی تو چچی خورشید کو دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی چہرے پر ناگوار تاثرات ابھر آئے۔

"السلام علیکم چچی جان۔"

"وعلیکم السلام"...... خوش خلقی سے جواب دیتی وہ سرتاپیر گھورنے لگیں۔

"یہ بھلا کوئی وقت ہے آنے کا' یہ کس قسم کی نوکری ہے' جو شام تک بٹھائے رکھتے ہیں۔" ان کی تجسس فطرت جاننے کو بے چین ہورہی تھی۔ ان کی بات کا کوئی جواب نہ دے کر وہ کمرے میں چلی گئی۔

"ارے فردوس تمہاری اس بیٹی کا نخرہ تو آسمان کو چھو رہا ہے۔ دیکھو جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔" چچی خورشید کو تو گویا بچھو نے ڈنگ مارا ہو۔

"تھکی ہوئی آئی ہے' سانس تو لے لے' پھر تم سوال جواب کرنا۔" فردوس بھی عاجز آچکی تھیں' ان کے ان فضول سوالوں سے۔

"جاتی ہوں' چولہے پر لوبیا چڑھائی تھی' جل نہ گئی ہو۔" چچی اٹھیں تو فردوس بیگم نے سکون کا سانس لیا۔

☆ ☆ ☆

وہ آفس میں بیٹھی کچھ کاغذات سامنے پھیلائے دیکھ رہی تھی' ذیشان چلا آیا۔

"یہ لو گلاب جامن کھاؤ۔" مٹھائی کا ڈبا اس کے سامنے رکھے وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"واہ.... یہ کس خوشی میں۔" مٹھائی اٹھاتے وہ بھی خوشی سے بولی۔

"میری منگنی کی خوشی میں۔" گلاب جامن جیسے اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔ جسے بمشکل نگلتے بولی۔

"اچھا تم نے بھی بتایا ہی نہیں کہ تمہاری...."

"دراصل سرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

"کون ہے وہ؟" اپنے تاثرات پر اس نے قابو پالیا تھا۔

"کزن ہے میری' میری پسند سے ہی ہوئی ہے' بہت باپردہ ہے' پاک باز سی ہے' بچپن سے دیکھ رہا ہوں اسے' بہت صاف کردار کی ہے' مجھے ایسی ہی بیوی چاہیے تھی۔ امی سے کہا تھا کہ شادی کرنی ہے تو اسی سے ورنہ نہیں۔" وہ جس جذب سے کہہ رہا تھا اس سے بخوبی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اس رشتے کی وجہ سے کس قدر خوش ہے۔

دوسری طرف وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ اس مرد کو باپردہ بیوی چاہیے تھی اور فلرٹ اور افیئرز بے پردہ لڑکیوں سے چلاتا تھا۔ وہ تو اس کے منہ پر طمانچے مار رہا تھا۔ یک دم سے اس کا دل مردوں سے اچاٹ سا ہوگیا۔

"سنو آج شام اک زبردست سی پارٹی ہے' چلو گی۔" اب بھی وہ اس کیفیت سے بے خبر کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے چلیں گے۔" اگر وہ انکار کرتی تو ذیشان کو اس کی کیفیت کا اندازہ ہوجاتا' اس لیے اس نے جانے کی ہامی بھرلی۔

شام کو وہ اچھی طرح سے تیار ہوکر وہ ذیشان کے ساتھ پارٹی میں چلی آئی۔ وہ ایک جانب بیٹھی کولڈ ڈرنک کے سپ لے رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص اس کی جانب چلا آیا۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس نے بڑی شائستگی سے کہا تو اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"کیا میں آپ کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔" وہ شخص درمیانے قد کا تھا' اس کی رنگت کالی اور توند نکلی ہوئی تھی' آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے وہ اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی کام ہے آپ کو مجھ سے۔" ذیشان کا غصہ اس پر اتارتے جیسے وہ کچھ چٹخنے لگی تھی۔

"اگر آپ کو کام ہو تو' میرا مطلب ہے مجھے سیکریٹری کی ضرورت ہے' آپ کام کریں گی' دراصل میں صدیق گروپ آف انڈسٹری کا مالک ہوں اور مجھے ایک سیکریٹری کی ضرورت ہے' اگر آپ...." اس کی بات کاٹتی وہ یک دم بولی۔

"میری سیلری کتنی ہوگی۔" ابرو چڑھا کر اس نے سپ لیا۔

"جتنی آپ چاہیں۔" وہ عام سے انداز میں بولا۔

"تو ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" وہ اچانک کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی۔ ذیشان قریب آیا۔

"چلیں۔" اس نے توند والے سے وزیٹنگ کارڈ لے کر پرس میں ڈالا اور ذیشان کے ہمراہ گاڑی کی طرف آگئی۔

"کون تھا یہ توند والا۔" ذیشان گاڑی اسٹارٹ کرکے بولا۔

"اک موٹی آسامی' جاب کی آفر کررہا تھا۔"

"تم نے قبول کرلی آفر۔" ذیشان نے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

"ہاں...."

"چلو اچھی بات ہے۔" ذیشان نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ کر کہا۔

☆ ☆ ☆

اس نے وہاں ملازمت کیا کرلی کہ اس کے تو گویا دن ہی بدل گئے تھے۔ پرکشش سیلری پیکج کے ساتھ دیگر مراعات' گھر میں جیسے پیسوں کی فراوانی ہونے لگی۔ نئے صوفے' قالین' کارپٹ' غرض یہ کہ ہر چیز آنے لگی۔

زین بھی اب چپ سا نشے میں دھت خاموش بھری زندگی گزار رہا تھا۔ گھر کے سارے فیصلے اب سحرش کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچتے۔ اک عجیب سا غرور اس

کی شخصیت میں آتا جارہا تھا۔ دونوں کے ساتھ حالات بھی بدل رہے تھے۔

پروفیشنل کاموں میں وہ بہت سینئر تھی۔ کام دل لگا کر کرتی، نظام صاحب اس کی اس ذمہ دارانہ صلاحیت سے بہت انسپائر تھا۔ وہ اب اس کی گڈ بک میں آچکی تھی۔ اور ان کے لیے بہت قابل بھروسہ تھی۔ ایک خاص بات جو اس نے نوٹ کی تھی کہ نظام صاحب کو دیکھ کر جو پہلا خیال دل میں آیا تھا ان کی شخصیت کے حوالے سے وہ بہت بودا نکلا تھا۔ وہ اسے دل پھینک قسم کا انسان سمجھ رہی تھی، جبکہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے ایک بے ضرر باس تھے۔ اگرچہ وہ ان کے ساتھ پارٹیز میں جاتی، پر کبھی کوئی غیر اخلاقی پہلو اس نے نہیں دیکھا تھا ان کی شخصیت میں۔ یہ شاید اس کی خوش نصیبی تھی کہ اسے یہاں ملازمت اور نظام صاحب جیسا باس ملا تھا۔ یہ عقدہ بھی جلد کھلا تھا، جب وہ پہلی بار ان کی بیوی کو دیکھ پائی تھی وہ اپنی فائلز لیے کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہی تھی، جب ایک حسین خاتون بلا اجازت اس کے آفس میں آگئیں، خوب صورت قیمتی بلیک ساڑھی میں ان کا بے مثال حسن اور بھی دو آتشہ تھا۔ وہ سیدھی نظام صاحب کے کمرے کی جانب بڑھنے لگیں کہ اس نے آواز دے کر روکا۔

"آپ کون ہیں؟ اور اس طرح بغیر اجازت کیسے جارہی ہیں۔" وہ بنا جواب دیے کچھ پل اسے دیکھتی رہیں، پھر اندر چلی گئیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے گئی مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ نظام صاحب ان خاتون کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"آج یہاں آکر تم نے تو ہمارا دن بنا دیا۔"

ایک حسین و لاپرواسی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتی وہ سحرش کو دیکھ کر نظام صاحب سے بولی۔

"ان کو بتادیں کہ ہم کون ہیں؟"

"اوہ ہاں مس سحرش یہ ہماری مسز ہیں، جمال نشین۔" وہ شرمندہ ہوگئی، اس نے ان کے ساتھ بہت بدتمیزی کی تھی، جس کے لیے معذرت ضروری تھی۔

"اوہ سوری میم... مجھے پتا نہیں تھا اس لیے۔"

"کوئی بات نہیں، یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔" وہ کمال تفاخر سے کہتی، وہ یک دم نظام صاحب سے باتوں میں مشغول ہوگئیں۔

اک دن وہ مبین سے اس بات کا ذکر کر رہی تھی۔

"نظام صاحب کی بیوی بے حد حسین ہے، مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا انہیں دیکھ کر تو آنکھیں بالکل چندھیا سی گئیں۔"

"نظام صاحب ان کے عاشق ہیں۔" مبین اپنے کیبن میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اسے جواب دیے جارہا تھا۔

"ان کی عمر میں تو بہت فرق ہوگا نا۔" اس نے دل میں دبے سوال کو اگل ہی دیا۔

"نہیں... وہ تین جوان بیٹوں کی ماں ہے۔" اس کے جواب نے تو سحرش کو بت بنا دیا تھا۔ شدید حیرانی کے عالم میں وہ صرف یہی کہہ سکی۔

"تین جوان بیٹے۔"

"ہاں..." مبین کی انگلیاں کی بورڈ پر بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔

"تب ہی نظام صاحب ادھر ادھر تانکا جھانکی نہیں کرتے۔" دل ہی دل میں سراہتے وہ خود سے مخاطب تھی۔

اس جگہ وہ بہت خوش تھی، آفس کا ماحول بھی مناسب تھا اور سیلری بھی، ناظمہ ہومیو پیتھک کورس مکمل کرچکی تھی، آج کل پریکٹس کر رہی تھی، شگفتہ ایم بی اے کر رہی تھی، اور تصور ایف ایس سی کر کے آج کل باہر جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ وہ کبھی ماں کو، تو کبھی سحرش کو کنوینس کرتا رہتا۔ "دیکھو تصور پہلے تم اپنی تعلیم مکمل کرلو، پھر چاہے تو کچھ بھی کرو مگر..."

"اچھا آج کل بڑی بڑی ڈگریوں والے فارغ ہیں، تو میں... پھر یہاں کچھ بھی نہیں ہے، بہت اچھا ویزا ہے، ہوسکتا ہے اللہ نے اس میں ہمارے لیے بہتری لکھی ہو، صرف اک چانس دیں، پھر کبھی نہیں کہوں گا۔ وہی کروں گا جو آپ کہیں گی۔"

اس کی باتوں پر غور کرتی وہ صرف یہی کہہ سکی۔

"ٹھیک ہے، جو تم اپنے لیے مناسب سمجھو۔"

پھر تصور باہر چلا گیا۔ واقعتاً اسے بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ وہ بھی کچھ پرسکون سی ہوگئی۔ اماں ان کو دیکھ کر خوش ہوتیں، اگر سحرش نے ہمت نہ کی ہوتی تو آج وہ نہ جانے کن حالوں میں ہوتے۔ وہ دن رات سوچتی۔ وہ تمام رشتے دار جو اعتراض کرتے اب جلتے کڑھتے، انہوں نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان کے گھر کی آرائش نہیں دیکھ سکتے تھے، نہ فردوس بیگم کے بچوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھ سکتے تھے۔ فردوس بیگم بھی ان کی لاتعلقی پر خوش ہوتی، پرسکون ہوگئی تھیں۔ ان کا میل ملاپ کون سا فائدہ مند تھا کہ قطع تعلق کچھ اثر ڈالتا۔ محلے والے، رشتہ دار فردوس بیگم کے بچوں کے لباس، ان کے رہن سہن کو دیکھ کر منہ میں انگلیاں دبائے حیرت زدہ ہوتے۔ سحرش نے تو کبھی کسی رشتے دار اور محلے کے گھر کا منہ تک نہ دیکھا۔ ایسے لوگوں پر لعنت ڈالتی جو مصیبت میں بجائے مدد کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں۔

* * *

وہ مبین کے کیبن میں کھڑی اس سے کچھ ڈسکس کر رہی تھی کہ کسی نے اسے مخاطب کیا۔ پلٹ کر اس نے اس شخص کو دیکھا جو غالباً کسی کام سے آیا تھا۔

"جی کہیے۔"

"میں ولید ہوں۔ نظام صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، آپ سحرش ہیں نا، نظام صاحب نے آپ کو بتایا ہوگا میرے بارے میں۔" اس کی وضاحت نے کچھ یاد دلایا۔

"جی جی... آئیے، میں آپ کو آپ کا آفس دکھا دیتی ہوں۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اسے اس کے آفس لے گئی۔

"یہ ہے آپ کا آفس، باقی کام آپ کو سر شکیل سمجھا دیں گے۔ آپ بیٹھیے، میں سر شکیل کو آپ کے پاس بھیج دیتی ہوں۔"

کچھ ہی دیر میں سر شکیل آچکے تھے۔ وہ اپنے آفس آئی، وہ اس شخص کے بارے میں سوچنے لگی، سر نے کہا تھا کہ آج ایک نیا ایگزیکٹو آفیسر آئے گا، وہ تو بھول ہی چکی تھی، اگر وہ شخص اسے یاد نہ دلاتا، وہ بندہ کافی ینگ تھا، اس کا خیال تھا کہ کوئی ادھیڑ عمر کا بندہ ہوگا، مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ کچھ دیر میں مبین اس کے کمرے میں آیا۔

"مس سحرش تم نے دیکھا وہ بندہ تو کافی ینگ ہے، میرا تو خیال تھا کہ کوئی بڑی عمر کا ہی ہوگا ایگزیکٹو آفیسر۔" جو وہ سوچ رہی تھی مبین نے بھی بالکل ویسا ہی سوچا تھا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال تھا۔" اس نے اتفاق کیا۔

"چلیں اپنی تو دوستی ہو ہی جائے گی، اپنی عمر کے بندے کے ساتھ، ذرا ایزی فیل ہوتا ہے۔" وہ کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔

اس دن کے بعد اس بندے سے اس کی کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ جبکہ مبین سے اس کے بارے میں وہ سنتی رہتی۔ وہ ایک دور دراز کے گاؤں سے تعلق رکھتا تھا، ایک ماں تھی، باپ نہیں تھا، دو بہنیں تھیں جو دونوں شادی شدہ تھیں۔ وہ بہت ذہین بندہ تھا، یہ نظام صاحب سے سنا تھا۔ ایک، دو بار ان کی سرسری ملاقات ہوئی جس میں ضروری کام کی بات ہی ہوئی تھی۔ اک دن جب نظام صاحب چھٹی پر تھے وہ بھی سارا کام کر کے فارغ تھی تو اپنے آفس سے نکلی، سیدھی شکیل صاحب کے آفس آئی تھی۔

شکیل صاحب نے ایک جگہ قسطوں پر مناسب فلیٹ دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں پوچھنے آئی تھی، لیکن آفس میں ولید کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ دونوں آستینوں کو فولڈ کیے ایک ہاتھ ٹیبل پر رکھے دوسرا بالوں میں دھیرے دھیرے پھیرتا وہ ہنوز شکیل صاحب سے ہمہ تن گوش تھا۔

"آئیں مس سحرش، بیٹھیں۔" شکیل صاحب کی نظر پڑی تو یک دم سے اسے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ وہ چپ چاپ سی آکر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دوسری جانب ولید پینٹ کی جیب سے موبائل نکال کر غالباً میسجز پڑھنے لگا، اس نے نوٹ کیا ایک بار بھی اس نے اس پر نظر نہیں ڈالی تھی۔

"شکیل صاحب آپ کب دکھائیں گے وہ فلیٹ۔ اگر آج نہیں تو پھر ابھی میں گھر جاؤں گی کیونکہ مجھے آج جلدی پہنچنا ہے گھر ضروری کام ہے۔" اس نے کچھ وضاحت کی تو شکیل صاحب چونکتے ہوئے بولے۔

"سوری بیٹا میں تو بھول ہی گیا اس طرح کرتے ہیں کہ کل چلتے ہیں' آج تو مجھے بھی اک کام ہے' دراصل بیوی کے کپڑے ٹیلر کو دیے ہیں' اگر گھر نہ لے کر گیا تو سمجھو خیر نہیں۔ پہلے جا کر اس ٹیلر کی خبر لوں کہ آج شام کو اسے شادی پر جانا ہے۔" شکیل صاحب مسکرا کر کہہ رہے تھے۔

وہ اٹھی تو شکیل صاحب ولید سے بولے۔

"تم بھی ابھی جاؤ گے۔"

"ہاں نہیں۔" وہ چونک کر موبائل آف کر کے جیب میں ڈال چکا تھا۔

"میرا کام رہتا ہے' ختم کر کے ہی جاؤں گا۔" وہ انہیں چھوڑ کر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

بے کیف دن راتیں گزر رہی تھیں۔ تصور پیسے بھیجنے لگا تھا' جب مالی حالات بہتر ہوئے تو کچھ اور بے سکونی سی طاری ہونے لگی۔ جانے کیوں اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ولید کے بارے میں کچھ زیادہ سوچتی ہے۔ شاید وجہ وہ دن ہو جب شدید بارش ہو رہی تھی اور وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی پریشان ہو رہی تھی' موٹر سائیکل قریب آکر رکی' جس کو دیکھ کر وہ کچھ پل کے لیے متحیر ہو گئی۔

"بیٹھیں میں چھوڑ دیتا ہوں آپ کو۔" اس کی گمبھیر آواز اس کے سراپے کی مانند حسین تھی' وہ کچھ پل کے لیے متذبذب رہی۔

"دیر ہو رہی ہے۔" وہ ایک بار پھر بولا۔

خاموشی سے پیچھے بیٹھ کر وہ اپنے بیگ کو آگے کر چکی تھی۔ سارا راستہ وہ دونوں خاموش رہے۔ ولید نے بھی کوئی بات نہ کی تھی۔

ایڈریس بتا کر جب اتری تو اس نے اس کا شکریہ کیا۔ بنا کچھ کہے وہ واپس چلا گیا تھا۔ اک دن ا بہت تعجب ہوا' مبین کے منہ سے ہی سن کر کہ وہ ا اس کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ مبین کے سا تو وہ خاموش رہی' پھر شدید حیرانی نے اسے آگھیرا تھا' پھر آج جب وہ مبین کے کیبن کی طرف آ رہی تھی تو جو اس کی جانب پشت کیے کھڑا تھا' مبین سے اسی متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔

"مس سحرش آج آئی یا نہیں۔ دکھائی نہیں دیں۔" بظاہر وہ بڑے عام سے انداز میں پوچھ رہا تھا مگر کچھ تھا اس کے لہجے میں۔ جیسے محسوس کر سحرش کا دل اچانک دھڑک سا اٹھا۔ اس نے سنا تھا کہ جب اچانک دل دھڑکنا شروع کر دے تو... تو کیا یہ بھی یہی چاہتی تھی وہاں کھڑے کھڑے بھی وہ وہاں نہیں تھی۔ مبین اسے دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا تھا۔

"یہ دیکھو تمہارے پیچھے ہی کھڑی ہیں اور تم رہے ہو کہ دکھائی نہیں دیں۔" اس کا بھانڈا مبین انجانے میں پھوڑ دیا تھا۔ وہ کچھ خجل سا فوراً" چلا گیا۔

"ارے ابھی تو تمہارا پوچھ رہا تھا اور ابھی...۔" ا دم سے مبین کچھ خیالی انداز میں بولا۔

"اوہ کہیں صاحبزادہ عشق وشق تو نہیں کر بیٹھا پھر تیز آواز میں ہنستا سحرش کو دیکھنے لگا۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ تو گیا کام سے۔" وہ ہنوز ہنسے جا تھا جبکہ سحرش بے خیالی میں اسے دیکھتے رہنے کے بعد اچانک ہوش میں لوٹی۔

"اگر ان بے تکی باتوں سے فرصت ملی ہو تو عرض کروں۔" اس کی ہنسی کو بریک لگا' پھر ایک بار سے ہنستے ہوئے بولا۔

"ارشاد... ارشاد...۔"

"وہ چھٹی پر ہے۔" دانت پیستے ہوئے وہ پلٹ اپنے آفس میں چلی گئی' مبین اب سیریس ہونے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی' سردی بڑھ گئی تھی'

ندموں پر پھیلائے وہ چائے بھرا مگ ہاتھ میں رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی' شگفتہ ے استری کر رہی تھی' ناظمہ ناخنوں پر نیل پالش ا رہی تھی۔ فردوس بیگم اندر آئیں اور ناظمہ کو دیکھ کر ے ناراضی سے بولیں۔

"یہ وقت ہے نیل پالش لگانے کا' ماں کا ہاتھ تم بھی بٹانا' تم سے اچھی تو شگفتہ ہے۔ جو کپڑوں کا ڈھیر استری جا رہی ہے' چلو اٹھو سالن چڑھاؤ اور سنو۔" اسے بی سے اٹھتے دیکھ کر مزید احکامات جاری کرتے ہے بولیں۔

"پودینے کی چٹنی اور رائتہ بھی بنانا۔" فردوس بیگم جائے نماز ڈال کر مغرب کی نماز پڑھنے لگیں۔ رش کے موبائل کی بپ بجی تو اک انجانا نمبر دیکھ کر نے آف کا بٹن دبا دیا۔ دو' تین بار متواتر بجتا رہا' رکار اس نے او کے کیا۔ دوسری جانب ناموس سی آواز سن کر وہ اچنبھے میں پڑ گئی۔

"جی کون؟ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں بات کر رہا ہوں ولید۔" پہلی دفعہ موبائل پر اس کی آواز سنی تھی' اس لیے جان نہ پائی۔

"اوہ سوری' میں پہچان نہ سکی۔ جی کوئی کام ہے آپ کو۔" اک نظر نماز پڑھتی ماں پر ڈالے اس نے دک انداز اپنایا۔

"دراصل آفس میں بات ہو نہیں پاتی' تو سوچا موبائل ہی یوز کر لوں۔ کل سنڈے ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لنچ کریں۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔"

"ٹھیک ہے' میں آجاؤں گی۔" جان چھڑاتے اس نے یہ جملہ بول تو دیا' مگر دل جس انداز سے دھڑکنے لگا لگ رہا تھا کہ سینے سے نکل کر باہر آجائے گا۔ اپنی یہ کیفیت اسے خود عجیب سی لگ رہی تھی۔ اک طرب بھری حیرت اک جانفزا تصور نے دل میں گدگدی سی دی۔ اک نقرئی ہنسی آپ ہی آپ ہونٹوں پر در آئی۔

"کس کا فون تھا بیٹا۔" فردوس بیگم دعا مانگ کر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

"کولیگ تھا' کہتا ہے کہ اک ضروری کام ہے' کل ملنا ہے۔" اس نے عام سے انداز میں کہہ کر ماں کو چپ کرا دیا۔ اپنے کمرے میں آکر وہ بستر پر گر کر جیسے آپ ہی آپ مسکرا اٹھی۔

اس بندے میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ جس نے اس عورت کا دل موہ لیا تھا۔ اک عجیب سی کھلبلی وجود میں ہو رہی تھی' ایسا تو اس نے کبھی بھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس مرد کو پسند کرنے لگی تھی یا شاید محبت کرنے لگی تھی' جو بھی تھا وہ اس دلدل میں اتر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

اپنی دلکشی سے اس عورت کو ریزہ ریزہ کرنے والا وہ مرد اس ریسٹورنٹ میں بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ ریڈ سلک کا نفیس کام والا سوٹ زیب تن کیے وہ اس کے قریب آئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ یک دم سے کھڑا ہو گیا۔

"میں لیٹ تو نہیں ہوئی۔" بیٹھتے ہوئے وہ بولی تو وہ دھیمے پن سے مسکراتا بولا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"جی کہیے' کیا بات ہے کہ جس کے لیے آپ کو مجھے یہاں بلانا پڑا۔"

اپنے دل کی حالت چھپاتے ہوئے وہ اس کے لبوں سے سننے کے لیے بے تاب تھی۔

"میں اک سیدھا سا بندہ ہوں' زیادہ کچھ تو نہیں کہوں گا' بس جو دل میں ہے وہی کہوں گا۔ میں بہت دنوں سے تم سے کہنا چاہتا تھا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں' پہلے میں نے اپنا تجزیہ کیا کہ آیا میں صرف پسند کرتا ہوں یا کچھ اور بھی ہے۔ جب دل کو لگا کہ میں پسند کی سرحد عبور کر چکا ہوں تو پھر یہ رئیلائز ہوا کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ جانے یہ بات سن کر تمہیں کیسا لگے' پر میں صاف بات کر رہا ہوں' میں بہت محبت کرنے لگا ہوں تم سے' اور تم سے شادی کرنا چاہتا

ہوں۔"

اس کی اتنی بات پر وہ کھل کر مسکرائی۔

"اتنی سی بات کے لیے اتنا بڑا خرچہ۔" اس کا اشارہ لنچ کی جانب تھا۔

"میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ اور اس کا جواب دو۔" اس نے اس کی باتوں کا برا نہیں مانا تھا' وہ قدرے ریلیکس ہوا تھا۔ دوسری جانب وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔

"میری بات کا جواب دو۔"

"اپنے والدین کو میرے گھر بھیج دو۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا' تو وہ جیسے جھوم اٹھا۔

"میرا باپ نہیں ہے' ماں کو گاؤں سے بلوا کر میں فوراً بھیجوں گا۔" اس کی جلد بازی پر وہ مسکرائی۔ پھر دونوں نے بہت دیر تک باتیں کی تھیں' ساتھ لنچ کیا' گھر آکر بھی وہ اسی کیفیت میں تھی' اک مسرور سی خوشی دل کو سکون دے رہی تھی۔

ہر گزرتے دن وہ دونوں قریب ہو رہے تھے۔ وہ دونوں عشق کی اس وادی میں ڈوبے ارد گرد سے غافل تھے۔ ان کا رشتہ طے ہو چکا تھا' جلد ہی شادی ہونے کی تیاری تھی۔

آج بھی ولید سے بات کرتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"شادی سادگی سے کریں گے' میں اپنی شادی میں کسی رشتے دار' عزیز و اقارب کو مدعو نہیں کروں گی' کیونکہ فلیٹ میں نے لیا ہے' میں شادی کا اتنا بڑا خرچہ افورڈ نہیں کر سکتی۔" ولید کے سامنے اس نے بہانہ گھڑ لیا تھا۔ شادی سادگی سے ہی ہوئی' ولید کی جانب سے اس کی ماں اور اس کے کچھ دوست تھے' جبکہ ادھر سے بھی صرف گھر کے لوگ تھے۔ ولید کی ماں کچھ دن ان کے ساتھ رہ کر واپس گاؤں چلی گئی کہ ان بند فلیٹوں میں اس کا دل گھبراتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں بہت مسرور تھے۔ ولید اس کا بہت خیال رکھتا وہ بہت کیئرنگ تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کبھی دل کی مراد ایسے بھی بر آئے گی۔ آسمان کی نیلاہٹیں دیکھتے ہوئے وہ اپنی خوش نصیبی کو سوچ رہی تھی۔ اس کی شادی کے ٹھیک چار مہینے بعد ناظمہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں' وہ امی کے گھر جاکر تیاریوں میں حصہ لیتی' اسے خوش دیکھ کر اس کی ماں بھی بہت خوش تھی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی' مایوں والے دن جب وہ تیار ہوئی تو ولید کے پاس چلی آئی۔

"چلیں مجھے امی کے گھر چھوڑ آئیں۔" ولید نے گاڑی لے لی تھی' شادی کے دوران ہی اسے پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا۔ وہ چونکہ گھر پر اکیلا ہوتا تھا اس لیے ادھر رات نہیں ٹھہرتی تھی' اس کے اکیلے پن کے خیال سے وہ واپس گھر آجاتی تھی۔ ولید اس کی محبت دل سے قدر کرنے لگا تھا۔ وہ گھر کے کام بھی خود کرتی اور ساتھ ہی جاب بھی کرتی۔ اس نے ولید کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ناظمہ کی شادی بخیریت اپنے انجام کو پہنچی تو فردوس بیگم کے ساتھ اس نے بھی سکون کا سانس لیا۔ لیکن قسمت کہ یہ اطمینان اور سکون کچھ پل کا مہمان بننے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نوٹ کر رہی تھی کہ ولید اس سے کترایا کترایا رہنے لگا ہے۔ ایک' دو بار اس نے بات کرنی چاہی' پر وہ ٹال گیا۔ وہ اب رات کو جلد ہی سوتا اور صبح بغیر ناشتا کیے جانے کو پر تولتا۔ آج کچھ جھنجلاتے ہوئے وہ آخر لڑ پڑی۔

"کیا ہے یہ سب' تم ایسے کیوں بی ہیو کر رہے ہو' کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

"کچھ نہیں جلدی کہو جو کہنا ہے میرے پاس فالتو وقت نہیں کہ تمہارے لیکچر سنتا رہوں۔" اس کے لہجے کی کرختگی پر وہ دم سادھے کھڑی رہی۔ پھر ایسا اکثر ہونے لگا۔ وہ وجہ جاننا چاہتی' پر وہ تو کوئی بند کتاب کی طرح چپ سادھے رہتا۔ کمرے کے ملگجے اجالے میں بستر پر دراز وہ ہادی کو سوچ رہا تھا۔

"یار تم نے اس لڑکی سے شادی کی' یہ کیا کیا تم نے' یہ تو بہت لوز کریکٹر کی تھی' ذیشان میرا اک دوست تھا' اس کے ساتھ افیئر چلایا تھا اس نے' اس سے پہلے بھی کسی اسکول کا پرنسپل سے انگیج رہی' یار یہ تو پارسا نہیں' یہ کیا کیا تم نے' ہمارے ساتھ این جی او میں کام کرتی تھی' یہ ذیشان کی گرل فرینڈ تھی۔"

وہ جو کچھ کہہ کے گیا تھا اس نے ولید کو شاکڈ کر دیا تھا۔ ہادی' ولید کو سحرش کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ وہ اک مارکیٹ میں شاپنگ کر رہے تھے۔ سحرش کاسمیٹکس دیکھ رہی تھی' جب ساتھ کی گارمنٹس شاپ سے نکلتے ہادی نے اسے روکا تھا۔ ہادی اور ولید کالج فیلو رہ چکے تھے' کبھی کبھار ملاقات ہوتی رہتی جو کہ اب بالکل ختم ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور پھر اک ایسا لرزہ خیز دن بھی آیا جب اس کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی' ولید نے اسے طلاق دے دی تھی۔

☼ ☼ ☼

مہین خاموشی فردوس بیگم کے گھر کی در و دیوار پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ خوشیاں اس قدر عارضی ہوں گی تصور میں بھی نہ تھا۔ اضمحلال کی کیفیت نے سحرش کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ آنسو آنکھوں سے گرتے شدت غم کو بڑھاتے تھے۔ رو' رو کر متورم آنکھیں سوکھنا ہی بھول گئی تھیں۔ اضطراب دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔ کتنا روئی تھی وہ ولید کے سامنے' کتنی گڑگڑائی تھی کہ وہ طلاق نہ دے پر اسے اس پر رحم نہیں آیا تھا۔ نہایت بے رحمانہ انداز سے اسے اس کا قصور گنواتے اس نے تین بول بولے تھے۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ولید... تمہیں یقین کیسے دلاؤں' خدا کے لیے مجھے معاف کر دو' میں بہت محبت کرتی ہوں تم سے' ایسا مت کرو میرے ساتھ۔" وہ چلائی تھی۔

"یہ اس وقت سوچتیں جب عشق لڑاتی تھیں مردوں سے۔"

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔" وہ چلائی تھی۔ پھر اس کے پاؤں میں گری رحم کی بھیک مانگتی رہی۔ پر وہ غضب ناک ہو تا غراتا رہا۔

"میں نے یک دم فیصلہ نہیں کیا معلومات حاصل کی ہیں ہر جگہ سے' تب جاکر اس فیصلے تک پہنچا ہوں۔"

"ایسے مت کرو' میں نے کچھ نہیں کیا... میں..."

وہ روتی رہی' مگر تین بول' بول کر اسے اپنے گھر سے تو کیا زندگی سے نکال دیا۔

رنجیدگی بھرے دن گزر رہے تھے۔ ماں تسلی' دلاسے دیتی' مگر دل مضطرب کسی صورت قرار نہ پا رہا تھا۔ زندگی بس دفتر اور گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ آفس سے تھکی ہاری آئی تو سیدھا اپنے کمرے میں گئی۔ بستر پر دراز وہ آرام کر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں چچی خورشید کی آواز گونجی۔

"جب بچے اس قسم کی حرکتیں کریں گے تو زندگی میں ایسے حالات تو درپیش ہوں گے' پسند سے شادی کرنے کا انجام دیکھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ تمہاری یہ بیٹی گل کھلائے گی۔"

"چچی صحیح کہہ رہی ہیں۔" زین جو قریب پڑی کرسی پر بیٹھا تھا نشے کی کیفیت میں آنکھیں بند کیے بولا۔

"میں بھی یہی کہتا تھا' مگر میری سنتا کون ہے؟"

فردوس بیگم زین کو کوسنے لگیں۔

"اللہ غارت کرے تمہیں کیا کیا ہے میری بیٹی نے جو تم بھی اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو' باقی سب کو چھوڑو تم تو غلط نہ کہو۔" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگیں تو چچی خورشید گھبرا کر چلی گئیں' زین بھی منہ بگاڑتا بولا۔

"ان کو سمجھانے لگو تو رونے بیٹھ جاتی ہیں۔" اندر کمرے میں بیٹھی سحرش بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی۔

آہستہ آہستہ وہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی تھی۔ ناظمہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی' باقی سب گھر والے گئے' اس نے جانے سے منع کر دیا۔ حالانکہ فردوس بیگم بار بار اصرار کرتی رہیں۔

"اماں نہیں جانا' بس میری طرف سے مبارک باد دے دینا۔"

وہ لوگوں کی طنز بھری باتیں برداشت نہ کر سکتی تھی' اس لیے اپنی دنیا میں مشغول ہو گئی۔ شگفتہ کا رشتہ طے ہوا تو شادی بھی جلد قرار پائی' مہینے کے اندر اندر اس کی شادی سے بھی وہ سبکدوش ہوئی' گھر میں کل تین بندے تھے اور دبیز خاموشی' کبھی کبھار ناظمہ اور شگفتہ کے آنے سے تھوڑی بہت رونق ہو جاتی۔ فردوس بیگم بیٹی کی ویران اجاڑ زندگی دیکھ کر اکثر آبدیدہ ہو جاتیں۔ سحرش بہت خاموش سی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس شخص کو بھلا نہ پائی تھی' اس نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ سچے دل سے محبت کی تھی۔ ایک سچی اور خالص محبت جسے تار' تار کرتا روندتا وہ اس کے منہ پر مار کر چلا گیا۔ یہ غم اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا تھا۔ دو سال ہوئے تھے اسے اس طرح رہتے۔ اس کی شخصیت کرچی کرچی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ آج کچھ ضروری سودا سلف لینے وہ مارکیٹ گئی تھی۔ خریداری کرتے ہوئے اسے زینت ملی تھی۔ اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ بلیک عبایا پہنے وہ بھی خریداری میں مصروف تھی۔

"سحرش تم' یہاں کیسے؟" خوشگوار سی حیرت میں گھرے زینت نے پوچھا۔

"تم سناؤ' یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ بھی اسے دیکھ کر شدید حیرت میں مبتلا ہو رہی تھی۔

"کہاں ہوتی ہو' گاؤں سے آئی ہو۔" اس نے ایک بار پھر سوال کیا تھا۔

"نہیں یہیں رہتی ہوں۔ تم آؤ نا کسی روز۔" زینت نے خوش خلقی سے کہا' وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"ٹھیک ہے' پر کوئی کانٹیکٹ نمبر تو دو۔" فون نمبر لکھوا کر زینت رخصت ہو گئی۔

گھر آکر بھی وہ زینت کو سوچتی رہی تھی۔ زینت نے اس کے ساتھ میٹرک کیا تھا۔ وہ کسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ ہاسٹل میں مقیم تھی۔ بہت خاموش' لیکن نہایت شارپ' وہ بہت سخت ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ گھر میں ٹی وی' رسالے نہیں آتے تھے' کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی' غرضیکہ ہر قسم کی پابندی تھی۔ اس گھٹے ہوئے ماحول میں رہتے وہ تنگ آچکی تھی۔ ہاسٹل سے باہر کسی نہ کسی بہانے جاتی' وہ کافی لڑکوں سے دوستی کر چکی تھی۔ ایک' دو کے ساتھ تو اس نے اخلاقی حدود تک پار کر لی تھیں۔ اور ایسا اس نے سحرش کو خود بتایا تھا۔ سحرش نے اس سے دوستی ختم کر لی تھی' کیونکہ وہ جس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث تھی' وہ قابل بھروسہ ہرگز نہ تھی۔ آج اسے دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ اس کا دیا گیا وزیٹنگ کارڈ اس نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ وہ اس سے دور ہی رہنا چاہتی تھی۔ جانے کیوں وہ آج تک اس سے نفرت کرتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ولید سے طلاق کے بعد اس نے وہاں سے جاب چھوڑ دی تھی اور ایک دوسری جگہ اپلائی کیا۔ وہاں بھی اسے بہت اچھی پوسٹ پر مناسب سیلری کے ساتھ جاب ملی۔ وہ مطمئن تھی کہ جیسے تیسے بھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ اب تو دل کی ہر لگن ہی ختم ہو گئی تھی۔ ماں نے کئی بار شادی کرنے کا مشورہ دیا' لیکن اس نے ہامی نہ بھری۔

"ایک بار کر کے کیا فائدہ ملا رہنے دیں اماں' گزر رہی ہے' جیسی بھی ہے۔"

فردوس بیگم اک ٹھنڈی گہری سانس لے کر نماز کے لیے اٹھ گئیں۔ گملے میں لگے پودینہ کے پتے توڑ کر اس نے دوسرے گملے میں لگی مرچیں بھی توڑیں اور کچن میں جا کر سلاد بنانے لگی۔ سلاد میں وہ مرچوں اور پودینہ کا زیادہ استعمال کرتی تھی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے گملوں میں ہی دونوں چیزیں لگائی تھیں۔

چاولوں کے ساتھ سلاد کھاتی وہ شگفتہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کافی دنوں سے اس نے چکر نہیں لگایا تھا' کل آفس سے چھٹی کے بعد خود اس سے ملنے کا تہیہ کرتے ہوئے اس نے کپڑے استری کر لیے تھے۔ شام پانچ بجے جب وہ آفس سے نکلی تو مغرب میں کچھ ہی دیر تھی' تیزی سے قدم اٹھاتی وہ ایک مارکیٹ میں گھسی۔ دو کولڈ ڈرنک کی بوتلیں اور کچھ پھل لے کر وہ ٹیکسی کی جانب آئی' ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے چلنے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ اسی اثنا میں اس کی نظریں ولید پر پڑیں۔ الجھے تاثرات لیے وہ ٹیکسی سے اتر چکی تھی۔

"بھائی ذرا رکو' میں ابھی آتی ہوں۔" ولید ساتھ کھڑی خاتون کو چھوڑ کر غالباً" واپس مارکیٹ گیا تھا۔ قریب آنے پہ اس کے خیال کی تصدیق ہو چکی تھی۔ وہ زینت تھی۔

"زینت تم یہاں کیا کر رہی ہو۔" دل میں عجیب وسوسے کے باعث وہ صرف یہی پوچھ سکی۔

"میں شوہر کے ساتھ آئی ہوں' اسپتال آئی تھی چیک اپ کے لیے' ابھی پانچواں چل رہا ہے نا' کچھ چیزیں چاہیے تھیں' وہ لینے اندر گیا ہے۔" اس نے وضاحت دی' جبکہ سحرش کے قدم لڑکھڑا سے گئے تھے۔

"تمہارے شوہر کا کیا نام ہے؟"

"ولید..... تم کیوں پوچھ رہی ہو۔" زینت نے عام سے انداز میں کہا' پھر خود ہی گویا ہوئی۔

"پھوپھو کا بیٹا ہے میرا' ہمارے ساتھ کے گاؤں میں رہتے تھے۔ اب یہیں سیٹل ہو چکے ہیں۔ پہلے اک جگہ شادی ہوئی تھی' وہ زیادہ چل نہ پائی' طلاق ہو گئی۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔" لرزتے لڑکھڑاتے وہ واپس ٹیکسی کی جانب آئی۔

"بظاہر شریف نظر آنے والی زینت سے شادی کر کے ولید اس بات پر نازاں تھا کہ اس نے اک شریف پاک باز عورت پائی۔ تو یہ تھا اس مرد کا زعم' اس کا غرور' گھمنڈ' میں نے کہا تھا نا ولید کہ ہو سکتا ہے کہ دوسری عورت مجھ سے زیادہ غلط ہو' ناپاک ہو' اور تم نے بڑے تفاخر سے کہا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب کیا ہوا' تم مردوں نے عورتوں کو اتنا گھٹیا چیز جان لیا کہ جس وقت چاہا پھینک دیا' جس وقت چاہا استعمال کر لیا۔"

کیسا انصاف تھا اس رب کا ———— دل میں لگی آگ سرد پڑتی جا رہی تھی۔

"اگر آج میں تمہیں بتا دوں کہ آؤ دیکھو تم اپنی بے بسی کہ تمہاری بیوی کتنی پاک باز ہے۔ پر میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں کسی عورت کا گھر تباہ نہیں کروں گی۔ پھر اس مرد سے بھی تو اپنا حساب چکتا کرنا ہے۔ یہ پاک باز بیوی مبارک ہو۔"

ٹیکسی شگفتہ کے گھر کے قریب رک گئی تھی۔ ٹیکسی سے اترتے ہوئے ایک مطمئن و آسودہ مسکراہٹ نے اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

☆ ☆

ناولٹ

ام مریم

ہم معتبر ٹھہرے

"السلام علیکم!" دھوپ اور گرمی کی حدت سے تپتا ہوا چہرہ لیے وہ پسینے سے بے حال اندر آئی تو اے سی کی کولنگ نے دل و دماغ میں جیسے ایک دم سکون بھر دیا۔ بیگ کاندھے سے اتار کر اس نے خود کو بستر پہ گرایا ہی تھا۔ جب چھوٹی نے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا اور ساتھ ہی اسکواش کا جگ گلاس ٹرے سمیت ٹیبل پر رکھ دیا۔ علیزے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم آج اکیڈمی نہیں گئیں؟ اور یہ رضیہ کدھر ہے۔ جو تم کام کرتی پھر رہی ہو؟" ورشے کو پڑھائی کے اوقات میں کچھ اور کرتے دیکھ کر وہ ہمیشہ یونہی خار کھاتی تھی۔

"رجو کچن میں ہے بٹلر چھٹی پہ تھا اس لیے کھانا بھی اسی بے چاری کو بنانا پڑا۔ میں اس کی ہیلپ کر رہی تھی کہ آپ کو آتے دیکھ کر اسکواش بنا کر لے آئی۔"

"بٹلر کہاں دفع ہو گیا ہے؟ ہر تیسرے دن چھٹی کی سوجھی ہوتی ہے۔" جھک کر جوتے اتارتے وہ برہم نظر آنے لگی۔

"اس کا بیٹا بیمار ہے بجو! ہاسپٹلائز کرنا پڑا۔ اتنی پریشانی کے عالم میں گیا ہے۔" ورشے نے آہستگی سے کہا مگر اس کے تیز و تند لہجے نے اسے ناگواری بخشی ہے یہ اس کے صبیح چہرے پر موجود خفیف سرخی نے بتلا دیا تھا مگر علیزے خاطر میں لانے والی کہاں تھی۔ وہ تو ورشے کی اس بات سے بھی متفق نہیں تھی کہ ملازم بھی عزت کے قابل ہوتے ہیں۔ سو وہ ملازموں کو ہمیشہ کمتر درجے کی مخلوق سمجھتی تھی تبھی ان کے لیے اس کا لہجہ و انداز کسی قدر ہتک آمیز ہوا کرتا تھا۔

"میں نے پوچھا تھا تم پہ کون سی افتاد آ پڑی کہ کالج چھوڑ کر چلی آئیں رجو کا ہاتھ بٹانے اور بھا نے آج گاڑی پھر نہیں بھیجی پبلک ٹرانسپورٹ میں خوار ہوتی ہوئی آئی ہوں۔" جوتے یہاں وہاں پھینک کر اب وہ ایک کے بعد دوسرا گلاس اسکواش کا خالی کر چکی تھی۔ مگر دماغ کی گرمی ہنوز تھی۔

"بھا، مما کے ساتھ گئے ہیں سیما بھابھی کی طرف پروپوزل لے کر۔" ورشے کی اطلاع نے اس کی پیشانی لاتعداد شکنوں سے بھر دی۔ اس نے ہونٹ بھینچے تھے اور کتنی دیر جیسے خود پہ ضبط کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

بھا یعنی اسد ان چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ چار سال قبل ایم بی اے کی ڈگری لینے کے بعد اس نے والد مرحوم کا بزنس سنبھالا تھا جسے چھ سال سے منیجر چلا رہا تھا اکرم صاحب کی وفات چھ سال پہلے ہارٹ اٹیک میں ہوئی تھی۔ تب پانچوں بچے زیر تعلیم تھے۔ علینہ بیگم بیوگی کی چادر اوڑھ کر بیٹھیں تو چار بیٹیوں کی ماں کے سر پر کسی رشتے دار نے بھی دست شفقت نہیں رکھا کہ کہیں ان کے بیٹوں کے لیے اپنی بیٹیوں کے رشتوں کے لیے دست سوال دراز نہ کر دیں۔ گو کہ علینہ بیگم حیثیت اور مرتبے میں کسی سے کم نہ تھیں مگر رشتہ دار تو حیثیت میں ان سے بھی کہیں آگے تھے اور آج کل جیسے کہ ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے اپنے سے اوپر دیکھنے کی تو وہ بھی اپنی اولاد کے لیے کچھ ایسے ہی خواب دیکھتے تھے۔ علینہ بیگم کو ناچار منیجر کے ہاتھ میں سارا حساب کتاب دینا پڑا اسد تعلیم کے ساتھ بھی ر آفس کا بھی چکر لگا لیتا کچھ منیجر بھی خدا خوف انسان تھا یوں یہ کڑا وقت نکل گیا تھا۔

زندگی بہت زیادہ پرسکون نہ سہی مگر مطمئن ضرور تھی مگر یہ اطمینان اس وقت جاتا رہا جب اسد کو اپنے آفس کی ہی ایک ورکر پسند آ گئی۔ وہ قبول صورت سیما کی اداؤں کے جال میں ایسا پھنسا کہ شادی پہ آمادہ ہونے لگا۔ علینہ بیگم کو سیما کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی تو وجہ اس کی شکل صورت اور بیک گراؤنڈ عام ہونا نہیں تھا۔ وہ بھانپ گئی تھیں سیما جیسی لڑکیاں گھر بسانے والی نہیں ہوتیں۔ اپنی اداؤں سے بلا تفریق ہر مرد کو متاثر کرنے والی لڑکی کو وہ بطور بہو قبول نہیں کر سکتی تھیں مگر اسد کے سر پہ تو جیسے عشق کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ ناچار علینہ بیگم کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور بیٹے کی خواہش کے مطابق سیما کا پرپوزل لے جانا پڑا۔ وہاں انکار کس کو تھا پہلی مرتبہ میں ہی ہاں کر دی گئی مگر اعصاب شکن مرحلہ تب شروع ہوا جب رشتہ

طے ہونے کے بعد انہوں نے اپنی کڑی شرط سامنے رکھی جسے سن کر علینہ بیگم طیش میں آگئیں۔ وہ ہرگز بھی وٹہ سٹہ نہیں چاہتی تھیں۔ بدلے کی شادی تو وہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں نہ کرتیں یہاں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جبھی انہوں نے صاف انکار کردیا تو ادھر سیما کے گھر والوں نے اسے اپنی توہین سے تعبیر کیا اور خود بھی رشتہ دینے سے انکار کردیا۔ صورت حال گمبھیر ہو کر رہ گئی۔ اسد ہر صورت سیما کو اپنانے کا خواہش مند تھا اور یوں پاگل ہو رہا تھا جیسے اس کے بغیر سچ مچ مر جائے گا۔ علینہ بیگم سے بھی اس موضوع پر اس کی تکرار ہو چکی تھی۔ صاف لگتا تھا اس کے منہ میں اپنی نہیں سیما کی زبان بول رہی ہے۔ ایک زبردست جھگڑے کے بعد جب اسد نے خودکشی کی کوشش کی تو علینہ بیگم جیسے بے حد خوفزدہ ہو گئیں۔ شوہر کے بعد اب ان کے خاندان میں وہی ایک مرد بچا تھا۔ بیٹے کی حیثیت سے تو وہ انہیں عزیز تھا ہی ایک نگران اور سرپرست کی حیثیت سے بھی وہ انہیں بے حد مطلوب تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اس کی خواہش پوری کرنے کو دل پہ پتھر رکھنا پڑا تو اندر سے جیسے ڈھے سی گئیں۔ اسد ان کے مان جانے پر بھی راضی نظر نہیں آتا تھا۔

"اچھا فیصلہ ہے آپ کا۔ ورنہ میرا تو کچھ نہیں بگڑنا تھا نقصان آپ کو اٹھانا پڑتا۔ چار جوان بیٹیوں کے ساتھ تنہا زندگی گزارنا ایک بیوہ عورت کے لیے اتنا بھی آسان نہیں اور ایسا آپ خود کرتیں ظاہر ہے آپ کو اکلوتے بیٹے پر بیٹیاں جو برتر ہیں۔" علینہ بیگم بس اسے دیکھتی رہ گئیں۔ بھلا کس انداز سے لگتا تھا یہ ان کا وہی کیئرنگ اور لونگ بیٹا ہے جو ان کے آنسوؤں پہ تڑپ اٹھتا تھا۔ آج اپنی خواہش کے لیے کتنی سفاکی سے نظریں پھیرلی تھیں۔

"چار چار بیٹیاں ہیں آپ کی۔ چاروں میں سے کسی ایک کو بھی بیٹے کی خواہش کے لیے ذرا سا کمپرومائز پہ آمادہ نہیں کرسکتیں تو میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ کو مجھ سے بھی محبت ہوگی۔" وہ بے حد بدگمان تھا یہ بدگمانی کیسے اور کہاں سے اس کے اندر بھری تھی وہ جانتی تھیں۔ کتنی آسانی سے وہ لفظ قربانی کو کمپرومائز کہہ رہا تھا۔ ایسے لوگوں کے ہاں بیٹی دینے کا مطلب گویا اپنے ہاتھوں بیٹی کو کنویں میں دھکیلنا تھا مگر وہ سمجھتا تب تھا نا۔ حالات و واقعات اور رشتے ہمیشہ انسان کو بے بس کرتے ہیں وہ بھی بے بس ہو گئی تھیں۔ ان کے آنسو دیکھ کر وہ چڑ گیا۔

"اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہے ان کا لڑکا! پڑھا لکھا ہے۔ گورنمنٹ ادارے میں اعلا پوسٹ پر ہے۔ شکل صورت بھی اچھی ہے اور کیا چاہیے؟"

"کچھ نہیں چاہیے بیٹے بس آپ انہیں اپنا عندیہ دے دو۔"

"ایسے کیسے عندیہ دے دوں۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ اپنی رضا مندی دینی ہو گی سب کے سامنے۔" اور علینہ بیگم ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئیں۔ ان کے پاس اسد کی یہ بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"آ گئیں آپ۔" علینہ بیگم کے انتظار میں وہ لاؤنج میں بیٹھی تھی اور ان کے اقدام پر شدید ناراض تھی۔

"ورشے بیٹے رجو سے کہو مجھے پانی پلائے۔" چادر اتار کر صوفے پہ گرنے کے انداز میں بیٹھتی وہ شکل سے ہی تھکی ماندی لگ رہی تھیں۔ ورشے رجو کو پکارنے کی بجائے خود اٹھ کر باہر نکل گئی۔

"کیوں گئی تھیں آپ وہاں مما۔" ان کی خاموشی اسے خار بن کر چبھی تھی۔ انہوں نے خالی گلاس ورشے کو تھمایا۔

وہ حقیقتاً "خائف تھیں۔

"بیٹے کچھ کام مجبوراً" کیے جاتے ہیں اسد کو کھونے کا حوصلہ ہے ہم میں؟"

"تو کیا آپ ان کی شرط مان لیں گی؟" وہ بھونچکی رہ

"میں مان چکی ہوں۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔" سر جھکاتے ہوئے انہوں نے گویا اس کے سر پہ پہاڑ توڑا تھا وہ تو جیسے سناٹوں کی زد پہ آگئی تھی۔ حق دق سی انہیں تکنے لگی۔

"کس کے لیے تجویز کیا ہے آپ نے مقبل؟ میرے یا ورشے کے لیے؟" شدت ضبط نے اس کی رنگت ایک دم سرخ کردی تھی۔

"وہ لوگ تمہارے لیے کہہ رہے ہیں۔" علینہ بیگم نظریں چرائے مجرمانہ انداز میں بولیں تو علیزے کے وجود میں جیسے کسی نے بھالا اتار دیا تھا۔

"اور آپ مان گئیں؟ اس کے باوجود کہ سکندر مجھ سے شادی کا خواہاں ہے۔" اس نے سرسراتی آواز میں اپنے تایا زاد کا حوالہ دیا جو اس کو بہت پسند کرتا تھا۔

"فاروق بھائی کبھی نہیں مانیں گے تم بھی جانتی ہو۔" علینہ بیگم کا انداز ہارا ہوا تھا۔

"تو اس کا مطلب آپ میرے ساتھ یہ کریں گی؟" وہ ششدر تھی۔

"مجھے اندازہ ہے بیٹے کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے مگر اسد......"

"آپ کو صرف اسد بھائی کے جذبات و احساسات کی فکر ہے میری نہیں؟ کیا میں آپ کی اولاد نہیں ہوں؟" اپنی بات مکمل کیے بنا ہی وہ رو پڑی اور یونہی روتے ہوئے اٹھ کر لاؤنج سے نکل گئی۔ علینہ بیگم ساکت بیٹھی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"آج یونیورسٹی مت جاؤ بیٹے! سیما کے گھر والے آ رہے ہیں آج کھانے پہ۔" وہ یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر آئی تو علینہ بیگم نے دبے ہوئے انداز میں کہا۔ مگر اسے تو جیسے آگ لگ گئی۔

"تو سیما کے گھر والوں سے میرا کیا تعلق کہ میں ان کے اعزاز میں گھر بیٹھ جاؤں۔" اس کے بلند لہجے میں گستاخی اور بدتمیزی کا بہت واضح عنصر تھا علینہ بیگم خائف سی ہو کر رہ گئیں۔

"تمہیں بتایا تو تھا کہ میں نے ہاں کردی ہے۔ وہ لوگ آج تمہاری رسم کرنے آئیں گے۔" کچھ دیر بعد خود کو سنبھال کر انہوں نے جیسے بلی تھیلے سے نکالی اور علیزے کے سر پہ آسمان ٹوٹ پڑا۔

"واٹ؟" وہ چیخی۔

"مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے یہ سب کرلیا۔ مما میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں سانپ کی پھنکار تھی۔ علینہ بیگم سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ ضبط کی کوشش میں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ورشے تو ان کے آنسو دیکھ کر مضطرب ہو گئی۔

"بجو پلیز! کنٹرول یور سیلف۔" ورشے کے ٹوکنے پر علیزے نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"شٹ اپ یہ تمہارا نہیں میرا معاملہ ہے۔ تم خاموش بیٹھی رہو۔"

"آئی ایم ساری بجو یہ صرف آپ کا نہیں مما کا بھی معاملہ ہے۔ پلیز سمجھیں۔ وہ آپ اور بھا کے درمیان کس طرح پھنسی ہوئی ہیں۔ احساس ہے آپ کو؟"

"انہیں صرف بھا عزیز ہیں اور میں بتا رہی ہوں میرا بھا کی خاطر بھینٹ چڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے بھا جو کرنا چاہتے ہیں کرلیں۔ خودکشی کی دھمکی دینا اور خودکشی کرلینا دونوں الگ باتیں ہیں۔ جبکہ حقیقت میں دنیا اور خواہشات سے دستبردار ہو جانا بالکل الگ بات ہے۔ میں سب جانتی ہوں یہ سارے اسباق کس کے پڑھائے ہوئے ہیں وہ صرف ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں۔ آپ اثر نہ لیں کچھ نہیں ہو گا ڈونٹ یو وری۔" مشورے سے نواز کر وہ چلتی بنی۔ علینہ بیگم کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں میں شدت آگئی تو ورشے نے اٹھ کر انہیں ساتھ لگا لیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں مما سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کچھ ٹھیک نہیں ہو گا بیٹے کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔ اسد کو میرا کچھ احساس ہے نہ شا۔ علیزے کو یہ

دونوں مجھے ٹارچر کر رہے ہیں۔ میں ماں ہوں مجھے دونوں عزیز ہیں مگر یہ سمجھتے نہیں میں کس کا ساتھ دوں وہ مرنے کی دھمکی دیتا ہے یہ راضی نہیں' علیزے اگر مان جائے تو اس کی زندگی میں پھر بھی بہتری لائی جا سکتی ہے۔ لڑکے سے ملی ہوں میں اپنی فیملی سے بالکل مختلف لگا ہے مجھے۔ سوبر اور باوقار ہم اس کا لائف اسٹائل چینج کر دیں تو۔۔۔" وہ تھک کر چپ ہو گئیں ورشے ان کا سر تھپکتی رہی تھی۔

"تم اسے سمجھانا بیٹے وہ مان جائے۔ اسد نے تو کوئی راستہ کھلا چھوڑا ہی نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد وہ پھر بولیں تو آواز آنسوؤں کی نمی سے بھیگی ہوئی تھی۔ ورشے نے آہستگی سے ڈھارس کے انداز میں ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ چائے لیں بجو۔" وہ سمیعہ اور اریبہ پر برس رہی تھی جو ٹی وی کے آگے بیٹھی تھیں۔ پڑھائی فراموش کر کے ٹی وی دیکھنا علیزے کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا جبھی دونوں کٹہرے میں تھیں۔ جب ورشے نے مداخلت کر کے گویا ان کی جان بخشی کی اپنی سی کوشش کی۔

"تم دونوں جاؤ یہاں سے۔" ورشے نے سہمی ہوئی سمیعہ اور اریبہ کو وہاں سے ہٹانا چاہا تو علیزے نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں گھورا وہ دونوں مزید سہم گئیں۔

"اوہ بجو جانے دیں انہیں فی الحال مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" ورشے نے عاجز ہو کر کہا تو وہ قدرے چونکی۔

"کیا بات؟" اس کا جیسے ماتھا ٹھنکا تھا۔ ورشے نے پہلے دونوں کو وہاں سے بھیجا پھر اس کی سمت متوجہ ہوئی۔

"کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کس بارے میں؟" اس کی تیوریاں چڑھنے لگیں۔

"عمر دراز صاحب کے بارے میں۔" ورشے کا لہجہ خفیف سی مسکراہٹ سمیٹ لایا تو اس کے تیور بگڑنے لگے۔

"کون عمر دراز صاحب؟"

"بجو سیما بھابھی کے بھائی! جن کا پرپوزل آیا ہے آپ کے لیے۔"

اس کے تجاہل عارفانہ پہ بھی ورشے نے تحمل سے جواب دیا تو وہ باقاعدہ اسے گھورنے لگی۔

"میں کیوں سوچنے لگی کسی ایرے غیرے کے لیے۔" اس درجہ نخوت زدہ جواب پہ ورشے کچھ بے بس نظر آئی۔

"بجو آپ کو مما کی پریشانی اور اضطراب کا اندازہ ہے وہ راتوں کو سو نہیں پا رہی ہیں۔" اس کے عاجز ہو کر کہنے پہ علیزے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"تو میں نے اڑائی ہیں ان کی نیندیں؟ مت بھولو کہ ان کے لاڈلے سپوت ہیں اس کی وجہ۔"

"تو بجو پریشانی تو سانجھی ہے نا۔ اس کا کوئی حل بھی تو نکلنا چاہیے۔"

"یعنی تم چاہتی ہو میں سکری فائز کروں؟ آئی ایم سوری ورشے میں اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔" وہ ایک دم سرد نظر آنے لگی۔ اس کے لہجے میں کسی قسم کی کوئی گنجائش نہ پا کر بھی ورشے نے جیسے اس کی منت شروع کی۔

"بجو پلیز! ذرا تسلی سے سوچیں عمر دراز بھائی ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔ اچھی خاصی پرسنالٹی ہے۔ رئیلی بجو آپ ہرگز گھاٹے میں نہیں رہیں گی۔ مما کہہ رہی ہیں وہ فنانشلی بھی سپورٹ کریں گی اور۔۔۔"

"جسٹ شٹ اپ ورشے' شٹ اپ! اگر مما کو یہ سکری فائز کرانا ہے یا داماد کے نام پہ کوئی کاٹھ کا الو پیسے سے خریدنا ہے تو وہ میری بجائے تم سے کانٹیکٹ کریں۔ کیونکہ میں نہ بے غیرت ہوں نہ بے حس۔" وہ غصے کی زیادتی سے بولنے پہ آئی تو رکنے کا نام نہیں لیا۔ یہاں تک کہ اسے ورشے کا دھواں ہوتا چہرہ بھی نہیں آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ غصے میں لال بھبھوکا چہرہ لیے ورشے کے کمرے میں آئی تھی۔ ایک دھماکے سے دروازہ بند ہونے کی آواز پہ ورشے جو کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھی چونک کر متوجہ ہوئی۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟" وہ اس کے سر پہ پہنچ کر غرائی۔

"الحمدللہ! آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" ورشے کے سکون اور اطمینان میں ہرگز فرق نہیں آیا تھا۔

"میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی ورشے' اپنے الفاظ واپس لو۔" ورشے کی مسکراہٹ نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"کون سے الفاظ؟" ورشے نے بے نیازی سے بھنوؤں کو اچکایا۔

"یہی کہ تم عمر دراز سے شادی کرو گی۔ میں تمہیں یہ بے ہودہ قدم نہیں اٹھانے دوں گی۔" وہ سلگی۔

"اس میں بے ہودگی کیا ہے؟ شادی تو ایک دن ہونا تھی نا ذرا جلدی سہی۔" ورشے ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگی۔ علیزے نے دانت کچکچائے۔

"تم میری ضد میں کر رہی ہو نا یہ سب کچھ؟"

"ایسی بات نہیں ہے بجو۔"

"پھر کیوں کر رہی ہو؟" وہ جیسے روہانسی ہونے لگی۔

"ہماری فیملی اس وقت سخت کرائسس سے گزر رہی ہے۔ مما بہت ٹینس ہیں۔ اس مسئلے کا یہی حل ہے بجو۔"

"یعنی تم یہ قربانی دو گی؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"میری سوچ آپ سے مختلف ہے بجو! میں یہ مما کی محبت میں کروں گی۔ آپ سمجھ لیں میں انہیں یوں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ پھر آپ نے صحیح کہا تھا۔ آپ ہی کیوں؟ میں کیوں نہیں؟" وہ ذرا سا ہنسی۔

"اپنی عمر دیکھی ہے تم نے؟" وہ جو ہونٹ بھینچے اس کی بات سن رہی تھی۔ کس قدر درشتی سے بولی۔

"انیس سال کی ہوں۔ شادی کے لیے ٹھیک ہے۔" ورشے کے اطمینان میں ذرا فرق نہیں آیا تو وہ جھنجھلانے لگی۔

"اس کی عمر دیکھی ہے؟ کم از کم بھی تیس بتیس کا ہو گا۔"

"اتنا زیادہ فرق تو نہیں ہے بجو! چلتا ہے۔" ورشے کے جواب نے اس کی آنکھوں کی جلن بڑھا دی۔ وہ ایک دم رخ پھیر گئی۔

"میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی ورشے تم ابھی بچی ہو۔ تم اس امتحان سے نہیں گزر سکتیں۔" وہ بولی تو اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"بجو ہمیں مما کو بھی تو تنہا نہیں چھوڑنا پریشانی میں۔ پپا کے بعد مما کو کھونے کا حوصلہ نہیں مجھ میں اور جتنا ٹینس کر رکھا ہے نا بھائی نے انہیں' جتنا پریشرائز کیا ہوا ہے مجھے لگ رہا ہے اگر اس مسئلے کا حل نہ نکلا تو مما کو لازماً کچھ ہو جائے گا۔ بجو بھائی کو پروا نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ لڑکے فطرتاً" کچھ سخت دل اور بے حس ہوتے ہیں مگر ایک بیٹی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ماں کی پریشانی سے خود کو دانستہ الگ کر لے۔ میں ایسا نہیں کر سکی بجو۔"

وہ اس سے لپٹ کر سسک اٹھی۔ گو کہ اس نے اپنی بات کی تھی اپنا حوالہ دیا تھا مگر علیزے کو لگا دانستگی میں اس نے علیزے کو جھنجھوڑا ہے۔ وہ ایک دم سن کھڑی رہ گئی۔

"مما سے کہنا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شادی تمہاری نہیں عمر دراز سے میری ہو گی۔ بتا دینا مما کو۔" کچھ دیر بعد ورشے کو خود سے الگ کر کے وہ بولی تو اس کے چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی بے حد سپاٹ تھا۔ ورشے کی تحیر و حیرانی کو دیکھنے وہ وہاں رکی نہیں تھی تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"ورشے بتا رہی تھی کہ۔۔۔"

وہ خود کو بظاہر پرسکون اور نارمل ظاہر کر رہی تھی مگر

ماما کی نظریں اس کے ستے ہوئے چہرے کو ہی نہیں حرکات و سکنات میں اضطراب کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ جبھی کسی قدر رسانیت سے بات کا آغاز کیا مگر اس نے ایک دم چمچہ زوردار آواز سے پلیٹ میں رکھا تھا۔

"وہ بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ آپ ان لوگوں کو بھی مطلع کردیجیے گا۔"

"بیٹے مجھے آپ سے یہی کہنا تھا کہ آپ جو قدم جذباتیت میں اٹھا رہی ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے اور۔۔۔"

"اور جو ورشے کر رہی ہے وہ ٹھیک کر رہی ہے؟" وہ گہرے طنز سے بولی تو ماما نے اسے بغور دیکھا۔

"میں نے ہرگز اسے فورس نہیں کیا۔ وہ اپنی خوشی سے کر رہی ہے تو سمجھوتہ بھی خوشی سے کرے گی۔"

"اگر کوئی خوشی سے نہر میں چھلانگ لگائے تو اسے لگانے دینی چاہیے؟" اس کے لہجے کی کاٹ نے ماما کو دولخت کردیا تھا۔ کچھ دیر وہ کچھ بول نہیں پائیں۔

"آپ یہ سب جذباتیت اور ناراضی میں کر رہی ہیں اور ناراضی میں اٹھائے جانے والے قدم دانستہ بربادی کی طرف جاتے ہیں۔ آپ سکندر کو پسند کرتی ہیں۔ آپ کی شادی ہم سکندر سے کریں گے۔"

"مجھے نہیں کرنی کسی سکندر وکندر سے شادی بس میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ میں ہرگز ورشے کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔" وہ دبے ہوئے لہجے میں چیخ پڑی۔

"خود کو تباہ کرلو گی۔" ماما نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ان کے لہجے میں عجیب سی بے چینی تھی۔

"مجبوری ہے۔" وہ زہرخند لہجے میں بولی تو ماما نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

✡ ✡ ✡

بعد کے مرحلے بہت تیزی سے طے ہوئے تھے۔ اس نے کسی قسم کی تیاری میں حصہ نہیں ڈالا۔ اسی روٹین کے مطابق یونیورسٹی جاتی رہی۔ اس کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے ورشے کو اس سے کسی قسم کی بھی بات کرنے کی جرات نہیں ہوسکی تھی۔

شادی کی ہر تقریب بہترین تھی۔ مایوں، ابٹن مہندی اسد نے ہر رسم پہ دل کھول کر پیسہ بہایا تھا۔ یوں تو ہر تقریب میں ہی وہ پیاری لگی تھی مگر مہندی کی رات تو اس پہ کچھ ایسا ٹوٹ کے نکھار آیا تھا کہ اس پہ اٹھنے والی ہر نگاہ کچھ لمحے کو ٹھٹک کر تھم جاتی تھی۔ رسم کے بعد ورشے اسے کمرے میں لے کر آئی تب بھی وہ بے حد خاموش اور کسی حد تک گم سم سی نظر آئی تھی۔ ۔۔۔ آنکھوں کی گہرائی میں کچھ آنسوؤں کی بھی نمی تھی جبھی آنکھوں کی چمک کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔

"عمر بھائی بہت ڈیسنٹ ہیں بجو! مجھے یقین ہے آپ ان کے ساتھ خوش رہیں گی۔

ابھی آپ کے ہاتھوں پیروں پہ مہندی لگے گی جاگنا پڑے گا تو چائے بنا کے لادوں؟"

ورشے نے بات بدل دی تھی۔ وہ منع کرتے کرتے سر میں اٹھتی درد کی ٹیسوں کی وجہ سے رک سی گئی۔

"ہاں مگر بہت اسٹرانگ بنانا اور سنو مہندی نہیں لگوانی مجھے۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے بس آرام کروں گی۔"

"مگر بجو۔۔۔!" ورشے پریشان ہوئی تو اس نے اسے ٹوک دیا۔

"مہندی سے زیادہ لڑکی کی رضامندی ضروری ہوتی ہے ورشے! جب اس کے بغیر شادی ہوسکتی ہے تو پھر یوں بھی ہو جائے گی۔" اس کا لہجہ بے حد سرد تھا ورشے کی رنگت متغیر ہونے لگی۔

"مم۔۔۔ مگر بجو آپ کی رضامندی سے۔۔۔"

"ہاں رضامندی۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

"میں دل کی رضا کی بات کر رہی تھی۔ خیر تم چائے لادو اور ساتھ پین کلر بھی۔" اس کی آواز بھرانے لگی جبھی ہونٹ بھینچ لیے۔ ورشے بھیگتی آنکھیں پونچھتی تیزی سے پلٹ گئی۔ علیزے نے ایک سرد آہ بھر کے سر تکیے پہ رکھ کے جلتی آنکھیں موندلیں۔

✡ ✡ ✡

بہت طویل سفر تھا جو اس نے طے کیا تھا اور اس سے کہیں بڑھ کے صبر آزما، گاڑی لاہور کے قدیم علاقے بھاٹی گیٹ سے بھی آگے ایک گھنٹہ تک سفر کرتی رہی تھی۔ تنگ تاریک اور گندی گلیاں جو پیچ در پیچ تھیں۔ بچوں کے ٹولے کا شور اس کی طبیعت مکدر کرتا رہا تھا جو گاڑی کے ساتھ ساتھ کب سے تعاقب میں تھے۔ بھاری لباس اور زیورات کے بوجھ سے اس کی کمر جھکی جارہی تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ بیٹھ بیٹھ کر بھی اور رو رو کے بھی۔ آج اس کی عمر دراز کے ساتھ نکاح کے بعد رخصتی تھی۔ گاڑی کے اندر سناٹا تھا۔ بس کبھی کبھار جھنجلاتے ہوئے ڈرائیور کی بڑبڑاہٹ تو کبھی اس کے مقابل بیٹھی اس کی ساس کی لعن طعن سنائی دیتی جو وہ محلے کے بچوں کی شان میں بلند آواز سے کرتی تھی۔ جو اسے اماں خیرن کہہ کر چھیڑ رہے تھے اور اس کی ساس طیش اور جھنجلاہٹ میں انہیں گالیاں دینے لگتی۔ خدا خدا کر کے گاڑی ایک جگہ رکی۔ ساس صاحبہ نے علیزے کے اوپر اوڑھائی چادر کا لمبا سا گھونگھٹ نکال دیا۔ وہ جزبز تو ہوئی مگر کچھ بولی نہیں۔ آس پاس شور بڑھ گیا تھا۔ عورتوں کی آوازیں جن میں ہنسی بھی شامل تھی بچوں کے رونے کی آوازیں، فضا میں پھوٹتے پٹاخوں میں دب گئیں۔

اسے گاڑی سے نکالا گیا۔ وہ اندھوں کی طرح خود کو بے بس محسوس کرنے لگی۔ معاً اسے دونوں اطراف سے دبوچ لیا گیا۔ مووی کی فلیش لائیٹ اس کی دبیز چادر کے گھونگھٹ سے گھس کر اس کی آنکھیں چندھیانے لگی۔

"دے عمر دوہٹی کے ساتھ ساتھ چل! تجھے کس بات کی آخر آئی ہوئی ہے۔ صبر سے کام لے۔ دلہن تو تجھے ابھی تین گھنٹے نہیں ملنے والی جتنی مرضی پھرتی دکھالے۔" کسی شوخ مزاج خاتون نے ٹھٹھا لگا کر کہا پھر ہر طرف کھی کھی شروع ہوگئی۔ ہنسی ٹھٹھول اور واہیات مذاق کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ علیزے کا دل گھبرانے لگا۔ علیزے کو عین صحن میں ایک کرسی پر بٹھانے کے بعد اس کی چادر اتار دی گئی۔ کسی نے اس کا میک اپ سنوارا تھا۔ سستے سینٹ اور پسینے کی ملی جلی لپٹیں علیزے کو ابکائیاں سی آنے لگیں۔

"خیرن خالہ تیری نوں تو بھی بڑی مجاجاں والی ہے۔ پتا نہیں لگا کے کھائے گی تیرے ساتھ کہ نہیں۔" میک اپ سنوارنے والی موٹی درمیانی عمر کی لڑکی نے اپنی پاٹ دار آواز میں تبصرہ کیا۔ وہ علیزے کے چہرے پر بے زاری اور ناگواری کو پا کر کس قدر جزبز ہوئی تھی۔

"ہاں بھئی نخرے کیوں نہ ہوں۔ آخر اونچے گھر کی رہنے والی ہے۔" کسی اور نے جلے دل کا پھپھولا پھوڑا تھا۔ علیزے ساکت رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آئی اس موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے کچھ رسمیں ادا کی گئیں پھر اسے چھت پر بنے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جو رنگ رنگین پھولوں اور برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا۔ کمرے میں تازہ چونے کی خوشبو اندر داخل ہونے پہ اس کے ناک میں گھسی تھی اس کے جہیز کا قیمتی فرنیچر چھوٹے سے کمرے میں بری طرح سے ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کا دل کچھ کم جل کر خاک نہیں ہوا تھا اور بھی بے زاری اور دکھ سے لبریز ہوگیا۔

"بھابھی آپ آرام کریں۔ میں عمر بھائی کو بھیجتی ہوں۔ ویسے کچھ کھانا پینا ہے تو مجھے ابھی بتاویں۔ ورنہ مہمانوں نے سب چٹ کر جانا ہے۔" اس کی چھوٹی نند جو اسے سہارا دے کر یہاں لائی تھی۔ کچھ عجلت میں بولی تو علیزے نے فی الفور سر کو نفی میں ہلا دیا بیڈ پر ٹک کر اس نے بے دلی سے اپنے لباس فاخرہ پہ نگاہ کی دھنک کے رنگوں جیسا بے حد خوب صورت اسٹائلش شرارہ سوٹ میچنگ کے زیورات وہ شہر کے سب سے مہنگے پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی تو وہ اس کی اس موقع پر خود کو دی اہمیت نہیں ان کا اسٹینڈرڈ ہی یہی تھا مگر اس کا نصیب ۔۔۔۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو خالی نظروں سے دیکھا اور سسکیاں دبانے کو ہونٹ بھینچ لیے۔ ٹپ ٹپ آنسو اس کے ہاتھوں کو

نم کرتے رہے۔ جانے کتنی دیر تک وہ یونہی دل کا بوجھ ہلکا کرتی رہی۔ نیچے سے آتا شور بتدریج ہلکا پڑتا گیا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک گہرے ہوتے سناٹے پہ غالب آنے لگی جب پہلے سیڑھیوں پہ پھر دروازے کے باہر بھاری قدموں کی آہٹ ابھری تھی۔ وہ قدرے چونک اٹھی۔ دروازہ کھول کر جو بھی اندر داخل ہوا تھا علیزے کی نگاہ اس کے جوتوں سے اوپر نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس کے دل میں اسے دیکھنے کی معمولی سی بھی خواہش نہیں ابھری تھی۔

"ارے آپ ابھی تک اسی طرح بیٹھی ہیں؟ چینج کرکے آرام کرتیں۔" خاصے جھجک کر سلام کرنے کے بعد وہ اسی کتراتے ہوئے انداز میں مخاطب ہوا تھا۔ علیزے نے نہ چاہتے ہوئے بھی سر اونچا کرکے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہاں اس روم میں اس قسم کی سہولت میسر نہیں تھی۔ ورنہ میں یہ زحمت نہیں کرتی۔" وہ جواباً ترخ کر بولی اور عمر کچھ اور بھی ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا۔

"آئی ایم سوری! میں آپ کے بیگ کا ابھی پتا کرتا ہوں۔ سعدیہ ....!" وہ پکارتا ہوا الٹے قدموں باہر چلا گیا۔ علیزے کا چہرہ جلنے لگا۔ اسے محسوس ہوا یہ معمولی شخص جان بوجھ کر اسے ذلیل کرکے گیا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تھی تو ساتھ وہی لڑکی تھی جو اسے یہاں چھوڑ کر گئی تھی۔

"بھابھی یہ آپ کے کپڑوں کا بیگ ہے۔ کون سا سوٹ پہنیں گی مجھے بتائیں نکال کے استری کردیتی ہوں۔" بیڈ کے نیچے سے سوٹ کیس کھینچ کر نکالنے کے بعد اسے کھولتی ہوئی وہ مستعدی سے بولی تو علیزے نے اسے ٹوک دیا۔

"نہیں تم جاؤ میں خود نکال لوں گی۔" وہ تو جیسے خود ایسی ہی بات سننے کی منتظر تھی۔ سکھ کا سانس بھرتی رفوچکر ہو گئی۔ علیزے نے پہلے زیورات اتارے تھے۔ پھر دوپٹے کی پنیں نکالنے لگی۔ اس کام سے فراغت کے بعد دوپٹہ اتار کر بے زاری سے صوفے پہ پھینک دیا اور جھک کر سوٹ کیس سے کپڑے نکالنے لگی۔ گرے لائننگ والا ٹراؤزر اور ساتھ کی شرٹ اٹھا کر سیدھی ہوئی تو صوفے پہ بیٹھے محویت سے اپنی جانب متوجہ عمر پہ نظر پڑی اور لمحہ بھر کو ٹھٹک سی گئی۔ گڑبڑا تو عمر بھی گیا تھا۔ جبھی سٹپٹا کر فوری طور پر نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ علیزے نے سر جھٹکا اور کپڑے لیے واش روم میں جا گھسی چینج کرنے کے بعد وہ باہر آئی تو عمر سگریٹ کے دھویں کے مرغولے بناتا کھڑکی کے آگے کھڑا تھا۔ علیزے اسے نظرانداز کرتی آگے بڑھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور جوڑے میں بندھے بالوں کو کھول کر دراز ہونے سے قبل چادر کا ایک سرا اپنے اوپر کھینچ لیا۔ اسی وقت عمر پلٹا تھا اور وہ جو کروٹ بدل رہی تھی ارادہ ملتوی کرکے اسے تکنے لگی۔

"آپ کو گرمی تو نہیں لگ رہی؟ میرا مطلب یہاں آپ کے گھر کے جیسی سہولیات تو نہیں ہیں۔"

علیزے نے کچھ بے زاری اور اکتاہٹ آمیز نظروں سے اس کنفیوز آدمی کو دیکھا۔ پتا نہیں وہ اتنا نروس کیوں ہو رہا تھا۔

"اگر لگ رہی ہے تو آپ کے پاس کوئی ہے حل اس کا۔ نہیں نا؟" وہ بدمزگی سے بولی تو اس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا۔ وہ بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

"مجھے احساس ہے کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہاں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کے شایان شان ہو۔"

"اچھا؟" وہ گہرے طنز سے ہنسی پھر زہرخند لہجے میں بولی۔

"اگر اتنا احساس تھا میرا تو پھر نہ کرتے یہ شادی۔" اس کے اعصاب چیخ اٹھے تھے۔ غصہ دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ احساس زیاں کچھ اور گہرا محسوس ہونے لگا۔ اس کے گھورنے پہ عمر کچھ خائف سا ہو گیا۔ علیزے نے ہونٹ بھینچے پھر سر تک چادر کھینچ کر لیٹ گئی اور عمر جو کچھ کہنے کو لب کھول رہا تھا گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

ساری رات گرمی حبس کی وجہ سے وہ سو نہیں سکی

تھی۔ صبح دم لائٹ بھی کچھ ٹکی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کی آنکھ لگ گئی۔ سو کر اٹھی تو دن کے دس بج رہے تھے۔ کمرا بھانت بھانت کے چہروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بے زاری اٹھ بیٹھی۔

"اتنی دیر تک سوتی ہو؟ نہا دھو تو لینا تھا۔ رحمت کے فرشتے پاس نہیں آتے۔" کسی بیاہتا نے نصیحت کی پھر جیسے یہ ہی موضوع چھڑ گیا۔ گزشتہ شب کے حوالے سے مذاق، شوخیاں اور چٹکلے اس کے چہرے کا تناؤ بڑھنے لگا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس نے کسی شناسا چہرے کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو چھوٹی نند سعدیہ اسے میز پہ چڑھی ہوئی نظر آئی۔

"ہاں جی بھابھی۔" اس کی نگاہوں کا مرکز خود کو پا کر وہ بڑی مدبرنی نزدیک آئی۔

"مجھے باتھ لینا ہے۔ میرے لیے کپڑے نکال دو۔"

ان جاہل عورتوں کی رنگ برنگی باتیں سننے سے بہتر اس نے یہی سمجھا تھا۔ ورنہ رات ایسا کچھ قابل ذکر نہیں تھا کہ یہ اہتمام کیا جاتا۔ عجب جھینپو سا شخص تھا وہ جتنا نروس نظر آتا تھا اس سے بڑھ کے گریزاں اس کے لیٹنے کے بعد وہ صوفے پہ سکڑ سمٹ کر لیٹا تھا اور صبح فجر کی پہلی اذان کے ساتھ یوں اٹھ کر بھاگا تھا جیسے قید سے رہائی ملی ہو۔ انتظار میں تو وہ بھی اس کے پلکیں فرش راہ نہیں کیے ہوئے تھی مگر یہ نظراندازی عجیب سی خفت اور توہین میں مبتلا کرکے رکھ گئی تھی۔

سعدیہ نے لپک جھپک اس کے کپڑے واش روم تک پہنچائے تھے۔

★ ★ ★

ولیمہ کی تقریب کے لیے وہ خود گھر میں تیار ہوئی تھی پارلر لے جانے کی زحمت کسی نے گوارا نہ کی تقریب کا اہتمام گھر کے باہر ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔ محلے کی اور رشتہ دار عورتوں نے اسے سلامیاں دی تھیں کھانا کھایا اور چلو جی تقریب کا اختتام ہو گیا وہ صحن کے ایک کونے میں صوفے پہ بٹھائی گئی تھی۔ وہیں بیٹھی اپنی قسمت پہ شاکی ہوتی رہی۔ کھانا اختتامی مراحل میں تھا جب اسد ،سیما کے ساتھ مما اور ورشے آئی تھیں۔ عمر جو کام میں مصروف ادھر ادھر پھر رہا تھا لمحہ بھر کو سلام دعا کرنے ان کے پاس ٹھہرا پھر اسد اور سیما کے آگے پیچھے پھرنے لگا مما اور ورشے گم سم سی اس کے ساتھ صوفے پہ بیٹھی رہیں۔ سیما نے ان کے آنے کا انتظار کیے بغیر کھانا کھانے پہ ناگواری کا اظہار بھی کیا تھا جو جھگڑے کی شکل اختیار کرتا رہ گیا کہ عمر کی اماں کو خود بیٹی کی اتنی تاخیر نے غصے میں مبتلا کیا ہوا تھا۔

"بجو آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟" ورشے کو اس کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی جبھی ٹوکا۔

"کیا بولوں تم بتاؤ؟" جواباً وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور مما نے ہونٹ بھینچ لیے تھے انہیں اس کی نظریں سراسر الزام دیتی ہوئی لگی تھیں۔ جس بیٹے کی خاطر انہوں نے بیٹی کو اس اقدام پہ مجبور کیا تھا اس نے آکر بہن کے سر پہ ہاتھ رکھنے یا احوال پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بس بیوی کے پیچھے دم ہلاتا پھر رہا تھا ایسی کون سی گیدڑ سنگھی ہے ان ماں بیٹیوں کے پاس کہ ہر کوئی انہی کا دیوانہ بنا ہوا ہے۔

ورشے کو سب سے زیادہ غصہ عمر پہ آرہا تھا۔ جو انہیں وقت دینے کی بجائے ماں، بہن کے پاس گھسا ہوا تھا۔

"بیٹے عمر کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟" مما نے مضطرب ہو کر اس سے سوال کیا تھا اور اس کے چہرے پہ تلخی پھیل گئی تھی۔

"کیا اب اس سوال کی گنجائش باقی بچی ہے مما! ہونے دیں جو جیسا ہو رہا ہے۔"

"اماں کہہ رہی ہیں آپ آکر دوسرے کمرے میں کھانا کھالیں۔"

سعدیہ نے آکر مما کو مخاطب کیا تو مما سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"تم نے کھایا علیزے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اب آرام کرنا چاہوں گی تھک گئی ہوں۔" اس کی بے اعتنائی کے مظاہرے پہ مما خاموش کی خاموش رہ گئیں۔ صحن میں اب اکا دکا مہمان تھے۔ زیادہ تر کمروں میں

گھسے واپسی کی تیاری میں تھے۔ علیزے اٹھ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ وہ واقعی بہت تھک گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیوں لے کر جانا چاہ رہے ہو تم اسے اپنے ساتھ۔"

اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ چائے بنانے کے خیال سے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو کمرے سے آتی اماں کو غصیلی آواز پہ ٹھٹک سی گئی۔ اب پتا نہیں وہ کس سے جھگڑا کر رہی تھیں۔

"بیوی ہے وہ میری لے جا سکتا ہوں اماں! یہاں وہ اکیلی کیا کرے گی؟" عمر کی مدھم مگر خائف آواز نے اس کے اٹھتے قدم زمین میں گاڑ دیے۔ کل اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور اسے واپس ڈیوٹی پہ جانا تھا۔ یہ بات تو علیزے کے بھی علم میں تھی کہ وہ کسی اور شہر میں جاب کرتا ہے۔ مگر وہ اسے ساتھ لے جانے پہ کیوں اپنی ماں سے لڑ رہا تھا۔ جبکہ اس کے خیال میں اس نے عمر کو ایسی کوئی آس نہیں دلائی تھی کہ وہ ایسا کوئی ایکشن لیتا۔ بلکہ وہ تو اسے مخاطب بھی نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ سیما کی ولیمہ کے دن کی بدتمیزی اور جھگڑے پہ عمر نے اس سے سیما کی طرف سے خود معذرت کی تھی۔

"اکیلی کیوں؟ ہم سب کو مرا ہوا سمجھ لیا تم نے؟ یا پھر ماں بہنوں پر اعتماد نہیں رہا۔" اماں کو بے حد برا لگا تھا جبھی اسے اچھی خاصی سنا دی تھیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں! آپ غلط مطلب نہ لیں۔" وہ عاجز سا ہو کر وضاحت دینے لگا۔

"پھر کیسی بات ہے تم بتا دو۔ حد ہوتی ہے عمر! شادی ہوتے ہی تمہارے تو رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ ایسی بھی حور پری نہیں ہے وہ کہ تم اب اسے گھر چھوڑ کر کام پہ بھی نہ جا سکو۔" سیما کا انداز طعنے دینے والا تھا۔ علیزے اسی وقت گویا اس کی آمد سے آگاہ ہوئی تھی۔

"عجیب بات کر رہی ہیں آپا! میں اسے ساتھ کیوں نہیں لے جا سکتا۔ آپ بھی تو اسد بھائی کے ساتھ ہنی مون پر باہر جا رہی ہیں نا۔ میرے اسے اپنے ساتھ رکھنے پہ آپ کو کیا اعتراض ہے۔" عمر کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی علیزے کو عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔

"کتنی مرتبہ منع کروں کہ آپا کہنا چھوڑ دے اور اماں دیکھ رہی ہیں اس کے رنگ ڈھنگ؟ شادی کے بعد کیسے آنکھیں پھیر لیں۔ یہ وہی ہے نا جسے ہمارے سامنے آنکھ اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ ساری اس گھنی میسنی کی پڑھائی ہوئی پٹیاں ہیں۔"

سیما نے پہلے اسے جھاڑا تھا پھر جیسے اماں سے شکایت کرنے لگی۔ پھر بیٹی کی ہمدردی میں اماں بھی اس کے ساتھ شامل ہو کر عمر کو لتاڑنے لگیں۔ عمر کی وقفے سے مگر منمنائی ہوئی آواز آئی تھی۔ وہ بے زار سی ہو کر واپس پلٹ گئی۔ ان چند دنوں میں وہ یہ اندازہ تو بخوبی لگا چکی تھی کہ عمر کی گھر میں حیثیت کتنی ثانوی تھی۔

"کس بات پہ جھگڑا ہو رہا تھا اماں سے؟" کچھ دیر بعد وہ اوپر کمرے میں آیا تو علیزے نے کڑے لہجے میں استفسار کیا تھا وہ چونک سا گیا۔

"کچھ نہیں بس۔۔۔"

"مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟" وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آ گئی۔ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر خفت سے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"کیوں؟ مجھ سے پوچھے بغیر اس بات پہ الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس کے روکھے انداز پہ عمر کی آنکھوں میں تحیر اتر آیا۔

"آپ نہیں جانا چاہتیں میرے ساتھ۔۔۔!"

"بالکل نہیں۔ میرا فائنل ایئر ہے سو مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔" اس نے خشک لہجے میں گویا اطلاع دی۔

"میں مائیگریٹ کرا لوں گا آپ کا۔" عمر کی بات پہ علیزے کے اعصاب کو جھٹکا لگا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"اتنا تردد کرنے کی کوئی وجہ بھی ہونی چاہیے۔ جبکہ آپ کی ماں بہن کے شک اور بیان کے مطابق نہ میرے حسن کا جادو آپ کے سر چڑھا ہے نہ آپ نے مجھے کوئی بوٹی سونگھائی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہ رہ سکیں۔" اس کے آتشیں لہجے میں گہرے طنز کی کاٹ تھی۔ عمر ایک دم شرمندہ نظر آنے لگا۔

"میرا خیال تھا یہاں آپ اماں اور سیما آپا کے ساتھ ریلیکس نہیں رہ پائیں گی۔ بس میں آپ کو اس ٹینشن سے بچانے کے لیے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔" وہ اسی شرمندگی میں گھرا وضاحت پیش کرنے لگا تو علیزے کی آنکھیں سلگ اٹھیں۔

"مجھے تمہارے اس احسان کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اتنی ہی مجھ سے ہمدردی تھی تو یہ شادی نہ کرتے میرے ساتھ۔" وہ اتنی تلخی اتنی درشتی سے بولی تھی کہ عمر ایک دم ہونٹ بھینچ گیا اس کے چہرے پہ لہراتے تاریک سائے کو علیزے نے نہیں دیکھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

مکلاوے سے واپسی پر وہ بیگ میں اپنی کتابیں وغیرہ بھر کے لے آئی تھی۔ جس دن عمر ساہیوال گیا اس سے اگلے دن علیزے بھی یونیورسٹی جانے کو تیار ہو گئی۔ اسے بیگ اور فولڈر کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے دیکھ کر اماں کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔ ان کی تو گویا آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"کدھر کی تیاری ہے بیگم صاحبہ۔" ان کا لہجہ مخصوص جہالت اور طنزیہ کاٹ لیے تھا جو ان کی پہچان بن چکا تھا۔

"یونیورسٹی جا رہی ہوں۔" وہ ناگواری کے باوجود اختصار سے بولی۔ اس نے سب کچھ چپ چاپ برداشت کرنے کا عہد کر لیا تھا۔

"شادی کے بعد پڑھائیاں نہیں ہوتیں۔ گھر سنبھالے جاتے ہیں۔ کام کون کرے گا یہاں۔" وہ اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ نچا کر تلخی سے بولیں تو علیزے خائف سی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے اماں سب کام کر لیا کروں گی مگر یہ میرا آخری سال ہے اور بہت اہم بھی۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"تجھے تیری ماں نے سسرال میں رہنے کا ڈھنگ سکھا کر نہیں بھیجا۔ اتنی من مانی کی یہاں اجازت نہیں کہ منہ اٹھایا اور گھر سے چل دیے اور کسی کو خبر بھی نہیں۔" وہ پھنکاریں تو علیزے روہانسی ہو گئی۔

"میں عمر کو بتا چکی ہوں انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

"بات سن بی بی! تیرے خصم کے سوا بھی گھر میں کوئی رہتا ہے۔ یہ تیرے ماں پیو کا گھر نہیں ہے جو بے قاعدگی چلے گی۔ یہاں کے کچھ قاعدے قانون ہیں۔ بزرگوں کا کچھ لحاظ ہے۔ آئی کچھ سمجھ کہ نہیں۔" وہ پھنکاریں تو علیزے کا چہرہ غم و غصے کی زیادتی سے بھاپ چھوڑنے لگا۔ وہ لب بھینچے ساکن کھڑی رہ گئی۔ شام تک اماں نے سیما کو بلا لیا تھا پھر اس کی عدالت لگ گئی وہ بغیر کسی گناہ کے مجرم ٹھہری تھی۔ سیما نے اس کی اور سعدیہ کی ایک ایک دن کی کام کی باری مقرر کی تھی۔

"اماں اب کوئی کام نہیں کریں گی اور تمہاری پڑھائی پتا ہے کتنی مہنگی ہے۔ اتنی بھاری فیسیں کون بھرے گا تمہاری؟ میرے بھائی کی تو ساری تنخواہ تمہاری فیسوں کی نذر ہو جائے گی اور اسد سے آس لگانے کی ضرورت نہیں ساری عمر کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہم نے تمہارا بہتر ہے پڑھائی چھوڑ دو۔" اس نے بڑے آرام سے اس کی زندگی کا ایک اور بڑا فیصلہ اپنی مرضی سے صادر کر دیا۔

"یہ میرا فائنل ایئر ہے۔ بہت اہم سال ہے آپ جانتی ہیں پھر چند مہینے ہی تو رہتے ہیں۔ میں اپنا زیور بیچ کر فیس جمع کرا دوں گی۔"

تمام تر غصے اور نفرت کے باوجود اس نے اپنا لہجہ سخت نہیں ہونے دیا۔ وہ جان گئی تھی جن لوگوں کے درمیان وہ پھنسی تھی اسے ہرانا بہت آسان تھا ان کے لیے۔ جبکہ وہ ضد یا اکڑ میں آ کر اپنا کیریئر تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جبھی مقصد نکالنے کو لجاجت سے بات کی

تھی۔
"یعنی بدنام کرو گی میرے بھائی اور ماں کو؟" سیما نے تیوریاں چڑھائی تھیں۔
"نہیں کسی کو کیا پتا چلے گا۔ میں نہیں بتاؤں گی۔" وہ عاجز ہوئی تھی۔
"ٹھیک ہے۔ مگر اپنے حصے کا کام تم خود کرو گی۔ پڑھائی اور تھکن کا بہانہ بنا کر کام سے جی چرانے کی ضرورت نہیں۔" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ تمام تر ناگواری کے باوجود علیزے نے خاموشی اختیار کی تھی۔ اپنا بدلہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی اس کے لیے ایک دم سے بہت کٹھن ہو کر رہ گئی تھی۔ صبح یونیورسٹی جانے سے قبل سعدیہ اسے ناشتا تیار کر دیتی۔ صفائی بھی وہی کیا کرتی۔ پبلک ٹرانسپورٹ سے دھکے کھا کر یونیورسٹی جانا آنا ہی اسے اتنا تھکا دیتا تھا پھر رات کا کھانا بھی اسے ہی تیار کرنا پڑتا رات کو اتنا تھک جاتی کہ پڑھائی کی ہمت نہ رہتی۔
دن ایسی ہی مصروفیت میں گزر رہے تھے سیما اکثر چکر لگاتی رہتی مگر کچھ دنوں سے سکون تھا کہ دونوں ہنی مون کے لیے چلے گئے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے آئی ہی تھی کہ اس کے سیل پہ مما کی کال آگئی تھی۔
"علیزے ماں کو بھول گئی ہو بیٹے کبھی آجایا کرو ملنے؟" انہوں نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا۔
"پہلے آپ نے مجھے بھلایا تھا جبھی مجھے اس جہنم میں جھونک دیا۔ اب صبر کریں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس پہ۔" وہ جھلستی ہوئی گرمی سے آئی تھی۔ گھر میں لائٹ نہیں تھی۔ وہ تو خود سے بھی بے زار تھی۔ اس زندگی سے سمجھوتہ کر چکی تھی مگر پتا نہیں مما کو معاف کیوں نہ کر پائی تھی۔ شاید شکوہ بھی اپنوں سے کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنا دکھ ان پر ہی عیاں کرتی تھی۔ گو کہ سارا فیصلہ مما کا نہیں تھا اس نے خود بھی اس میں حصہ ڈالا تھا۔
"مجھے معاف کر دو بیٹا! مجھے تمہاری زندگی کی تلخیوں کا اندازہ ہے۔ تمہیں کیا پتا سکون میں تو ہم بھی نہیں ہیں۔ یہاں سیما نے ہمیں سولی پہ چڑھایا ہے۔ ہولے ہولے سب کچھ اپنے نام کروا رہی ہے! پچھلے دنوں ورشے کے لیے بھی ایک رشتہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر لے آئی۔ بڈھا کھوسٹ سیٹھ ہے۔ یقیناً" دولت کا لالچ دیا ہو گا انہیں۔ اسد بھی ساتھ مل گیا تھا۔"
وہ روہانسی ہو کر اپنے حالات بتانے لگیں۔ علیزے کے غصے کی جگہ تشویش نے لے لی۔
"مما آپ ہرگز بھی اسد بھائی کی بات نہیں مانیں گی۔ چاہے وہ کتنا ہی فورس کریں۔"
"نہیں بیٹے! تم فکر نہ کرو۔ تمہاری مرتبہ معاملہ اور تھا۔"
مما کی تسلی پہ اس کے سینے کی گہرائیوں سے سرد آہ نکلی تھی۔ یہ موضوع اسے ہمیشہ غمگین کر دیتا تھا اور شاکی بھی۔

☼ ☼ ☼

"تم! اس مرتبہ بڑی جلدی چکر لگا لیا۔ ہاں بھئی اب بیوی کی محبت کھینچ لائی ہے۔ جب تک ماں تھی نگوڑ ماری راستہ تکتی تھی تب تو مہینے کے مہینے بھی بار بار بلانے پہ شکل دکھانے آیا کرتے تھے۔" اماں نے اس کا حسب توقع استقبال کیا تھا۔ وہ ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔
"سعدیہ مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلانا۔ اماں میری ترقی ہو گئی ہے۔ بس یہی بتانے آیا تھا۔"
"ہاں بھئی اب اسے بھی بیوی کی خوش بختی کے کھاتے میں ڈال دینا۔" ان کے شکوؤں کا ایک انبار تھا گویا وہ کہاں تک وضاحتیں کرتا۔ سعدیہ لپک جھپک ٹھنڈا پانی لے آئی تھی۔
"یہ فروٹ اٹھا لو۔ میں ذرا نہا لوں۔"
خالی گلاس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تو اماں کی تیوری چڑھ گئی۔
"بیٹھ جا دو منٹ ماں کے پاس بھی۔ کمرے میں

وی تیرے انتظار میں نہیں بیٹھی ہوئی ملے گی آوارہ گردی کو نکلی ہے۔"
"وں کہاں گئی ہیں؟" عمر نے الجھ کر پہلے انہیں پھر گو دیکھا کہ ان سے تو جواب کی توقع نہیں تھی۔
"یونیورسٹی تمہیں نہیں پتا! اب مکر نہ جانا فون پہ ے خلاف کان بھرتی ہے وہ جانتی ہوں۔" ایک نیا ام بڑے دھڑلے سے عائد ہوا تھا۔ وہ اب کے صلاحت دیے بغیر کان لپیٹ کر اوپر کمرے میں آگیا ے نکال کر پہلے غسل کیا پھر کچھ ستانے کے ے لیٹا ہی تھا کہ اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ وہ ا ہو کر کچھ دیر بیٹھا رہا پھر کمرے سے باہر آکر نیچے ے ہوئے سعدیہ کو دروازہ بند کرنے کو پکارا تو اس کی ے اماں کمرے سے نکلیں۔
"اب کدھر خوار ہونے جا رہا ہے؟ اسے لینے؟"
"نہیں میں ذرا مارکیٹ جا رہا ہوں۔ یو پی ایس لا نے کا سوچا ہے۔"
"بڑی بات ہے بھئی! قسمت والی ہے وہ جس کے ے ہی گھر میں ساری سہولتیں آرہی ہیں۔ ایک ہم ا کہ ساری زندگی اسی گھر میں سڑتے ہوئے گزار خود خریدنے کی بجائے اس کے بھائی کو فون کر وہ ا کر دے ہمارے مفت کے پیسے نہیں ہیں جو برباد رتے پھریں۔" ان کے اعتراضات اور کل کل اع ہو چکی تھی۔ عمر نے عاجز ہو کر انہیں دیکھا۔
"اماں یہ ہمارے گھر کی چیز ہے۔ ہم کیوں کسی سے پھریں۔ پھر یہ صرف اس کے لیے تو نہیں لگوا "
"ہاں تو اور کس کے لیے لگوا رہا ہے۔ منہ نہ ہی ا میرا! یہ خیال تجھے شادی کے بعد ہی کیوں آیا ۔" وہ لڑنے کو تیار تھیں۔ عمر زچ ہو کر واپس پلٹ

"ٹھیک ہے میں نہیں لگوا رہا۔ جانے دیں۔" کسی ے سے کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا تھا۔ ا منہ اتر گیا وہ کتنی دیر بڑبڑاتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک گھنٹے بعد لائٹ آئی تو سعدیہ اس کے لیے کھانا لے آئی تھی۔ وہ کسلمندی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"علیزے کب تک آجاتی ہیں؟"
"آج ہی دیر ہوئی ہے بھائی! ورنہ اس وقت تک آجاتی ہیں۔"
"آج کیوں دیر کر دی؟ فون ہے اس کے پاس؟" اسے فطری تشویش نے آن لیا۔
"جی ہے ان کا سیل فون مگر مجھے نمبر نہیں پتا۔" سعدیہ کے جواب نے اس پر اوس ڈال دی نمبر کا تو اسے بھی نہیں پتا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔
سیل فون نکال کر وہ علیزے کی مما سے استفسار کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسی پل بیرونی دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ سفید سوٹ میں دھوپ اور گرمی سے تمتمایا ہوا چہرہ لیے علیزے ہی تھی۔ اماں اسے دروازے پہ ہی روک کے دیر سے آنے پہ بازپرس کر رہی تھیں۔
"بس خراب ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔"
وہ رسان سے وضاحت دے کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ اماں پیچھے بڑبڑاتی رہیں عمر واپس آ بیٹھا۔ علیزے اپنے دھیان میں اندر آئی تھی۔ اسے سامنے پا کر کچھ ٹھٹک سی گئی۔
"السلام علیکم۔" وہ رسان سے بولا تھا وہ چونکی پھر سپاٹ انداز میں جواب دیتے چادر اور بیگ اتار کر رکھنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے واش روم میں بھاگی۔ عمر کی نگاہ ڈائننگ ٹیبل کے آئینے میں دکھائی دیتے اپنے عکس پہ جا ٹھہری۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی یاسیت تھی۔ اس اچانک ہونے والے سامنے نے بھی علیزے کے چہرے پہ خوشی یا مسرت کا کوئی رنگ نہیں بکھیرا تھا۔ یقیناً" وہ اس کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور رکھتا بھی کیوں؟ وہ ایک بے حد عام سا انسان تھا اور وہ کسی ریاست کی شہزادی لگتی تھی۔ جسے قسمت کی ستم ظریفی نے اپنے بے رحم تھپیڑے سے

یہاں لا پھینکا تھا۔ وہ علیزے کے رویے سے شاکی نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ پہ بالکل درست تھی۔ کاش اسے پہلے اماں اور آپا کے اس منصوبے کا پتا چل جاتا تو وہ صاف منع کر دیتا۔ عین مہندی کی رات جب وہ گھر پہنچا تھا تب اس کے سر پہ یہ بم پھوڑا گیا تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا وہ بھی اس صورت جبکہ اماں اور آپا نے ہمیشہ اسے دبا کر رکھا تھا۔

ایسے ان کی کسی بھی بات سے اختلاف کی ہمت ہی کب تھی جب تعلیم مکمل ہونے کے بعد قسمت سے اسے گورنمنٹ آفس میں جاب ملی تو اس سے تین سال پہلے ہی سیما ملازمت کر رہی تھی۔ وہ اس سے تین سال بڑی تھی۔ مگر طرحدار تھی اور بننے سنورنے کا سلیقہ تھا جبھی خود پہ بے حد توجہ دیتی۔ آس پاس کے گھروں اور رشتہ داروں کے منہ سے بھی اس نے متعدد بار اماں اور آپا کے لیے اخلاق سوز باتیں سنی تھیں۔ جو اسے شدید ناگواری میں مبتلا تو کرتی تھیں مگر وہ باز پرس کا حق محفوظ نہیں رکھتا تھا۔ ایک بار اپنے کزن سے اس کی کسی بات پہ تکرار ہو گئی اور فہد نے اسے منہ کی مار مار کر چپ کرا دیا تھا۔

"وہ بس کر تو بڑا آیا شریف! تیری بہن جتنی پاک باز ہے نا سب جانتا ہوں۔ اتنی جگہ تو اس کے معاشقے چلے ہیں۔ لوگوں کو الو بنا کر لوٹنا تمہاری آپا کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور تیری اماں پورا ساتھ دیتی ہے اس کا۔"

فہد کی ایسی کئی اور باتوں نے اس کا گرم خون کھولا دیا تھا اور بات لڑائی مار کٹائی تک جا پہنچی تھی۔ پورے خاندان میں اس لڑائی اور اس کی وجہ نے ہفتوں گردش کی تھی اور اماں نے الٹا اسے ہی رگیدا تھا۔

"تجھے ضرورت کیا تھی اس کے منہ لگنے کی؟ گند کو چھیڑ کر چھینٹے پڑوانے والی بات۔" اس نے جواب میں ان باتوں کی وضاحت مانگ لی تھی بس پھر تو اماں اور سیما نے جو لتے لیے اس کے اسے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ وہ کبھی ان باتوں کا یقین نہ کرتا اگر وہ خود سیما کو دو تین بار بہترین گاڑی میں ہر مرتبہ کسی نئے چہرے کے ساتھ نہ دیکھ لیتا۔ سیما کا وطیرہ ہی یہی تھا۔ وہ مردوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتی اور اداؤں کے جال م پھانس کر اپنا مقصد حل کرتی تھی۔ اچھی شکل کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ پھر اسد جیسا بے وقوف لگا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹنے کا فیصلہ لیا۔ سونے پہ سہاگہ شادی کے موقع پہ ایسی شرط ر دی۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ اس گنگا سے اپنے گھر والو کو بھی فیض یاب کرنا چاہتی تھی۔ عمر کی شادی اسد بہن سے ہونے کی صورت ان کا گھر بہترین جہیز بھر جاتا۔ سونا نقدی اور جو مکان وغیرہ حصے میں آ الگ! اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مترادف اماں کو اسکیم بے حد بھائی اور یوں عمر کو مطلع کیے بغیر ہی سا معاملہ طے کر لیا گیا کہ اسد تو پوری طرح مٹھی میں آ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کچھ پیسے رکھ لیں۔" اگلے دن اتوار تھا اور وہ پڑی تھی۔ ناشتے کا کام نبٹا کر اس نے مشین لگا ر تھی۔ اپنے ہفتے بھر کے دھونے والے کپڑے لے کمرے میں آئی تو عمر جیسے اس کا منتظر تھا۔ علیزے نے حیران ہو کر اس کے بڑھائے ہوئے نوٹوں کو د تھا۔

"یہ کس لیے؟" اس کی صبیح پیشانی پہ شکنیں پڑ گئیں۔

"پڑھتی ہیں تو ظاہر ہے ضرورت تو پڑتی ہو گی۔" آہستگی سے بولا۔ پتا نہیں وہ اس سے نظریں چرا کر کیوں بات کرتا تھا۔

"بڑی جلدی خیال نہیں آ گیا آپ کو میری ضرورتوں کا؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گئی۔

"آئی ایم سوری! مجھے احساس تھا مگر.....!" وہ ہچکچ تو علیزے نے استفہامی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مگر......" وہ وضاحت چاہ رہی تھی۔ عمر جزبز ہو لگا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ اس کی اس ناگواری سے خائف تھا۔

"مجھے ضرورت نہیں ہے آپ کے پیسے کی سنبھا

ھیں۔ آپ کی ماں بہنوں کے کام آئیں گے۔"
وا نخواہ غصہ آنے لگا۔

"ان کے ساتھ ساتھ آپ بھی میری ذمہ داری ہیں اپنے حقوق تو ادا کرنے دیں۔" وہ نرمی سے یا تھا علیزے چونک گئی۔

"کس قسم کے حقوق کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں؟ ے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہاں جانتے ہیں نا سب! جانتے ہیں میرا دفاع......" اس کا کاٹ دار طنزیہ لہجہ عمر ہ واضح طور پر پھیکا کر گیا۔

"اسی لیے میں نے آپ کو ساتھ لے جانا چاہا تھا۔"

"آپ کے خیال میں یہ مسئلے کا حل تھا؟" وہ چیخی۔

"پھر کیا چاہتی ہیں آپ؟" وہ عاجز آ گیا۔

"کم از کم آپ سے کچھ نہیں۔ بس اپنے کام سے رکھیں۔"

وہ اپنا غبار اس پہ نکال کر الماری کھول کر کپڑے لنے لگی۔ عمر نے ہونٹ کاٹے تھے۔ پیسے واپس کو اس نے کرتے کی جیب سے والٹ نکالا تو ٹ کے ساتھ کوئی اور چیز بھی جیب سے نکل کر نیچے ی تھی اور لڑھکتی ہوئی کچھ دور پہ چلی گئی۔ پختہ فرش پر نک کی ڈبیا کی آواز کا ارتعاش گونجا عمر کے ساتھ یزے بھی متوجہ ہوئی۔ دل شیپ میرون کلر کی ولی سی ڈبیا کا ڈھکن کھلا تھا اور نازک سی گولڈ کی رنگ علیزے کے قدموں سے کچھ فاصلے پر گر کر ساکن ہو ا عمر نے یہ انگوٹھی علیزے کی رونمائی کے لیے چاہت سے خریدی تھی مگر اپنے سے بہت اونچے مام کی دلہن کو پا کر وہ اتنا کنفیوز ہوا کہ یہ معمولی تحفہ ے دینے کی ہمت نہیں کر سکا اور وہ یونہی جیب میں رہ گیا۔ پھر دلہن کے چہرے پر اپنے لیے بے زاری ناگواری کے تاثرات نے بھی تو اسے پیش رفت کی ت نہیں کرنے دی تھی۔ وہ جو پہلے ہی ماں اور بڑی کے بے تحاشا دباؤ میں پل کر بڑا ہوا تھا اور ایک دبی لی شخصیت کا مالک تھا۔ اتنی شاندار لڑکی کے قابل بھی خود کو نہیں پاتا تھا۔ جبھی ان کا تعلق ایک دگی اور تناؤ کا شکار ہو کر رہ گیا۔ علیزے نے انگوٹھی سے نگاہ ہٹا کر عمر دراز کو دیکھا۔ وہ ہونٹ بھینچے کچھ مضطرب سا لگا۔ معاً وہ جھکا اور انگوٹھی کے ساتھ ڈبیا اٹھا کر انگوٹھی کو بند کیا اور والٹ کے ساتھ ڈبیا بھی ڈریسنگ کا دراز کھول کر بے دلی سے اس میں پھینکی اور خود پلٹ کر باہر نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بہت دیر بعد بھی علیزے بہت دیر تک اسی پوزیشن میں کھڑی رہی۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور چہرہ جانے کس جذبے کے تحت سرخ ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے ہیئر برش اٹھانے کو ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھینچی تو نگاہ انگوٹھی کی ڈبیا کے ساتھ پڑے ہرے نوٹوں پر جم کر رہ گئی۔ عمر دراز پیسے اور رنگ وہیں چھوڑ گیا تھا دانستہ یا بھول کر وہ سمجھ نہ سکی کچھ دیر ساکن سی بیٹھی رہی پھر جانے کس جذبے کے تحت رنگ کیس اٹھا کر کھولا۔ سرخ دہکتے نگینے سے مزین بے حد نفیس ڈیزائن کی نازک سی انگوٹھی جگر جگر کر رہی تھی۔ اس نے احتیاط سے نکالی اور بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہن لی۔ کچھ ڈھیلی تھی مگر اس کے گداز دودھیا ہاتھ میں بے حد جچی تھی۔ کل جانے سے قبل وہ مارکیٹ سے اسپیشل اس کے لیے شاپنگ کر کے لایا تھا۔ تین چار موسم کی مناسبت سے خوشنما رنگوں کے سوٹ اور ساتھ میں دو نازک سے سینڈلوں کی جوڑیاں۔ اس نے شاپنگ بیگ لا کر اس کے پاس بیڈ پہ رکھا تو وہ نوٹس بنانے میں محو تھی۔ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"یہ آپ کے لیے ہے رکھ لیں پلیز۔"

"کیا ہے یہ؟" وہ حیران ہوئی۔

"کھول کر دیکھ لیں۔" عمر دراز صوفے پہ بیٹھ کر جھک کر جوتے کھول رہا تھا۔ علیزے نے شاپر الٹ دیا۔

"اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟" وہ ایک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔

"پھر کیا کرتا؟ پیسے آپ نے لیے نہیں تھے۔" وہ

مدھم سا بولا تو علیزے نے پہلی بار بہت دھیان سے اسے دیکھا تھا۔

"اپنے گھر کے اصولوں کو میری خاطر توڑ کر کیوں ذلیل ہوتے ہیں۔" اس نے کچھ دیر قبل ہی اماں کے چیخنے کی آوازیں سنی تھیں۔ جس میں وہ عمر کو زن مریدی کے طعنے دے رہی تھیں۔ تب وہ معاملہ نہیں سمجھی تھی مگر اب بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں عمر دراز کا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا یقیناً"۔

"مجبوری ہے۔ میں نہیں چاہتا جتنی دیر آپ یہاں ہیں کسی قسم کی پریشانی سے دوچار ہوں۔" وہ جوتے اتار چکا تھا۔ تھکے ہوئے انداز میں کنپٹیاں دباتا ہوا بولا تو علیزے خفیف سا چونکی۔

"میں کہیں جا رہی ہوں کیا؟"

"میں جانتا ہوں آپ ہمیشہ یہاں نہیں رہیں گی۔ یہ گھر اور یہاں کی کوئی بھی چیز آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کی واپسی کے سارے راستے میں کھلے رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کا ہر فیصلہ مجھے دل سے قبول ہو گا۔ جس طرح سے میری یا آپ کی فیملی نے آپ کو مجبور کیا میں آپ پر کوئی جبری فیصلہ مسلط نہیں کروں گا۔"

اس کے ایک دم دہک اٹھنے والے چہرے پہ نگاہ ڈالے بغیر وہ سرعت سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ پھر دانستہ وہ علیزے کے سامنے نہیں آیا۔ رات جب وہ سوئی تب وہ کمرے میں آیا تھا اور اس کے اٹھنے سے پہلے ساہیوال کے لیے روانہ ہو گیا۔ دروازے پہ کھٹکایا گروہ جو انگوٹھی پہ نگاہ جمائے ماحول سے کٹ گئی تھی ایک دم چونکی اور گھبرا کر ہاتھ جلدی سے پشت پہ چھپا لیا۔ سعدیہ نے اس کے گڑبڑانے کو حیران ہو کر دیکھا تھا پھر بولی تھی۔

"بھابھی لائیں اپنے وہ سوٹ مجھے دے دیں۔ میں سلائی کر دیتی ہوں۔"

"کون سے؟" وہ بےزاری سے بولی۔

"جو کل بھائی آپ کے لیے لائے ہیں۔ میں سلائی سینٹر جاتی ہوں نا۔ نئی ڈیزائننگ کے سلائی کروں گی۔" وہ جوش سے کہہ رہی تھی۔ علیزے نے نخوت سے سر جھٹک دیا۔

"مجھے نہیں سلوانے۔"

"کیوں بھابھی! میں نے اپنے اور اماں کے بھی سلائی کرنے ہیں۔ بھائی ہمارے لیے بھی لائے تھے نا۔" وہ اماں اور سیما سے یکسر مختلف مزاج رکھتی تھی۔ معصومیت سے بتا رہی تھی۔

"بس ابھی مجھے ضرورت نہیں ہے سعدیہ تم جاؤ۔" اس نے جان چھڑائی تھی۔ سعدیہ بےدلی سے مڑی۔

"سنو سعدیہ تم سلائی سینٹر کیوں جاتی ہو؟ پڑھائی چھوڑ دی کیا۔"

"جی بھابھی بس انٹر کیا۔ پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا سپلی آئی تھی انگلش میں تو اماں نے اٹھا لیا پڑھائی سے اور سلائی سینٹر ڈال دیا۔ اب تو مجھے دو سال ہو گئے ہیں سلائی سیکھتے۔ ایکسپرٹ ہو گئی ہوں، اپنے کپڑے سی کر آپ کو دکھاؤں گی۔ اگر پسند آجائیں تو سلوا لیجیے گا۔"

"تم پڑھائی دوبارہ اسٹارٹ کیوں نہیں کرتیں سعدیہ۔"

"وہ میں نے بتایا نا کہ مجھے مشکل لگتی ہے انگلش۔" سعدیہ گڑبڑا سی گئی۔

"میں تمہیں ہیلپ دیا کروں گی ڈونٹ وری! اگلے مہینے ایگزیم ہو رہے ہیں سکنڈ ایئر کے تم کلیئر کر کے ہم کالج میں ایڈمیشن لے لینا۔ ٹھیک ہے؟"

"جی جی۔" سعدیہ نے گھبرا کر کہا اور پلٹ کر بھاگ گئی۔ علیزے آہستگی سے مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

وہ اماں کو بتا کر مما کی طرف چلی آئی۔ کچھ دنوں میں اس کے ایگزیم شروع ہو جانے تھے پھر نکلنا مشکل ہو جاتا اسد اور سیما ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ ان کا ٹور کچھ اور طویل ہو گیا تھا۔ بزنس ایک بار پھر منیجر کے رحم و کرم پہ تھا اور مما، اسد کی اس لاپرواہی پر پریشان نے اور کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہی تھیں۔

"آپ ورشے کے لیے کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس کی بھی شادی کر دیں مما۔" ان کی تمام شکایتوں اور پریشانیوں کا اس کے پاس یہی مناسب حل تھا۔

"کوشش تو کر رہی ہوں بیٹا! مگر اچھے رشتے اتنی آسانی سے تھوڑی ملتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ عمر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟" یہ وہ سوال تھا جو ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیتا تھا۔

رات کو جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئی تو جانے کیوں اس کی آنکھیں اپنی قسمت کے اس پکر پہ بھیگنے لگیں۔ بہت دیر تک وہ بستر پہ کروٹیں بدلتی رہی۔ اے سی کی کولنگ اور نرم گداز بیڈ، پرسکون ماحول مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اب وہ شاید ان سہولتوں اور ٹھاٹ کی عادی نہیں رہی تھی۔ یہ بھی ایک مذاق ہی تھا۔ اسے ہنسی آگئی جب ہی سیل فون کی بیپ پہ وہ چونکی۔ کسی انجان نمبر سے کال تھی۔ اس نے کسی قدر تذبذب سے کال ریسیو کی۔

"ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" سلام کے بعد وہ بہت رسان سے پوچھ رہا تھا۔ وہ حیرت کی زیادتی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میرا نمبر کس سے لیا آپ نے؟"

"اسد بھائی سے۔ ایکچولی آپ کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔" اس کے لہجے میں واضح گریز تھا۔ علیزے نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"سعدیہ بتا رہی تھی آپ اسے انگلش کے پیپر کی تیاری کرا رہی ہیں؟"

"کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" وہ سرد آواز میں بولی تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"ارے نہیں مجھے تو بہت اچھا لگا۔ میرے کہنے پر تو وہ کبھی مانی ہی نہ تھی۔ میں تو آپ کا مشکور ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا تو دوسری سمت یکلخت خاموشی چھا گئی۔

"کب تک ادھر رہنے کا ارادہ ہے آپ کا؟" اس کا انداز کسی قدر جھجکا ہوا تھا۔

"کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے نروٹھے پن سے کہا تو وہ شاید دوسری جانب مسکرایا تھا۔

"مجھے گھر کا چکر لگانا تھا۔ جب آپ آجائیں گی تب میں بھی....."

"آپ مجھ سے بندھے تھوڑی ہیں۔ آنا ہے تو آجائیں۔ پہلے ہی آپ کی اماں کو کم شکایتیں نہیں ہیں مجھ سے۔" اس کی بات قطع کر کے وہ غصے سے کہہ گئی۔ تو وہ ایک دم خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اوکے میں لگا لوں گا چکر آپ آرام کریں میں نے یقیناً" ڈسٹرب کر دیا آپ کو۔" اگلے لمحے بےحد تکلف آگیا تھا اس کے لہجے میں۔ علیزے نے حیران ہو کر سیل فون کو دیکھا جہاں رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے کاندھے اچکائے اور سیل فون پھینک کر کروٹ بدل لی۔ پتا نہیں وہ کیوں سلگ اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عمر بھائی آئے ہوئے ہیں آپ کو لینے۔" وہ یونیورسٹی سے لوٹی تو ورشے کی اطلاع پہ تھم سی گئی۔ دل کچھ عجیب انداز سے دھڑک اٹھا۔

"کہاں ہیں؟" اس نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے سوال کیا۔

"ابھی ہی آئے ہیں۔ مما کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ کہاں جا رہی ہیں؟ سلام تو کر آئیں پہلے۔" وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو ورشے نے ٹوکا تھا۔

"سلام کہیں بھاگا جا رہا ہے نہ تمہارے عمر بھائی! فریش تو ہونے دو مجھے۔" وہ بےنیازی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی جبکہ ورشے اسی پل وہاں آنے والے عمر دراز کے سامنے خفت زدہ سی کھڑی تھی۔

"آپ بیٹھیے نا بھائی! بجو ابھی آتی ہیں۔" وہ مودب ہو کر بولی۔

"ہاں اچھا! ورشے آپ پلیز اپنی بجو سے کہیں جلدی تیار ہو جائیں۔ اماں نے بلوایا ہے۔" وہ صوفے

پہ نکتا ہوا بولا تو وہ رشے گھبرا گئی۔
"لیکن بھائی مما تو کھانا تیار کرا رہی ہیں۔ کھا کر جایئے گا نا پلیز۔"
"نہیں گڑیا کھانے کے لیے معذرت! پھر کبھی سہی۔"
"مگر بیٹے۔" اسی وقت مما اندر آئی تھیں۔
"آنٹی پلیز! میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ لجاجت سے بولا تو مما مسکرا دیں۔
"اوکے بیٹے ایز یو وش۔" کچھ دیر بعد مما سے رخصت لے کر علیزے اس کے ساتھ بائیک پہ آکر بیٹھی تو موڈ کچھ آف تھا۔ خود عمر دراز بھی خاموش تھا۔
"ایسی کون سی افتاد آگئی تھی اچانک۔" وہ بھڑکی۔
"اماں کا حکم تھا۔ آپ کو پتا ہے میں آپ کو زحمت دینا مناسب نہیں سمجھتا۔" جواباً وہ بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں جتلا کر بولا تو علیزے نے چپ سادھ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پورا ایک دن ہو گیا تھا بچے کو گھر آئے۔ کیسی بے خبر بیوی ہے احساس ہی نہیں شوہر اتنے دنوں بعد گھر آیا ہے آرام سے ماں کے گھر بیٹھی ہے۔" اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا۔ اماں کی لعن طعن شروع ہو گئی۔ وہ ہونٹ بھینچے انہیں سلام کرتی اوپر آگئی۔ چادر اتار کر پھینکی بیک سائیڈ پہ رکھا اور الٹے قدموں کچن میں آگئی۔ سعدیہ وہیں کھڑی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بیزار سے انداز میں سلام کیا۔
"وسلام! کیا پکا ہے سعدیہ۔" اس نے فریج کھول کر سلاد کے لیے سبزیاں نکالتے ہوئے سوال کیا۔
"قورمہ اور چکن پلاؤ۔ آپ کھانا لگائیں سب کچھ بس تیار ہے۔" سعدیہ نے روٹی سینکتے ہوئے کہا۔ وہ سر ہلا کر برتن نکالنے لگی۔ کھانے کے بعد برتن اسی نے دھوئے تھے۔ کچن کا دروازہ بند کر کے وہ باہر آئی تو اماں زور زور سے بول رہی تھیں۔
"ارے نخرے کیوں نہ دکھائے گی؟ ہر لحاظ سے مکمل شوہر ملا ہے۔ محبت اور زن مریدی میں بھی نمبر ون ہے۔ دیکھو ذرا بیوی کی خاطر یو پی ایس لگوا دیا۔ پڑھا لکھا اچھے عہدے پر فائز! میرے بیٹے میں کیا کمی تھی۔ اسے اس جیسی ایک چھوڑ ہزار ملتیں۔ میرے بیٹے جیسا لڑکا تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔" وہ یہ آخری جملہ ہر آئے گئے کے آگے ضرور بہت فخر سے دہراتی تھیں۔ مگر آج اسے ہمیشہ کی طرح غصہ آنے کی بجائے ہنسی آگئی تھی۔ اس میں تو شک نہیں تھا ان کے بیٹے نے یو پی ایس اس کی وجہ سے لگوایا تھا۔ اتنی کڑھن تو اماں کا حق بنتی تھی۔

☼ ☼ ☼

علیزے اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھی۔ جب بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اس کے بالکل سامنے رکھ دیا گیا۔ اس نے چونک کر اسے اٹھایا۔ عمر دراز اس کے سامنے تھا۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو میں اس کی سانولی رنگت کچھ اور بھی سانولی لگ رہی تھی۔ آرمی کٹ ہیئر اسٹائل اور نظر کا سلور فریم کا چشمہ اسے سوبر بناتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور مضبوط جسم! وہ اتنا بھی گیا گزرا تو نہیں تھا۔ وہ جانے کیوں اسے دیکھے گئی۔
"میں نے سوچا آپ کو اس کی ضرورت ہو گی۔ کیا آپ ہر روز اتنی رات تک ہی پڑھتی ہیں؟" وہ فاصلے پہ ہٹ کر صوفے پہ جا بیٹھا۔ علیزے چونکی۔
"نہیں روز تو نہیں آپ ڈسٹرب ہو رہے ہیں تو لائٹ بند کر دیتی ہوں۔"
"نہیں آپ بے فکر ہو کر پڑھیں۔ میرا ویسے بھی آج چھت پہ سونے کا موڈ ہے۔"
"میں آپ کا بستر......" وہ اٹھی تھی جب بے اختیار ٹوکتے ہوئے عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا مگر احساس ہونے پہ اگلے لمحے چھوڑ بھی دیا۔
"سوری مگر میرے لیے پلیز تکلفات میں نہ پڑا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس سے نظریں ہٹا کر بولا اور اسے گم سم چھوڑ خود باہر نکل گیا۔ علیزے نے

کے جانے کے بعد گم سم کی کیفیت میں اپنے ہاتھ کو دیکھا جہاں اس کی سخت گرفت کا احساس ہلکی سرخی کی صورت رقم تھا اور لمس کے احساس نے جو سارے وجود میں بھرے تھے وہ اسے مضطرب کر کے رکھ گئے پھر وہ چاہنے کے باوجود پڑھ نہیں پائی تھی اور لائٹ آف کر کے سو گئی۔
وہ رات کا ہی کوئی پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ پیاس محسوس کر کے بستر سے اتری تو اندھیرے میں کسی شے سے الجھ کر بری طرح گری تھی۔ گرنے سے تو جو حواس مختل ہوئے سو ہوئے خود کو کسی وجود سے ٹکرانے اور پھر اس کی بانہوں کے حصار میں گھر جانے کی اسے وحشت نے ـــــ جکڑ لیا۔ بے اختیار اس کے حلق سے گھٹی ہوئی سی چیخیں نکل گئیں۔
"مائی گاڈ علیزے! یہ میں ہوں عمر دراز پلیز ٹیک اٹ ایزی۔" اسے بری طرح سے جھٹکتے ہوئے وہ کرنٹ کھانے کے انداز میں پیچھے ہٹ رہی تھی کہ اس اثناء میں آواز پہ وہ جیسے ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی۔ عمر اسے آہستگی سے خود سے الگ کرنے کے بعد اٹھا پھر سوئچ بورڈ کے نزدیک جا کر لائٹ آن کر دی۔ علیزے ہنوز وہیں بیڈ اور صوفے کے درمیانی خالی جگہ پہ بیٹھی گہرے سانس لے رہی تھی۔
"آئی ایم سوری! میری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی۔ ڈر گئی تھیں آپ؟" وہ وہیں کھڑا کہہ رہا تھا۔ علیزے نے خود کو سنبھال کر اسے دیکھا۔
"ظاہر ہے ڈر گئی تھی۔ آپ تو چھت پہ گئے تھے نا سونے پھر یہاں۔"
"بارش ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے مجھے اندر آنا پڑا۔"
"پھر بھی صوفے کی بجائے یہاں سونے کی کیا تک ہے؟" وہ خجل سی ہو کر بکھرے بال سمیٹنے لگی۔
"صوفے پہ سویا نہیں جاتا مجھ سے جبھی یہاں لیٹا تھا۔ اگین سوری آپ کو زحمت......"
"آپ اتنے فارمل کیوں ہو رہے ہیں۔ اٹس اوکے اور بیڈ پہ لیٹ جائیں۔ سوری مجھے خیال کرنا چاہیے تھا۔"
"تو آپ کیا یہاں نیچے لیٹیں گی؟ نہیں یہ مناسب نہیں لگتا۔" وہ متامل تھا۔ علیزے نے پلکیں اٹھا کر اسے دھیان سے دیکھا۔ اس کی رنگت پھر سرخ ہو گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس کی انسلٹ کر چکا تھا۔ شاید وہ ان فاصلوں کو سمیٹنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ اندر کی ساری جلن اس پہ نکال دے۔ اسے بتائے کہ وہ اس کی بہن کی طرح کا مزاج نہیں رکھتی کہ ایک کے بعد دوسرا مرو بدلتی پھرے۔ مگر اس طرح تو اسے خود بتانے والی بات تھی کہ وہ اس کی پیش رفت کی منتظر ہے۔ وہ کیوں اس پہ اس کی اہمیت آشکار کرے جبکہ وہ اسے اس کا حق دینے پہ آمادہ نہیں تھا۔
"میں خوامخواہ نیچے سوؤں گی۔ آپ کی طرح عالم چیتا کی جانشین تھوڑی ہوں کہ صوفے پہ پوری نہ آ سکوں۔" اسے نارمل انداز میں بات کرنے کو باقاعدہ خود پہ جبر کرنا پڑا تھا۔ عمر دراز جیسے ممنون ہو کر رہ گیا۔
"کہاں جا رہی ہیں آپ۔" اسے باہر جاتے دیکھ کر وہ چونکا۔
"پانی پینے! پیاس کی وجہ سے ہی تو آنکھ کھلی تھی میری۔"
"رکیں میں لے کر آتا ہوں۔ باہر اب بھی بارش ہو رہی ہے۔"
"نہیں میں چلی جاؤں گی۔ مجھے کسی کو اپنے لیے زحمت دینا پسند نہیں ہے۔" وہ سختی سے کہہ کر دروازہ کھول کر چلی گئی۔ عمر دراز حیران کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر بہت سارے دن بہت خاموشی سے گزرتے چلے گئے۔ اس نے سعدیہ کی بہت اچھی تیاری کرائی تھی اس کے ایگزیم کے بعد علیزے کے اپنے امتحان شروع ہو گئے۔ اسی دوران اسد اور سیما ہنی مون سے واپس آگئے تھے۔ وہ سب کے لیے تحائف لائے تھے۔ علیزے کو جو موٹ پیس اس نے دیا وہ بے حد معمولی سا تھا علیزے اس کی اپنے لیے کدورت کو

جانتی تھی جبھی کچھ کہے بغیر خاموشی سے سوٹ رکھ لیا اس کے ایگزیم کے دنوں میں بھی عمرو راز نے گھر پہ ایک چکر لگایا تھا۔

"جب تک آپ کے ایگزیم ہو رہے ہیں گھر کے کام نہ کریں۔ آپ کا حرج ہو گا۔" وہ صبح ناشتا بنا رہی تھی جب عمر نے ماتھے پہ شکنیں لیے اسے ٹوکا تھا۔

"میرا کوئی حرج نہیں ہوتا۔ میں عادی ہو گئی ہوں۔"

"راتوں کو جو اتنی دیر تک جاگتی ہیں نہ جاگا کریں۔ آپ کی صحت متاثر ہو رہی ہے۔" وہ پتا نہیں کیوں اس کے لیے اتنا متفکر ہو رہا تھا۔ علیزے نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔

"آپ کو میری اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں پردیسیوں سے دل لگانے کے خطرناک نتائج سامنے آسکتے ہیں؟" شاکنگ پنک سوٹ میں ملبوس ملکوتی نقوش اور بے حد سلکی بالوں والی یہ خوب صورت سی لڑکی صبح دم اس کا موڈ ایک دم سے خوشگوار کر کے گئی تھی۔ علیزے نے چونک کر اسے دیکھا۔ کچن کی سلیب سے ٹکا وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔

"اگر آپ مجھے اس گھر سے نکالنے پہ کمربستہ ہیں پھر تو ظاہر ہے۔ پردیسی ہی ہوں میں۔" اس کی جانب سے رخ پھیر کر وہ جتنی سنجیدگی اور خفگی سے بولی تھی عمرو راز اسی حساب سے سٹپٹایا۔

"سوری آپ شاید ہرٹ ہوئیں میں تو مذاق کر رہا تھا۔" اس کی وضاحت پہ علیزے نے ٹھنڈا سانس بھر لیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مذاق والی بات کون سی تھی۔ گھر سے نکالنے والی یا دل لگانے والی۔

☼ ☼ ☼

دن بہت سست روی سے گزرے تھے مگر پھر بھی جیسے بہت وقت بیت گیا تھا۔ موسم بدلا گرمیاں رخصت ہوئیں اور سردیاں شروع ہونے کو تھیں۔

عمرو راز کی وہی روٹین تھی۔ اب تو علیزے بھی اماں کی لعن طعن جھڑکیوں اور سیما کی سازشوں کی جیسے عادی ہو گئی تھی۔ علیزے نے سعدیہ کا تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن کرا دیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے کالج جاتی ٹیوشن اسے علیزے ہی دیتی تھی۔ اس جیسی پڑھائی کی چور لڑکی پہ اسے خاصی زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ پھر ایک اور دھماکہ ہوا۔ سیما کا کسی بات پہ اسد سے بھرپور جھگڑا ہوا اور وہ ناراضی میں گھر چھوڑ کر واپس آگئی۔ جھگڑے کی نوعیت کا کسی کو بھی پتا نہیں چلا تھا۔ دونوں کسی کو کچھ بتانے پہ راضی نہیں تھے اور نہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار تھے دونوں گھرانے بھرپور ٹینشن کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ عتاب علیزے پہ ٹوٹا تھا۔ اماں اور سیما' علیزے کو ہر صورت گھر سے نکالنے کے درپے ہو گئی تھیں۔

وہی وٹے سٹے کی شادیوں والی روایتی سی نفرت یعنی اگر ایک فریق کی غلطی ہے تو دوسرے سے لازمی وہی فیصلہ کرانا ہوتا ہے۔ علیزے اس جبری فیصلے پہ احتجاج بلند کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"میں مما کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں نہیں جائے گی؟ جب میری بیٹی میکے کی دہلیز پہ آکر بیٹھ سکتی ہے تو تو بھی جائے گی چل۔" اماں نے اسے زور سے دھکیلا تھا۔ وہ لڑکھڑائی مگر خود کو سنبھال لیا تھا۔

"آپ کی بیٹی کا جھگڑا ہوا ہے اماں! میرا آپ سے کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔"

"تم مجھے طعنے دے رہی ہو؟ اگر جھگڑا نہیں بھی ہوا تو بی بی پھر بھی یہ سزا تو تمہیں بھگتنا پڑے گی۔ وٹے سٹے میں اسی طرح ہوتا ہے۔"

سیما آنکھیں نکال کر غرائی تھی۔ علیزے خوف سے سرد پڑنے لگی۔ وہ مزید کچھ نہیں بولی۔ اور اپنے کمرے میں آکر مقید ہو گئی۔ نیچے سیما اور اماں نے ایک طوفان مچا کر رکھا تھا۔ اس کا دل جانے کیا کیا سوچ کر گھبرانے لگا۔ کچھ نہ سوجھا تو مما کو فون کر لیا تھا۔

"مما یہ لوگ مجھے گھر سے نکال رہے ہیں پلیز کچھ

کریں۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں بیٹے! ہم تو گویا کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈوریاں ان سفاک لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔" مما خود بے حد دکھی تھیں۔ فون پہ ہی رونے لگیں۔

"میں ایسا کچھ نہیں چاہتی ہوں مما! میری زندگی تماشا بن رہی ہے۔ کل ان کی صلح ہو جائے گی تو یہ مجھے بھی واپس بھیج دیں گے۔ پھر لڑائی ہو گی تو مجھے پھر نکال دیں گے۔" وہ سسکنے لگی۔ مما اسے فون پر تسلی دلاسے دیتی رہیں۔

"تم عمر سے بات کرو۔ وہ کیا کہتا ہے؟" اور علیزے کے اندر بے چارگی اتر آئی۔ اب انہیں وہ کیا کہتی کہ اس نے کبھی اسے کوئی آس نہیں دلائی تھی۔ شام کے بعد رات اتر آئی۔ وہ کمرے سے نہیں نکلی۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سوجھ گئی تھیں رات کا دوسرا پہر تھا جب اس کے کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ذرا آنکھ لگنے سے قبل تک وہ نیچے سے مسلسل جھگڑے کی آوازیں سنتی رہی تھی۔ جس میں زیادہ تر اسد اور علیزے کو ہی کوسا جا رہا تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی تھی ساتھ میں عمرو راز کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ اسے دروازہ کھولنے کا کہہ رہا تھا۔ اس کے تن مردہ میں جیسے جان پڑ گئی۔ وہ سرعت سے اٹھی اور آگے بڑھ کر دروازے کا بولٹ گرا دیا۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

عمرو راز اس کی پرنم آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بولا۔

"جی.....! آپ کب آئے؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے۔ اماں نے بلوایا ہے۔" وہ اندر آ گیا۔ علیزے کچھ سہم کر اس کی صورت تکنے لگی۔ جانے اب وہ کیا کہتا ہے۔

"میں اسے بتا دوں گی کہ میں اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے خود کو ڈھارس دی۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اگلے لمحے اماں اور سیما دندناتی ہوئی

کمرے میں آن گھسی تھیں۔

"ابھی نکالو اسے گھر سے باہر! اس کے بھائی کو فون کرو آکر لے جائے اسے۔ میری بیٹی کو بھی اسی طرح نکالا ہے۔" اماں چلانے لگیں۔ علیزے نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔ عمرداز ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

"ہاں تو اور کیا۔ لینے آیا تھا اس کا بھائی! مگر یہ کمرے سے نہیں نکلی۔" سیما نے پھنکار کر کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی' میں کہہ چکی ہوں۔" وہ ضبط کھو کر چیخی۔ عمرداز نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"کیسے نہیں جاتی ابھی بتاتی ہوں تمہیں۔" اماں تلملا کر اس پر چڑھ دوڑیں مگر عمرداز نے بروقت مداخلت کی۔

"پلیز اماں! آرام سے۔"

"کیا آرام سے؟ باہر نکال اسے۔" وہ غرائیں۔

عمرداز انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ خاصی دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ پھر سیما اور اماں صبح تک اسے مہلت دینے پہ بمشکل رضامند ہو کر نیچے گئی تھیں۔ علیزے حواس باختہ سی بیٹھی تھی۔ عمرداز نے دروازہ بند کر کے اسے دیکھا اور گہرا سانس بھرا۔

"آپ مجھے صبح نکال دیں گے؟" وہ سراسیمگی سے استفسار کر رہی تھی۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ رسان سے پوچھنے لگا۔

"میں واپس نہیں جانا چاہتی۔ میں ہمیشہ یہاں رہنا چاہتی ہوں۔"

اس نے لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر اپنا فیصلہ سنایا تو عمرداز نے کچھ دیر تک خاموشی سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

"جذباتیت کے بغیر فیصلہ کریں علیزے! آپ کے لیے بہترین موقع ہے واپسی کا آپ پر کوئی الزام بھی عائد نہیں ہو گا۔ آپ اپنی مرضی کی راہ چن لیں۔"

علیزے نے ــــــ ہرٹ ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

"آپ مجھے رکھنا نہیں چاہتے ہیں نا! مجھے پتا تھا۔ آپ اپنی اماں اور بہن کے خلاف چل ہی نہیں سکتے۔"

"یہ بات نہیں ہے علیزے! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں واپسی کے راستے آپ کے لیے کھلا چھوڑنا چاہتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں آپ کے ساتھ زبردستی کی گئی۔ یہاں کچھ بھی آپ کے شایان شان نہیں ہے اور زبردستی کے بندھن پائیدار نہیں ہوتے جب دلوں میں گنجائش نہ ہو تو......"

"مگر یہ میرا نصیب تھا اور نصیب سے جھگڑا نہیں کیا جا سکتا۔ میں اپنے نصیب کے لکھے پہ اگر شاکر نہیں تھی تو اب شاکی بھی نہیں ہوں اور کس کے دل کی گنجائش کی بات کر رہے ہیں اپنے......!"

"میں تو آپ کی بات کر رہا ہوں۔ میں تو آپ کو پہلی بار دیکھ کر ہی......" "معا" وہ ایک دم زبان دبا گیا کچھ کھسیاہٹ کا شکار ہوتا ہوا۔ علیزے نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا کہہ رہے تھے آپ۔" اس کے بے تابی سے سوال کرنے پہ عمرداز نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"میں بہت عام سا انسان ہوں علیزے اور آپ اسی قدر خوب صورت اور خوب صورت لوگوں سے تو خود بخود محبت ہو جایا کرتی ہے۔ بس میں خود کو آپ کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔" وہ پہلی بار اس پہ اپنی کیفیت آشکار کر رہا تھا۔

"تو آپ مجھ سے محبت کرتے تھے؟" وہ حیران رہ گئی۔

"ہاں مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی بلکہ ہے۔ جبھی تو تمہاری خاطر اکثر اماں کی نافرمانی کرنے لگا تھا جو پہلے کبھی نہیں کی تھی۔" وہ کسی قدر جھینپ کر بولا تو علیزے کی حیرت دوچند ہو کر رہ گئی۔

"اسی لیے مجھے اپنے ساتھ بھی لے جانا چاہتے تھے؟"

"ہاں مجھے اماں کا آپ کو ڈانٹنا اچھا جو نہیں لگتا تھا۔ مجھے پتا تھا ایک دن یہ سب ہونا ہے جو آج ہوا۔" وہ یونہی خفت زدہ سا بتائے گیا۔ علیزے نے گہرا سانس بھرا پھر مسکرا دی۔

"تو آپ اب مجھے کل مما کی طرف تو نہیں بھیجیں گے؟"

علیزے میں پھر آپ سے کہوں گا۔ صرف ... کی بنا پہ زندگی نہیں گزرتی۔ آپ اچھی طرح ... ہیں۔" وہ ایک بار پھر سنجیدہ ہوا تو علیزے نے گھورا تھا۔

"... رنگ کس کے لیے تھی جو دراز میں رکھی تھی ...؟"

"آپ کے لیے ہی خریدی تھی مگر......"

"... دینے کا حوصلہ نہیں ہوا۔" علیزے نے اس کی اچکی تو وہ ہچکچا سا گیا۔

"وہ مجھے آپ کے سامنے بہت معمولی لگی تھی۔"

"جہاں رشتے خاص ہوں وہاں کچھ بھی معمولی نہیں ... عمر! آپ نے نہیں پہنائی تو کیا ہوا میں نے خود پہن ... جو چیز میری ہے اس پہ مجھے حق جتانا اچھا لگتا ہے۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا اور داہنا ... بڑے ناز سے اس کے سامنے لہرایا۔ عمر گنگ رہ گیا ... کے ہاتھ کی انگلی میں رونمائی رنگ دیکھ کر۔

"علیزے 'علیزے!" وہ ایک دم مسرور ہوا تھا ... اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بے ساختہ ہونٹوں سے چھوا۔

"آپ نے مجھے خاص کر دیا ہے علیزے ... تھینکس اے لاٹ۔"

"کیا میں سمجھوں کہ آپ کو بھی مجھ سے محبت ہے؟" وہ کسی قدر شوخی سے بولا تو علیزے نے زیر لب ... مسکراتے ہوئے گردن اکڑائی۔

"میں کیوں بتاؤں بھلا؟ آپ کو کیا لگتا ہے؟"

"مجھے تو صاف لگتا ہے یہ لڑکی جو میری بے نیازی پہ ... گھورتی ہے اور نظراندازی پہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ مجھ سے لازما "محبت کرلی ہے۔" وہ ہنس رہا تھا۔

علیزے بری طرح سے بلش کر گئی۔

"یعنی آپ بھی وہ نہیں تھے جو ظاہر کر رہے تھے ... نا۔" وہ اسے گھورنے لگی۔ جوابا" وہ ہنستا رہا۔

"آپ تو سمجھ دار ہیں جناب۔"

"عمر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر اماں اور آپا نے آپ ... فورس کیا تو......"

"نہیں علیزے! پریشان مت ہوں۔ میں آپ کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ آپ کے ساتھ اب مزید کوئی جبر کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ ٹرسٹ می! میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" عمرداز نے اس کے ہاتھ تھام کر تسلی دی تو وہ ذرا سا ریلیکس ہوئی۔

"مگر اس طرح اماں بہت خفا ہو جائیں گی عمر! جو میں نہیں چاہتی وہ ماں ہیں آپ کی اور ماں کے بیٹے پہ بہت حقوق ہوتے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ آپ اسد بھائی کی طرح اپنی ماں کو سرے سے نظرانداز کر دیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا جناب! اماں مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اکلوتا بیٹا جو ہوں۔ جبھی تو ایک بہترین لڑکی تلاش کی ہے اپنے بیٹے کے لیے اتنی بہترین کہ اگر ان کا بیٹا کہیں جذباتی ہو کر بھٹکنا چاہے تو وہ اسے بھٹکنے نہیں دیتی۔ پھر رشتے میرے نزدیک بہت اہم ہیں۔ آپ اپنی جگہ پہ اماں اپنی جگہ پہ۔ میں نا صرف اماں کو سمجھاؤں گا بلکہ اسد بھائی کے ساتھ آپا کی مصالحت کرانے کی بھی کوشش کروں گا۔"

"ہاں میں بھی دعا کروں گی۔"

"صرف دعا؟" وہ بسورا تو علیزے چونکی۔

"اور کیا کروں؟ آپ بتائیں؟"

"یار اپنے اس شوہر نامدار پہ بھی تھوڑی سی توجہ کی عنایت کر دو اتنے مہینوں سے اسی نگاہ کرم کا منتظر ہے۔" وہ شریر ہوا تو علیزے شرم سے سرخ پڑتی ڈھنگ سے اسے گھور بھی نہ سکی۔ عمرداز نے یونہی ہنستے ہوئے اسے بانہوں کے حصار میں لیا تو اس کے اندر ڈھیروں طمانیت اور سکون اتر آیا۔ وہ اپنی فہم و فراست سے یقینا" ایک نہیں دو گھر ٹوٹنے سے بچانے میں کامیاب رہی تھی۔

✡ ✡

ملیحہ رفیق

دھوپ کا روپ

"آہ!" زخموں سے چور جسم کو زبردستی گھسیٹنے کی کوشش میں اس کے لبوں سے ایک دلسوز چیخ نکلی۔

"ارے بدبخت! کیوں اس ہڈیوں کے ڈھانچے سے بیر لیتی ہے اگر ایک دن نہیں دیکھے گی اسے تو کیا مرجائے گی۔" اماں حاجراں نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس بٹھانے کی کوشش کی مگر اس لمحے اس پر ایک جنون طاری تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے بازو کو چھڑایا اور تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ چند لمحوں کے اس وصال کے لیے اس کا پورا جسم تھکن کے احساس سے چور ہوچکا تھا' مگر اسے ملنا تھا۔ اپنے غم خوار سے...اپنے ہم سفر سے...اسے ملنا تھا ہر فصیل کو توڑ کر اس تک جانا تھا اور پھر محض چند لمحوں کی صدیوں جیسی مسافت طے کرکے وہ اس کے سامنے تھی۔

دونوں میں نظروں کا تبادلہ ہوا۔ غم زوال سے نڈھال سب کو جھکی زرد اور نارنجی نگاہوں سے دیکھتا وہ اسے روز کی طرح دنیا کی بے ثباتی اور فانی ہونے کی لافانی داستان سنا رہا تھا۔ دونوں نے خاموش اپنے اپنے غم بیان کیے تھے۔ کوئی عروج و زوال کی کہانی کا عنوان تھا تو کوئی حاصل سے لاحاصل تک کا مسافر اور پھر دھیرے دھیرے وقت سمٹنے لگا اور ملاقات کے ختم ہونے کا عندیہ دینے لگا اس کو ڈوبتے دیکھ کر اسے اپنا آپ بھی اس کی طرح اندھیروں میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا پھندہ بن کر اٹکنے لگا اس نے بے بسی سے زنگ آلود چوکور فریم میں لگی لوہے کی سلاخوں کو اس سختی سے تھاما جیسے اپنی بے بسی دکھا کر اسے روکنا چاہتی ہو مگر جانے والے کو کون روک سکا ہے۔

لاچاری کسی سیال مادے کی صورت میں اس کے چہرے کی زمین کو بھگونے لگی تھی اور پھر وہ شب تاریکی میں ڈوب گیا۔ سب کی طرح وہ بھی اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ خشک لبوں پر جمی پپڑی کو اس نے بے دردی سے اپنے دانتوں میں دبا کر کچل ڈالا جس سے اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا اور پھر وہ اسی سیلن زدہ دیوار کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔ ایک اور یاد کا چاند ڈھلتے سورج کی جگہ لینے لگا۔

☼ ☼ ☼

"واؤ ماہی! میری جان تم نے تو کمال کردیا۔" مسز زیدی نے جیسے ہی پارلر میں قدم رکھا سامنے کھڑی برائیڈل نے انہیں چونکا کر رکھ دیا۔

"ارے میم! آپ آگئیں۔ اچھا ہوا اب آپ دیکھ کر بتائیں کیسا لگ رہا ہے ان کا ہیئر اسٹائل' کچھ پتا تو نہیں چل رہانا۔" ماہی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے برائیڈل کو پوری طرح گھما کر ان کے سامنے کیا۔

"بالکل نہیں جانو! اس کے ہیئر اسٹائل سے تو لگ رہا ہے کہ اس کے بال بہت ہیوی ہیں اور پیشانی تو بہت مہارت سے تم نے کور کی ہے۔ کیوں شانزے بیٹا تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟" مسز زیدی نے اپنے قریب کرتے ہوئے برائیڈل سے پوچھا جو کہ ایک مشہور ماڈل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دوست کی بھانجی بھی تھی اور چونکہ کچھ عرصہ پہلے ہی بال جھڑ جیسی بیماری کا شکار ہوئی تھی للٰذا مسز زیدی (جو کہ شہر کی میک اپ آرٹسٹ مانی جاتی تھیں) نے منہ مانگی فیس کے ساتھ اسے تیار کرنے کی ذمہ داری لے لی اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ ماڈل کے لہنگے میں دوپٹہ اس کی شرٹ کے ساتھ ہی ایک پٹی کی صورت میں اٹیچ تھا۔ مگر آج صبح ہی انہیں ایک ایمرجنسی کی وجہ سے لاہور جانا پڑ گیا اور یوں اس برائیڈل کی تیاری ماہی نے اپنے سر لے لی تھی۔ کہ وہ ایسی مشکلوں سے نبٹنا بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔

"جی آنٹی! میں تو خود سرپرائزڈ ہوگئی تھی جب اس نے مجھے ہیئر اسٹائل دیا۔ رئیلی شی از ویری ٹیلنٹڈ گرل۔" شانزے نے تائیدی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"نو ڈاؤٹ شی از۔" مسز زیدی نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"پتا ہے شانزے! کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے میں یہ پارلر ماہی کو ہی دے دوں۔ کیونکہ اسے کامیاب بنانے

میں مجھ سے زیادہ اس کی محنت اور مہارت شامل ہے۔ اور پھر میرے خوابوں کی تعبیر بھی ماہی نے ہی تو پوری کی ہے۔ ایک کامیاب اور فیمس سیلون کے خواب کی تعبیر۔ بس اب مجھے سکون کی موت آسکے گی کہ زندگی میں جو چاہا حاصل کرلیا۔ اب تمناؤں کے محل ختم ہوئے۔" خاموشی سے کام کرتی ماہی کو دیکھ کر انہوں نے یاسیت بھرے انداز میں کہا۔ جس پر ان دونوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"ارے میم! آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔" ماہی نے بلش آن کی کٹ واپس ٹیبل پر رکھی اور ان کے پاس آکر کہا کہ کبھی کبھی وہ ایسی ہی لایعنی باتیں کرتی تھیں۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو میری جان۔ تم شانزے کو فائنل ٹچ دے کر اسٹوڈیو میں فوٹو شوٹ کے لیے بھیج دو۔ اور ہاں آج ان کے علاوہ تین برائیڈل اور بھی ہیں تمہارے ساتھ شاہین اور فروا بھی ہیلپ کروائیں گی۔ مگر دیکھو بیس تم خود بنانا۔ اوکے۔" انہوں نے جلدی جلدی اسے اگلی ہدایات دیں کہ وہ ایسی ہی تھیں ایک لمحے میں جذباتی کرڈالتیں تو دوسرے ہی لمحے بالکل نارمل۔ اور ماہی مسکراتے ہوئے شانزے کو بلش آن لگانے لگی جبکہ دوسری طرف مسز زیدی کی سوچ کا پرندہ بہت اونچا اڑنے لگا تھا۔ تیزی سے تنہا کام کرتی ماہی پر نظر ٹکاتے ان کا دماغ اس کے ہاتھوں کی رفتار سے تقریباً سو کلو میٹر کی رفتار سے تیز چل رہا تھا۔ آج ماہی نے ان پر ایک اور سوچ کا دریچہ کھولا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بختیار! آخر ایسا کیا کام ہے تمہارا جو ختم ہونے میں نہیں آرہا۔ آخر کب واپسی ہوگی تمہاری۔" مسز زیدی نے جھنجلاتے ہوئے تیسری بار کال کی تھی مگر ہر بار ایک ہی جواب ملنے پر وہ چڑ کر رہ گئیں۔

"آپا! مجھے آئے ابھی دو ماہ ہی تو ہوئے ہیں ابھی مجھے کچھ کام ہے یہاں پر۔ ایک دو ماہ میں آجاؤں گا۔" اس نے آپا کی جلد باز طبیعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رسانیت سے سمجھایا۔

"دیکھو بختیار! تم جانتے ہو کہ میں اکیلی اتنے کام نہیں سنبھال سکتی اور آؤٹ ڈور کتنے ہی کام ہیں جو تمہاری وجہ سے التوا کا شکار ہیں اور تم ہو کہ دبئی کی سیروں میں گم ہو۔" انہوں نے اسے ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"آپا! آپ پریشان نہ ہوں بس میرا کام جیسے ہی ختم ہوگا میں آجاؤں گا اور آؤٹ ڈور تمام کاموں کی ذمہ داری میں جمال صاحب کو دے کر آیا تھا۔ وہ کر تو رہے ہیں۔" بختیار نے الجھن بھرے انداز میں کہا کہ تقریباً روز ہی وہ جمال صاحب سے تمام تفصیلات معلوم کررہا تھا اور سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔

"وہ ملازم ہیں بختیار! ملازم میں اور تم میں فرق ہے۔ تم جانتے ہو میں ملازموں پر اعتماد نہیں کرتی۔" انہوں نے قطعیت بھرے انداز میں اسے ٹوکا۔

"اچھا تو وہ ماہی بھی تو ملازم ہے اس پر تو آپ کو بڑا بھروسہ ہے۔" اسے شرارت سوجھی تھی۔

"اس کو تم چھوڑو۔ جس پرندے کے پر ہی نہ ہوں وہ اڑان نہیں بھر سکتا اور اس پر مالک کو اس کے اڑنے کا ڈر نہیں رہتا۔" انہوں نے ایک پرسکون سانس خارج کرتے ریلیکس ہوکر کہا۔

"کیا مطلب آپا! پرندے۔ اڑان۔ یہ انسان کے ذکر میں چرند پرند کہاں سے آگئے۔" اس نے حیرانی سے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو کان سے ہٹاتے ہوئے دیکھا کہ آپا کی آواز بے حد اجنبی لگی تھی اس پل اسے۔

"ارے چھوڑو میری جان! بس جو تمہیں کہا ہے اس پر عمل کرو اور جلد واپس آؤ۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے معصوم بھائی کو تنبیہہ کی اور دوسری طرف بختیار ابھی تک اسی دشمن جان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جس کا خیال آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ اپنا حق جتانے آجاتی تھی اور نظروں میں دبئی کے حسین نظاروں کی جگہ اس کا سادگی سے بھرپور سراپا سما گیا تھا اور پھر لمحوں میں اس کے خیالات نے اس تک کا سفر طے کرلیا۔ اور پھر سب کچھ پس منظر

ن چلا گیا' صرف بختیار خان تھا اور اس کے خیالات کی دنیا' سب کچھ بے حد صاف دکھائی دے رہا تھا اسے نا حاصل کرنا مگر شاید ابھی تک وہ یہ نہ جان سکا تھا کہ ل کی دو پٹڑیاں دور تک ساتھ تو چل سکتی ہیں مگر بھی بھی مل نہیں سکتیں۔

☆ ☆ ☆

"ذکیہ! ماہین نہیں آئی ابھی تک۔" ثریا بیگم نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اچانک گھڑی کی طرف دیکھ کر پوچھا جس کی سوئیاں اب دس کے ہندسے کو چھونے والی تھیں۔

"ارے آپا! آج کل موسم کی مناسبت کی وجہ سے شادیوں کا رجحان بڑھ جاتا ہے تو کام بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔ اسی لیے دیر سویر ہوجاتی ہے۔ بس آتی ہی ہوگی۔" ذکیہ بیگم نے جز بز ہوتے ہوئے جواب دیا کہ خاندان کے لوگ ماہین کے اس کام کو ویسے ہی پسند نہیں کرتے تھے۔

"ارے بھئی لڑکی ذات ہے۔ دھیان رکھا کرو۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو پورے خاندان کی بچیوں کا مستقبل داؤ پر لگ جائے گا۔" ثریا بیگم نے زہر میں بجھے تیر ہمدردی کی کمان میں لپیٹ کر نکالے تھے جبکہ ذکیہ نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"آپا ہم جیسے غریبوں کے پاس تربیت کا مان ہی ہوتا ہے اور مجھے اپنی بچی پر بے حد اعتماد ہے اور رہی بات خاندان کی بچیوں کی تو ان کے نصیب ان کے ساتھ ہیں۔" ذکیہ بیگم نے دو ٹوک انداز میں انہیں مزید گل افشانی سے روکا تھا۔

"بھئی ہم تو خاندان کو جوڑ کر رکھنے والے لوگ ہیں۔ کہنا ہمارا فرض تھا سو کہہ دیا۔" ثریا بیگم نے نفاست و سلیقے سے سجے اس چھوٹے سے کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"فرائض کی تو بات ہی چھوڑیے آپا! فرائض نبھانے کے تو بہت سے وقت آئے اور گئے مگر کس نے ادا کیے یہ تو اوپر والا ہی جانتا ہے۔" ذکیہ بیگم نے انہیں ماضی کے آئینے میں دھکیلا تھا۔

"اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ ماہین کی شادی کا بھی کچھ سوچا ہے یا ساری عمر اس کی کمائی کھانے کا ارادہ ہے۔" ثریا بیگم نے ایک اور زہر میں بجھا تیر کمان سے نکالا۔

"کیوں نہیں آپا! ان شاء اللہ جب کوئی مناسب بر مل گیا۔" ذکیہ بیگم نے ان کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے ممتا سے چور لہجے میں کہا اور ویسے بھی اب تو انہیں — اس کی عادت سی ہوگئی تھی۔

یہی خاندان والے تھے جب ان کے شوہر انور حسین کو ایک رات اچانک فالج کا اٹیک ہوجانے پر دیکھنے بھی نہ آئے تھے۔ انور حسین جو کہ ایک پرائیویٹ کالج میں کینٹین لگانے کے ساتھ ساتھ رات کو وہیں چوکیداری کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ اچانک بستر مرگ سے جا لگے گھر کے حالات بے حد خراب ہوگئے۔ اچھے وقتوں کا جوڑا ہوا بھی محض اتنا ہی تھا کہ بمشکل چند دن کا علاج اور ڈاکٹروں کی مہنگی فیسوں کی نذر ہوگیا۔ ایسے میں تین بچوں کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلانا بے حد مشکل ہوگیا تھا۔ ذکیہ بیگم نہ تو باہر جاکر کام کرسکتی تھیں کہ بیمار شوہر کو کون سنبھالتا اس وقت ماہین ایف اے کے پارٹ ون کی طالبہ تھی۔ مالی حالات کے پیش نظر سب بچوں کو تعلیم سے اٹھا لیا گیا۔ ماہین سے چھوٹی امبرین جو کہ ساتویں میں تھی اور پھر تیسری کا طالب علم عثمان تھا ایسے میں سب خاندان والوں کو وہ بوجھ محسوس ہونے لگے تھے۔ مالی مدد تو دور کی بات کسی نے اخلاقی جرات بھی نہ کی کہ کہیں ان کی کوئی ذمہ داری انہی پر نہ آن پڑے مگر ایک ذات موجود ہوتی ہے جو کسی کے نہ ہونے پر بھی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔

وہ جب ایک در بند کرتا ہے تو کہیں نہ کہیں کوئی روزن ضرور کھول دیتا ہے۔ اور یہ روزن مسز ریحانہ زیدی کی صورت کھلا تھا۔ ماہین کو ان کے سیلون میں نوکری ان کی مالک مکان کی بیوی کی وجہ سے مل گئی تھی جو کہ ان کی ریگولر کسٹمر تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماہین کی لگن اور محبت سے مسز زیدی بے حد متاثر

ہوئیں اور انہوں نے ماہین کے معاوضے میں معقول اضافہ کیا تھا۔ آہستہ آہستہ کاروبار زندگی پھر سے چلنے لگا اور یہی بات خاندان والوں کے لیے ناگواری کا سبب تھی۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ہم انسان کسی کے دکھ کو ختم کرتے ہوئے تو بہت بار سوچتے ہیں مگر کسی کی خوشی میں شریک ہوتے ایک بار بھی ہمیں کسی قسم کا کوئی گمان، وہم نہیں ہوتا ہمارے دل میں، جبکہ کسی کے غم کو بانٹنے کے لیے ہم ہر ہر پہلو اور زاویے سے دیکھتے ہیں کہ کہیں ہماری ذات پر کوئی حرف نہ آجائے۔

☼ ☼ ☼

"او جھلی! بول کہاں بیچا مال اور کتنے یار تھے تیرے ساتھ اس کام میں ملوث۔" لیڈی کانسٹیبل نے اس کے بالوں کو پوری طاقت سے اپنی مٹھی میں پکڑ کر کھینچا۔ درد کی شدت سے اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔

"میں نے کہا نا میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ اللہ کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔" بمشکل چند الفاظ اس کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔

"دیکھ بی بی! تو ابھی جانتی نہیں ہے کہ تجھ سے کس کس طرح منوایا جاسکتا ہے۔ تیری بھلائی اسی میں ہے کہ آرام سے مان جا اور مال برآمد کروادے۔ ورنہ تو پھر..." اس نے ڈنڈا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے اسے خوفناک صورت حال کا نقشہ کھینچا تھا۔

"تم مجھ سے قرآن اٹھوالو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس نے آخری بار اس بنت حوا سے التجا کی تھی۔

"او قرآن کو نہ بیچ میں لا بدبخت۔ یہ تو تم لوگوں کے لیے مذاق ہے۔" اس نے اس کے منہ کو ایک ہاتھ میں لے کر سختی سے کہا۔

"تو ایسے نہیں مانے گی تیرے لیے تو تھرڈ ڈگری ہی کام آئے گی۔" اس نے ایک جھٹکے سے اس کا منہ چھوڑا جس سے اس کی گردن کو شدید جھٹکا لگا اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی پلیز! ضد نہ کریں۔ مجھے جانے دیں۔ ورنہ آپا ناراض ہوجائیں گی۔" اس نے پیار سے ذکیہ بیگم کے کندھوں کے گرد اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ ماہی! خوامخواہ کی ضد مت باندھ، تو جانتی ہے میں اب کی بار اس بات کی ذرا برابر بھی کسی کو ہوا نہیں لگنے دوں گی۔ بس میں نے کہہ دیا تو نہیں جائے گی تو بس نہیں جائے گی۔" ذکیہ نے غصے سے اس کے بازو ہٹائے اور ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑی بیڈ شیٹ اس کے ہاتھوں میں تھمائی تھی۔

"امی! آپ کیوں نہیں سمجھتیں۔ میرا جانا بے حد ضروری ہے۔" اس نے بے زاری سے چادر کو بیڈ پر پھینکا۔

"میں جانتی ہوں یہ سب فرار حاصل کرنے کے بہانے ہیں۔ وہ فرار جو حالات نے ہماری وجہ سے تجھے اپنی ذات، اپنی خوشیوں سے کرنے پر مجبور کردیا ہے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ان خودغرض ماؤں میں سے نہیں جو حالات کی چکی میں اولاد کو پیس کر کسی ایک کی زندگی برباد کردیں۔" انہوں نے قطعیت بھرے لہجے میں اسے مزید بحث سے روکا۔

"مگر امی! دانی اور شاہین کی ذمہ داری ہے مجھ پر۔ میرے بعد گھر کے اخراجات کون چلائے گا۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے خفگی سے بیڈ پر منہ موڑے بیٹھی اپنی بھولی ماں کو دیکھا جو اس وقت عجیب کشمکش میں گھری بیٹھی تھیں۔

"دیکھو ماہین! جب تمہارے ابا کو فالج ہوا تو کیا ہمیں لگتا تھا کہ ہم ایک بھی دن اس زندگی کی گاڑی کو دھکیل پائیں گے۔ تین چھوٹے بچوں کے ساتھ ساتھ بیمار شوہر کا علاج معالجہ، لوگوں کی بے حسی، رشتہ داروں کے جھوٹے دلاسے، عزت، فاقے کیسے آزمائش کے دن تھے جو میرے رب نے چڑھائے بھی اور اتارے بھی۔

مگر سب دھیرے دھیرے ٹھیک ہوگیا نا۔ اسی طرح بیٹے جب تم نہیں ہوگی تب بھی اللہ کوئی اور وسیلے سے یہ کام ایسے ہی چلاتا رہے گا۔ دنیا اک بہتے سمندر کی مانند ہے۔ ماہین کسی ایک قطرے کے نکل جانے سے اس کی روانی کو کوئی فرق نہیں پڑتا، پہلے ہی تمہاری بات ہر جگہ بنتے بنتے ختم ہوجاتی ہے۔ نہ جانے کون دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے۔ کچھ خبر نہیں۔ اب تمہاری یہ بے کار کی ضد، دیکھو بچے، مجھے اور پریشان مت کرو۔" انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا کہ وہ جانتی تھیں کہ گھر کے خراب حالات نے اسے بے حد حساس بنادیا تھا۔ مگر اب وہ ہر صورت اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ اور باقی گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انہوں نے ماہین سے چھپ کر ایک دو گھروں میں کام کا بندوبست کرلیا تھا کہ اب شاہین کچھ سمجھ دار ہوگئی تھی اور انور حسین بھی کچھ بہتر تھے لہٰذا اب انہیں شدت سے ماہین کو دلہن بنے دیکھنے کا انتظار تھا۔ انہوں نے خاموشی سے چادر بدلتی ماہین پر نظریں لگائے سوچا اور دل ہی دل میں نہ جانے کتنی بار آمین کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماہی تم روؤ نہیں میری جان۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" ریحانہ بیگم نے اپنے دل میں اٹھتی مسرت و شادمانی کی لہروں کو دباتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں اسے جھوٹا دلاسا دیا۔

"آپا! سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کون شخص ہے جو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑگیا ہے اور آخر میرے ساتھ ایسا کیوں کررہا ہے؟" اس نے رندھے ہوئے لہجے میں آپا کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو ایک لمحے کو مسز ریحانہ زیدی کو اس کی جھیل سی آنکھوں میں ٹھہرے پانی نے احساس ندامت میں مبتلا کردیا مگر دوسرے ہی پل انہوں نے اپنے آپ کو کمپوز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے جانو! تمہارے لیے رشتوں کی کوئی کمی ہے۔ میں خود کسی اچھے لڑکے سے تمہاری شادی کرواؤں گی۔" انہوں نے خوشامدانہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے اور یہ دلاسا کوئی پہلی بار تھوڑی دیا تھا ماہین کو انہوں نے جہاں بھی ماہین کی بات بننے لگتی کوئی انجان شخص اس کے ہونے والے سسرال میں ماہین کے اور اپنے تعلقات اور ملاقاتوں کا حوالہ دے کر رشتہ ختم کرنے پر زور دیتا اور اس طرح لڑکے والے بدگمان ہوکر جواب دے دیتے تھے۔ اور ذکیہ بیگم کی ہر بار اس بات کو صیغہ راز رکھنے کے باوجود نہ جانے کیسے اسے پتا چل جاتا تھا۔

"تم بہت ڈسٹرب ہو۔ ایسا کرو آج تم ریسٹ کرو۔ کام باقی ورکرز کرلیں گی۔ بلکہ میں تمہارے لیے اچھی سی چائے بھجواتی ہوں۔" انہوں نے اسے ریسٹ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جانے کا کہا۔

"تھینک یو سو مچ آپا! مگر میرے خیال میں، میں گھر جاؤں گی۔ ساری رات سو نہیں سکی تو اب نیند آرہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو..." اس نے نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولا۔

"ارے میری اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ایسا ہے کہ تم تھوڑی دیر انتظار کرلو کیونکہ گاڑی ایئرپورٹ گئی ہے بختیار کو لینے، پھر ڈرائیور تمہیں ڈراپ کردے گا ٹھیک۔" چونکہ یہ ایریا ایسا تھا کہ کنوینس ملنا مشکل ہوتا تھا تو آپا نے تمام ورکرز کے لیے پک اینڈ ڈراپ سروس دی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر ریسٹ روم کی طرف بڑھ گئی جبکہ اس کی پشت پر نظریں ٹکائے ریحانہ زیدی نے ایک لمبی سانس فضا میں چھوڑی تھی۔

جس دن سے ماہین نے اچانک اپنی بات طے ہوجانے کا بتایا تھا ان کی رات کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ اس سے پہلے بات دیکھنے دکھانے پر ہی ختم کروادی جاتی تھی کہ لڑکی کا کریکٹر ہی مشکوک ظاہر کردیا جاتا تھا۔ مگر اس بار بات کچھ آگے بڑھ گئی تھی تو کارروائی بھی اتنی ہی مضبوط کرنا پڑی تھی انہیں، ماہین گزشتہ آٹھ سالوں سے ان کی ورکر تھی جسے اللہ نے قدرتی ہنر سے نوازا

تھا وہ عام سے عام لڑکی کو بھی بے حد خوبصورت بنا دینے کا قدرتی فن رکھتی تھی اور یہی بات تھی کہ ریحانہ زیدی کے پاس بے شمار ورکرز ہونے کے باوجود ان کی نظر ہمیشہ ماہین پر رہی تھی۔ وہ کسی قیمت پر اسے کھونے کا تصور نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ماہین کی سادہ لوح طبیعت کا بھرپور فائدہ اٹھاتی تھیں جو انہیں اپنا ہمدرد و غم گسار جان کر اپنا ہر دکھ سکھ ان سے کرتی تھی۔ اس روز بھی مٹھائی کھاتے ہوئے انہوں نے مبارک باد دینے کے بہانے تمام تفصیلات بمع فون نمبر اس سے حاصل کر لیا اور ہر بار کی طرح اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس نے جیسے ہی ریسٹ روم میں قدم رکھا سامنے ہی اس دشمن جاں پر نظر پڑی تھی۔ ڈارک براؤن سوٹ میں اس کی دودھیا رنگت کچھ زیادہ ہی دمک رہی تھی۔ چند آوارہ زلفوں نے چہرے کا حصار بالکل ایسے ہی کر رکھا تھا جیسے چاند کا گھیرے سیاہ بادل کرتے ہوں۔ بہت غور سے دیکھنے پر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں کے گوشے گیلے تھے جبکہ پلکیں نیند میں بھی لرز رہی تھیں جبکہ ناک حد سے زیادہ سرخ ہو رہی تھی۔ جیسے وہ بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ دروازے سے ٹیک لگائے بازو سینے پر لپیٹے نہ جانے وہ کب تک اسے نظروں میں سجائے رکھتا کہ ایک دم بے چین ہو کر اسے پکار بیٹھا۔

"ماہی۔!" اسے نیند میں اپنے نام کی سرگوشی سنائی دی تھی۔ انجانے احساس کے تحت اس نے فوراً آنکھیں کھولیں جبکہ بختیار کو اپنے صوفے کے پاس کھڑے دیکھ کر اسے شدید غصہ آیا تھا۔

"آپ..... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔" بختیار کو پہلی بار اپنی بے اختیاری پر بے حد غصہ آیا تھا کہ ماہین اس کے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔

"وہ... دراصل مجھے لگا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو اس لیے پریشان ہو کر آپ کو پکار بیٹھا۔" ایک اور بودا جواز جلدی سے اس کے منہ سے پھسلا تھا۔ اس نے خجل ہو کر اس کے غصے سے لال بھبھوکا چہرہ کو دیکھا تھا۔

"بختیار صاحب! پہلی بات تو یہ کہ آپ کو کیا الہام ہوا تھا میری طبیعت خرابی کا جو آپ سیدھے یہاں چلے آئے اور دوسری بات یہ کہ میرے خیال میں ہم میں نہ تو اتنی بے تکلفی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا رشتہ جو آپ اتنی زحمت کریں۔" اس کے کٹیلے انداز پر بے ساختہ بختیار کے لبوں پر مسکراہٹ رینگی تھی دراصل ریسٹ روم میں تو وہ کسی برائیڈل کا بھاری بھرکم سوٹ کیس اٹھانے آیا تھا کہ اس وقت پارلر میں اس کے سوا کوئی مرد ملازم موجود نہ تھا تو آپا نے اسے ہی آواز دے ڈالی جو ابھی ایئرپورٹ سے آتے ہی اوپر رہائشی پورشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی جو اب حیرانی سے اس کے نہ جانے پر اسے دیکھ رہی تھی اور پھر یکدم کچھ سوچتے وہ آگے بڑھا۔

"ماہین! اگر تم اپنے جملے کی ترتیب درست کرو تو یہ سب کچھ ممکن ہے۔" وہ بالکل اس کے پاس آکر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مدھم لہجے میں بولا جبکہ ماہین کے سانس خشک ہوئی تھی اسے اتنا قریب دیکھ کر۔ اس نے باہر جانے والے راستے کی طرف دیکھا جس پر وہ جما کھڑا تھا۔

"آپ..... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید۔ مجھے جانا ہے پلیز راستہ چھوڑیں۔" اس نے کپکپاتی آواز کو بمشکل کنٹرول کیا۔

"مجھ سے شادی کرو گی ماہین! پلیز انکار مت کرنا' میں نے بے حد طویل انتظار کیا ہے تمہیں پانے کے لیے۔" ماہین نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا مگر یہ لفظ اسے کسی اور کے لگے تھے اسی طرح انتظار کا حوالہ تو وہ شخص دیتا تھا اس کے سسرالیوں کو۔

"کیا سوچنے لگیں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں....." ابھی اس کے لفظ مکمل ادا نہ ہوئے تھے کہ وہ بل کھا کر پلٹی تھی۔

"بس بختیار صاحب! اس سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا۔" اس کے زہرخند لہجے نے بختیار کو چونکایا تھا۔

"مگر کیوں! میری طلب سچی ہے ماہین' میں آپ کو بہت پسند کرتا ہوں۔" دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی اس کی آواز محض سرسراہٹ کی مانند محسوس ہوئی تھی۔

"آپ کی طلب سچی ہو سکتی ہے مگر جو راستے آپ نے اپنائے ہیں وہ بہت گھٹیا تھے۔ آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ آپ کے ان گھٹیا ٹیلی فونز کی وجہ سے میری عزت داؤ پر لگ گئی۔" ماہین نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا کہ اسے اب تک یقین نہیں ہو رہا تھا کہ بختیار جیسا شریف النفس انسان جس نے کبھی اس پر زیادہ دیر نگاہ تک نہ ٹکائی تھی وہ ایسا کر سکتا ہے۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کون سے فون' اور کس نے کیے..... کہاں؟" بختیار جو ماہی کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈیز سے ناواقف تھا اس وقت شدید الجھن کا شکار ہونے لگا تھا۔

"آخر مجھ سے شادی میں حرج کیا ہے۔" اس نے تمام باتوں کو پس پشت ڈال کر دو ٹوک انداز میں اس کا فیصلہ جاننا چاہا تھا۔

"اس میں حرج ہے۔ میں لوگوں کے شک کو یقین میں نہیں بدلنا چاہتی آج جو بات ان کے دل میں پنپ رہی ہے' میں خود اس کو زبان زدعام بنا دوں' ہرگز نہیں اور اب تو ایسا بالکل بھی نہیں ہو گا۔" اس نے قطعیت بھرے انداز میں کہتے ہوئے جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے مگر وہ راستے سے ہٹا نہ تھا۔

"ماہین! تم غلط....." اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرتا دروازے کی اوٹ میں چھپی ریحانہ زیدی تیزی سے آگے بڑھیں۔

"ارے بخت! لے بھی آؤ سوٹ کیس..... اور ماہین تم گئی نہیں' اوہو میں ہی پیغام بھجوانا بھول گئی تھی ڈرائیور آگیا ہے' تم چلی جاؤ۔" انہوں نے مصروفیت بھرے انداز میں دونوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے نارمل انداز میں کہا جبکہ ماہین نے ان کے آنے پر شکر ادا کیا تھا۔ اور جلدی سے آگے بڑھی۔ پاس سے گزرتے ہوئے لاشعوری طور پر اس کی نگاہ دروازے کے پاس کھڑے بختیار سے ملی ——— کیا کچھ نہ تھا ان نگاہوں میں' الجھن' کچھ کھو دینے کا دکھ گہری اداسی لمحہ بھر میں اس کے دل کو ملامت ہوئی تھی مگر وہ نظر انداز کرتی تیزی سے گزر گئی۔ دو گہری الجھن بھری نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا کروں آخر ایسا... معاملہ ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔" انہوں نے پریشانی سے پیشانی کو مسلا تھا۔ جبکہ پاس بیٹھی موبائل پر چیٹ کرتی پنکی نے ذرا کی ذرا ان کی طرف دیکھا۔

"او مما! آپ کیوں اتنی ٹینشن لیتی ہیں۔ بخت ماموں کو ٹالتی رہیں کہ آپ خود بات کریں گی یا پھر انہیں آؤٹ ڈور کاموں میں زیادہ الجھا دیں' سمپل۔" پنکی نے لیمن جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔

"اتنے عرصے سے یہ ہی تو کر رہی تھی مگر کل آتے ہی بخت کا سامنا ہو گیا ماہی سے' اور اس نے خود بات کر ڈالی وہ تو بھلا ہو اس کم عقل کا جو بات آگے نہ بڑھ سکی ورنہ تو....." مسز زیدی نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے اپنی نرم و نازک پری پیکر بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا جو ان کا کل اثاثہ تھی۔

"میڈم! برائیڈل کیسی لگ رہی ہے؟" پنکی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ اتنے میں پارلر میں تیار کی ایک برائیڈل کو ان کی ورکر ثنا نے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"جیسا منہ ہے ویسا ہی لگنا ہے نا اب میک اپ کوئی جادو تو نہیں ہے' ہونہہ۔" پنکی جو بے حد منہ پھٹ اور بدلحاظ تھی طنزاً گویا ہوئی جبکہ اس کی بات پر معصوم سی برائیڈل کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی کہ اس دن ہر

کوئی بے حد نرم جذبات رکھتا ہے۔

"پنکی! خاموش رہو، ٹھیک ہے نا، ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہے اور بیٹے آپ درود شریف پڑھو اور اچھا اچھا سوچو۔" مسز زیدی جو پنکی کے اس نخوت بھرے انداز سے سخت نالاں تھیں، جلدی سے بات سنبھالتے ہوئے بولیں کہ پہلے ہی پنکی کی وجہ سے کافی کسٹمرز خراب ہو چکے تھے۔

"مما! ایک اور بات آئی ہے ذہن میں، فنٹاسٹک آئیڈیا ہے، بس تھوڑا سا رسکی ہے۔" ان دونوں کے جانے کے بعد پنکی عجیب سے انداز میں بولی۔ مسز زیدی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پنکی ان کے کان کے پاس آ کچھ کہنے لگی۔ جسے سن کر مسز زیدی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھیے میم! سب ٹھیک ہے، میں بس فائنل ٹچ دے کر آؤٹ لیٹ مکمل کر دوں۔" ماہین نے جلدی سے بلش آن کا ٹچ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! سب ٹھیک ہے۔" برائیڈل نے ہرا ینگل سے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر او کے کیا تھا۔

"او کے میم! آپ یہ جوس لیں، میں وارڈ روب سے آپ کا دوپٹہ، جوتے اور زیور نکال کر لاتی ہوں۔" اس نے روم ریفریجریٹر سے اورنج جوس گلاس میں نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور خود پارلر میں ہی بنی الماریوں کی طرف بڑھی تھی۔ آج ویسے بھی باقی تمام ورکرز آف تھیں اور مسز زیدی کو بھی ایک فنکشن میں جانا تھا لہٰذا ماہین اکیلی ہی تھی سو وہ جلدی سے کام ختم کرنا چاہتی تھی۔

"میم! کیا آپ زیور نہیں لائیں۔" ماہین نے جوتے، چوڑیاں اور دوپٹہ صوفے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے! یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے خود تین ڈبے الماری میں رکھے تھے، تم ٹھیک طرح سے دیکھو۔" ماہین کے کہنے پر وہ یکدم چیئر سے کھڑی ہوتے ہوئے اس پر چلائی تھی۔

"میم! الماری میں اور کچھ بھی نہیں ہے، آپ خود دیکھ لیں بے شک۔" ماہین کے ہاتھ پاؤں اس کے چلانے پر پھولنے لگے تھے۔ اس نے فق رنگ کے ساتھ بوکھلاتے ہوئے کہا۔ وہ اسے لیے خود الماری تک چلی آئی۔

"کہاں جا سکتا ہے زیور، آخر تمہارے علاوہ تو یہاں کوئی نہیں آیا۔" برائیڈل نے الماری کھنگالتے ہوئے اسے جھڑکا تھا اور پھر ہاتھ میں پکڑے موبائل پر تیزی سے بٹن پریس کرنے لگی۔ جبکہ ماہین کو انجانے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے اپنے پورے بدن میں چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آپا پلیز! پلیز میری مدد کریں، آپ تو جانتی ہیں نا اپنی ماہی کو میں ایسی نہیں ہوں، آپ کچھ بولتی کیوں نہیں ہیں، خاموش کیوں ہیں۔ آپا پلیز کچھ بولیں۔" آنا" فانا" ایک جم غفیر تھا جو طرح طرح کی بولیاں بول رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی مسز ریحانہ زیدی کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"دیکھو بی بی! حالات اور واقعات کا جائزہ لیا جائے تو بات بالکل صاف اور واضح ہے، اب تم سیدھی طرح سے یہیں اس چار دیواری میں بات ختم کر لو اور ان کے بارہ تولے زیورات بتا دو کہاں ہیں۔" وقوعہ کے لیے بلائے گئے انسپکٹر نے آرام سے چائے کا کپ ٹیبل سے اٹھایا تھا جبکہ ماہین کی نگاہیں ابھی بھی مسز زیدی پر ٹکی تھیں۔

"انسپکٹر صاحب! مجھے نہیں لگتا یہ ایسے آرام سے مانے گی۔" دلہن جا چکی تھی جبکہ اس کے کچھ رشتہ دار جائے وقوعہ پر موجود تھے انہی میں سے ایک نے دانت چباتے ہوئے سنگدلی سے کہا۔

"ارے ہم تو صرف مسز زیدی کی وجہ سے اس دو ٹکے کی لڑکی سے آرام سے بات کر رہے ہیں کہ بات پارلر کی ریپوٹیشن کی ہے۔ ارے اس سے اگلوانا تو رے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔" انسپکٹر نے ایک نرم تفاخر سے گردن اکڑائے بیٹھی مسز ریحانہ زیدی پر ڈالا جبکہ اگلے ہی لمحے وہ نظر جب ماہین پر اٹھی تھی تو تھراں سی سختی اور حیوان کی سی سفاکی لیے ہوئے تھی۔ اس کے پورے بدن میں ارتعاش سا پیدا ہوا اور پھر سب کچھ پس منظر میں جانے لگا۔ چکرائی نظروں کے ساتھ کچھ ہی لمحوں میں وہ فرش پر ڈھے سی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر دفعہ 390 کے تحت اس پر چوری کا مقدمہ دائر ہوا تھا۔ نہ جانے کیسے اماں کو اطلاع ملی تھی اور وہ دانی کے ساتھ فوراً" تھانے چلی آئی تھیں۔ وقت کے چکر... میں ایک اور مظلوم گھرانہ پھنس چکا تھا۔ سلاخوں کے پیچھے اپنی معصوم بچی کو دیکھ کر ان کا دل آگ کے الاؤ میں جلا تھا۔

انہیں اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے اور یقین تو ماہین کو بھی نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر کے سانپ نے کہاں کہاں ڈسا تھا۔ ایسے پیچیدہ حالات میں اسے آپا بیگم کی خاموشی بے حد پریشان کر گئی۔ اور وہ جو محبت کا دعوے دار تھا اس نے بھی پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ اماں سے جتنی دوڑ دھوپ ہو سکتی تھی وہ کر رہی تھیں مگر خاندان والے تو پہلے ہی موقع کی تاک میں تھے۔ اور اب تو ان کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ اماں کی جتنی جمع پونجی تھی وہ کچھ ہی دنوں میں تھانے داری اور اس کے عملے کی چائے پانی میں ختم ہو گئی تھی۔ عدالت نے دفعہ 390 کے تحت اسے پانچ سال قید کا حکم سنایا تھا۔ جس روز اسے سزا ہوئی یہ اس سے دوسرے روز کی صبح تھی جب جیل میں منتقل کیے جانے کے بعد پہلی بار اس کی ملاقات آئی تھی۔ وہ اماں کا سوچ کر چلی آئی۔ مگر وہاں آپا کو دیکھ کر حیرانی سے آگے بڑھی۔

"آپا! آپ... دیکھیں آپا میرے ساتھ کیا ہو گیا۔" آپا یعنی مسز زیدی کو ہمیشہ ہی اس نے اپنے سب سے زیادہ قریب پایا تھا اور اب بھی انہیں دیکھتے ہی ضبط کھو بیٹھی تھی۔

"ارے میری جان! میں آ گئی ہوں نا، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے لوہے کی باریک جالی دار سوراخوں سے دیکھتے ہوئے اسے دلاسا دیا تھا۔

"مگر کیسے آپا! کیسے ہو گا یہ سب۔" اس نے دھندلائی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

"دیکھو جانی! میں کچھ کرتی ہوں، بس تم فکر مت کرو۔ میں پھر آؤں گی۔" مسز زیدی نے اسے پچکارتے ہوئے کہا اور وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

نہ ہی راستوں کی خبر مجھے
نہ ہی منزلیں میری قرار گاہ
میں اس جہان کا باسی ہوں
نہ وصال جہاں نہ ہجر کا ہو شائبہ
تیری یاد کو تھامے کسی بچے کی مانند
نہ سفر میں ہوں نہ مسافت کا ہے خاتمہ

تھانے میں گزارے دن اس پر بے شمار تلخ حقیقتوں کو آشکار کر گئے تھے۔ یہاں پر قتل کے مقدمے سے زیادہ چوری کے مقدمے میں دلچسپی لی جاتی تھی۔ کیونکہ اس طرح کے مقدموں میں پولیس والے دونوں طرف سے مال حرام لوٹتے تھے۔ جو پارٹی مضبوط ہوتی وہ اتنا ہی ان کا منہ بھر کر اپنا الو سیدھا کرتی۔ مجبوراً" دوسری پارٹی بھی کچھ نہ کچھ اپنی حیثیت کے برابر ان کی خاطر تواضع کرتی۔ مگر جیل میں منتقل ہو جانے پر ماہین کے لیے کچھ آسانیاں ہو گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ ان حالات کی عادی ہونے لگی۔ جیسے پرندہ قید سے مانوس ہونے لگتا ہے اسی دوران ریحانہ زیدی پھر سے ملنے آئیں۔

"دیکھو ماہی! میں مدعیوں کو بارہا صلح پر آمادہ کرنے کی کوشش کر چکی ہوں مگر وہ نقصان پورا ہوئے بغیر تمہیں کسی صورت رہا نہیں ہونے دیں گے۔" مسز زیدی نے بے حد پریشان انداز میں کہا تھا۔

"مگر آپا! آپ تو جانتی ہیں کہ ہماری مالی حالت کیسی ہے، ہم کہاں سے اتنے روپے..." بے اختیار اس کے

آنسو بہنے لگے۔

"دیکھو جانی! حقیقت پسندی سے سوچو اب کس کے پاس لاکھوں کی رقم ہے، جو تمہیں بچانے کے لیے انہیں دے اور پھر اتنی بڑی رقم قرض کی صورت میں کون دیتا ہے۔ اب ایک ہی راستہ ہے اگر تم کہو تو بتاؤں۔" مسز زیدی نے کیوٹکس لگے اپنے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے پراسرار سے انداز میں کہا۔

"کون سا راستہ آپا؟" اس نے جلدی سے پوچھا تھا۔

"تم یہ کاغذات پڑھ لو ان پر سب درج ہے اور پھر دل مانے تو سائن کر دینا۔" انہوں نے چھوٹے سے کھڑکی نما ہول سے کاغذات کا فولڈر اسے پہنچایا تھا جسے تذبذب کے عالم میں اس نے پکڑا تھا۔

"مگر آپا یہ ہے کیا؟" اس نے کاغذات کو کھول کر پڑھنے سے پہلے ان کی طرف دیکھا جس پر انہوں نے خاموش نگاہوں سے اسے پڑھنے کا اشارہ کیا اور پڑھتے پڑھتے اس کے ہاتھ سرد ہونے لگے تھے۔ یکدم اماں کا خوشی سے بھرپور چہرہ آنکھوں میں ابھرا تھا وہ کیسے ان کی تمناؤں کا گلا گھونٹ سکتی تھی۔ اور ابا کی ملتجی نگاہیں جو وہ ہر بار اس کے انکار پر اپنے اوپر اٹھتے محسوس کرتی تھی مگر وہ ان سب باتوں کے باوجود یہ کیسے بھول سکتی تھی کہ وہ اپنے گھر کی واحد کفیل تھی۔ اس نے بے دردی سے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا تھا اور کسی فیصلے پر پہنچتے آپا کی طرف دیکھا۔

"ملاقات کا وقت ختم ہونے والا ہے بی بی۔۔۔ جلدی کرو۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی بھاری بھرکم کالے لباس میں ملبوس کرخت عورت اندر داخل ہوئی جبکہ ریحانہ زیدی کا ہاتھ فوراً" اپنے پرس میں گیا تھا اور کچھ ہی پل میں اس ہاتھ کی گرمی بھاری بھرکم عورت کے ہاتھ کو گرما گئی تھی اور وہ چپ چاپ واپس چلی گئی۔

"ٹھیک ہے آپا! مجھے منظور ہے۔ لائیے میں سائن کروں۔" اس کے جاتے ہی ماہی بولی جبکہ ریحانہ زیدی نے جلدی سے قلم اس کی طرف بڑھا دیا۔

سائن کرنے سے پہلے ماہی کے کانوں میں کسی اور کے الفاظ بھی گونجے تھے۔

"یاد رکھنا ماہی! میں صرف تمہارا ہوں۔ اور تمہارا انتظار ہمیشہ کروں گا" اور وہ دن دور نہیں جب محبت فاتح ٹھہرے گی۔" ماہین کی آنکھوں سے ماضی کا دکھ آنسو بن کر بہنے لگا اور "اب وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" اس نے تلخی سے سوچا تھا کہ وہ تو اپنی ذات ہی گروی رکھ چکی تھی۔ اس نے خاموشی سے سائن کر کے پیپرز ریحانہ زیدی کو تھمائے تھے اور کوئی اس لمحے اگر مسز زیدی کو دیکھ لیتا تو شاید . . .

☆ ☆ ☆

"آپا۔۔۔ کہاں ہیں بھئی؟" لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس نے آوازیں دی تھیں۔

"کیا ہوا ماما جانی۔" پنکی سیلولیس شرٹ اور کیپری پہنے کمرے سے برآمد ہوئی تھی جبکہ اس کا حلیہ دیکھ کر بختیار نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپا کہاں ہیں؟" اس نے مختصراً" کہا تھا۔

"ابھی آئی ہیں۔ اپنے کمرے میں ہی ہوں گی' ویسے ماما جانی برے تو ہم بھی نہیں' دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کریں۔" پنکی نے اک ادا سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے مزید تپایا۔ جب سے وہ تنہا کراچی رہ کر آئی تھی اپنے کورسز کے سلسلے میں اس کے ڈھنگ بے حد واہیات ہو چکے تھے اور اس بات پر کئی بار بختاور کی اپنی بہن سے بحث ہو چکی تھی مگر وہ اکلوتی اولاد کے لیے کچھ بھی سننے پر آمادہ نہ تھیں۔ وہ اس کو اگنور کرتا ان کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

"آپا! آپ کے ٹکٹس کروا دیے ہیں' مجھے جلدی ہے میں بیڈ کے سائیڈ پر رکھ رہا ہوں۔ آپ سنبھال لیجیے گا۔" واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی جبکہ بختاور کو ایک بہت ضروری کام تھا جس کے باعث وہ عجلت میں کاغذات رکھ کر پلٹنے ہی والا تھا جب ایک اسٹامپ پیپر پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اس نے اٹھا کر سرسری سا جائزہ لینا چاہا مگر دوسرے ہی پل اسے اپنے

پاؤں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔

"آپ اس حد تک گر سکتی ہیں مسز ریحانہ زیدی۔" کاغذ کو مٹھیوں میں بھینچتے اس نے غصے سے کھولتے ذہن سے سوچا مگر یہ وقت جوش دکھانے کا نہیں ہوش سے کام لینے کا تھا۔ اس نے چپ چاپ کاغذ کو ویسے ہی تہہ کیا تھا اور اسی جگہ پر رکھ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ارے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ راتوں رات امیری کا سوچنے والی لڑکیاں اپنے ساتھ ساتھ خاندان کا بھی بیڑہ غرق کر دیتی ہیں' اب دیکھ لو ذکیہ کیا کچھ نہیں سننے کو مل رہا ہمیں برادری والوں سے' ارے تم تو یہاں دبک کر بیٹھی ہو ذرا کہیں نکلو تو پتا چلے۔" ثریا بیگم نے جھوٹے آنسو بہاتے ہوئے اپنے ساتھ آئی دو اور خواتین جو کہ ان کی دور پرے کی ہی رشتے دار تھیں ان کی طرف تائیدی انداز میں دیکھا۔

"لو اور نہیں تو کیا' ہماری تو بچیوں کا سسرال میں جینا حرام ہو کر رہ گیا ہے' ایسے ایسے طنز کر رہے ہیں لوگ کہ لکھ کر زمین پر پھینکو تو وہ بھی آگ بن جائے۔" زاہدہ جو کبھی اچھے وقتوں میں بھی ان کے گھر نہ آئی تھی۔ ان کی ساس کی نند کی بیٹی تھی مگر اب خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی ذکیہ بیگم کو ایسے باتیں سنا رہی تھی گویا سب سے زیادہ سگی وہ ہی ہے اور اسے ہی بدنامی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جس دن سے ماہین کے ساتھ یہ حادثہ ہوا تھا نہ جانے کس طرح خاندان بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی اور اسی دن سے ذکیہ بیگم کو دو دھاری تلوار پر سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی ہمدردی کی آڑ میں یہ جتانے چلا آتا تھا کہ خبر اس تک پہنچ چکی ہے۔

"اچھا بھئی! ہم چلیں۔ اللہ تمہاری مشکل آسان کرے۔" کچھ دیر بعد وہ تینوں جانے کے لیے اٹھی تھیں۔ ذکیہ بیگم چپ چاپ انہیں دروازے تک رخصت کرنے آئیں' ابھی وہ دروازہ بند کر کے پلٹی ہی تھیں کہ دوبارہ دستک ہوئی تھی۔

"یا اللہ! اب پھر کوئی۔ تیروں کی بوچھاڑ کرنے چلا آیا۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں ہے' مجھے اتنا نہ آزما۔" ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر دستک تھی کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ بجھے دل سے انہوں نے دروازے کی کنڈی گرائی۔

"آپ کون؟" سامنے ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر انہوں نے حیرانی سے پوچھا کہ دل تو ہر لمحے سوکھے پتے کی طرح کانپتا رہتا تھا۔

"آنٹی میں۔۔۔ بختاور ہوں مسز زیدی کا بھائی۔" سامنے کھڑے لڑکے نے تذبذب اور ہچکچاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ذکیہ بیگم نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج سے ٹھیک دو دن بعد اسے رہا کر دیا جانا تھا۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کر ڈھلتی شام کے اداس سورج کو دیکھا۔ ریحانہ آپا نے ہرجانے کی تمام رقم مدعیوں کو عدالت کے ذریعے بھر دی تھی اور یوں انہوں نے رقم کے عوض اس کو خرید لیا تھا۔ ایک قید سے نکل کر ایک اور قید میں جانا تھا۔ اس نے کرب سے آنکھیں موندی تھیں مگر ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں بہت زور سے چبھی تھیں۔ اماں ان تین مہینوں میں روز ملنے آتی تھیں۔ مگر کچھ عرصے سے اس نے نوٹ کیا تھا کہ ان کی بجھی آنکھوں میں چمک سی ابھرنے لگی تھی۔ ایسی چمک جو کسی کے امید دلانے سے انسان میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس نے اس تبدیلی کو اپنی رہائی اور ریحانہ بیگم کی فیاضی سے منسلک کیا تھا اور پھر وہ گھڑی بھی آ گئی جب وہ رہا ہو کر جیل کی تاریکی سے دنیا کی روشنی میں واپس آئی تھی۔

تین مہینے پہلے اس کی زندگی کو تاریکیوں میں دھکیلا گیا تھا اور اب اس کی ذات کو تاریک روشنیوں میں دھکیلا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ارے پنکی! بیٹا جلدی کرو' ہمیں فلائٹ کے ٹائم تک وہاں ہر صورت پہنچنا ہے۔" مسز ریحانہ زیدی نے ———— سینڈل پہنتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر سامنے آئینے میں اپنے مرمریں سراپے کو دیکھتی پنکی کو ٹوکا تھا۔

"ممما! فلائٹ میں ابھی پون گھنٹہ باقی ہے۔ ہمیں کوئی ایک شہر سے دوسرے شہر تھوڑی ہی جانا ہے فلائٹ پکڑنے۔" پنکی نے بریسلٹ اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ شاپنگ کے لیے دبئی جارہی تھیں۔ آج ان کے لیے دوہری خوشی تھی۔ ایک تو مسز زیدی ہر بار کی طرح اپنے سودے میں کسی کی زندگی جیت چکی تھیں اور دوسری طرف دبئی میں بختاور کے ساتھ مل کر وہاں ایک سیلون کی اوپننگ کرچکی تھیں۔ ماہین کی رہائی سے انہیں دلی تسکین حاصل ہوچکی تھی اور اسی لیے انہوں نے دبئی وزٹ کا پروگرام بنالیا تھا' اور اب وہ اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کررہی تھیں۔ گاڑی ایئرپورٹ کی طرف رواں دواں تھی۔

☆ ☆ ☆

"اماں!" اس نے جیسے ہی جیل کے آہنی گیٹ کو پار کیا۔ دو پیار بھرے بازوؤں میں اپنے آپ کو چھپالیا تھا۔

"میری بچی! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ شکر ہے میرے مولا کا کہ تو آزاد ہوگئی۔" اماں نے اپنی ممتا بھری آغوش میں لیے اسے دلاسا دیا تھا۔ جس پر وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔

"اماں! میں آزاد نہیں ہوئی اماں' صرف میرا قفس بدل دیا گیا ہے۔" اس نے ہچکیوں میں روتے ہوئے اپنی معصوم تمنائیں دل میں لیے کھڑی ذکیہ بیگم کو کہا۔

"تو کیا کہہ رہی ہے ماہی۔" انہوں نے حیرانی سے بے تحاشا روتی ماہین کو دیکھا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں۔" اور پھر وہ مختصراً راستے میں اماں کو ان کی شرائط اور معاہدے کے بارے میں بتانے لگی۔ جس کو ذکیہ بیگم خاموشی سے سنتی رہیں ———— اتنے میں ———— گھر آگیا تھا۔ دستک دینے پر دانی نے دروازہ کھولا تھا اور پھر شاہین اور دانی دونوں اس سے لپٹ کر رونے لگے۔ نہ جانے وہ لوگ کتنی دیر دہلیز پر کھڑے روتے رہتے جب اچانک شاہین نے آنسو صاف کرکے پیچھے ہٹتے ہوئے اسے کسی مہمان کی آمد کا بتایا تھا۔

"آپی! اوپر آپ کے کوئی مہمان آئے ہیں اور بہت دیر سے آپ کا انتظار کررہے ہیں۔"

"میرے مہمان! مگر کون...؟" اس نے حیرانی سے اماں کی طرف دیکھا تھا۔

"تم خود جاکر دیکھ لو۔ ہوسکتا ہے کوئی پارلر سے تمہاری رہائی کا سن کر ملنے آیا ہو۔" اماں نے ہونٹوں پر آئے تبسم کو روکتے ہوئے انجان پن سے کہا اور وہ کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

"آپ..." اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا سامنے کرسی پر براجمان شخصیت کو دیکھ کر بری طرح چونکی تھی۔

"کیسی ہیں ماہی آپ؟" بختاور نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آپ لوگوں کے جال میں پھنسے پنچھی کیسے ہوسکتے ہیں بختاور صاحب۔" اس نے شعلہ بار نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمیشہ مجھ سے اتنی بدگمان کیوں رہتی ہیں ماہی۔" وہ اس کے بالکل قریب آتے ہوئے کہا۔

"دوسری کی زندگیوں کو گروی رکھنے والے' ان کی عزتوں کو پیروں تلے روندنے والے لوگ کیسے اپنے بارے میں خوش گمان ہوسکتے ہیں کہ لوگ ان کے بارے میں اچھا سوچیں۔" اس نے طنزاً" مسکراتے ہوئے کٹیلے لہجے میں کہا تھا۔

"تم حقیقت سے بے خبر ہو۔ اس لیے اتنا کڑوا سوچ رہی ہو۔ میں نے کبھی بھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ بعض اوقات ہم اپنی فہم سے ہی حالات کا ذمہ کسی ایک فرد پر ڈال دیتے ہیں جبکہ..."

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے آپ بے خبر ہیں یا پھر بے قصور' پہلے میری شادی میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور اب میرے ساتھ اس گزرے سانحے میں آپ کا کوئی کردار نہیں ہے نا۔" اس نے اطمینان سے بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے اسے دوٹوک انداز میں لتاڑا تھا۔

"کردار ہے مگر نگیٹو نہیں بلکہ پوزیٹو۔" بختاور نے مسکراتے ہوئے اسے حیران کرنا چاہا۔

"کیا مطلب۔" ماہین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ ہے مس ماہین انور کہ آپ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ مسز ریحانہ زیدی نے کیا تھا۔" بختاور کے الفاظ ماہین پر قیامت بن کر ٹوٹے تھے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا! وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔" اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا تھا۔ اور پھر بختاور دھیرے دھیرے اسے بتانے لگا کہ کس طرح آپا اس کے لیے آنے والے رشتوں کو ناکام بنواتی رہیں اور اس کے لیے انہوں نے پارلر کے ہی ملازموں کا استعمال کیا اور پھر اچانک جب انہوں نے بختاور کا رجحان اس کی طرف بڑھتے دیکھا تو انہیں اس بار معاملہ بے حد نازک لگا کیونکہ اس بار مدمقابل کوئی اور نہیں بلکہ ان کا اپنا لاڈلا بھائی تھا۔ جس کو وہ کبھی بھی کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ بختاور انہیں بتا چکا تھا کہ دبئی والے سیلون کو وہ اور ماہین کنٹرول کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ماہین کو بھی اپنے پاس رکھنا تھا اور بختاور کو بھی اس سے دور کرنا تھا جس کے لیے انہیں پنکی کے بتائے منصوبے پر عمل کرکے ماہین کو بختاور کی نظروں میں گرانا تھا اور ماہین کو مالی طور پر پریشرائز کرکے اپنے پاس رکھنا تھا۔ مگر قسمت کا بھید ابھی ان پر بھی آشکار نہیں ہوا تھا اور اچانک بختاور نے پنکی اور ان کی تمام باتیں سن لیں اور اس طرح بختاور نے ایک اور چال چلی۔

"مگر آپا نے مجھ سے اسٹامپ پیپر پر سائن کروائے ہیں اور اب میں ساری زندگی کے لیے ان کے معاہدے کی پابند ہوں ورنہ قانونی کارروائی ہوگی خلاف ورزی کی صورت میں۔" ماہین نے خوف سے لڑکھڑاتی آواز میں سامنے بیٹھے بختاور کو دیکھا۔

"ان کاغذات کی بات کر رہی ہو۔" اچانک اپنے کوٹ کی جیب سے اس نے ایک کاغذ نکال کر لہرایا۔

"ارے! یہ آپ کے پاس کیسے؟" ماہین نے جھپٹ کر وہ پیپر اس سے لیا تھا۔

"یہ چال میں نے چلی تھی۔" بختاور نے اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کو ایک بار پھر حیران کیا۔

"آپ نے... مگر کیوں؟" وہ یکدم کھڑی ہوئی۔ شک کے ناگ پھر سے سر اٹھانے لگے تھے۔

"اس لیے کیونکہ میں چور سے ہی پیسے نکلوانا چاہتا تھا۔" ابھی اس کی بات جاری تھی کہ سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر انجان نمبر کو دیکھا تھا۔

"ہیلو!" بختاور نے یس کرکے فون کان سے لگایا۔

"جی بختاور زیدی بات کر رہا ہوں کیا... مگر کیسے؟" لمحے بھر میں بختاور کے چہرے پر پریشانی نے گھیراؤ کیا تھا۔ ماہین بھی الجھن سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا بختاور' سب ٹھیک تو ہے۔" تیزی سے اٹھتے بختاور کو دیکھ کر وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"ماہی! پنکی اور آپا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ مجھے فوراً" لاہور جانا ہے۔" ان کی آواز سن کر ذکیہ بھی چلی آئی۔ بختاور نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے۔

"بختاور! مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔ پلیز مجھے بھی لے چلیں۔" ماہین کی آواز پر اس کے قدم رکے تھے۔ اس نے الجھن سے اسے اور پھر ذکیہ بیگم کو دیکھا۔

"اوکے! چلو۔" اور پھر ان دونوں نے تیزی سے ایک ساتھ بیرونی دروازے کی سمت قدم بڑھائے تھے جبکہ ذکیہ کے ساتھ ساتھ برآمدے میں چارپائی پر لیٹے انور حسین نے بھی ان دونوں کی سلامتی کی دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہر دن کا انت رات ہے اور ہر عروج کو زوال۔

انسان اس دنیا میں بے حد اختیارات رکھنے کے باوجود بالکل خود مختار نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ بہت دیر کر دیتا ہے۔ ایسا ہی حال ان فرعونی سوچ رکھنے والے مسز زیدی جیسے لوگوں کا بھی ہے۔ جو کسی کی زندگیوں کا سودا اشرفیوں کے برابر تول کر سمجھتے ہیں کہ وہ حاکم اعلا ہیں۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی زندگی بھی ان کی پیدائش کے ساتھ ہی اللہ کے ہاں گروی ہوتی ہے۔ جسے جب چاہے وہ چھین سکتا ہے۔ ماہین جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں تھیں جنہیں مسز ریحانہ زیدی جیسی شیر کی کھال پہنے بھیڑیں اپنے اندر نگل چکی تھیں۔ مگر درحقیقت وہ خود اپنی زندگی میں اگلے پل کے بارے میں نہیں جانتیں۔

شاندار گاڑی ایئرپورٹ کی جانب رواں دواں تھی کہ اچانک بریک فیل ہونے کی وجہ سے سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکرا گئی جس میں ریحانہ زیدی کی بیک بون بری طرح متاثر ہوئی تھی جبکہ ان کی خوبصورت بیٹی پنکی اپنے پیروں کو کھو چکی تھی۔ مسز زیدی اپنا غم بھلائے اپنی بیٹی کی خوبصورتی میں پڑ جانے والے رنج کو دیکھ کر۔ پاگل پن میں مبتلا ہونے لگی تھیں۔

"نہیں ایسا کیسے ہو سکتا' پنکی میری بچی' نہیں نہیں میری بیٹی اتنی خوبصورت ہے وہ معذور نہیں ہو سکتی۔ یہ معذوری' محتاجی تو غریبوں کی بیماریاں ہیں۔ نہیں پیسے سے سب کچھ ممکن ہے۔ سب کچھ ہے نا بختاور۔" اسپتال کے بیڈ پر لیٹے اچانک انہیں پھر سے دورہ پڑا تھا۔ ماہین جلدی سے باہر نرس کو بلانے دوڑی تھی جبکہ بختاور نے ان کے سر کو پیار سے سہلایا تھا کہ کچھ بھی تھا وہ اس کی ماں جائی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے نیند کے زیر اثر آچکی تھیں۔ بختاور' ماہین کو دیکھنے باہر آیا تھا۔

"ماہین!" ستون سے ٹیک لگا کر بے آواز روتی ماہین کے کندھے پر ہاتھ رکھ اسے پکارا۔

"کاش! انسان کو اس کے کیے کی سزا اس دنیا میں نہ ملتی۔ کتنا اذیت ناک ہوگا نا یہ سب آپا کے لیے۔" اس نے روتے ہوئے پلٹ کر بختاور کو دیکھا۔

"انسان جو فصل بوتا ہے وہ ہی کاٹتا ہے۔ اگر یہاں نہیں تو آگے جاکر۔ مگر دنیا میں یہ اس لیے کاٹتا ہے کہ آگے چل کر کچھ آسانی ہو جائے اس کے لیے۔ یہ بھی ہمارے رب کی محبت کا ایک رخ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگلی سزا بے حد کٹھن ہے۔ مگر خیر۔ تم اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔ اور مجھے ایک بات بتاؤ۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے صبیح چہرے سے آنسو پونچھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا بات۔" اس نے بھیگی پلکیں یکدم اٹھاتے ہوئے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"کیا تم اب بھی مجھ سے بدگمان ہو۔" آنکھوں میں شرارت بھرے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔" ماہین نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب! کیا تم ابھی تک..." اب کے حیران کرنے کی باری اس کی تھی۔

"ہاں۔ کیونکہ ابھی تک وہ اسٹامپ پیپر موجود ہے آپ کے پاس۔" اس نے دوبارہ ستون سے ٹیک لگا کر اسپتال کے گراؤنڈ میں بیٹھے لوگوں پر نظر ٹکاتے کہا۔

"وہ... اچھا لیکن بھئی وہ تو میں نہیں پھاڑوں گا۔ اب کیا پتا کب ماہین صاحبہ ہم سے شادی کے بعد بھی بدگمان ہو جائیں اور چھوڑنے کا فیصلہ کرنے لگیں تو کم از کم کوئی تو ثبوت ہوگا نا ہمارے پاس۔" بختاور اس کے بالکل قریب آکر کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"نہیں بختاور کی ماہین ایسی نہیں۔" ماہین نے سر جھکائے لرزتی پلکوں کی جھالر گراتے بے حد جھجک کر کہا۔ جبکہ اس کے لرزتے ہونٹوں اور پلکوں نے بختاور کی دھڑکنوں کو منتشر کیا تھا۔

"تو پھر ماہین کا بختاور بھی ایسا نہیں۔ میری جان۔" اس نے کاغذ کے ٹکڑے ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا۔ دور افق پر سورج ڈوبنے کو تھا' ماہین نے ایک نظر اپنے ہمسفر پر اور پھر اس کی طرف دیکھا جس نے خاموش نگاہوں سے اسے خوشیوں کے چاند کی نوید سنائی تھی۔

فوزیہ یاسمین

دست کوزہ گری

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی' جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ' سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم' ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے' اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔

۲۴

چوبیسویں قسط

اپنا نام بتانے کے بعد اسے امید تھی کہ اب الیان کے رویے میں تھوڑی تبدیلی آئے گی وہ اپنے انداز اور لہجے پر شرمندگی کا اظہار کرے گا اور اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرے گا جیسے کہ اس کا حال احوال پوچھے گا۔
مگر وہ تو بالکل بت بن گیا تھا وہ اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا مگر افسوس کی بات یہ تھی کہ اس کے انداز میں رومیلہ کے لیے پسندیدگی کا کوئی عنصر نہیں تھا بلکہ بے زاری کا پہلو نمایاں تھا۔
رومیلہ کا بحال ہوتا اعتماد ایک بار پھر ڈگمگانے لگا۔
الیان کے جھڑکنے پر وہ خود بھی ایک دم جوش میں آگئی تھی اور بڑے سنجیدہ انداز میں اپنے ماسی نہ ہونے کے متعلق بتانے لگی۔
مگر الیان کا ایک دم ٹھنڈا رد عمل اس کی ساری خود اعتمادی کو تہس نہس کر گیا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ فوراً اس کے سامنے سے ہٹ جائے مگر وہ تو کمرے سے اس خواہش کے ساتھ نکلی تھی کہ شاید کسی سے ملاقات ہو جائے تو وہ کسی سے کچھ بات کر سکے۔ نمل نے اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ لوگ اسے لینے نہیں آئیں گے۔
کل رات رخصتی کے بعد نمل نے ابرار سے پوچھا تھا کہ وہ صبح کتنے بجے رومیلہ کے گھر روانہ ہوں گے تو انہوں نے صاف منع کر دیا کہ رومیلہ کے گھر کوئی نہیں جا رہا۔
نمل نے کریدنا یا اصرار کرنا چاہا تو انہوں نے اسے بری طرح جھڑک دیا نمل خود اس عجیب و غریب رویے پر حیران تھی اور اب رومیلہ کا فون آنے پر تو جیسے وہ بالکل ہی چونکنی ہو گئی اور ایک کے بعد ایک سوال پوچھنے لگی۔
"رومیلہ تم ٹھیک ہو نا؟"
"گھر والوں کا رویہ کیسا تھا تمہارے ساتھ؟"
"الیان کس طرح پیش آیا؟"
"ان کا گھر کہاں ہے؟"
"بات چیت کرنے میں تمہیں وہ لوگ کیسے لگے؟"
"تم پریشان تو نہیں ہو نا؟"
رومیلہ اس کے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ دے سکی ایک تو وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔
دوسرے یہ کہ بھلے ہی ان کے بیچ لاکھ دوستی سہی مگر جو کچھ ہوا تھا اس میں خود رومیلہ کی بے عزتی تھی اپنی ناقدری کے متعلق بتاتے ہوئے رومیلہ کی زبان لڑکھڑا گئی اور جھوٹ وہ نمل سے بول نہیں سکتی تھی چنانچہ اس نے زیادہ بات کیے بغیر فون بند کر دیا۔
اسے یقین تھا نمل اس کے اس انداز پر الجھ گئی ہو گی لیکن وہ خود اتنی الجھی ہوئی تھی کہ نمل کے متعلق سوچ کر خود کو اور ٹینس نہیں کرنا چاہتی تھی۔
البتہ اس پل اسے اپنا اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا سخت زہر لگا تھا لہٰذا وہ ماسی کے لائے کپڑے زیب تن کر کے چہرہ رگڑ رگڑ کر صابن سے دھو کر چائے کی پیالی اٹھا کر ایسے باہر نکلی تھی جیسے کچن میں برتن رکھنے جا رہی ہو۔
وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ گھر کے لوگ جاگ گئے ہوں تاکہ وہ ان سے بات کر سکے ورنہ کوئی خود سے چل کر اس کے کمرے میں جانے کب آئے اور وہ اب مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔
مگر الیان سے سامنا ہونے پر اسے خود کا اس طرح باہر نکل آنا وہ بھی ایک ماسی کے کپڑے پہن کر سخت نامناسب لگ رہا تھا۔
الیان تو اس کا نام سنتے ہی خاموش ہو گیا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس طرح خاموش کھڑے رہ کر الیان کے سامنے مجسمہ بن کر رہنا چاہیے یا کمرے میں واپس پلٹ جانا چاہیے۔

آخر اللہ تعالیٰ کو ہی اس پر رحم آ گیا اور اسے ان دونوں کے بیچ کا زیادہ بہتر ہموار راستہ مل گیا۔ وہ گلا صاف کرتے ہوئے بظاہر بڑے اعتماد سے بولی۔
"کچن کہاں ہے؟" الیان اس کے سوال اور لہجہ پر چونک اٹھا۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی ایک بالکل نئی نویلی دلہن سے ایسے سوال کی جبکہ شادی بھی بالکل غیر روایتی انداز میں ہوئی ہو۔
"میں نے پوچھا ہے کچن کہاں ہے؟" الیان کو ہنوز حیران دیکھ کر رومیلہ نے بڑی سنجیدگی سے سوال دہرایا تو الیان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
انسان جس کے خلاف ہوتا ہے اس کی ہر بات اسے بری لگتی ہے یہی اس وقت الیان کے ساتھ ہو رہا تھا عموماً اسے خود اعتماد لڑکیاں متاثر کرتی تھیں بلاوجہ کی شرمانے لجانے والی لڑکیاں اسے چھچھوری لگتی تھیں۔
مگر اس وقت رومیلہ کا یہ انداز اسے سخت زہر لگا تھا وہ اس کی خود اعتمادی کو بے باکی کا نام دیتے ہوئے یہی سوچنے لگا تھا۔
"ہونہہ! سارا گھر ایک سے بڑھ کر ایک ڈھیٹ اور بے شرم ہے بجائے اس کے کہ نئے گھر میں اس طرح دندناتے پھرنے پر شرمندہ ہو یا خجالت محسوس کرے بڑی ڈھٹائی سے کچن کی بابت پوچھ رہی ہے جیسے پہلے ہی دن گھر پر قبضہ جما لیا ہو اور اس کی شروعات باورچی خانے سے کرنی ہو۔"
"کچن کہاں ہے یہ جاننا آپ کے لیے قطعاً ضروری نہیں، آپ فی الحال اپنے کمرے میں تشریف لے جائیں۔" الیان کا لہجہ خاصا کھردرا تھا رومیلہ کا اعتماد تو ڈھیر ہوتا ہی تھا ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا کر رہ گیا وہ تیزی سے کمرے کی طرف واپس مڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

نمل، رومیلہ سے بات کر کے کافی فکر مند ہو گئی تھی وہ رومیلہ کی فطرت سے واقف تھی وہ بہت صابر و شاکر لڑکی تھی اپنی پریشانیوں کو ڈھنڈورا پیٹنا یا اپنی محرومیوں کا رونا رونا اسے سخت ناپسند تھا۔
بچپن سے ماں کے سائے سے محروم ہونے کے باوجود اس نے کبھی والدین کے زیر سایہ پرورش پانے والے بچوں پر رشک کیا نہ حسد۔ یہی نہیں اس کے والد اور بھائی بھی ہمیشہ اس کی ذات سے لاپروا رہے اس بات پر بھی اس نے کبھی ان کی برائیاں باہر کے لوگوں سے نہیں کیں۔
نمل اور سنبل سے وہ کبھی کبھی دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی وہ بھی ایسی صورت میں جب کوئی اچانک نئی بات ہو جاتی اور اس کے پچھلے زخم بھی ہرے ہو جاتے یا پھر جب نمل اپنے گھر کے ماحول اور عظمت خلیل کے رویے کو لے کر کڑھ رہی ہوتی تب وہ اپنے حالات کا تذکرہ کر کے اس کا غم غلط کرنے کی کوشش کر لیتی۔
اسی لیے اس کے ٹال مٹول پر نمل بخوبی سمجھ گئی کہ رومیلہ کا وہاں بڑے سرد سے انداز میں خیر مقدم کیا گیا ہے الیان اور اس کے گھر والوں کا رویہ تو وہ خود اپنی آنکھوں سے شادی کے وقت دیکھ رہی تھی اب گھر جا کر بھی رومیلہ کے ساتھ یہ سرد مہری اسے حقیقتاً ہولا گئی تھی۔
وہ بے اختیار موبائل ایک جانب رکھتی اٹھ کر رشیدہ کے کمرے کی طرف چل دی۔
رشیدہ صبح صبح بے دار ہوتی تھیں یہ وقت ان کا عبادت اور تلاوت کا تھا نمل آہستہ سے دروازہ بجا کر ان کے کمرے میں داخل ہو گئی۔
عظمت خلیل عام طور پر دوسرے کمرے میں سوتے تھے انہیں ہر وقت رشیدہ کی اپنے سر پر موجودگی سخت ناپسند تھی جس کے نتیجے کے طور پر دونوں کے دو کمرے پوری طرح سے آراستہ کیے ہوئے تھے کہ عظمت خلیل کو

جب رشیدہ کی شکل دیکھنے کا دل نہ چاہ رہا ہوتا تو وہ سکون سے دوسرے کمرے میں جا کر آرام کر سکیں۔
رشیدہ حسبِ معمول تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں اتنی صبح صبح نمل کو اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھ کر ان کے ہاتھ رک گئے وہ سوالیہ انداز میں نمل کو دیکھنے لگیں۔
"امی آپ ابھی ابرار بھائی کو فون کریں اور کہیں کہ رومیلہ کو اس کی سسرال سے لینے میں جاؤں گی اگر تمہارا جانے کا ارادہ نہیں ہے تو صرف ایڈریس بتا دو ہم خود چلے جائیں گے۔" رشیدہ اپنی عادت کے مطابق اس کی بات سن کر فوراً" ہی پریشان ہو گئیں۔
انہوں نے تسبیح کو مٹھی میں بند کرتے ہوئے پہلے نمل پر دم کیا پھر آہستگی سے پوچھنے لگیں۔
"کیا بات ہے جب رات ہی ابرار نے منع کر دیا تھا تو اتنی صبح صبح پھر یہی سوال دہرانے کا خیال تمہیں کیوں آگیا ہے؟" نمل نے فوراً" انہیں رومیلہ کے فون کا خلاصہ سنا دیا وہ بھی نمل کی طرح بلکہ نمل سے بھی زیادہ ہراساں ہو گئیں پھر بھی انہیں اس طرح ابرار کو فون کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا وہ کشمکش کے عالم میں بولیں۔
"ابرار نے جب ایک بار منع کر دیا تو پھر وہ مجھے کیوں بتائے گا رومیلہ کے گھر کا ایڈریس۔"
"لیکن امی، ہم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتے نا پتا نہیں رومیلہ کے ساتھ وہاں کیا ہو رہا ہو گا۔"
"ایسی باتیں مت کرو میرا دل تو پہلے ہی بیٹھنا شروع ہو گیا ہے۔ تم ذرا رومیلہ سے میری بات کرا دو۔" رشیدہ کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔
"امی رومیلہ سے بعد میں بات کریں گے پہلے آپ ابرار بھائی سے ایڈریس لے لیں۔" رشیدہ ایسے نمل کو دیکھنے لگیں جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہوں۔
"لیکن ابرار اور اس کی بیوی کے بغیر ہم دونوں کا وہاں جا کر اسے لانا کتنا عجیب سا لگے گا اور پھر پتا نہیں اس کی سسرال والوں کا رویہ کیسا ہو گا کیا پتا ان کی ابرار سے بات ہو چکی ہو انہوں نے خود ہی ساتھ بھیجنے سے منع کیا ہو پھر ہمارا اصرار بالکل بلاوجہ کا نہ لگے۔"
"امی آپ ابرار بھائی سے بات کریں گی تو پتا چلے گا نا میں فون ملا رہی ہوں آپ کہہ دیں مجھے ایڈریس چاہیے بس۔" نمل نے سائیڈ ٹیبل پر سے ان کا موبائل اٹھا کر بٹن دبانے شروع کر دیے۔
رشیدہ اسے منع کرنے کے لیے تاویلیں سوچتی رہ گئیں اور اس نے لائن ملنے پر موبائل ان کے کان سے لگا بھی دیا۔
"اتنی صبح صبح وہ پتا نہیں اٹھا بھی ہو گا یا نہیں۔" رشیدہ کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابرار نے کال ریسیو کر لی۔
"ہیلو ممانی، آپ اتنی صبح صبح سب خیریت تو ہے نا۔" رشیدہ کے لیے فوری طور پر کچھ بولنا مشکل ہو گیا۔
"آں وہ۔۔۔ ابرار بیٹے۔" نمل کے مستقل اشارے کرنے پر لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولیں۔
"میرا۔۔۔ دل چاہ رہا تھا کہ میں خود رومیلہ کو اس کی سسرال لینے جاؤں بن ماں کی بچی ہے نا ایسے موقعوں پر ماں کی کمی کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے تم لوگوں کا وہاں جانے کا ارادہ کتنے بجے تک ہے میں اور نمل بھی آجائیں گے۔" رشیدہ نے ابرار کے مزاج کو دھیان میں رکھتے ہوئے بہت سنبھل کر بات کی تاکہ وہ کوئی ٹکا سا جواب نہ دے دے پھر بھی وہ عادت کے مطابق روکھے سے لہجے میں بولا۔
"ممانی ایسے موقعوں پر لڑکی کی ماں تو اسے لینے سسرال نہیں جاتی اس لیے آپ کے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جب ایک چیز اللہ تعالیٰ نے قسمت میں لکھی ہی نہیں تو دوسرے لوگ اس کمی کو کیسے پورا کر سکتے ہیں پھر ماں کا نعم البدل تو کوئی ہے ہی نہیں۔

اصل میں الیان کے گھر والوں نے منع کر دیا تھا کہ ان کے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں ہے میں ایک بار پھر بات کر کے دیکھ لوں گا اگر انہوں نے اعتراض نہیں کیا تو آپ چلی جائیے گا۔" ابرار انہیں اکیلا وہاں بھیجنا نہیں چاہ رہا تھا اور خود اس کا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا چنانچہ اس نے کہہ کر فوراً" فون بند کر دیا۔
اس کے ذہن میں اس وقت ہزار چیزیں چل رہی تھیں اسے بریرہ کو واپس گھر بھیجنا تھا اس کے گھر پہنچنے کے بعد ان کا اگلا قدم کیا ہو گا ابھی تو یہ بھی دیکھنا تھا ایسے میں رشیدہ کا فون اسے تپا ہی گیا تھا۔
دوسری طرف رشیدہ کو بھی اس کا لب و لہجہ احساس توہین میں مبتلا کر گیا انہوں نے فون بند ہونے پر شاکی نظروں سے نمل کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں اسی لیے اسے فون نہیں کرنا چاہ رہی تھی وہ تو سیدھے منہ بات ہی نہیں کرے گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے ابرار کی گفتگو کا لب لباب اس کے گوش گزار کر دیا۔
"ابرار بھائی کی جگہ ہمیں پھوپھا کو فون کرنا چاہیے۔" نمل نے رومیلہ کے باجانی کا ذکر کیا۔
"فی الحال کسی کو فون کرنے کی ضرورت نہیں کیا پتا واقعی لڑکے والے کسی قسم کے رواجوں کو پسند نہ کرتے ہوں اور انہوں نے ہی منع کیا ہو آنے سے۔ اب ہم زبردستی تو رومیلہ کو نہیں لا سکتے نا۔"
"لیکن ہم کم از کم وہاں جا کر رومیلہ سے مل تو سکتے ہیں کہ وہ لوگ کس قسم کے ہیں کہاں رہتے ہیں ان کا رویہ رومیلہ کے ساتھ کیسا ہے؛ یہ سارے اطمینان تو کر سکتے ہیں نا۔" نمل جرح کرنے والے انداز میں بولی تو رشیدہ رسانیت سے کہنے لگیں۔
"ایک دن یا چند گھنٹوں کی ملاقات میں تم ان لوگوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتیں اور کوئی رائے قائم کر بھی لو گی تو اس سے رومیلہ کی زندگی پہ کوئی فرق نہیں پڑ جائے گا اسے اب ان ہی لوگوں اور ان ہی حالات میں رہنا ہے ہم اس سے ملنے میں اگر زیادہ جلد بازی کا مظاہرہ کریں گے تو اس کے لیے مسائل ہی کھڑے کریں گے اسی لیے میں تو کہتی ہوں جب ابرار نے منع کر دیا ہے تو ہمارا وہاں نہ جانا ہی بہتر ہے فون پر تو تم بات کر ہی سکتی ہو تم اس کی خیریت پوچھتی رہنا پھر ولیمہ میں بھی ملاقات ہو جائے گی۔" نمل چپ چاپ انہیں دیکھے گئی۔
وہ ان سے متفق تو نہیں لگ رہی تھی مگر بحث کے لیے کوئی ٹھوس دلیل بھی نہیں تھی اسے بددل دیکھ کر رشیدہ نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے موضوع بدل دیا۔
"رومیلہ نے اپنی شادی میں خرم کو بھی بلایا تھا؟"
"نہیں۔"
"مگر وہ تو کل آیا تھا۔" رشیدہ چونکیں۔
"ہاں۔ بغیر انویٹیشن کے آیا تھا۔" نمل بے زاری سے بولی۔
"کیا ولیمہ میں بھی آئے گا۔" رشیدہ نے پرسوچ لہجے میں پوچھا۔
"پتا نہیں۔ کیوں؟ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔" نمل نے ٹھٹک کر پوچھا۔
"جس طرح وہ ولیمے کے متعلق بازپرس کر رہا تھا اس سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا کہ رومیلہ نے اسے بلایا ہے۔"
رشیدہ کی بات پر نمل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"ہاں ہے تو بڑا بے غیرت آ بھی سکتا ہے ولیمہ میں، مگر آپ کو تو خود کچھ نہیں پتا آپ نے بھلا اسے ولیمہ کے متعلق کیا بتایا ہو گا۔"
"ہاں مجھے تو تفصیل معلوم نہیں۔ مگر میں نے بھائی صاحب سے اس کی بات کرا دی تھی۔" رومیلہ کے والد کا سن کر نمل ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"کیا؟ آپ نے..... اوہ گاڈ آپ کو کیا ضرورت تھی پھوپھا سے بات کرانے کی۔ انہوں نے تو پورا ایڈریس تک سمجھا دیا ہوگا۔"

"ظاہری بات ہے۔ ہمارا ہونے والا داماد ہے اتنا اخلاقی تقاضا تو انہیں نبھانا ہی تھا۔"

"وہ کوئی داماد وغیرہ نہیں ہے۔" نمل تلخ ہوگئی۔

"مگر لوگوں کو تو یہی پتا ہے نا۔" رشیدہ کی بات پر کچھ لمحوں کے لیے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی جسے رشیدہ کی مدھم آواز نے توڑا۔

"ویسے سچ پوچھو تو مجھے تو خرم اس شخص سے بہت الگ لگتا ہے جس کا تذکرہ تم کرتی ہو۔" نمل زبان سے کچھ نہیں بولی البتہ سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی تو وہ اپنے جملے کی وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

"مجھے تو وہ بہت اچھا اور تمیز کا لگتا ہے۔" نمل کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مبارک ہو۔ اس نے آپ کو بھی شیشے میں اتار لیا۔"

"دیکھو ایسی بات نہیں ہے جو کچھ تم نے بتایا ہے اسے سننے کے بعد میرا خود اس کی تعریف کرنے کا دل نہیں چاہتا مگر جو سچ ہے اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا بظاہر وہ بہت خوش مزاج اور با اخلاق لگتا ہے۔ دور سے مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پاس آکر میری ٹیبل پر بیٹھ گیا بڑی اپنائیت سے اس نے میری اور تمہارے والد کی خیریت پوچھی ان کے نہ آنے کی وجہ پوچھی غرض یہ کہ اس سے بات کرکے لگتا ہے کہ اس کی تربیت بہت اچھے خطوط پر ہوئی ہے" نمل بے زاری سے خرم نامہ سن رہی تھی کہ ان کی اگلی بات پر چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"جب بھی کوئی نیا شخص مجھ سے ملتا ہے وہ میری معذوری کو ڈسکس ضرور کرتا ہے کہیں کسی کی نظروں میں ہمدردی ہوتی ہے تو کہیں تجسس ہلکورے لے رہا ہوتا ہے مگر خرم ان بہت کم لوگوں میں سے ہے جنہوں نے میری وہیل چیئر کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے صرف اور صرف میری شخصیت پر دھیان دیا ہے۔

اس نے مجھ سے اشاروں میں بھی نہیں پوچھا کہ میں اس کرسی کی محتاج ہو کر کیوں رہ گئی ہوں؟" رشیدہ کے سنجیدہ سے لہجے پر نمل صرف ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ کچھ لمحوں کے لیے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی جسے نمل نے ہی اٹھتے ہوئے توڑا۔

"میں ایک بار رومیلہ کو فون کرکے پوچھ لیتی ہوں اگر وہ کہتی ہے کہ ہم دونوں کو آنا چاہیے تھا تو پھر میں اسی سے کہوں گی کہ اپنی سسرال میں کسی سے میری بات کرادو تاکہ میں ایڈریس سمجھ سکوں۔" رشیدہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

البتہ جب وہ کمرے سے نکلنے لگی تب کہنے سے باز نہ آئیں۔

"بعض اوقات انسان کسی کو سمجھنے میں غلطی کر دیتا ہے کہیں تم خرم کو سمجھنے میں غلطی تو نہیں کر رہیں۔"

"میں نہیں امی آپ خرم کو سمجھنے میں غلطی کر رہی ہیں مجھے تو اچھی طرح پتا ہے کہ اسے کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔" نمل نے دروازے کے ہینڈل کو سختی سے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے ایسے کہا جیسے اس کا ذہن کہیں بہت دور سفر کر رہا ہو۔

"میں ابھی نہیں۔" رشیدہ اس کے چہرے سے کچھ اخذ نہ کرسکیں۔

"ابھی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن اگر وہ رومیلہ کے ولیمہ میں پہنچا تو اس بار اسے آنے پر بڑا پچھتاوا ہوگا۔" نمل کہہ کر رکی نہیں اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

الیان' ابرار سے رابطہ کرنے کی کوششیں ترک کرکے اس کے گھر جانے کا مصمم ارادہ تو کرچکا تھا اگر رومیلہ

ٹکراؤ نہ ہو جاتا تو وہ اب تک اس کے گھر جانے کے لیے نکل بھی چکا ہوتا۔ مگر رومیلہ سے ملنے کے بعد وہ ایک ہم سوچ میں پڑ گیا۔

شادی والے دن ان تینوں کا رویہ کوئی ڈھکا چھپا نہیں تھا حالانکہ ابرار کی تاکید تھی کہ وہ بالکل نارمل طریقے سے انہیں لے کر آئیں گے۔

بلکہ وہ لوگ مارے باندھے صاف زبردستی کے بلائے گئے انداز میں پہنچے تھے گویا ابرار کی ایک بات کو صحیح طریقے سے نہیں نبھا سکے تھے۔

ہو سکتا ہے ابرار اس کا انتقام لینے کے لیے بریرہ کو وعدے کے مطابق نہ چھوڑ رہا ہو۔

الیان نے اس پر فوراً ہی ظاہر بھی کردیا تھا کہ وہ سب سمجھ گیا ہے' ہو سکتا ہے اپنی اصلیت کھلنے پر وہ تلملا کر بریرہ کو آج واپس بھیج دینے کا ارادہ ملتوی کرچکا ہو۔

الیان چاہے کتنا بھی غصہ کرلے بعد میں چاہے وہ ابرار کی کھال اتار دے لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا کہ ابرار کے ہاتھوں میں ان کے گھر کی عزت و ناموس تھی۔

وہ جب چاہے اسے مٹی میں ملا سکتا تھا۔

بریرہ کے ساتھ اگر وہ کچھ نہیں بھی کرتا ہے تب بھی اگر وہ بریرہ کو کل تک نہیں چھوڑتا تو عین شادی والے دن ان کا گھر تو تماشا بن جائے گا۔

یا اگر چھوڑ بھی دیتا ہے مگر اتنے مظالم کرنے کے بعد کہ اس پر نظر پڑتے ہی دیکھنے والے کو اندازہ ہو جائے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

تو بریرہ کی شادی ٹوٹنا اور ان کا ساری دنیا کے سامنے سر جھک جانا یقینی تھا۔

پھر بھلا وہ کس بات پر اکڑ رہا تھا اور کیا سوچ کر ابرار کے گھر جانے کے لیے کمر کستا عزم سے چلا جا رہا تھا۔ عقلمندی کا تقاضا یہی تھا کہ اس وقت غصے اور نفرت کو ایک طرف رکھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے ابرار کے فون کا انتظار کیا جائے۔

الیان خود کو پرسکون کرنے کے لیے گہری گہری سانسیں کھینچنے لگا اور گیسٹ روم کے دروازے سے واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔

وہ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے اب ابرار کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا پہ اور بات تھی کہ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑنے کی بجائے گھڑی کی سوئیوں کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کھنچتے جا رہے تھے کہ تبھی اچانک بلند ہونے والے شور نے اس کی ساری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔

الیان تیزی سے اٹھتا کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کے کمرے کے آگے بنی ریلنگ سے نیچے لاؤنج کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا جہاں اس کے ماموں' ممانیاں بمع بچوں کے زور و شور سے بول رہے تھے۔ الیان' ریاض غفار کو نیچے اکیلا دیکھ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ان کے نزدیک آگیا۔

مگر قریب آنے پر اسے حیرت بھرا اطمینان ہوا جب اس نے ان سب کو خوشی خوشی مبارک باد دیتا پایا۔ البتہ سب کی زبان پر ایک شکوہ بھی تھا۔

"تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟"

"ایسے اچانک کیوں شادی کرلی ایسی کیا ایمرجنسی ہوگئی تھی۔"

"کم از کم ذکر تو کرتے۔"

"خیر جو بھی ہوا بہت بہت مبارک ہو۔"

"تمہاری بیوی ہے کہاں ذرا اس سے تو ملواؤ۔" چھوٹی ممانی کے کہنے پر الیان بے ساختہ ریاض غفار کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اتنے شرمندہ تھے کہ چپ چاپ سر جھکائے نظریں چرائے کھڑے تھے۔ ان لوگوں کا رویہ انہیں مزید شرمندہ کر گیا تھا جو دوہرا رشتہ جڑ جانے کے باوجود نام نہاد سسرالی بن کر اکڑنے کی بجائے اس قدر خندہ پیشانی سے ان کی خوشی میں شریک ہونے آ گئے تھے۔

حالانکہ جو کچھ ہوا تھا انہیں پورا پورا حق تھا ناراض ہو جانے کا۔

"بھئی کیا ہو گیا۔ آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے اور یہ شگفتہ اور بریرہ کہاں ہیں؟" ممانی جان نے چاروں اطراف میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

الیان بریرہ کے ذکر پر کچھ پریشان سا ہو گیا تبھی فوراً حرکت میں آتے ہوئے ماموں جان کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ان سب سے قدرے ہٹ کر بالکل سنجیدہ سے کھڑے تھے ان کے چہرے پر ناراضی نہیں تھی مگر ان کے رویے میں ایک محسوس کیا جانے والا کھنچاؤ تھا۔

"ماموں جان میں......"

"مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ جو بھی مجبوری تھی یا جن حالات میں بھی تم نے شادی کی وہ سب تم نے ہم سے چھپایا کیوں؟" ماموں جان کے لہجے میں ایک دکھ بول رہا تھا۔ الیان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ان سے کیا کہے جبکہ وہ مزید کہنے لگے۔

"تمہاری نانی کو تو اتنا دکھ ہوا ہے کہ انہوں نے صبح سے کچھ کھایا پیا ہی نہیں ہے۔"

"کیا؟" الیان ایک دم چونک اٹھا۔

"میرا تو انہیں بتانے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا مگر یہ بچے تمہاری تصویر اخبار میں دیکھ کر اتنے پرجوش ہو گئے کہ تمہاری نانی کو سب پتا چل گیا ہم یہاں اس وقت ان ہی کی خاطر آئے ہیں تم اپنی بیوی کو لے کر ابھی ہمارے ساتھ ہوٹل چلو اور ان سے معافی مانگو شاید اسی طرح ان کا صدمہ کچھ کم ہو جائے۔" الیان خود کو مشکل میں محسوس کرنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا بولے۔

تبھی ریاض غفار نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ماموں جان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"صرف الیان اور رومیلہ ہی نہیں، میں اور شگفتہ بھی جا کر ان سے معافی مانگیں گے۔ چلو الیان جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" ریاض غفار نے اتنی جلدی خود کو کمپوز کر لیا تھا کہ الیان حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"جی ریاض بھائی۔ آپ کو اور شگفتہ کو بھی چلنا چاہیے جب یہ سب آپ کے علم میں تھا اور آپ دونوں اس پر رضامند تھے تو آپ بھی اتنے ہی قصوروار ہیں جتنا کہ الیان۔" ماموں جان کی بات پر الیان صرف انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

ان کا جملہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس شادی کو سراسر لو میرج سمجھ رہے تھے جانے ایسی کیا آفت آ گئی تھی کہ الیان نے ریاض غفار اور شگفتہ غفار کو بھی اس افراتفری پر مجبور کر دیا۔

"تم نے کیا رات سے اب تک کپڑے ہی نہیں بدلے۔ الیان آخر تم بتاتے کیوں نہیں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟" ماموں جان اس کا بکھرا ہوا سا حلیہ اور شرمندہ سا چہرہ دیکھ کر تپ ہی گئے۔

اس کے پاس بتانے کے لیے تھا ہی کیا وہ صرف بات بدلتے ہوئے ریاض غفار سے مخاطب ہو گیا۔

"میں تو اس وقت نہیں جا سکتا آپ ممی کے ساتھ چلے جائیں۔" ریاض غفار جانتے تھے وہ اس وقت بریرہ کے

ے کا انتظار کر رہا ہے مگر ماموں جان سمجھے وہ نانی جان کا سامنا کرنے سے کترا رہا ہے اس لیے ٹال رہا ہے تبھی ڈپٹ کر بولے۔

"ریاض بھائی اور شگفتہ نے شادی نہیں کی ہے جو یہ دونوں چلے جائیں تم اور رومیلہ بھی ہم سب کے ساتھ چل رہے ہو جاؤ جا کر بلا کر لاؤ اپنی بیوی کو۔" ماموں جان نے سختی سے کہا۔

الیان سوالیہ انداز میں ریاض غفار کو دیکھنے لگا انہوں نے سر کو ہلکے سے جنبش دیتے ہوئے گویا اسے ماموں جان کی بات مان لینے کو ہی بہتر ظاہر کیا تو الیان بے دلی سے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔

دروازے پر دستک دے کر وہ کمرے کے اندر چلا آیا رومیلہ بیڈ پر بیٹھی موبائل کو دیکھ رہی تھی ایسا لگ رہا تھا وہ کسی کو فون کرنے کا ارادہ کر رہی ہو مگر فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔

الیان کو دیکھ کر وہ بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"میرے کچھ رشتے دار باہر آئے ہیں وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں ذرا باہر آ جاؤ۔" الیان یہ کہہ کر پلٹنے لگا تو رومیلہ گھبرا کر بولی۔

"میں..... مجھے باہر آنا ہو گا۔"

"ہاں تو؟" الیان نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے وہ..... انہیں کمرے میں بھیج دیں۔" رومیلہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ابھی تھوڑی دیر پہلے جس طرح الیان اس کے ساتھ پیش آیا تھا وہ رومیلہ کو بھولا نہیں تھا اسی لیے وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر کچھ نروس ہو گئی تھی۔

"وہ بہت سارے لوگ ہیں کمرے میں نہیں آ سکتے اور پھر تمہیں ان کے ساتھ جانا بھی ہو گا۔" الیان ایک بار پھر پلٹنے لگا۔

"کہاں؟" رومیلہ حیرانی سے بولی۔

اب کی بار الیان نے ایک تیز سی نظر اس پر ڈالی مگر رومیلہ اس کی بے زاری محسوس کر لینے کے باوجود ہنوز سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی تو الیان دانت پیستے ہوئے بولا۔

"میری نانی کو تم سے ملنا ہے وہ تمہیں نانی کے پاس لیے جا رہے ہیں اور کوئی شک یا سوال۔" الیان کو امید تھی اتنے طنزیہ لہجے کے بعد وہ خاموشی سے سر نفی میں ہلا دے گی۔ مگر اس وقت اسے حیرت ہوئی جب رومیلہ نے سوال کی بجائے الٹا اعتراض کر ڈالا۔

"میں اس حلیے میں آپ کے گھر والوں کے سامنے کیسے جا سکتی ہوں۔"

"جیسے اس گھر میں آ سکتی ہو ویسے ہی جا بھی سکتی ہو۔" الیان چبا کر بولا۔

رومیلہ کے خاک بھی سمجھ میں نہ آیا وہ تو اس گھر میں بڑے اچھے حلیے میں آئی تھی دلہن بن کر بالکل روایتی انداز میں۔ پھر بھلا وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔

اسے ایک بار پھر جانے کے لیے پر تولتا دیکھ کر رومیلہ تیزی سے بولی۔

"دیکھیں میں ان کپڑوں میں تو آپ کے گھر والوں سے نہیں مل سکتی آپ مجھے یہاں کا ایڈریس بتا دیں میری کزن مجھے کپڑے لا دیں گی۔"

"اور اس میں ٹائم کتنا لگے گا۔" الیان نے تلخی سے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر سپاٹ لہجے میں بولا۔

"رخصتی کے وقت اپنے ساتھ ایک جوڑا ہی لے آتیں۔" الیان کی بات کسی تیر کی طرح رومیلہ کو لگی تو وہ اسی

کے لب ولہجے میں بولی۔
"اگر پتا ہوتا کہ یہاں میرے ساتھ یہ سلوک ہونے والا ہے تب تو واقعی ایک جوڑا رکھ لیتی۔" الیان کو رومیلہ کی طرف سے اس قسم کے جملے کی بالکل امید نہیں تھی وہ کچھ لمحوں کے لیے گنگ رہ گیا۔

ہر بار اس کی غیر موجودگی میں الیان نے یہی طے کیا تھا کہ جب تک بریرہ واپس نہیں آجاتی کم از کم تب تک ان سب کا رویہ اس کے ساتھ اتنا برا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ابرار سے اس کی شکایت کردے اور ابرار اس کا بدلہ بریرہ سے لے۔

مگر ہر بار اس کے سامنے آتے ہی الیان کا خون کھولنے لگتا اور وہ اپنا فیصلہ فراموش کر بیٹھتا۔

ابھی بھی اس کی بات پر چند لمحوں کے لیے الیان سوچ میں پڑ گیا کہ جس لہجے میں اس نے جواب دیا تھا وہ اس کے بری طرح تپے ہوئے ہونے کو ظاہر کر گیا تھا۔ اب ظاہری بات تھی کہ اسے جو بھی غصہ آرہا ہوگا اس کا اظہار وہ اپنے بھائی کے سامنے تو ضرور کرے گی جس کے رد عمل میں وہ بریرہ کو بھیجنے سے بھی انکار کر سکتا ہے۔

الیان یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ رومیلہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"کم از کم بال بنانے کے لیے ایک کنگھا یا برش تو دے دیجیے۔" الیان کے ایک دم خاموش ہو جانے پر رومیلہ کو شرمندگی کا احساس ہوا تھا کہ شاید وہ کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئی تھی تبھی اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے نسبتاً بہتر لہجے میں بولی۔

اس طرح گفتگو کرنا اس کے مزاج میں شامل نہیں تھا اور اس وقت تو صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ کسی قسم کی تلخی نہیں چاہتی تھی۔

شادی چاہے جن حالات میں بھی ہوئی ہو وہ تو ہر صورت اسے نبھانا چاہتی تھی اور پھر ان لوگوں کا رویہ جو بھی ہو احسان تو بہر حال ان لوگوں نے کیا تھا اور وہ کوئی احسان فراموش نہیں تھی۔

الیان کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کا مطالبہ غلط نہیں تھا وہ اسے اپنی نانی سے ملوانے لے جا رہا تھا اس کا حلیہ اتنا مناسب تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ بھلے ہی وہ نئی نویلی دلہن نہ لگے لیکن معمول کے مطابق ایک مہمان جیسی تو لگنی چاہیے۔

پہلے ہی شادی اس قدر مشکوک طریقے سے ہوئی تھی اس میں اگر اس کا حلیہ بھی نامناسب ہوا تو ایک طرح سے وہ خود لوگوں کو سوچنے اور باتیں بنانے پر مجبور کر رہے ہیں۔

جبکہ الیان کی خواہش تھی کہ فی الحال سب اس موضوع پر بات کرنا بند کر دیں تاکہ ممی ڈیڈی دونوں کم از کم ایک صدمے سے باہر آجائیں۔

بریرہ کے ساتھ جو ہوا تھا وہ ناقابل برداشت دکھ تھا مگر کم از کم بیٹے کی طرف سے وہ کڑھنا چھوڑ دیں کیونکہ الیان کو یقین تھا اس کا وقتی نقصان ضرور ہوا ہے مگر بہت جلد وہ اس سے چھٹکارا پا کر اس کی تلافی کر لے گا مگر یہ بات ریاض غفار اور شگفتہ غفار کے لیے سمجھنا تقریباً" ناممکن تھا۔

لہٰذا وہ اس بار شگفتہ غفار سے بات کرنے کی بجائے سیدھا بریرہ کے کمرے میں آگیا اور اس کی وارڈروب کھول کر دیکھنے لگا۔

وہ کپڑے، جوتوں اور زیوروں کی شوقین بالکل روایتی سی لڑکی تھی اس کے پاس جدید تراش خراش کے بیش قیمت کپڑوں کا بیش بہا کلیکشن موجود تھا کہ دیکھنے والے کے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو جائے۔

مگر الیان کا ہاتھ خود بخود پیچ کلر کی شیفون جارجٹ کی ایڑھی تک آتی اے لائن شرٹ اور چوڑی دار کی طرف بڑھ گیا جس کی قمیص پر پیچ کلر کی ہی خوب چوڑی چوڑی لیسوں سے بڑی خوب صورت ڈیزائننگ کی گئی تھی ہینگر

اس سوٹ پر ایسے پلاسٹک بیگ چڑھا ہوا تھا جیسے یہ ابھی تک پہنا نہ گیا ہو۔

اصل میں الیان نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کزنز جوڑے کو دیکھ کر پہچان لیں کہ یہ بریرہ کا پہنا ہوا ہے۔

سوٹ نکالنے کے بعد وہ بریرہ کی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا الماری کی طرح یہاں پر بھی بریرہ کے شوق اور من کی تکمیل کی آزادی کا منہ بولتا ثبوت موجود تھا۔

الیان نے جو جو چیزیں ہاتھ میں آسکیں اٹھائیں اور کمرے سے باہر نکل گیا گیسٹ روم نیچے تھا اور وہ یہ سب اٹھا نیچے نہیں جانا چاہتا تھا چنانچہ وہ سب سامان اپنے کمرے میں لے آیا اور ملازمہ کو بلوا کر اس کے ہاتھ ایک شاپر میں رومیلہ کے پاس بھجوا دیا۔

خود اسے تو تیار ہونے میں دس منٹ ہی لگنے تھے کہ اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا نک سک سے تیار ہونے کا البتہ نہا کر کپڑے بدلنا سخت ضروری تھا ورنہ ماموں جان نے تو صرف ٹوکا تھا۔ نانی جان تو پوری کلاس لے لیتیں۔

فریش ہو کر وہ شگفتہ غفار کے پاس جانے کا ارادہ کرتا کمرے سے نکلا ہی تھا کہ ریاض غفار اپنے کمرے سے باہر نکلتے نظر آگئے۔ وہ بھی محض کپڑے بدل کر ظاہر جانے کے لیے پوری طرح تیار نظر آرہے تھے۔

"ممی تیار ہیں۔" الیان نے نزدیک آکر پوچھا تو انہوں نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت ٹھیک ہو رہا ہو۔

"وہ تو کمرے سے نکلنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ کہہ رہی ہے میں تو اپنے بھائیوں اور ماں سے آنکھ ملانے کے قابل ہی نہیں رہی ہوں۔ وہ تو منہ سر لپیٹے بستر پر پڑی ہے۔ موبائل میں پہلے ہی بند کر چکا ہوں۔ اس میں تو کسی کو فیس کرنے کی ہمت نہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر ان کی ہمت نہیں ہے تو انہیں فورس مت کریں۔ ملازمہ سے کہہ دیں ان کے کمرے میں انہیں ناشتا دے دے اور اپنے سامنے بیٹھ کر کرائے۔" الیان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہنے کی کوشش کی۔

"الیان، شگفتہ اگر ہمارے ساتھ نہیں گئی تو سب کو ایسا لگے گا کہ تم نے ہماری مرضی کے بغیر یہ شادی کی ہے۔" ریاض غفار اعتراض کرتے ہوئے بولے۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔" الیان بے زاری سے بولا۔

"بہت فرق پڑتا ہے تم کوئی گستاخ اور خود سر اولاد نہیں ہو پھر لوگ تمہیں ایسا کیوں سمجھیں۔"

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ ممی پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہیں، انہیں اور پریشان نہ کریں۔ اب ہم جلدی سے چلتے ہیں، تاکہ وہاں سے جلدی سے لوٹ سکیں۔ مجھے واپس آکر ابرار کے پاس جانا ہے۔" الیان کا لہجہ اس کے خطرناک عزائم کو ظاہر کرنے لگا تو بے اختیار ریاض غفار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کچھ بھی کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے اور کل بریرہ کی شادی ہے۔" الیان صرف انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

کل شادی تھی اور انتظامات کتنے مکمل تھے اور کتنے نامکمل، اس طرف تو الیان نے دھیان بھی نہیں دیا تھا۔

"کیا ہوا الیان بھائی، ابا پوچھ رہے ہیں اور کتنا ٹائم لگے گا۔" شاہ جہاں ماموں کا بیٹا شاہد تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آکر بولا تو وہ دونوں سنبھل گئے۔

"بھئی اپنے ابا سے کہو دلہن کو تیار ہونے میں کچھ تو ٹائم لگے گا نا۔" ریاض غفار نے کمال مہارت سے اپنے تاثرات اور لہجہ ایک دم تبدیل کر لیا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دلہن تو کب کی باہر آچکی ہے۔" شاہد کے پیچھے حامد کی بہن سکینہ بھی اوپر

آ گئی۔

الیان نے بے اختیار چونک کر ہاتھ پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی تھی یہ جان کر جبکہ سکینہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"بہت بہت مبارک ہو الیان بھائی۔ بھابھی تو بہت پیاری ہیں۔ اب ذرا ہمیں بھی بتادیں کہ میری بھابھی کہاں ہیں۔ آپ لوگوں نے تو گاؤں والوں کو بھی مات دے دی ہے۔

بریرہ بھابھی کو بالکل سات پردوں میں چھپالیا ہے۔ ہم تو بالکل بور ہوگئے ہیں۔" سکینہ کے لہجے میں شکوہ نہیں اپنائیت تھی۔

وہ لوگ ٹھہرے بھلے ہی ہوٹل میں تھے۔ مگر سارا دن یہیں جمع رہتے تھے۔ مگر جب سے بریرہ اغوا ہوئی تھی ریاض غفار نے تکلف اور مروت بالائے طاق رکھ کر ماموں جان سے فون پر کچھ اس طرح بات کی کہ انہیں اندازہ ہوگیا کہ کچھ دن کے لیے اس طرح کے گیٹ ٹو گیدر بند کردیے جائیں۔ بریرہ تھکن کی وجہ سے بیمار پڑ رہی ہے۔ لٰہذا اسے مکمل آرام کرنے دیا جائے۔

بریرہ ان کی لاڈلی بہو تھی۔ چنانچہ انہوں نے برا مانے بغیر فوراً" ان کی بات مان لی اور بچوں سے کہہ دیا کہ سسرالیوں کی طرح سیدھا بارات لے کر ہی جانا اور یہ روز' روز کا ہنگامہ بند کرو۔

بچے ان کی بات ماننے پر مجبور ہوگئے۔ مگر اب گھر تک آکر انہیں بریرہ سے ملنے سے کیسے روکا جاسکتا تھا۔

ریاض غفار پریشان نظروں سے الیان کو دیکھنے لگے۔ جو خود چند لمحوں کے لیے ساکت ہوگیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے بریرہ بھابھی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتیں۔ وہاں ہوٹل میں نانی جان کے پاس حامد بھائی موجود ہیں۔ کم از کم مجھے ابھی تو ملنے دیں۔" وہ لجاجت سے بولی تو الیان بہت ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔

"سکینہ۔۔۔ اس وقت اس سے ملنے کی ضد نہ کرو' میری اس اچانک شادی نے ممی اور بریرہ کو بہت ہرٹ کیا ہے۔ وہ ابھی کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہ رہیں۔ اس وقت اگر تم اس سے ملوگی تو وہ بہت ان کمفر ٹیبل فیل کرے گی۔" الیان کی بات میں بہت وزن تھا۔ سکینہ ایک دم چپ ہوگئی۔

جبکہ ریاض غفار زخمی نظروں سے الیان کو دیکھنے لگے۔ ان کے بیٹے نے صورت حال کو سنبھالنے کے لیے سارا الزام اپنے سر رکھ لیا تھا۔ گھر کی عزت کو بچانے کے لیے وہ خود کیسے سب کی نظروں میں والدین کا نافرمان بن کر کھڑا ہوگیا تھا اور یہ سب کر کے بھی اس کے چہرے پر کوئی دکھ یا پچھتاوا نہیں تھا۔ بلکہ سکینہ اور شاہد کے خاموشی سے مان جانے پر ایک سکون پھیل گیا تھا۔

لیکن یہ سکون صرف ریاض غفار کی شرمندگی کو کم کرنے کے لیے تھا۔ ورنہ اندر سے بریرہ کے متعلق سوچ سوچ کر اس کی حالت تباہ ہوچکی تھی۔

سکینہ نے بریرہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کرکے اس کی فکر کو اور بڑھا دیا تھا۔ اگر ابرار نے وعدے کے مطابق بریرہ کو نہیں چھوڑا تو کیا ہوگا۔

الیان اسی ادھیڑبن میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ نیچے آکر اس نے ایک بار بھی رومیلہ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ حالانکہ چاروں طرف سے وہ اس کی تعریفیں سن رہا تھا۔ سب ہی اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ مگر الیان اپنی ہی سوچوں میں الجھا رہا۔ یہاں تک کہ نانی اماں کے پاس پہنچ گیا۔

ماموں جان' ریاض غفار' الیان اور رومیلہ ان کے کمرے تک آئے تھے۔ باقی سب اپنے کمروں میں چلے گئے۔ یہاں تک کہ حامد جو ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ سلام دعا کرکے باہر نکل گیا ریاض غفار نے بات کرنی شروع کی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

شگفتہ نہیں آئی۔ بیٹی آتی تو میں کچھ بولتی بھی۔ اب بھلا داماد سے کیا شکایت کروں۔"

یسی باتیں کررہی ہیں آپ۔ کیا میں آپ کے لیے غیر ہوں۔" ریاض غفار کو حقیقتاً" ان کے لہجے سے دکھ

ومیلہ جھکا سر اٹھا کر نانی اماں کی طرف دیکھنے لگی سب لوگوں کی گفتگو سے اسے اتنا تو پتا چل ہی گیا تھا کہ ان ے کسی کو بھی اس شادی کا علم نہیں تھا۔

ب تک کسی نے اس سے اس اچانک شادی کی وجہ نہیں پوچھی تھی لیکن ان کی حیرانی جابجا ظاہر ہو رہی تھی۔

مرےساں جو بزرگ عورت موجود تھی اس کے چہرے پر حیرت اور غصہ نہیں بلکہ صرف اور صرف دکھ پھیلا تھا۔

فید کپڑوں میں ملبوس وہ سفید بالوں کے ساتھ بہت مقدس سی ہستی لگ رہی تھیں دوپٹے کے پلو سے نم سوں کو صاف کرتے ہوئے وہ رومیلہ کو بہت بے ضرر سی لگی تھیں۔

اس عمر میں جہاں انسان کا مقصد حیات صرف اولاد کی خوشیاں اور آسودگی رہ جاتا ہے وہاں بدلے میں اسے اولاد مرف ایک چیز چاہیے ہوتی ہے کہ اسے مان دیا جائے اور اس کی عزت کی جائے۔

ف اولاد کی طرف سے کیے گئے سرکش فیصلے اس کی پوری ہستی کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں جہاں اپنی رائے دینے لی خواہش نہیں ہوتی لیکن یہ ارمان ضرور ہوتا ہے کہ مجھ سے رائے مانگی جائے حالانکہ اس کے جواب میں ے یہی کہنا ہوتا ہے۔

"جیسی تم لوگوں کی خوشی۔" لیکن اس ایک جملے کو ادا کرنے میں ایک ایسی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ جس کا ں نعم البدل نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اکثریت ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں رکھتی اور جانے انجانے میں بزرگوں کا دل دکھانے کا سبب بنتی رہتی ہے اور پھر یہ شکایت کرتی نظر آتی ہے کہ زندگی میں سے سکون ختم ہو ہے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ذہنی انتشار پیچھا نہیں چھوڑتا۔

رومیلہ ان پر سے نظریں ہٹا کر الیان اور ریاض غفار کو دیکھنے لگی۔

ریاض غفار ایک بار پھر بے بس ہو کر خاموش ہوگئے تھے اور ایک بار پھر الیان کو آگے بڑھنا پڑا تھا مگر اس بار ے بھی بولنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

"نانی اماں۔۔۔ ممی۔۔۔ آپ سے شرمندہ ہیں۔۔۔ وہ آپ کو فیس نہیں کرسکتیں۔۔۔ بلکہ ہم سب شرمندہ ہیں۔۔۔ پلیز ہم سب کو معاف کردیں۔"

"لیکن ایسی کیا آفت آگئی تھی کہ تم۔۔۔" نانی اماں ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں تو الیان کی ہمت بھی ب دے گئی۔

اس نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرکے انہیں خاموشی سے رونے دیا کہ صفائی میں کہنے کے لیے اس کے ں پاس تھا نہیں البتہ ایک بار وہ دل کا غبار نکال لیتیں تو وہ ان کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیتا۔

س یہی سوچ کر وہ خاموش ہوگیا تو رومیلہ حیرانی سے کبھی نانی اماں کو اور کبھی ریاض غفار اور کبھی الیان کو دیکھنے ل آخر اس کی برداشت جواب دے گئی تو اس نے آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ رکھے واٹر ڈسپنسر میں سے پانی نکالا ان کے برابر میں آبیٹھی۔

"نانی اماں۔ یہ لیں پانی پی لیں۔" اس نے ابھی ابھی الیان کو انہیں نانی اماں کہتے سنا تھا لٰہذا اس نے بھی یہی طرز مخاطب دہرا دیا۔

الیان نے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اسے نانی اماں کے برابر میں براجمان دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ودنانی اماں بھی پل بھر کے لیے ہچکیاں لینا چھوڑ کر رومیلہ کو دیکھنے لگیں۔

"اس طرح رونے سے تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" رومیلہ نے پانی کا گلاس ان کے لبوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ تو انہوں نے پانی پینے کی بجائے ہاتھ اٹھا کر گلاس پکڑ لیا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔" ان کے پوچھنے پر رومیلہ کو اچانک یاد آیا کہ وہ ایک دن کی دلہن ہے تبھی تھوڑا جھجکتے ہوئے بولی۔

"رومیلہ۔" رومیلہ کہہ کر انتظار کرنے لگی کہ شاید اب وہ کچھ کہیں مگر وہ تو بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ آخر کچھ دیر بعد انہوں نے بڑا غیر متوقع سوال پوچھا۔

"کب سے جانتی ہو تم الیان کو؟"

"جی۔" رومیلہ کے جیسے کچھ سمجھ میں نہ آیا ریاض غفار نے البتہ لب کشائی کی مگر نانی جان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے سوال کی وضاحت کرنے لگیں۔

"میں پسند کی شادی کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن پسند کی شادی میں اتنی جذباتیت کا مظاہرہ کرنا اور اس میں اتنے لوگوں کی دل آزاری کرنا اس کی شدید مخالفت کرتی ہوں۔" رومیلہ منہ کھولے ان کی بات سن رہی تھی۔

ریاض غفار اور ماموں جان سر جھکائے بیٹھے تھے البتہ الیان بغور رومیلہ کے ایک ایک تاثر کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

"کیا تمہارے گھر والوں کو اس جلد بازی کی شادی پر کوئی دکھ نہیں ہوا۔" رومیلہ کی سمجھ میں یہ تو آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

الیان کے کزنز کی گفتگو سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کے اس طرح اچانک شادی کر لینے سے خاصے دلبرداشتہ ہوئے ہیں۔

مگر اس شادی کو وہ کوئی کورٹ میرج جیسی لو میرج سمجھ رہے ہیں یہ اندازہ اسے نانی جان سے مل کر ہوا تھا۔

"کون کون ہے تمہارے گھر میں۔" نانی اماں اب سوگ منانا چھوڑ کر اس کا انٹرویو لینے پر اتر آئی تھیں۔

نازک نازک سے نین نقش والی کچھ گھبرائی گھبرائی سی یہ نکھری نکھری لڑکی انہیں پہلی نظر میں ہی متاثر کر گئی اور پھر اس حقیقت پر چاہے جتنا بھی کڑھا جاتا اس سے انکار تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اب الیان کی بیوی ان کے خاندان کی بہو تھی۔

چنانچہ انہیں سارے روایتی سوال یاد آنے لگے تھے۔

"بتاؤ نا کون کون ہوتا ہے تمہارے گھر میں۔"

"ج۔۔۔ جی میرے والد اور بھائی بھابھی ہیں۔"

"اور تمہاری والدہ۔"

"ان کا تو بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔" رومیلہ نے آہستگی سے کہہ کر سر جھکا لیا تو نانی اماں جو اس پر بگڑنے اور اس سے بازپرس کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ ایک دم پسیج گئیں۔

"اوہ تبھی شاید تمہیں معاشرے کی اونچ نیچ سمجھانے والا کوئی۔۔۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں نانی اماں۔ میں اتنی نا سمجھ نہیں کہ شادی جیسا اہم فیصلہ خود تن تنہا جلد بازی میں کر ڈالوں۔" رومیلہ نے رک کر ایک نظر الیان اور ریاض غفار کو دیکھا وہ دونوں اسے ہی دیکھ رہے تھے جیسے یہ جاننا چاہتے ہوں کہ وہ اب کیا کہتی ہے۔

جبکہ رومیلہ کی نظروں میں ان کے لیے الجھن بھری تھی کہ آخر وہ لوگ سچ بتا کیوں نہیں دیتے جن حالات میں یہ شادی ہوئی ہے اس کی وجوہات چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

الیان کی کزنز سے اسے اتنا تو علم ہو گیا تھا کہ ان کے گھر میں کل کسی کی شادی ہے باقی کی تفصیلات پوچھنا اسے اچھا نہیں لگا تھا اور اب وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پہلے ہی جو ہوا وہ کوئی خوشگوار واقعہ نہیں تھا لیکن اسے نہ بتانے کی صورت میں ان دونوں کا کردار زیادہ مشکوک ہو رہا تھا بانسبت اسے کھول کر بیان کر دینے میں۔

رومیلہ نے ان پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچی اور کہنا شروع کیا۔

"میرے بھائی نے میری شادی کینیڈا میں مقیم ایک لڑکے سے طے کی تھی جس کی ساری معلومات کینیڈا میں رہنے والے ایک دوست نے کی تھی۔ کچھ دن پہلے جب وہ لڑکا شادی کے لیے کراچی آیا تب پتا چلا کہ یہ تو وہ ہے ہی نہیں جس سے کینیڈا میں میرے بھائی کے دوست نے ملاقات کی تھی۔ ابرار بھائی اس دھوکے پر بھڑک اٹھے انہوں نے رشتہ ہی ختم کر دیا۔ کسی لڑکی کی بارات اگر دو دن پہلے آتے آتے رہ جائے تو اس کی معاشرے میں کیا عزت رہ جاتی ہے یہ کوئی بیان طلب نہیں ہے۔

اس لیے ابرار بھائی نے فوراً" الیان سے رابطہ کیا یہ اور میرے بھائی دوست ہیں الیان نے اس کڑے وقت میں میرے بھائی کی جو مدد کی ہے اس کے سامنے احسان کا لفظ بھی چھوٹا پڑتا ہے۔

میں یہ نہیں جانتی کہ انہوں نے آپ سب لوگوں کو اطلاع کیوں نہیں دی اس کے پیچھے بھی ضرور کوئی وجہ ہو گی مگر جو آپ سمجھ رہی ہیں وہ بات ہرگز نہیں ہے ہماری شادی سب کے سامنے باقاعدہ طریقے سے ہوئی ہے ہم نے کوئی کورٹ میں جا کر رجسٹر میرج نہیں کی۔" کمرے میں موجود چاروں نفوس اس کی بات پورے دھیان سے سن رہے تھے۔

نانی اماں اور ماموں جان تو شکل سے ہی کافی سنجیدہ اور دکھی لگ رہے تھے البتہ ریاض غفار کچھ حیران حیران سے تھے جیسے ان کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کس رد عمل کا اظہار کریں۔

صرف ایک الیان تھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا وہ محض سپاٹ نظروں سے رومیلہ کو دیکھ رہا تھا۔

اسے یہ تو یقین تھا کہ رومیلہ جھوٹ نہیں بول رہی تھوڑی بہت معلومات تو وہ بھی کر چکا تھا اس لیے اس کے بخوبی سمجھ میں آگیا تھا کہ ابرار نے بریرہ کو اسی لیے اغوا کیا تھا کہ اس کی بہن کی شادی ٹوٹنے کے باوجود وقت مقررہ پر ہو جائے مگر اسے رومیلہ کی مکاری پر تاؤ آرہا تھا کس قدر معصوم بن کر وہ اس کی اور ابرار کی بے مثال دوستی کی داستان سنا رہی تھی ایسے سادہ سے لہجے میں وہ بول رہی تھی جیسے الیان خود سے قربانی دینے آگیا ہو اپنی دوستی نبھانے کے لیے۔

اسے یقین تھا ابرار کی اس سازش میں اس کا پورا گھر شریک ہے مگر آفرین تھی اس لڑکی پر جس نے اتنی زبردست اداکاری کرتے ہوئے ایسے بھولپن سے سب کہا کہ ریاض غفار تک اس کی کہانی سے متاثر نظر آرہے تھے۔

"یہ سب تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" نانی اماں نے الیان کو دیکھتے ہوئے پوچھا ان کے لہجے میں اب شکایت نہیں تھی بلکہ ایک ستائش تھی تبھی وہ کہہ رہی تھیں۔

"تم نیکی کا ڈھنڈورا پیٹ کر اسے ضائع نہیں کرنا چاہ رہے ہو گے لیکن بیٹے سچ کو چھپا کر تم ہم سب کو خود سے اور اس لڑکی سے بدگمان کر رہے تھے۔ جب تمہارے دوست نے تم سے مدد مانگی تھی تمہیں تبھی ہمیں بتا دینا چاہیے تھا ہم تمہارے ساتھ بارات لے کر جاتے۔" نانی اماں کا لہجہ خوش گوار ہوتا دیکھ کر ماموں جان بھی مسکراتے ہوئے بولے۔

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں، ہم تو اس بے چاری کے بارے میں جانے کیا کیا سوچ بیٹھے تھے۔" پھر رومیلہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"ویسے ہمیں معلوم ہے تمہاری کوئی کورٹ میرج نہیں ہوئی باقاعدہ ہوٹل میں نکاح ہوا ہے۔ اتنی تفصیل تو
اخبار میں موجود تھی۔" ان کی بات پر نانی اماں ایک دم جیسے کچھ یاد آنے پر تیزی سے بولیں۔
"ذرا پتا تو کرو یہ اخبار میں تصویر کس رپورٹر نے لگادی۔ اللہ رحم کرے ہماری بہو کی تصویر اخبار میں چھاپ دی
وہ بھی دلہن کے روپ میں۔"
"میری تصویر۔" رومیلہ نے بے یقینی سے کہا۔
"ہاں تم دونوں کی تصویر سے ہی تو ہمیں تمہاری شادی کا پتا چلا ہے۔ اب بھلا بتاؤ کتنے لوگوں کی نظر پڑتی ہے
اخبار پر۔" نانی اماں کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا اس لیے اب انہیں یاد آیا تھا کہ ان کا کتنا دل جلا ہے رپورٹر کی
اس حرکت سے۔
ریاض غفار ماموں کو خوشگوار ہوتا دیکھ کر شکر کا کلمہ پڑھے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے یہ اور بات تھی کہ
رومیلہ کی تصویر اخبار میں چھپنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور الیان کو تو یقین تھا کہ یہ سب ابرار کا کیا دھرا
ہے تو بھلا وہ رپورٹر کے خلاف ایکشن لینے کا کیوں سوچتا۔
البتہ نانی اماں کے جارحانہ انداز نے اسے چند لمحوں کے لیے سن ضرور کردیا تھا جو عورت صرف اپنی بہو کی
تصویر اخبار میں چھپنے پر اتنی غضبناک ہو رہی ہے جسے یہ گوارہ نہیں ہو رہا کہ جانے کتنے مردوں نے اسے دیکھا ہوگا
اسے اگر دوسری بہو اور اپنی نواسی کے اغوا ہونے کی بات پتا چل گئی تو اس کا کیا ردعمل ہوگا کہ ان کے گھر کی عزت
تین دن اور دو راتوں سے گھر سے باہر ہے۔
الیان ایک دم بری طرح مضطرب ہوگیا وہ فوراً یہاں سے جانا چاہتا تھا مگر ان کی خوش گپیاں ہی ختم نہیں
ہو رہی تھیں۔
نانی اماں کی ہر حرکت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں رومیلہ بہت پسند آگئی ہے وہ بڑے دلار سے کہہ رہی تھیں۔
"جوڑے تو اللہ تعالیٰ آسمان پر بناتا ہے۔ جب 'جہاں اور جس سے نکاح لکھا ہوتا ہے تب' وہاں اسی کے ساتھ
ہوتا ہے۔ تم دل چھوٹا نہ کرو اسی میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوگی اب دیکھنا میں بریرہ اور حامد کی شادی والے دن
کیسے دھوم دھام سے تمہارا ولیمہ کرتی ہوں۔ تمہیں آج ہی الیان کی ممانیوں کے ساتھ جاکر کل کے ولیمہ کے لیے
ایک شاندار جوڑا لے کر آنا ہے ابھی بھلے ہی تم نے بریرہ کا جوڑا پہن لیا ہے مگر آگے ایسا نہیں ہوگا۔" الیان چونک
کر نانی اماں کو دیکھنے لگا۔ جو ماموں جان سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھیں۔
"دیکھو نا کتنا بڑا دل ہے میری بریرہ کا۔ بات پکی ہونے پر جو جوڑا سسرال کی طرف سے آیا تھا وہ نکال کر بھابھی کو
دے دیا۔" رومیلہ کو سخت تعجب ہوا تھا بے ساختہ وہ کہہ اٹھی۔
"یہ بریرہ کون ہے؟" اس کے سوال پر وہ چاروں بری طرح چونک اٹھے۔
"تم ابھی تک بریرہ سے نہیں ملیں۔" نانی اماں نے حیرانی سے پہلے رومیلہ کو دیکھا پھر تعجب بھری نظروں سے
الیان کو دیکھنے لگیں۔
"بریرہ کہاں ہے الیان؟" الیان کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔ سب کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پیلس ہوٹل سے واپسی میں زوبیہ کا ذہن بہت بری طرح الجھا ہوا تھا عائشہ اختر کے ساتھ گھر جاتے ہوئے اسے
گھر جانے سے خوف آرہا تھا۔

ملے ہی اسے شائستہ خالہ کی روح ہمیشہ سے نظر آرہی تھی اور جب کوئی اس سے یہ کہتا کہ یہ تمہارا وہم ہے تب
ی طرح چڑ جاتی تھی مگر پھر بھی دل میں کہیں یہ امید اور خواہش پل رہی تھی کہ یہ واقعی اس کا وہم ہو۔ لیکن
ی باتوں نے اس کے خوف و ہراس میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔
ہاں ہوٹل میں بھی اس نے بہت زہر مار کر چند نوالے کھائے تھے یہ تو شکر تھا کہ عائشہ اختر نے خود بھی بہت کم
ھاکر اسے گھر چلنے کے لیے کہہ دیا ورنہ تو وہ اصرار کرکے اسے زچ کردیتی تھیں۔
وبیہ کو ان کی غیر معمولی خاموشی نے تھوڑی دیر کے لیے حیران بھی کیا مگر اس کے پاس ان پر غور کرنے کا وقت
ہی تھا۔
وہ تو تب سے یہی سوچ جارہی تھی کہ اس کے علاوہ یہ سب خرم کے ساتھ ہی کیوں ہوا۔ کیا اس لیے کہ خرم
ے کمرے میں رہتا ہے۔ لیکن شائستہ خالہ کی روح کوئی صرف اس کمرے تک تو مقید نہیں ہے۔ وہ تو زوبیہ
ساتھ اس گھر سے اس گھر میں منتقل ہو چکی تھی۔ تو کیا شائستہ خالہ وہاں اور یہاں دونوں جگہ آتی جاتی رہتی

اسے اب خیال آرہا تھا کہ اسے خرم سے کہنا چاہیے تھا وہ ان سے بات کرنے کی کوشش کرے کیا پتا خرم ان
ات سننے میں کامیاب ہوجائے بلکہ اسے خرم کو بتانا چاہیے تھا کہ شائستہ خالہ کی روح سے ڈرنے کی ضرورت
ہے۔ وہ کسی کو تب تک تکلیف نہیں پہنچاتیں جب تک کوئی دوسرا کسی اور کو تکلیف نہ پہنچائے یا بے وقوف
کی کوشش نہ کرے۔
اسے یہ بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے خرم کو تاکید کیوں نہیں کی کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے جیسی اسی کی
ت رخسار نے کی تھی اور بدلے میں شائستہ خالہ نے اس کا سر زمین پر دے مارا تھا۔
ہیں وہ خرم کو بھی کوئی چوٹ نہ پہنچادیں۔ اسے اب اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ وہ اس قدر سن کیوں ہوگئی تھی
کہ بول سکی اور نہ کچھ پوچھ سکی۔ اسے کم از کم یہ تو پوچھنا چاہیے تھا کہ شائستہ خالہ کی روح اسے صرف اپنے
رے میں نظر آتی ہے یا پورے گھر میں وقتاً فوقتاً دکھائی دیتی ہے۔
اس نے تو خرم سے کوئی بات ہی نہیں کی اور عائشہ اختر کو آتا دیکھ کر اسے چلتا کردیا یہ عائشہ اختر کو بھی اسی وقت
ا تھا ویسے تو ہر جگہ گھنٹوں لگادیتی ہیں جہاں جاتی ہیں وہاں سے آنے کا نام نہیں لیتیں بس اسی دن فوراً آگئیں۔
کہ وہ اس دن بھی بڑی دیر سے آئی تھیں یہ صرف زوبیہ کا غصہ تھا جو وہ ایسے سوچ رہی تھی۔)
یادہ متجسس ہونے پر وہ بس یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتی کہ خرم نے اس کا نمبر لیا ہے وہ اسے فون ضرور کرے

ایک دن اسی انتظار میں گزر گیا اور اس کا موبائل ہمیشہ کی طرح خاموش ہی پڑا رہا۔ دوسرا دن گزرنے پر زوبیہ
چینی سوا ہوگئی اور آخر ایک دن اس نے خود ہی موبائل اٹھا کر خرم سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دوسری
گھنٹی کی آواز سنتے ہوئے زوبیہ کی ہتھیلیاں تک پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

ناولٹ

نسرین نگہت سبزواری

وفا کے گرداب

جب ماں کے نادر شاہی فرمان کے مطابق احمد ولی ان کے چہیتے اور اکلوتے بھائی کی اولادوں کے لیے بقرعید کے موقع پر عیدی کے سامان سے لدا پھندا ماموں کے گھر پہنچا تو لڑکیوں کا ایک جم غفیر ماموں جان کی سب سے بڑی کار کے گرد جمع تھا اور وہ سب بیک وقت کار میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ولی کے لیے ان میں سے کئی چہرے اجنبی تھے شاید ان میں ممانی جان کی اپنی بھانجیاں، بھتیجیاں اور محلے کی چند لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ولی کو خیال آیا کہ ان لڑکیوں کی بجائے جنھوں نے حال ہی میں سب سے زیادہ لڑکیاں ایک کار میں سما جانے کا ریکارڈ قائم کر کے گنیز ورلڈ بک میں اپنا نام لکھوایا ہے۔ اس میں اس گروپ کا نام شامل ہونا چاہیے تھا اور ولی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے دیکھتے ہی دیکھتے وہ فوج ظفر موج اس بڑی کار میں سما گئی۔ ممانی جان ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر براجمان تھیں، ان کی گود میں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ثانیہ تھی، حالانکہ وہ بھی عمر میں چودہ پندرہ سال سے کم نہیں تھی اور اپنی ماں کی طرح فربہی کی طرف مائل تھی۔ اس نے اس ہنگامے میں ابھی تک ولی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی زور، زور سے چلانے لگی۔

"ولی بھائی جائیے گا نہیں، ہم بس ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔" پچھلی سیٹوں سے بھی اسی قسم کی کوئی کوشش ہو رہی تھی۔ ولی اندر پہنچا تو سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صرف باورچی خانے سے برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ولی پلٹ کر برآمد میں بیٹھے منشی جی کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ صاحب اپنی چھ عدد لڑکیوں کے علاوہ اپنی بھا بھتیجیوں اور محلے کی چند لڑکیوں کو چوڑیاں پہنوانے ہیں۔ ولی نے طویل سانس لیا۔ عام حالات میں ممانی جان جب شاپنگ کرنے جاتی تھیں تو ان کے کئی گھنٹوں کا نسخہ ہوتا تھا۔ اور آج تو وہ نہ جانے لڑکیوں کو لے کر گئی تھیں۔ یقیناً" ان کی واپسی را گئے ہوگی۔

ولی کو ان کا انتظار کرنا تھا۔ کیونکہ امی کے کے مطابق ولی کو سارا سامان ممانی جان کے حوا کر کے جانا تھا اور یہ بھی بتانا تھا کہ فردا" فردا" کس لیے کیا چیز ہے، ولی کی امی اپنی حیثیت کے مطابق ہر بقرعید پر بڑے اہتمام سے بہترین تحفے انھیں بھجوا تھیں، لیکن ممانی جان کو وہ تحفے کبھی پسند نہیں آ تھے۔ انہوں نے کبھی انہیں درخور اعتنا سمجھا تھا نہ کبھی ان کی اس کوشش کو سراہا تھا اور نہ ہی کبھی بد میں کچھ بھیجا تھا، لیکن ولی کی امی اس بے اعتنائی باوجود بڑی باقاعدگی سے اپنا شوق پورا کرتی تھیں بقول ان کے ان کا ایک ہی تو بھائی تھا۔ بڑے بھ ہونے کے ناتے ولی کے ماموں عید پر ان کے گھر آ اور اس کی بہن ناجیہ کے ہاتھوں پر عیدی ضرور رکھ کرتے تھے اور ولی کی امی نہال ہو جاتی تھیں۔ جان نے کبھی ان کے ہاں آنے کی زحمت گوارا نہیں تھی اور ولی کا خیال تھا کہ ماموں اپنی بیوہ بہن کی اولاد

الی بھی بیوی سے چھپا کر کیا کرتے تھے۔ ولی کو یہ بالکل پسند نہیں تھی، لیکن وہ امی کی بے پایاں کے سامنے مجبور تھا۔ وہ بھائی کے دیئے ہوئے پوں کو بڑی عقیدت سے سنبھال کر رکھا کرتی اور محلے والوں کو فخر سے بتاتے ہوئے اس رقم گنا فرضی اضافہ کر دیا کرتی تھیں۔

باپ کی وفات کے بعد ولی کے چھوٹے سے خاندان بہت مشکل وقت دیکھا تھا۔ وہ اچھے خاصے ے پر قائم تھے، لیکن انتہائی ایماندار افسر ہونے کی حیثیت سے ایک چھ، سات مرلے کے مکان کے علاوہ کوئی جائیداد نہیں بنا سکے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کا کنبہ مختصر تھا۔ والد کی وفات کے چند ماہ بعد ہی وہ اپنی بڑی شان دار سرکاری کوٹھی چھوڑ کر اپنے چھوٹے سے مکان میں آبسے۔ باپ کی پینشن میں ان کا گزارا بمشکل ہوتا تھا، دونوں بہن بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ ولی کی امی نے ایک پرائیویٹ کالج میں جاب کر لی تھی۔ یوں زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل پڑی تھی۔ ان کی ممانی کا رویہ والد کے انتقال کے بعد کچھ اور بھی

بے گانہ ہو گیا تھا۔ لیکن فرزانہ بیگم کو اپنے اکلوتے بھائی' بھاوج اور ان کی اولادوں سے بے پناہ محبت تھی' لیکن ممانی کو شاید اپنی نند اور ان کے کنبے سے کوئی رغبت نہیں تھی اور وہ مروتاً" بھی اس ناپسندیدگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتی تھیں۔ ماموں تو کبھی کبھار آجاتے تھے' لیکن ممانی جان بہت کم یہ تکلیف گوارا کرتی تھیں اور آتیں تو اتنے تکلف اور بے گانگی کے ساتھ کہ ولی اور ناجیہ الجھ کر رہ جاتے اور فرزانہ بیگم ان کے آگے بچھ بچھ جاتیں کہ وہ دونوں شرمندگی محسوس کرنے لگتے۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں داخل ہوتے ہی راشدہ بیگم کا منہ بن جاتا اور جتنی دیر وہ بیٹھی رہتیں' بے زار سا منہ بنائے بیٹھی رہتیں۔ اپنی نند کی خاطر مدارات کو انہوں نے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ زیادہ سے زیادہ چائے کی پیالی بمشکل قبول کرتیں۔

ولی کو اپنی امی کا اس قدر جھکاؤ دیکھ کر غصہ تو آتا تھا' مگر وہ مجبور تھا' سب سے بڑی مجبوری تھی کہ ولی کے والد سرفراز صاحب کی زندگی میں ولی کی بہن ناجیہ کا رشتہ ماموں جان کے اکلوتے بیٹے مشہود سے طے پا چکا تھا اور اب ان کے انتقال کے بعد ولی کی امی کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں راشدہ بیگم ان کی مالی حالت سے گھبرا کر یہ رشتہ نہ توڑ دیں' جبکہ ولی نے اپنی پیاری سی بہن کی حیا بار آنکھوں میں مشہود کے لیے پسندیدگی بھی دیکھی تھی اور سب سے بڑھ کر مشہود بھی ناجیہ کو پسند کرتا تھا۔ وہ سعودی عرب میں جاب کر رہا تھا اور جب بھی پاکستان آتا تو ناجیہ کے لیے پیارا سا تحفہ لانا نہیں بھولتا تھا۔ (اور اب تو پچھلے دو سال سے وہ پاکستان آیا بھی نہیں تھا اور یہی بات فرزانہ کے لیے باعث تشویش بھی تھی' لیکن حقیقت صرف یہ تھی کہ کچھ نئے پروجیکٹس شروع کرنے کی وجہ سے وہ بے حد مصروف رہتا۔) بہن کے دل میں اس نازک سے احساس کی وجہ سے وہ اپنی ممانی کے خشک رویے اور بے اعتنائی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا' یہی نہیں اس کی امی اسے ہر ہفتے ممانی جان کے آستانے پر حاضری دینے کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی کا معاملہ ہے' اس لیے انہیں ناجیہ کی ہونے والی سسرال کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔

یہ بھی ولی کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی' ممانی جان کے ہاں ہر ہفتے حاضری دینا اس کی انا پر بہت ہی تازیانہ تھا' جبکہ ماموں جان بھی ملک سے باہر رہتے تھے' دونوں باپ' بیٹے نے شاید یہی کام سنبھال رکھا تھا وہ کما کر لاتے رہیں اور اپنے خاندان کا اسٹیٹس بڑھاتے رہیں۔ ولی کے ساتھ ممانی جان کا رویہ خاصا دل شکن ہوتا تھا۔ وہ تو ولی کے سلام کا جواب بھی بمشکل دیتی تھیں' یہ غنیمت تھا کہ وہ ان کی سات عدد زنانہ اولادوں میں خاصا ہر دل عزیز تھا۔ سوائے تانیہ کے جو بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور ہو بہو ماں کی تصویر تھی' شکل و صورت' جسامت اور فطرت میں' ویسے ماموں جان کے ہاں صرف اس وقت جاتا تھا جب امی کے اصرار کے آگے مجبور ہو جائے' وہ ویسے ہی بہت مصروف رہتا تھا۔ وہ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ اس کی بہترین کوشش تھی کہ وہ اچھی کامیابی حاصل کر کے جلد از جلد جاب کر لے اور امی کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو جائے۔ اس کی دو سالہ بڑی بہن ناجیہ بھی پچھلے سال ماسٹرز کر کے فارغ ہوئی تھی۔ اس نے بھی جاب کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن مشہود کا عندیہ پا کر امی نے اسے روک دیا۔

وہ کافی دیر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا بے زاری کے عالم میں ٹی وی کے چینلز بدلتا رہا۔ اس کا انتظار طویل ہو رہا تھا۔ ممانی جان کے آنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں تھا۔ کچن سے برتن کھنکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پہلے کی بات تھی کہ ممانی جان کے ہاں نوکروں کے علاوہ نوکرانیوں کی بھی ریل پیل ہوتی تھی۔ لیکن شبو کے آنے کے بعد نوکرانیوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر کم ہوئی اور پھر برائے نام رہ گئی۔ اب صرف ڈرائیور' مالی' چوکیدار اور ایک چھوٹی سی بچی رہ گئی تھی جو گھر کا کام کرنے کی بجائے ماموں جان کی لڑکیوں کی خدمت میں حاضر رہتی تھی۔ لڑکیوں کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

اب بھی بیشتر اوقات میں ٹی وی دیکھا کرتی تھیں اور کپڑوں کے اسٹائل اور تراش خراش میں انڈین ڈراموں کی ہیروئنوں کی نقل کیا کرتی تھیں یا پھر شاپنگ کرتی تھیں۔ راشدہ بیگم کو شبو کی صورت میں ایک ایسی نوکرانی مل گئی تھی جو چار نوکرانیوں کا کام اکیلے نبٹا دیا کرتی تھی اور پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔

شبو' راشدہ بیگم کے چچازاد بھائی کی بیٹی تھی اور اب والدین کے انتقال کے بعد لاوارث ہو کر ان کے زیر سایہ آگئی تھی۔ ولی کچن میں پہنچا تو وہ حسب توقع کام میں جتی ہوئی تھی' برتن ایک انبار کی صورت میں اس کے سامنے ڈھیر تھے اور وہ تندہی سے انہیں دھونے میں مصروف تھی۔ دو' تین ہانڈیاں بھی چولہے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ ممانی جان کے ہاں دوپہر کے کھانے کے بعد شام کی چائے پر بھی زبردست اہتمام ہوتا تھا اور کھانے کے دوران برتنوں کا استعمال بھی بے دریغ ہوتا تھا۔ شبو برتن دھونے کے ساتھ ساتھ چولہے پر دھری ہانڈیوں سے بھی نبٹ رہی تھی۔ اس کے کپڑے ملگجے تھے اور بکھرے ہوئے بالوں کی لٹیں صندلی پیشانی پر پسینے سے چپکی ہوئی تھیں۔ وہ ہر بات سے بے خبر کام میں مصروف تھی۔ راشدہ بیگم یعنی ممانی جان کو چوڑیاں پہنانے کے لیے اپنی بھانجی' بھتیجیوں کے علاوہ محلے کی لڑکیاں تو یاد رہی تھیں' لیکن انہیں شبو کا بالکل خیال نہیں آیا تھا۔ ولی کو دیکھ کر شبو ایک لمحے کے لیے چونکی' پھر سر جھکا کر دوبارہ کام میں مصروف ہو گئی۔ ولی آگے بڑھا اور اس کے ساتھ کھڑے ہو کر برتن دھونے لگا۔

"ارے' ارے ولی بھائی' یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" وہ بری طرح بوکھلا گئی۔

"اس طرح کام جلدی نبٹ جائے گا' پھر میں تمہیں مہندی اور چوڑیاں دلانے لے چلوں گا۔" ولی نے اطمینان سے کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ولی بھائی' مجھے مہندی اور چوڑیوں کا شوق نہیں ہے۔" شبو نے اپنے ایک بازو سے ماتھے پر جھولتی ہوئی لٹ کو ہٹاتے ہوئے کہا' کیونکہ دونوں ہاتھ صابن سے آلودہ تھے۔

"میری طرف دیکھو شبو۔" ولی نے اچانک کہا' شبو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کچھ حیران ہو کر ولی کی طرف دیکھا۔

"شبو' تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے' لیکن تمہاری آنکھیں کبھی تمہارا ساتھ نہیں دیتیں۔ پھر تم جھوٹ کیوں بولتی ہو؟" ولی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ شبو کے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔ اس نے عجیب سی نظروں سے ولی کی طرف دیکھا۔

"جب والدین نہ ہوں اور سر پر چھت کی بہت سخت ضرورت ہو تو جھوٹ بولنا پڑتا ہے ولی بھائی۔" شبو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور تیزی سے کچن سے باہر نکل گئی۔ ولی نے بہتے ہوئے نل کو بند کیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے برتن دھونے اور کھانا تیار کرنا ہے۔ اور یہ بھی یقین تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ دوبارہ کچن میں نہیں آئے گی۔ ولی نے ایک طویل سانس لیا اور کچن سے نکل گیا۔

ایک طویل انتظار کے بعد ولی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے واپسی کی ٹھانی' حالانکہ پتا تھا کہ گھر جا کر امی سے زبردست ڈانٹ کھانی پڑے گی' لیکن اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اگر وہ شبو کو ایک بار دیکھے بغیر چلا گیا تو تمام رات سو نہیں سکے گا۔ وہ ٹی وی لاؤنج کے پچھلے دروازے سے اندرونی برآمدے کی طرف بڑھا اور چند قدم چل کر رک گیا۔ شبو اندھیرے میں برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی' پچھلے برآمدے میں عام طور پر اندھیرا رہتا تھا۔ شاید گھر کا کوئی فرد اس طرف بہت کم آتا تھا اور برآمدے کے آخری کونے میں شبو کا کمرہ تھا' اس چھوٹے سے کمرے میں شبو کی چارپائی اور چھوٹی سی میز تھی' جسے وہ رائٹنگ ٹیبل کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ کتابیں وہ ایک ٹوٹی پھوٹی سی الماری میں

رکھتی تھی جو ایک کونے میں پڑی تھی۔ ایک پرانا سا صندوق چارپائی کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ یوں بھی چند جوڑے کپڑوں اور کتابوں کے سوا اس کے پاس کوئی اثاثہ نہیں تھا۔ اس وقت اسی کمرے کے سامنے ستون سے لگی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی' ولی شبو کو متوجہ کرنے کے لیے ہلکے سے کھنکھارا' شبو نے چونک کر مڑ کر دیکھا اور ولی نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شبو میری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ میں بڑے بڑے دعوے کر سکوں۔ لیکن آج تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تمہیں منظور ہو تو میں بہت جلد تمہیں اس جہنم سے نکال کر لے جاؤں گا۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ رک کر بولا۔

"میں نے شاید اپنی اوقات سے بڑھ کر بات کہہ دی ہے' اگر تمہیں برا لگا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔" ولی پلٹنے ہی والا تھا کہ شبو بول پڑی۔

"مسئلہ آپ کا نہیں میری حیثیت کا ہے۔ ایسی بات نہ کہیے جس پر کل آپ کو پچھتانا پڑے۔" شبو تیزی سے مڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ولی چند لمحے وہاں کھڑا رہا' پھر پلٹ کر ٹی وی لاؤنج میں آیا اور باہر نکل گیا۔ اسی لمحے کار پورچ میں رکی اور ڈھیر ساری لڑکیاں چیختی چلاتی' شور مچاتی کار سے باہر نکل آئیں۔

"ہائے ولی بھائی' شکر ہے آپ ابھی گئے نہیں' ورنہ آپ سے لڑائی ہو جاتی۔" فائزہ کے ساتھ اور دو' تین لڑکیاں بھی حلق کے بل چیخیں اور دوڑتی ہوئی آ کر ولی کے بازوؤں میں جھول گئیں' ولی نے بمشکل اپنے آپ کو ان سے چھڑایا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اندر کی طرف چل پڑا۔ ظاہر ہے راشدہ بیگم کے آنے کے بعد اس کا یوں چلے جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ خاص طور سے اس کی امی کو اس کی اس نازیبا حرکت کا پتا چل جاتا تو وہ اسے کبھی معاف نہ کرتیں۔ ممانی جان ویسے تو لڑکیوں کو چوڑیاں پہنانے لے گئی تھیں' مگر یوں ہی رواداری میں وہ ڈھیر ساری شاپنگ بھی کر آئی تھیں' جس کے نتیجے میں ان کا موڈ خلاف معمول زیادہ ہی خوشگوار تھا۔ اور اب ولی کے لیے لازم تھا کہ وہ تمام چیزیں تفصیل سے دیکھے اور ان کی تعریف بھی کرے اور ساتھ ساتھ ممانی جان کی پسند کو بھی سراہے۔ ورنہ ممانی جان تو ناراض ہوتیں سو ہوتیں امی اس کی اچھی خاصی درگت بنا دیتیں۔

وہ نا صرف ان کی تمام خریدی ہوئی چیزیں دیکھتا رہا بلکہ ایک ایک چیز کی دل کھول کر تعریفیں کرتا رہا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس تمام عرصے میں ولی کی امی کی بھیجی ہوئی چیزوں کو کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور وہ تمام تحفے جو امی نے بڑے چاؤ سے خریدے اور شوق سے پیک کیے تھے ایک کونے میں پڑے اپنی قسمت کو رو رہے تھے۔ جب رات کے ایک بجے وہ حویلی سے نکلا تو کوفت' تھکن اور بھوک سے اس کا برا حال تھا' کیونکہ شاپنگ کے جوش میں کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ شام کے سات بجے سے لے کر رات کے ایک بجے تک ان کے ہاں بیٹھا رہا ہے اور چائے کے ساتھ دو' تین بسکٹس کے سوا کچھ نہیں کھایا ہے۔ یہ چائے کی پیالی بھی شبو کی مہربانی کا نتیجہ تھی۔ اس نے تو کھانے کو بھی پوچھا تھا' لیکن اس نے مروتاً" انکار کر دیا تھا کہ وہ سب کے ساتھ ہی کھائے گا اور وہ لوگ شاید باہر سے ہی کھا آئے تھے۔

وہ گھر پہنچا تو ایک اور پریشانی اس کی منتظر تھی اور دروازہ کھولنے امی ہی آئی تھیں اور وہ ان کی شکل دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی گمبھیر مسئلہ درپیش ہے۔ وہ بھی شاید اس کی شکل دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ وہ بے حد بھوکا ہے' بغیر کچھ پوچھے انہوں نے کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا اور ولی ان کے ضبط پر اش اش کر اٹھا کہ یہ معلوم کر کے ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی تھی کہ رات کے ایک بجے ان کا بیٹا ان کے بھائی کے گھر سے بھوکا واپس لوٹا ہے' کھانا کھانے کے بعد وہ کچن میں آیا تو فرزانہ بیگم دو پیالی چائے بنا کر کچن سے نکل رہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سے کوئی

معاملہ شیئر کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور جب انہوں نے وہ مسئلہ بیان کیا تو اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی اور اسے ایک بار پھر لگنے لگا کہ زندگی اب بھی اس پر مہربان نہیں ہے اور قسمت کے ترکش میں ابھی کئی اور تیر باقی ہیں۔ راشدہ بیگم نے انتہائی سخت لہجے میں ٹیلی فون پر نیا نادر شاہی فرمان جاری کیا تھا۔

"چھ مہینے بعد مشہود واپس آ رہا ہے اور جلد از جلد مشہود کی شادی کروانا چاہتی ہیں' جو کہ اب پاکستان میں ہی سیٹل ہونا چاہتا ہے' تاکہ اس کے بعد وہ اپنی بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔" انہوں نے فرمایا تھا کہ ان کے پاس تو کسی چیز کی کمی نہیں' لیکن ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہیں اور سب شادی میں شرکت کریں گے۔ اس لیے جہیز بھی ان کے شان شایان ہونا چاہیے' تاکہ انہیں ان بڑے لوگوں کے سامنے سبکی نہ اٹھانی پڑے۔ ان کے قریبی ملنے والوں میں بڑے بڑے رئیس' بزنس مین اور منسٹرز شامل ہیں۔ جہیز میں کم از کم بڑھیا سی کار ضرور ہونی چاہیے اور بارات کا استقبال کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں تو کم از کم کسی بڑے اور مشہور شادی ہال میں ہونا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا تھا کہ وہ فرزانہ کے حالات دیکھتے ہوئے بس اتنا ہی طلب کر رہی ہیں' ورنہ ان کے بیٹے کے لیے تو بڑے بڑے افسروں' جاگیرداروں اور منسٹروں کے رشتے آ رہے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ ولی اور اس کی امی کے لیے یہی پریشانی کم نہیں تھی کہ اب ناجیہ کو شادی کے بعد ممانی جان کے زیر سایہ رہنا پڑے گا' جبکہ ان کا مزاج اور رویہ روز روشن کی طرح ان پر عیاں تھا' ورنہ پہلے تو یہی امید تھی کہ مشہود اسے اپنے ساتھ سعودیہ لے جائیں گے۔

اوپر سے اتنے عظیم الشان جہیز کا مطالبہ اور ساتھ ہی یہ دھمکی کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کسی اور امیر گھرانے میں کر سکتی ہیں۔ ولی اور فرزانہ بیگم سر پکڑے بیٹھے تھے۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی' ورنہ راشدہ بیگم کے لیے یہ رشتہ توڑنا کون سا مشکل تھا۔ ماموں جان اور مشہود کی مجال نہیں تھی کہ راشدہ بیگم کے سامنے دم مار سکیں۔ اسے یہ بھی ادراک تھا کہ یہ رشتہ ٹوٹ جانے سے اس کی معصوم بہن کے نازک سے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ اس کی خوشی کے لیے اپنی جان تو دے سکتا تھا' مگر اس کی خوشی برباد نہیں کر سکتا تھا۔ بے حد تھکن ہونے کے باوجود اس پوری رات ولی کو نیند نہ آ سکی۔ زندگی پہلے بھی اس کے لیے آسان نہیں تھی' مگر اب تو مسائل کا ایک پہاڑ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کیا کرے گا' راشدہ بیگم کے مطالبات کیسے پورے کرے گا۔

اسے ایم بی اے کے فوراً" بعد اچھی جاب کی پیش کش ہوئی تھی۔ ترقی کے امکانات بھی تھے' مگر فی الحال تو اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ ممانی جان کے مطالبات کیسے پورے کرے گا۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائے گا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر کار نیند کی دیوی کو ہی اس پر ترس آ گیا اور وہ اپنے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ نہ جانے کب نیند کی وادی میں اتر گیا۔

☼ ☼ ☼

آج حویلی میں پھر ہنگامہ برپا تھا' چونکہ آج تانیہ کی سالگرہ تھی۔ فرزانہ بیگم ایسے موقعوں پر پیچھے نہیں رہ سکتی تھیں۔ راشدہ بیگم کے سرد رویے کے پیش نظر وہ خود اپنے بھائی کے گھر بہت کم آتی تھیں اور نزلہ بے چارے ولی پر گرتا تھا۔ آج بھی وہ تانیہ کے لیے تحفوں سے لدا پھندا حویلی پہنچا تھا۔ حسب دستور و حسب روایت وہ تحفے ٹی وی لاؤنج کے ایک کونے میں پڑے تھے۔ اپنی نند کی اس کاوش اور ولی کی اس محنت کو راشدہ بیگم نے گردن کی ہلکی سی جنبش سے قبول کیا تھا' جس پر ولی کی تقریباً" آدھے مہینے سے زیادہ تنخواہ قربان ہو گئی تھی اور وہاں کسی نے انہیں کھول کر دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی تھی' جبکہ وہ تحفوں کی واحد کھیپ تھی جو تانیہ کی خدمت میں پیش ہوئی تھی۔ تحفوں کے اس حشر پر ولی کا خون اندر ہی اندر

کھول رہا تھا، مگر وہ مجبوری کے تحت مہر بہ لب تھا۔

یوں تو ممانی جان کی اپنی قوم ہی تعداد میں خاصی تھی، اس پر سے ان ساتوں بہنوں کی فرداً فرداً سہیلیاں، وہ شور بپا تھا کہ خدا کی پناہ اور حسب معمول اس شور شرابے میں شبو کہیں نہیں تھی، کیونکہ اسے تو بہرحال باورچی خانہ سنبھالنا تھا۔ ہزار حیلوں اور بہانوں کے بعد ولی وہاں سے جان چھڑا کر بھاگنے ہی والا تھا کہ اسے یاد آیا کہ اسی دن بی اے کا رزلٹ نکلا تھا اور شبو سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوگئی تھی۔ وہ آج بھی معمول کے مطابق کچن میں مصروف تھی۔ اس کی خوشی میں شریک ہونے والا کوئی نہیں تھا۔ شاید اسے کسی نے جھوٹے منہ مبارک باد بھی نہیں دی تھی۔

ولی نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ وہ موقع غنیمت جان کے آگے بڑھا۔ شبو ہمیشہ کی طرح کھانے کے بعد کے جھوٹے برتن دھونے میں لگی تھی۔ ولی کو دیکھ کر وہ حواس باختہ ہوگئی اور بوکھلا کر ٹی وی لاؤنج کی طرف دیکھنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں، یہ سب لوگ ڈرائنگ روم میں ہیں۔۔۔ بس ایک منٹ کے لیے۔۔۔" اس نے شبو کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندرونی برآمدے کی طرف لے جانے لگا۔ شبو نے ہاتھ چھڑانا چاہا، لیکن ولی کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ زبان سے وہ ممانی جان کی وجہ سے احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی، ورنہ اس کے ساتھ ولی کی بھی شامت آجاتی، ولی کے ہمدردانہ رویے کے پیش نظر اس کے دل میں ولی کے لیے نرم گوشہ بہرحال موجود تھا۔ برآمدے میں شبو کے کمرے کے پاس آکر اس نے شبو کا ہاتھ چھوڑ دیا، وہ استفہامیہ نظروں سے ولی کی طرف دیکھنے لگی۔

"شبو اپنی شان دار کامیابی پر یہ حقیر سا تحفہ قبول کرو۔" ولی نے سرخ گلابوں کا خوب صورت سا گلدستہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کی اپنی اور شبو کی پسند کے مطابق ساغر صدیقی کی کلیات ساغر بھی تھی۔

"شبو اپنی شان دار کامیابی پر یہ حقیر سا تحفہ قبول کرو بہت بہت مبارک ہو۔"

"ولی بھائی اول تو یہ کامیابی شان دار نہیں ہے، بس سیکنڈ ڈویژن آئی ہے۔"

"شبو اور کچھ نہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا تو سیکھ لو، جس نے تمہیں ذہانت جیسی نعمت سے نوازا ہے، اور خبردار جو تم نے یہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کیا۔" ولی نے پیش بندی کے طور پر کہا، وہ شبو کی محتاط اور لیے دیے رہنے کی ادا سے واقف تھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔

"مگر ولی بھائی میں یہ سب کچھ کہاں رکھوں گی، تائی جان نے دیکھ لیا تو میرے ساتھ آپ کی شامت بھی آجائے گی۔"

"اگر چاہو تو یہ کتاب اپنے تکیے کے نیچے چھپا دینا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے کمرے میں کوئی نہیں آتا۔ ان پھولوں کے ساتھ جو چاہے سلوک کرو، بس اتنا یاد رکھنا کہ سرخ پھول بہت خوب صورت جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں اور میرے دل میں یہ جذبہ تمہارے سوا کسی اور کے لیے نہ کبھی تھا، نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ تمہارے دل میں میرے لیے کیا ہے، یہ تو مجھے معلوم نہیں، مگر اتنی امید ضرور کرتا ہوں تم اس کی ناقدری نہیں کرو گی۔" ولی نے واپس پلٹنے سے پہلے شبو پر ایک نظر ڈالی۔

وہ چودھویں کی رات تھی۔ سامنے ہی درختوں کی اوٹ میں پورا چاند مسکرا رہا تھا اور چاندنی میں نہائی ہوئی سادہ سفید لباس میں ملبوس شبو حیران پریشان سی ولی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں تو پلکیں جھپکنا ہی بھول گئی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہمدردی کے علاوہ کوئی احساس ولی کے دل میں اس کے لیے ہو سکتا ہے۔ ولی نے ہاتھ ہلا کر اسے اللہ حافظ کہا اور اندر کی طرف واپس پلٹ گیا۔ شبو نے بے اختیار کتاب اور پھولوں کو باری باری چوم لیا۔ ولی نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دیا۔ شبو اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ سی کھڑی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا شبو کے پاس پہنچا۔

"میری طرح ان پھولوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ انہیں اتنی پذیرائی نصیب ہوگی۔" اس نے نرمی سے شبو کا ہاتھ تھاما، ہلکے سے دبایا اور واپس لوٹ گیا۔ اب اسے ان تحفوں کا کوئی دکھ نہیں تھا، جن کی یوں ناقدری کی گئی تھی، اس کا تحفہ دل کی بارگاہ میں قبول ہوگیا تھا۔ اندر سے زور، زور سے باتیں کرنے کی آوازوں نے اسے خبردار کردیا کہ ممانی جان اپنی اولادوں سمیت ٹی وی لاؤنج میں واپس آچکی ہیں۔ اس نے شبو پر الوداعی نظر ڈالی اور اندر کی طرف مڑ گیا۔ وہ اسی طرح بے نیازی کے ساتھ کچن میں جاکر مصروف ہوگئی اور پلٹ کر اسے جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

چھ مہینے اتنی تیزی سے گزرے تھے کہ ولی کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوبتا جارہا تھا۔ حالانکہ اس عرصے میں اس کی ترقی ہوئی تھی۔ تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور اس نے قرضے کے لیے بھی اپلائی کردیا تھا، لیکن ظاہر ہے قرضے کی رقم اتنی تو نہیں تھی کہ ممانی جان کے سارے مطالبے پورے ہوجاتے۔ فرزانہ بیگم اب زیادہ تر مصلے پر رہتی تھیں اور تاجیہ کی خوب صورت آنکھوں کے کنارے بھیگے رہتے تھے، لیکن ولی بے بس تھا۔ بقیہ چھ مہینے کی قلیل مدت میں وہ اتنی بڑی رقم کیسے جمع کر سکتا تھا۔ اسے ماموں جان اور مشہود کی طرف سے بھی کوئی توقع نہیں تھی، ماموں جان تو ہمیشہ ہی ممانی جان کے سامنے خاموش ہی رہتے تھے، کیونکہ یہ کاروبار انہیں سسر کی طرف سے ہی منتقل ہوا تھا اور ممانی جان اکثر و بیشتر یہ جتاتی رہتی تھیں، لیکن مشہود کی خاموشی اس کے لیے بہت مایوس کن تھی۔ کبھی کبھی تو اسے خیال آتا کہ شاید وہ تاجیہ کے لیے سنجیدہ ہی نہیں ہے۔

ولی کو مشہود سے بھی شکایت تھی۔ اگر وہ تاجیہ سے محبت کرتا تھا تو اپنی ماں کے سامنے اتنا بے بس کیوں تھا۔ محبت تو بڑے بڑے طوفانوں کا سامنا کر سکتی ہے، اس کی محبت اتنی کمزور کیوں ہے کہ ماں کے ناجائز مطالبات کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ماں کا درجہ بہرحال منگیتر سے بلند ہے، لیکن کیا وہ اس طرح ماں کا غلط کہنا مان کر حق و انصاف کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ مگر وہ خود بھی تو اپنے فرائض کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس میں بھی تو اتنی ہمت نہیں کہ وہ حالات سے بغاوت کرکے اپنی محبت کا ہاتھ تھام لے۔ وہ بھی تو اپنے پیار کے لیے دنیا سے بغاوت نہیں کر سکتا، پھر وہ مشہود سے کیوں اس بات کی توقع کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس مشکل کا واحد حل یہی ہے کہ وہ ممانی جان کے مطالبات پورے کردے۔ اپنی بہن کی معصوم سی دنیا کو اجڑنے سے بچالے۔ لیکن وہ یہ سب کیسے کرے، کہاں سے اتنی بڑی رقم لے کر آئے۔ اور دن تھے کہ ہوا کے دوش پر اڑے جارہے تھے۔

چھ ماہ گزر چکے تھے اور اب چھ ماہ باقی تھے ممانی جان کا اصرار تھا کہ وہ مشہود کی شادی کے فوراً بعد ثانیہ کی شادی کروینا چاہتی ہیں، تاکہ اور لڑکیوں کی باری آئے اور وہ اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوسکیں، اس دن وہ بے حد تھکا ہوا گھر پہنچا تو اسے امی کا شاہی فرمان ملا، اسے ممانی جان کی عیادت کے لیے حویلی جانا تھا۔ ولی کو اب حویلی جانا برا نہیں لگتا تھا۔ اس امید پر کہ شاید اسے شبو کا دیدار نصیب ہوجائے جو کہ بہت کم ہوتا تھا۔ ممانی جان کی ثانیہ کے سوا ساری لڑکیاں اسے اس طرح گھیرے رہتی تھیں کہ باورچی خانے میں جاکر شبو کو ایک نظر دیکھنا ممکن ہی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ یہ امید دل میں لیے حویلی پہنچا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی پورا کنبہ ٹی وی لاؤنج میں جمع تھا۔ ممانی جان کی طبیعت قدرے ناساز تھی، لیکن وہ دل بہلانے کے خیال سے وہیں موجود تھیں۔

انہوں نے حسب دستور ولی کے سلام اور مزاج پرسی کا جواب انتہائی سرد انداز میں دیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی چوتھے نمبر کی بیٹی اس کے سر ہوگئی کہ اگلے دن اس کا ریاضی کا ٹیسٹ ہے۔ لہٰذا ولی اس کی تیاری کروا دے۔ ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ان سب کا شاپنگ کا پروگرام بن گیا۔ یہ وہ واحد سرگرمی تھی جو

ممانی جان کا موڈ بحال کر سکتی تھی۔ ولی کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ ایک تو اسے اس انتہائی غبی اور نکمی لڑکی کو پڑھانے سے نجات مل گئی تھی' پھر یہ امید بھی ہو چلی تھی کہ شبو کو ایک نظر دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے شبو کچن میں نہیں ملی تھی۔ شاید وہ کھانا پکا کر فارغ ہو چکی تھی۔ ولی کو معلوم تھا کہ اگر شبو کچن میں نہ ہو تو پچھلے برآمدے میں ہوتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ فارغ نہیں تھی' صحن میں نلکے کے پاس کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ شاید یہ وہ نفیس اور بے حد قیمتی کپڑے تھے جنہیں اسے واشنگ مشین میں دھونے کی اجازت نہیں تھی۔ مبادا وہ خراب نہ ہو جائیں۔ وہ نرم ہاتھوں سے انہیں دھو رہی تھی اور دھیرے دھیرے گنگنا بھی رہی تھی۔

اے جذبہ دل اگر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

ولی نے پہلی بار شبو کو گنگناتے سنا تھا۔ اس کی آواز بے حد سریلی تھی اور آج اس میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا اسے سنتا رہا۔ اچانک ہی شبو نے مڑ کر دیکھا۔ ولی کو دیکھ کر وہ حیران ہو گئی' پھر ساختہ اس کی نظریں ٹی وی لاؤنج کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ شاید اسے ہر پل یہی ڈر رہتا تھا کہ کوئی ولی کو اس کے ساتھ نہ دیکھ لے۔

"آپ۔۔۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی ولی اس کی نظروں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"گھبراؤ نہیں شبو۔۔۔ وہ ساری شیطان کی خالائیں ممانی جان کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی ہیں اور حسب توقع تین' چار گھنٹے سے پہلے نہیں آئیں گی۔" اس نے ولی کا جملہ نظر انداز کر دیا۔

"آپ کب آئے؟"

"میں تو کب سے یہاں کھڑا تمہاری دلکش آواز سن رہا تھا۔"

"مذاق مت کیجیے۔" شبو دوبارہ کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا' تمہاری آواز واقعی بہت خوب صورت ہے' مگر اپنی ہر خوب صورت چیز کی طرح اپنی آواز چھپا کر رکھتی ہو' شاید اس کے لیے جس کا تمہیں انتظار ہے۔"

"مجھے کسی کا انتظار نہیں اور نہ ہی میں خواب دیکھنے کی عادی ہوں۔" وہ اٹھ کر نلکے کے نیچے کپڑے کھنگالنے لگی۔

"مگر تمہیں کسی کا انتظار نہیں ہے تو کیا میں توقع کروں کہ تم میرا انتظار کرو گی' خواہ تمہارا انتظار کچھ طویل ہی کیوں نہ ہو جائے۔" ولی نے رکتے رکتے کہہ دیا۔

"اگر آپ مجھے میری تمام محرومیوں کے ساتھ قبول کر سکتے ہیں تو میں آپ کا انتظار کیوں نہیں کروں گی۔" اس نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے رسان سے کہا اور ولی اس کی صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔

"لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ کے وعدوں اور میرے انتظار کی حد صرف مایوسی ہے۔ کم از کم میرا انتظار تو انتظار ہی رہے گا' اسی لیے میں خواب نہیں دیکھتی' لیکن میں آپ کا انتظار ضرور کروں گی' کیونکہ انسان کے پاس اپنے لیے بھی تو کچھ کرنے کو ہونا چاہیے۔" اس کی آواز میں جذباتیت تھی اور نہ رومانیت۔ وہ بڑی سادگی سے بول رہی تھی' جیسے یہ روزمرہ کی بات ہو' جبکہ ولی تو خوشی اور حیرت سے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شبو بھی اس کے لیے اپنے دل میں لطیف جذبات رکھتی ہے اور اس کا اظہار اس نے کر بھی دیا تھا' لیکن بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ' شاید یہ حقائق فہمی اس کی فطرت کا خاصہ تھی۔ وہ خواب دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

آج کا دن ولی کے لیے زندگی کا مسرور ترین دن تھا' لیکن ابھی بہت سے مرحلے باقی تھے۔ عشق کی منزل اس کے لیے بہت دشوار تھی۔ اسے تو خوش ہونے اور خوشی منانے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ دل پر ایک بار پھر مایوسی غلبہ پانے والی تھی کہ اسے شبو کا خیال آگیا۔ شبو تو بچپن سے حالات کی سنگینی کا مقابلہ کرتی آئی ہے۔ مگر وہ کتنی بہادر ہے۔ اتنی خدمت اور محبت کے صلے میں اسے صرف نفرت و حقارت ہی ملتی ہے' لیکن اس کے ماتھے پر شکن بھی نہیں آئی۔ اسے کم از کم ایسی صورت حال تو درپیش نہیں ہے' تعلیم میں کامیابی کا حصول اس کے لیے کس قدر دشوار ہے۔ وہ کتنی تنہا اور بے آسرا ہے۔ اس کے سر پر کوئی شفقت کا ہاتھ نہیں ہے۔ کوئی اسے حوصلہ دینے والا نہیں ہے۔ وہ کم از کم اس دنیا میں تنہا تو نہیں ہے۔ بے سائبان تو نہیں ہے۔ اسے بھی ہمت کرنا چاہیے۔ اپنے رب کریم پر سب کچھ چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بے آسرا نہیں چھوڑتا۔ کہیں دور گھڑیال نے دو بجائے تو ولی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ واش روم میں جا کر وضو کیا اور تہجد کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے تمام مسائل اس کے سپرد کر کے ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

ولی مسلسل اپنی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اس نے آفس کے بعد ایک پرائیویٹ کالج میں جاب شروع کر دی تھی۔ آمدنی بڑھنے کی رفتار پھر بھی بہت کم تھی۔ اسے تو ایک قلیل عرصے میں اتنا روپیہ کمانا تھا تاکہ ممانی جان کے مطالبات پورے کر سکے۔ ورنہ ممانی نے تو مشہود اور ناجیہ کی منگنی توڑ دینے کی دھمکی دے دی تھی۔ ان کے لیے یہ رشتہ توڑنا مشکل نہیں تھا۔ ان کے قابل اور کماؤ بیٹے کے لیے بہت سے رشتے مل سکتے تھے' لیکن ناجیہ کے لیے دوبارہ اتنا اچھا جوڑ ملنا مشکل تھا' جبکہ اس منگنی کے بارے میں سارا خاندان اور قرابت والے جانتے تھے نسبت ٹوٹنے پر بدنامی ناجیہ کی ہی ہوتی کہ نہ معلوم کیا برائی دیکھ کر سسرال والوں نے اتنی پرانی منگنی توڑ دی۔ ہمارے معاشرے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لڑکے پر کوئی الزام آ بھی جائے تو دنیا بہت جلد بھول جاتی ہے نظر انداز کر دیتی ہے' لیکن اس لڑکی کو کبھی معاف نہیں کیا جاتا' جس کے ساتھ اس طرح کا کوئی حادثہ ہو جائے۔

ممانی جان کو دھماکے کرنے کی عادت تھی' ایک دھماکہ انہوں نے چھ ماہ پہلے کیا تھا اور ایک اور دھماکہ انہوں نے چھ ماہ بعد کر دیا۔ ان کا تازہ فرمان تھا کہ مشہود اور ناجیہ کے ساتھ ساتھ ولی اور تانیہ کی شادی بھی کر دی جائے۔ بقول ان کے یوں تو تانیہ کے لیے بہت سے رشتے آرہے تھے' لیکن انہیں بہرحال اپنا بھانجا سب سے زیادہ عزیز تھا۔ ولی کے لیے یہ نیا انکشاف انتہائی ہوش ربا تھا۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ ولی کو گھر داماد بننا ہو گا' کیونکہ ان کی بیٹی جن ناز و نعم میں پلی تھی اور جن آسائشوں کی عادی تھی' اسے فرزانہ بیگم کے گھر میں نہیں مل سکتی تھیں۔ وہ صرف بیوہ نند سے ہمدردی کے طور پر اس رشتے کو استوار کرنے پر مجبور تھیں' لیکن بصورت دیگر وہ کوئی بھی قدم اٹھانے کے مجاز تھیں۔

اس دن مدتوں بعد ولی کی امی اپنی بھابھی کے پاس آئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ منت سماجت کر کے چھ مہینے کی مدت میں چند اور مہینوں کا اضافہ کروا لیں گی' لیکن ان کے سر پر ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا' انہیں ولی اور تانیہ کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا' لیکن وہ اپنے اکلوتے بیٹے سے یوں کیسے دستبردار ہو سکتی تھیں' جبکہ وہ اپنی بھاوج کے مزاج سے بھی واقف تھیں اور انہیں تانیہ کی ضدی' خود سر اور مغرور فطرت سے بھی آگاہی تھی۔ راشدہ بیگم نے اپنی تمام لڑکیوں کی تربیت اسی انداز میں کی تھی' مگر تانیہ ہو بہو ماں کی کاپی تھی۔ وہی طنطنہ' غرور و تکبر اور دوسروں کو کمتر سمجھنے کی عادت۔ وہ فوری طور پر کوئی بھی جواب دینے سے قاصر تھیں' لیکن انہیں معلوم تھا کہ انہیں ہر صورت اپنی بھاوج کا کہا پورا کرنا ہو گا۔ دوسری صورت میں ولی کا تو کچھ نہ بگڑتا' مگر ناجیہ کی زندگی تباہ ہو جاتی' لیکن وہ اپنے بیٹے کو بھی کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ بے حد واجبی سی خاطر مدارات کے بعد جب فرزانہ بیگم نے اپنی بھابھی سے اجازت چاہی تو انہوں نے ولی کو حکم دیا کہ وہ ماں کو چھوڑ کر واپس آجائے اور فائزہ کو مڈٹرم امتحان کی تیاری

کروائے۔ اور حسب عادت ولی نے ان کے آگے سر جھکا دیا۔

شام ہو چکی تھی' وہ فائزہ کو پڑھا کر فارغ ہو چکا تھا۔ ممانی جان اور لڑکیاں حسب معمول کہیں باہر چلی گئی تھیں۔ کچن سے کھانے کی خوشبو آرہی تھی' یعنی شبو کچن میں مصروف تھی۔ اس کا دل مچل رہا تھا کہ ایک نظر شبو کو دیکھ لے۔ مگر اس کا فائدہ ہی کیا تھا' اس کے تو اپنے سارے سپنے ٹوٹ گئے تھے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شبو کی آنکھوں میں خوابوں کی کرچیاں دیکھ سکتا۔ اس نے ایک طویل سانس لیا اور باہر کی طرف مڑ گیا' شبو نے اسے کچن کی کھڑکی سے جاتے دیکھ لیا تھا' لیکن اسے کوئی گلہ نہیں تھا' اسے تو بہت پہلے معلوم تھا کہ اس نے اپنی آنکھوں میں خواب سجانے کی جو پہلی اور آخری غلطی کی ہے' اس کا انجام کتنا سنگین ہو گا۔

آج وہ بہت دن بعد حویلی آیا تھا۔ وہ بھی فرزانہ بیگم نے اسے مجبور کر کے بھیجا تھا' وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کے رویے سے ان کی بھاوج کو اس کے دل کا حال پتا لگے —— شام کا جھٹپٹا چھا رہا تھا۔ ممانی جان کی بڑی کار پورچ میں نہیں تھی۔ ولی کو عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ امی کی ضد بھی پوری ہو گئی اور اس کی گلو خلاصی بھی ہو گئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا' یونہی ٹی وی چینلز بدلتا رہا اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکلنے سے پہلے وہ غیر ارادی طور پر کچن کی طرف مڑ گیا۔ شبو کچن میں نہیں تھی۔

وہ پچھلے دو' تین مہینوں سے شبو سے نہیں ملا تھا' وہ کیا منہ لے کر شبو کے پاس جاتا' اگر وہ سوال کرتی کہ اس نے ایسا کیوں کیا' اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ اس کی بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے رنگ بکھیر کر اور پھر وہ سارے رنگ چھین کر اسے ہر خوشی سے محروم کر دے۔ وہ تو خود اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ شبو سے کیسے نظر ملاتا۔ لیکن آج اس کے پاس آخری موقع تھا کہ شبو کو آخری بار ایک نظر دیکھ لے۔ کیونکہ اگلے ہی دن فرزانہ بیگم راشدہ بیگم سے شادی کی تاریخ لینے آرہی تھیں۔ چند دن بعد ماموں جان اور مشہود کی واپسی بھی متوقع تھی۔ اس کے بعد تو ایک ہنگامہ شروع ہونے والا تھا۔ پھر بھلا اسے شبو سے ملنے کی فرصت کہاں ملتی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار شبو کے سامنے اپنی مجبوریاں کھول کر بیان کر دے۔ وہ جانتا تھا شبو اس سے کوئی شکایت نہیں کرے گی۔ لیکن شاید اس طرح اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کے سامنے وہ اپنا دکھ بیان کر سکتا۔

اس نے تو اپنی بہن سے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ نہ ہی شبو کے بارے میں جتایا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر ناجیہ کو اپنے بھائی کے درد سے آگہی ہو گئی تو وہ ساری عمر خوش نہیں رہ سکے گی' اس نے تو بساط بھر تانیہ سے اس کی شادی کی مخالفت کی تھی۔ وہ تانیہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ جب تک ولی نے قسم کھا کر اسے یقین نہیں دلایا کہ وہ اس شادی سے خوش ہے اس کا احتجاج بند نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں وہ اس سے دل کی بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ اسے تو زندگی نے زیادہ دوست بنانے کی بھی مہلت نہیں دی تھی کہ ان کے ساتھ اپنی پریشانیاں شیئر کر سکتا۔ ایک' دو بچپن کے دوست تھے' وہ بھی روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے۔

توقع کے عین مطابق شبو پچھلے صحن میں نظر آگئی۔ وہ نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ شفاف چاندنی میں سفید لباس میں وہ چاندنی کا حصہ لگ رہی تھی۔ ولی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لیتا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کو کبھی عبور نہیں کر سکتا' چاہے صدیاں گزر جائیں۔ آخر کار وہ نماز سے فارغ ہو گئی۔

"شبو!" ولی نے اسے دھیرے سے پکارا۔ وہ جائے نماز سمیٹتے ہوئے اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اور اب بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ولی نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شبو... میں جانتا ہوں' میں نے تمہیں بہت دکھ دیے ہیں' لیکن آج میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں اب تم کبھی میرے لیے آنسو نہیں بہاؤ گی۔ میں اس قابل نہیں ہوں شبو۔" ولی کا گلا رندھ گیا اور وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"یعنی آپ مجھے اس واحد کام سے روکنا چاہتے ہیں جو مجھے سکون دے سکتا ہے۔" شبو نے مسکرا کر کہا۔ شاید اسے اپنے دکھ پر قابو پانا آتا تھا۔

"شبو میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔" ولی کا گلا ایک بار پھر رندھ گیا۔ وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکے ہوئے تھا۔

"ولی..." شبو نے ولی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ اس نے اپنے آپ پر ایک بار پھر قابو پا لیا تھا۔

"ہم آج آخری بار مل رہے ہیں۔ وعدہ کیجیے کہ آج کے بعد آپ اس طرف کبھی نہیں آئیں گے۔ اس لیے میں آپ کو ایک بات بتا دینا چاہتی ہوں۔ شاید اس طرح آپ کے دل کو سکون مل جائے۔ آپ کو مجھ سے شرمندہ ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے بدگمان نہیں ہوں۔ میں آپ کی مجبوریاں جانتی ہوں۔ میرے خوابوں کی پروا مت کیجیے گا۔ مجھے تو عادت ہے خواب ٹوٹتے دیکھنے کی۔ پہلی بار میں نے اپنے خواب اس وقت ٹوٹتے دیکھے تھے جب امی کے بعد بابا بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ امی کی وفات کے بعد بھی میری آنکھوں میں بہت سے خواب تھے۔ اچھی زندگی کے خواب' اعلا تعلیم کے خواب' خوشیوں کے خواب۔ جو صرف بابا کی ذات سے وابستہ تھیں۔

بابا کے بعد میں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیے۔ بلکہ یوں کہیے کہ مجھے خواب دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ آپ سے وابستہ خواب میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اس لیے وہ مجھے دکھ نہیں دیتے۔ آپ کو میرے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل بنا رکھا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنی زندگی اس کے مطابق گزارنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آج کے بعد میں خوش رہنے کی کوشش کروں گی' کیونکہ آج میں نے اپنے حصے کے تمام آنسو بہا دیے ہیں اور ولی آپ کو بھی آج مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ اب آپ بھی میرے بارے میں نہیں سوچیں گے۔ ان چند گھڑیوں کو جو ہم نے ساتھ گزاری ہیں' کبھی یاد نہیں کریں گے اور پورے خلوص کے ساتھ تانیہ کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر دیں گے۔ یہ اس کا جائز حق ہے۔" وہ اپنی متورم آنکھوں میں عجیب سی چمک لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہیں شبو' میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتا جسے میں نبھا نہ سکوں۔ تم کتنی خود غرض ہو' خود تو ہم دونوں کے ماضی کو یاد رکھنے کے سارے حقوق اپنے پاس رکھ رہی ہو اور مجھے ان سے محروم کرنا چاہتی ہو۔ حالانکہ تم جانتی ہو یہ شادی میری مجبوری ہے۔ میری بہن کی خوشیوں کے لیے سودا ہے۔ میں تانیہ جیسی لڑکی کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ بلکہ میں تو تانیہ کو بھی کوئی الزام نہیں دیتا۔ یہ اس کے ساتھ بھی زیادتی ہو رہی ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔ پھر تم مجھ سے ایسا وعدہ کیوں لے رہی ہو جسے میں نبھا نہیں سکتا؟" ولی نے پہلی بار اپنے دکھ کا اظہار اپنے سوا کسی کے سامنے کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آج کے بعد وہ کبھی کسی سے دل کی بات نہیں کہہ سکے گا۔

"اچھا چلیے' یہ وعدہ تو کر سکتے ہیں کہ آپ ایسا کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔" شبو نے ایک بار پھر ولی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ شاید اس طرح وہ ولی کا دکھ ہلکا کرنا چاہتی تھی' اس لیے بھرپور طریقے سے اسے خوش کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ یہ شبو کا ایک نیا انداز تھا۔ وہ ایک خاموش اور سنجیدہ فطرت لڑکی تھی' ولی کے سامنے بھی وہ ریزروڈ سی رہتی تھی' لیکن آج وہ نہ جانے کیا جتانا چاہ رہی تھی' اور یہ حقیقت تھی کہ اس کا یہ انداز دیکھ کر ولی کو بہت تقویت ملی تھی۔ یہ ایک سچ ہے کہ انسان اپنا دکھ تو برداشت کر جاتا ہے' لیکن اپنے

پیاروں کا دکھ سہنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ آج شبو کو یوں مسکراتے اور خوش دیکھ کر ولی کے دل کا بوجھ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر شبو جیسی نازک لڑکی زندگی میں اتنے بہت سے غم اٹھا کر مسکرا سکتی ہے تو اسے بھی زندگی کی اس نئی جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس جنگ میں منافقت اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ یہ قدرت کی کیسی ستم ظریفی تھی کہ وہ جو ہمیشہ سے منافقت اور جھوٹ سے نفرت کرتا آیا تھا' اب اسے پوری زندگی اسی کے سہارے گزارنی تھی۔

"تم جانتی ہو شبو میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہاں اتنا وعدہ ضرور کر سکتا ہوں کہ خوش رہنے کی نہیں تو خوش رکھنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ تانیہ کو خوش رکھنا یوں بھی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا واحد شوق شاپنگ ہے اور میں اسے اس مقصد کے لیے باقاعدگی سے پیسے دیتا رہوں گا' خواہ بقیہ مہینہ ہم دونوں کو فاقے ہی کیوں نہ کرنا پڑیں اور میرا خیال ہے کہ شاپنگ کے لیے تانیہ یہ بھی برداشت کر سکتی ہے۔" ولی نے مصنوعی قہقہہ لگایا اور شبو بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ولی نے شبو کو قہقہہ لگاتے دیکھا تھا۔ ہنستے ہوئے وہ سنجیدہ سی کامنی سے لڑکی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ ولی کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی' لیکن اس نے اسے دبا لیا اور دل کھول کے قہقہے لگاتا رہا۔

"اچھا ولی۔" اچانک ہی شبو سنجیدہ ہو گئی۔

"کار کے ہارن کی آواز آئی ہے' شاید سب لوگ واپس آگئے ہیں' اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔ اب ہمیشہ کے لیے اللہ حافظ۔" اس نے اپنا ہاتھ ولی کی طرف بڑھایا۔ ولی نے بے اختیار اسے تھام کر آنکھوں سے لگا لیا اور تیزی سے اندر کی طرف مڑ گیا۔

✡ ✡ ✡

مشہود واپس آگئے تھے اور حقیقت سے واقف ہوتے ہی انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ سخت طیش کے عالم میں تھے کہ ان کی والدہ نے بغیر ان سے پوچھے ان کے دام لگا کر انہیں سر عام فروخت کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ وہ ناجیہ سے لڑکپن سے محبت کرتے آئے تھے اور اسے کسی بھی قیمت پر کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان کی ماں ان کے نام پر اپنی نند کو بلیک میل کر رہی تھیں۔

وہ جانتے تھے کہ ولی اور تانیہ ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں۔ سب سے بڑھ کر وہ اس وٹے سٹے کے رشتے کے مخالف تھے۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ فریقین پر زبردستی لادا جا رہا تھا۔

"امی آپ نے میری شادی کے لیے یہ شرط لگا دی کہ ولی کو تانیہ سے شادی کرنی پڑے گی اور اسے گھر داماد بھی بننا پڑے گا۔ کیونکہ وہ اپنے گھر میں تانیہ کو خوش رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس طرح اپنے ولی کو ہی بے توقیر نہیں کیا۔ میری عزت بھی دو کوڑی کی کر دی۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ تانیہ اس طرح خوش رہ سکے گی۔ آپ نے اس سے ایک بار تو پوچھا ہوتا کہ وہ بھی اس رشتے سے خوش ہے یا نہیں۔ چلیں وہ تو ناسمجھ ہے۔ خود آپ کو احساس نہیں ہوا کہ آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔ کس لیے پھوپھی جان کو اپنے اکلوتے بیٹے سے محروم کر رہی ہیں' ان کا واحد سہارا چھین رہی ہیں۔ کیا میں اور ناجیہ ایسی صورت حال میں خوش رہ سکتے تھے۔ آپ نے صرف جہیز کے لالچ میں اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ مجھے بتائیے آپ کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ میں اور ابا صرف آپ کی خوشی کے لیے ہی تو سالوں سے دربدر ہیں اور آپ نے مزید پیسے کے لالچ میں اتنا عرصہ اپنی نند کے پورے خاندان کو سولی پر چڑھا دیا۔ صرف اس لیے کہ وہ آپ کی نند ہیں اور آپ ان سے صرف اس لیے نفرت کرتی ہیں کہ وہ غریب ہیں' کاش کبھی آپ نے ان کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھا ہوتا تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ آپ کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہی ہیں۔ جان بوجھ کر ان کی مجبوریوں کا مذاق اڑا رہی ہیں اور آپ نے ان تمام باتوں کی مجھے اور ابا کو خبر تک نہ ہونے دی۔

ابا نے تو خیر ہمیشہ سے ہی آپ کو تمام اختیارات سونپ کر دم سادھ رکھا ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے اتنا ذلیل گھٹیا اور بزدل سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے اس ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاؤں گا۔ اس معصوم کے خاندان کو لوٹ کھسوٹ کر ان کی تمام خوشیاں برباد کر کے آپ کے سامنے سر جھکا دوں گا' افسوس امی' آپ نے تو مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا' ذلیل کر دیا' اب میں کیا منہ لے کر پھوپھی جان اور ولی کے سامنے جاؤں گا۔ ناجیہ کا سامنا کیسے کروں گا۔ وہ لوگ آپ کو تو شاید معاف کر دیں۔ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑے۔ پورا خاندان سر جھکائے ان کے سامنے شرمندہ کھڑا تھا۔ صرف مشہود کے والد اسے افتخار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

آفس کے خطوط میں ایک رجسٹری گل شبو منصور کے نام سے بھی تھی' ولی اس خط کو پا کر ششدر رہ گیا۔

"بھلا شبو کو کیا ضرورت تھی اسے خط بھیجنے کی۔" وہ خط کھولتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ دل میں عجیب سی بے چینی تھی کہ آخر شبو کو اسے خط لکھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ شاید اسے وہ کوئی اہم بات بتانا چاہ رہی تھی' لیکن چونکہ اس دن انہوں نے کبھی نہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لیے اسے خط کا سہارا لینا پڑا۔ مگر وہ اہم بات کیا ہو سکتی تھی' لفافے میں سے ایک پچیس ہزار والا پرائز بونڈ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی انعامات کی تفصیل والا کاغذ تھا اور ایک نمبر پر سرخ پنسل سے دائرہ لگا دیا گیا تھا۔ پچیس ہزار کے بونڈ پر ڈیڑھ کروڑ کا پہلا انعام نکلا تھا۔ ولی کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے لفافے کو دوبارہ جھٹکا تو اس میں سے کاغذ کا ایک اور پرزہ برآمد ہوا۔ یہ ایک مختصر سی تحریر تھی۔ شبو نے بغیر کسی القاب کے چند سطریں لکھی تھیں۔

"یہ پرائز بونڈ وہ واحد اثاثہ تھا جو میرے بابا نے میرے لیے چھوڑا تھا اور اس کی حفاظت کی بہت تاکید کی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس بونڈ پر انعام ضرور نکلے گا اور یہ رقم میری شادی کے لیے کام آئے گی۔ ان کا یہ خواب تو پورا نہ ہو سکا۔ تاہم میں نے اسے بہت حفاظت سے سنبھال کے اب تک رکھا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس پر انعام بھی نکل آیا ہے جو میرے لیے تو بے کار ہے' میں نے اپنے لیے جس زندگی کا تعین کیا ہے اس میں دولت کی گنجائش ہی نہیں۔ نہ ہی میرا شادی کا ارادہ ہے۔ اسے میری طرف سے اپنی شادی پر ایک حقیر سا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیں۔ آپ کو یاد ہو گا کبھی ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب یہ ساتھ خوشی میں ہو یا غم میں۔ وعدہ تو وعدہ ہے نا! ہاں ایک بات اور' مجھے ایک اسکول میں نوکری مل گئی ہے اور ساتھ ہی ہوسٹل میں رہائش بھی۔

اسکول کی پرنسپل نے میرے حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے وہ تمام سہولیات دینے کا وعدہ کیا ہے جو زیادہ تجربہ کار اور کوالیفائیڈ اساتذہ کو حاصل ہیں' بس یہ وعدہ لیا ہے کہ میں جلد از جلد اپنا ماسٹرز مکمل کر لوں گی' حویلی میں رہتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا' مگر ہوسٹل میں' میں ان شاء اللہ جلد ہی اپنا مقصد پورا کر لوں گی۔"

نیچے کوئی پتا درج نہیں تھا۔ ولی حیرت سے گنگ ہو کر پرائز بونڈ کو دیکھ رہا تھا' اس وقت اسے واقعی ایک بڑی رقم کی بہت ضرورت تھی' جس سے وہ ممانی جان کے مطالبات پورے کر سکے۔ لیکن اسے یہ رقم اس طرح ملے گی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا' وہ شبو جس نے اپنے والد کی وفات کے بعد انتہائی کسمپرسی میں زندگی گزاری تھی جو ممانی جان کے گھرانے کی دن رات خدمت کر کے بھی پیسے پیسے کو محتاج رہتی تھی' جو اس بات کے لیے ممانی جان کی حد سے زیادہ احسان مند رہتی تھی کہ انہوں نے اسے پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہے اور کتابوں وغیرہ کے لیے وہ رقم ماموں جان سے حاصل کیا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ چار نوکرانیوں کا کام اکیلے کرتی تھی۔ اس صورت میں اس کا اتنا حق تو بنتا تھا کہ کم از کم اس کی تعلیم کے اخراجات پورے کیے جائیں اور پڑھنے کی اجازت بھی مشہود بھائی کی

مہربانی تھی۔

ولی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ شبو کی اس مہربانی کا کیا اور کیسے جواب دے' اس نے پہلی فرصت میں حویلی جانے کا ارادہ کیا' تاکہ شبو سے اس سلسلے میں بات کر سکے' وہ اس رقم سے ایک شاندار زندگی کا آغاز کر سکتی تھی اور اس نے اپنے لیے کچھ بھی سوچے بغیر سب کچھ اس کے نام کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب وہ حویلی پہنچا تو وہاں کا ماحول انتہائی پریشان کن اور انتہائی دل گداز تھا۔ ٹی وی لاؤنج الٹا پڑا تھا اور وہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سیدھا کچن میں پہنچا' چونکہ اس کا خیال تھا گھر کے افراد یقیناً گھر سے باہر گئے ہوں گے اور شبو اسے وہاں مل جائے گی۔ لیکن وہ وہاں جا کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ کچن میں ممانی جان بمعہ اپنی ساتوں لڑکیوں کے موجود تھیں جو کسی چھوٹے موٹے میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ فرش پر دیگچیاں اور دوسرے برتن لڑھک رہے تھے۔ سنک کے اندر اور باہر گندے برتنوں کا ڈھیر تھا۔ ہر طرف مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ممانی جان اور تانیہ زور' زور سے چلا چلا کر شبو کو گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں۔ دوسری لڑکیاں آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ ہر لڑکی دوسری کو الزام دے رہی تھی کہ اگر اس نے صبح سے کام شروع کر لیا ہوتا تو اب تک تین دن کا پھیلا ہوا کام کچھ نہ کچھ نبٹ چکا ہوتا' ولی حیران پریشان کچھ دیر اس سنگین منظر کو دیکھتا رہا۔ سب سے پہلے تانیہ کی نظر اس پر پڑی۔

''بس یہی کسر رہ گئی تھی کہ آپ بھی تشریف لے آئیں اور ہمارا تماشا دیکھیں۔'' وہ ولی پر برس پڑی۔

اسی وقت ممانی جان کی نظر بھی اس پر پڑی اور ان کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ انہوں نے پہلے تانیہ کو گھور کر خاموش کرانے کی کوشش کی اور پھر ولی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچن سے باہر لے آئیں۔ آج ان کے انداز میں تحکم کی بجائے نرمی اور حلاوت تھی۔

''بیٹا اگر ہو سکے تو صرف آج کے لیے اپنی ماسی کو یہاں لے آؤ۔ اس کم بخت شبو نے ہمیں دھوکہ دے دیا' اچانک ہی یہ کہہ کر یہاں سے دفعان ہو گئی کہ اسے اسکول میں نوکری مل گئی ہے۔ اور اب وہ ہوسٹل میں رہے گی' حرام خور کہیں کی' ساری عمر ہمارا کھایا' ہماری روٹیوں پر پلی' اب ہماری ہی بدولت چار لفظ پڑھ لیے تو دماغ آسمان پر پہنچ گئے۔'' ان کی حلاوت ایک بار پھر تلخی میں ڈھل گئی۔

''امی جان اس نے تو پندرہ دن پہلے بتا دیا تھا کہ اسے اسکول میں نوکری مل گئی ہے اور وہ چلی جائے گی۔ آپ نے ہی اس کی بات نہیں سنی کہ یونہی رعب دکھا رہی ہے' تاکہ ہم اس کی خوشامد کر کے اسے روک لیں اور اسے آگے پڑھنے کی اجازت دے دیں' اب دیکھ لیں' اسے گئے دو ہی دن ہوئے ہیں اور گھر کی کیا حالت ہو گئی ہے' کاش آپ اس کے ساتھ اتنا برا سلوک نہ کرتیں تو شاید وہ یہاں سے جاتی بھی نا۔'' یہ سب سے چھوٹی ثانیہ تھی جس کی رائے سب سے الگ ہوتی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے سچ کہہ دیتی تھی چونکہ تانیہ کے بعد لاڈلے پن میں اس کا دوسرا نمبر تھا۔

''اچھا اچھا... بکواس بند کرو اور جا کر بہنوں کا ہاتھ بٹاؤ۔'' ممانی جان نے کھسیانی ہو کر اسے ڈانٹا اور وہ کچن کی طرف مڑ گئی' ولی نے یہی غنیمت جانا کر جا کر ماسی جنت کو ساتھ لے آئے۔ ورنہ یہ ہنگامہ کبھی ختم نہیں ہو سکے گا۔ ممانی جان نے لڑکیوں کو کام کرنے کی عادت بالکل نہیں ڈالی تھی۔ یہ بھی مقام شکر تھا کہ چند ماہ پہلے ماسی جنت ان کے ہاں آگئی تھی' چونکہ اس کی بہو اور بیٹے نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور اس کے پاس اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ورنہ تو کل وقتی نوکرانی رکھنے کی حیثیت تو فرزانہ بیگم کی بھی نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ فرزانہ بیگم نے ناجیہ کی بہترین پرورش کی تھی اور اسے تعلیم کے ساتھ امور خانہ داری میں طاق کر دیا تھا۔ ماسی جنت کے ساتھ ولی' ناجیہ کو بھی لے آیا۔ ناجیہ نے کمال سمجھ داری سے سب لڑکیوں کو اپنے

ساتھ لگایا اور تھوڑی ہی دیر میں پوری حویلی جگمگا اٹھی۔ مگر تانیہ کا خاص طور سے موڈ سخت خراب تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار گھر کا کام کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ناجیہ کی شادی کو چھ سال گزر گئے تھے۔ وہ لوگ کراچی میں سیٹل ہو گئے۔ امی کے انتقال کے بعد ولی بھی کراچی آگیا۔ یوں وہ زندگی سے مطمئن تھا' لیکن ان چھ سالوں میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی شبو کو نہیں بھول سکا تھا' لیکن اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی' کرتا بھی کیسے وہ تو کوئی نشان چھوڑ کر ہی نہیں گئی تھی۔ حویلی والوں کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا' اس نے یہ سوچ کر بھی اسے تلاش کرنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا کہ جو ہستی اس کی روح میں بستی ہے اسے ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر ایک دن ایک بک اسٹال پر کتابیں خریدتے ہوئے اس کی نظر ایک میگزین پر پڑی۔ اس میں گل شبو نامی کسی مصنفہ کا مضمون چھپا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی تصویر بھی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے میگزین کے ذریعے شبو کا پتا معلوم کیا اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ ایک چھوٹا سا خوب صورت سا گھر تھا' سامنے مختصر سے لان میں گلاب' نرگس اور دوسرے موسمی پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ گھر کی سرخ دیواروں پر مختلف پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ عجیب سی سوچوں کا شکار تھا۔ نہ جانے اتنے سال بعد شبو اسے پہچانے گی بھی کہ نہیں۔ پتا نہیں اس کا آنا' اپنی زندگی میں اس کی مداخلت پسند آئے' نہ آئے۔

''نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا' شبو آج بھی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ لیکن اس کے لیے تو میں ایک غیر شخص ہوں جو شادی شدہ ہے' نہ جانے اس کا رویہ کیسا ہو گا۔'' عجیب عجیب سے وسوسے اسے ستا رہے تھے۔ اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اسے ایک دفعہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ شبو کی بھی شادی ہو سکتی ہے۔ چند لمحے انتظار کے بعد ایک پانچ' چھ سال کے بچے نے دروازہ کھولا۔ بڑا پیارا سا بچہ تھا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

''جی انکل آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' اس نے بڑے ادب سے سوال کیا۔

''بیٹا گل شبو صاحبہ یہیں رہتی ہیں؟''

''تو یوں کہیے نا کہ آپ کو میری امی سے ملنا ہے۔'' بچے نے سر ہلا کر کہا۔ ایک چھنا کا ہوا اور ولی کے آس پاس سب کچھ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔

''گل شبو صاحبہ آپ کی امی ہیں؟'' اس نے ایسے پوچھا جیسے وہ بچہ ابھی اس بات سے انکار کر دے گا۔

''جی ہاں... وہ میری امی ہیں' لیکن اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ آپ کو ان سے ملنا ہو تو شام کو آئیے گا۔''

''اچھا بیٹا ان سے کہہ دینا کہ ولی ان سے ملنے آیا تھا یا کچھ بھی نہ کہنا۔ وہ مجھے جانتی نہیں ہیں' یہی بہتر رہے گا۔'' آخری الفاظ جیسے ولی نے اپنے آپ سے کہے اور تھکے تھکے قدموں سے واپس چل پڑا۔ گھر آکر بھی وہ بہت دیر تک اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا رہا۔

''واہ احمد ولی صاحب آپ کیا سمجھے تھے کہ وہ آپ کے نام کا تیاگ لیے بیٹھی ہو گی۔ اپنی زندگی آپ کے نام کر دی ہو گی۔ مگر کس خوشی میں۔ اس کے لیے تو آپ کی شادی کو ایک عرصہ گزر گیا۔ ایک شادی شدہ انسان کے لیے وہ کیوں جوگن بن جاتی۔ اپنی عمر گنوا دیتی' مانا کہ اس نے تمہارے لیے وہ کچھ کیا جو کسی کے لیے کوئی نہیں کرتا۔ مگر تم نے اس کے بدلے میں اسے کیا دیا۔ اب کیا اسی کا فرض بنتا ہے کہ وہ قربانیاں دیتی جائے۔'' ولی کے پاس اپنے حق میں بھی بہت سے دلائل تھے۔

''میں نے بھی تو اپنی پوری زندگی اس کے نام کر دی۔ اس کے سوا کسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ باوجود کوشش کے اپنی ماں کی آخری خواہش بھی پوری نہیں کر سکا اور وہ چند سال بھی میرا انتظار نہ کر سکی۔ بیاہ رچا کے بیٹھ گئی' بے وفا کہیں کی۔'' ولی

سے دل کی بھڑاس نکالی اور بظاہر مطمئن ہو گیا۔ لیکن اس دل کا کیا کرتا جو شبو کو بھلانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ نیند تو سالوں سے اس سے روٹھی ہوئی تھی' اب تو بالکل باغی ہو گئی۔ پرانی یادوں کی یلغار اسے پاگل کیے دے رہی تھی۔ وہ بہتیرا دل کو سمجھاتا کہ اب وہ پرائی امانت ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے' مگر دل مانتا تو بات تھی' پھر وہ گنتی کے چند لمحے ہی تو تھے جو اس کا کل اثاثہ تھے' لیکن ان مختصر لمحات نے اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا' اس نے سوچا تھا کہ وہ ناجیہ کی بات مان کر شادی کرلے گا کہ اب یہی اس کی سب سے بڑی تمنا تھی' لیکن اس نے ایک بار پھر اسے مایوس کر دیا' نہ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا' ہر لمحہ اسے شبو کا خیال ستانے لگا تھا۔ کبھی کبھی تو دحشت میں وہ آفس سے بھی نکل جاتا اور بلا مقصد سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ کئی دفعہ وہ گاڑی سے ایکسیڈنٹ کرتے کرتے بچا تھا۔ شاید وہ اپنا ذہنی توازن کھو رہا تھا۔ شاید وہ بھی کسی دن مجنوں کی طرح گریبان چاک کر کے جنگلوں میں نکل جائے گا اور اسی طرح موت کی وادی میں اتر جائے گا' بے نام و نشاں ہو جائے گا' مگر کیا فائدہ' شبو کو تو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ اس کا کیا انجام ہوا' اسے تو اس کا خیال بھی نہ آتا ہو گا۔ پھر اس نے خود ہی ایک دلیل دریافت کی۔ وہ آخری بار ایک نظر شبو کو دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید اسی طرح اس کے ذہن کو سکون مل جائے۔

پرائز بونڈ والی رقم آج بھی اس کے اکاؤنٹ میں موجود تھی۔ مشہود نے جہیز کے نام پر کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے ذہن نے ایک بہانہ تراشا۔ شاید اس کے دماغ پر یہی بوجھ ہے۔ اسے ایک بار پھر شبو سے ضرور ملنا چاہیے اور اس کی امانت لوٹا دینی چاہیے۔

جب وہ شبو کے گھر پہنچا تو دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ شبو سے ملاقات ہو جائے' بس وہ آخری بار اسے ایک نظر دیکھ لے۔ دل کی حسرت نکل جائے' پھر وہ یہ شہر ہی چھوڑ دے گا۔ شبو کی محبت جو اس کے دل کی واحد خوشی تھی اب ایک عذاب بن گئی تھی۔ ایک اذیت کی شکل اختیار کر گئی تھی' جو دن میں چین لینے دیتی تھی' نہ رات میں' اب تو رت جگوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کا ذہن ماؤف ہو جائے۔ اسے کچھ بھی یاد نہ رہے۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہ ماں کے حکم عدولی کی سزا ہے۔ زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ شاید یہی بے قراری اس کا مقدر ہے' کیونکہ اسے ماں کی معافی نہیں مل سکتی۔ مگر شادی کر کے وہ اس معصوم ہستی کے ساتھ انصاف نہ کر سکتا۔ اس کے حقوق پورے نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی تو گناہ عظیم تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے بیل بجائی تھی۔ شاید دعا کی قبولیت کا وقت تھا' اس کے سامنے شبو کھڑی تھی۔ ہلکے رنگ کی پرنٹڈ ساڑھی میں وہ ہمیشہ سے مختلف لگ رہی تھی۔

"آپ..." وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"معاف کرنا' میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ دراصل میں ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آیا تھا۔" وہ خوامخواہ ہی پر تکلف ہو رہا تھا۔

"ہاں عمر نے مجھے بتایا تھا جب آپ پہلی بار آئے تھے' آئیے نا' اندر آئیے۔" اندر آتے ہی اس نے پہلا سوال یہ کیا۔

"وہ تانیہ... میرا مطلب ہے آپ کی بیگم کہاں ہیں' انہیں اپنے ساتھ نہیں لائے۔" وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی' چھوٹا سا ڈرائنگ روم شبو کے سلیقے کی گواہی دے رہا تھا۔ ولی نے کچھ کہنا چاہا' مگر وہ اندر جا چکی تھی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں اسکوائش کے دو گلاس تھے۔

"تمہارے شوہر کہاں ہیں؟" شبو اس کی طرف گلاس بڑھا رہی تھی۔ اس سوال پر اس کا ہاتھ لرزا اور نازک سا گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

"میں نہیں سمجھی آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"بھئی میں تمہارے شوہر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں' اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟" ولی نے مسکرا کر ماحول کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میری شادی ہو گئی ہے؟" وہ الجھے الجھے انداز میں بولی۔

"ارے بھئی' عمر تمہارا بیٹا ہے تو پھر..." ولی نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ..." وہ اتنا ہی کہہ سکی اور جھک کر قالین سے شیشے کی کرچیاں اٹھانے لگی۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا شبو۔" ولی نے بے چین ہو کر کہا۔

"عمر کو میں نے پالا ضرور ہے' لیکن وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔" شبو نے آہستہ سے کہا۔

"مگر وہ تو تمہیں ماں کہتا ہے؟"

"ہاں... اسے یہی معلوم ہے' وہ میری ایک کولیگ کا بیٹا ہے۔ ان دونوں نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور دونوں خاندانوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ پھر ایک حادثے میں دونوں ہی زخمی ہو گئے۔ عمر اس وقت بمشکل سال بھر کا ہو گا۔ میں نے عارضی طور پر اس کی ذمہ داری سنبھال لی۔ لیکن وہ دونوں ہی بے ہوشی کے عالم میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کا کوئی رشتے دار بھی نہیں آیا' کیونکہ ہم کسی کو اطلاع ہی نہیں دے سکے تھے۔ یوں یہ بچہ میری ذمہ داری بن گیا۔"

"لیکن تم نے اس سے اپنے آپ کو ماں کیوں کہلوایا' تم اس رشتے کو کوئی اور نام بھی تو دے سکتی تھیں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے' اس کالج کیمپس میں سب مجھے جانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ عمر مجھے اپنی ماں سمجھتا ہے۔ میں اسے حقیقت بتانا بھی نہیں چاہتی' میرے لیے بھی تو یہی سب کچھ ہے۔ میری متاع حیات' میرا اثاثہ۔" وہ جذبات کی رو میں بہہ رہی تھی۔

"کیا تم اسے کبھی نہیں بتاؤ گی کہ تم اس کی ماں نہیں ہو؟" ولی نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ضرورت ہی کیا ہے؟" شبو نے لاپروائی سے کہا۔

"کیوں... ضرورت کیوں نہیں ہے' کیا تمہیں شادی نہیں کرنی؟"

"نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

"کیوں... شادی کیوں نہیں کرنی؟" ولی نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ اس سوال کا جواب نہیں جانتے؟" شبو نے الٹا اس سے سوال کردیا اور پھر خود ہی شرمندہ ہوگئی۔
"میرا مطلب ہے۔"
"شبو آج پہلی بار تم نے اتنے استحقاق سے ایک سوال پوچھا ہے تو میں بھی تمہیں بتادوں کہ اگر تم نے ولی کے علاوہ کوئی اور نام اپنے نام کے ساتھ جوڑنا پسند نہیں کیا تو ولی بھی آج تک تمہارا ہے' صرف تمہارا۔" ولی نے آہستہ سے شبو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شبو نے فوراً" ہی چھڑالیا۔
"آپ کی شادی۔۔۔؟" وہ حیرت کے مارے اتنا ہی کہہ سکی۔
"ہاں شبو۔۔۔ حالات کچھ اتنی خوب صورتی سے بدلے کہ میرے تمام مسائل حل ہوگئے۔ مشہود بھائی نے ممانی جان کی تمام شرطیں ماننے سے انکار کردیا۔ وہ جہیز کے علاوہ ادلے بدلے کی شادی کے بھی خلاف تھے۔ جبکہ تانیہ کو بھی اس رشتے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری زندگی برباد ہونے سے بچ گئی۔ تاجیہ 'مشہود کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے' امی بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ بس اب میں ہوں اور میری یادیں۔ اب تک تو یہی زندگی کا سرمایہ ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔" ولی نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چراگئی۔
"اوہو۔۔۔ میرا بھی کتنا دماغ خراب ہے' کچن میں چائے تیار رکھی ہے اور مجھے لانے کا خیال ہی نہیں رہا۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور ولی نے آسودہ سے انداز میں صوفے کی پشت سے سر ٹکادیا۔ چائے کے دوران خاموشی رہی' اچانک ولی کو خیال آیا۔
"تم نے عمر کو اس کے باپ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟"
"میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ اس کے بابا باہر کے ایک ملک میں رہتے ہیں اور ان کے لیے پاکستان آنا مشکل ہے۔"
"کیا وہ ان بہانوں سے بہل جاتا ہے؟"
"ہاں۔۔۔ اب تک تو بہل جاتا تھا' اب آپ آگئے ہیں تو۔۔۔" وہ بے ساختگی میں کہہ گئی' پھر بوکھلا کر اٹھنے لگی۔ ولی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔
"ہاں شبو۔۔۔ اب میں آگیا ہوں تو کچھ کہو' میں منتظر ہوں۔" کچھ دیر بعد شبو نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں۔
"اس کے بعد جو کچھ کہنا ہے' آپ کو کہنا ہے۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔
"ہاں شبو' میں ایک مدت بھٹکنے کے بعد تمہارے پاس لوٹ آیا ہوں۔ اب میرے اندر تمہیں کھونے کی ہمت نہیں ہے۔" اس نے دھیرے سے شبو کا ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگالیا اور شبو نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ آنسوؤں سے بھیگ گیا ہے۔
"تم عمر کو بتادو' اس کا باپ ہمیشہ کے لیے لوٹ آیا ہے' بلکہ آؤ پوری دنیا کو بتادیں کہ ہم تینوں ایک ہوگئے ہیں' کبھی نہ جدا ہونے کے لیے۔" ولی نے آہستہ سے شبو کو اپنے قریب کیا اور شبو نے اس کے شانے پر سر رکھ کر سکون کے احساس کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں۔
"ارے ہاں شبو۔۔۔" ولی کو اچانک یاد آیا کہ وہ یہاں ایک خاص مقصد سے آیا تھا۔
"تمہاری رقم آج بھی میرے اکاؤنٹ میں جمع ہے' اس کا کیا کریں۔"
"کون سی رقم؟" وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے بولی۔
"یار وہی پرائز بونڈ والی رقم جو تم نے مجھے بھیجی تھی اب یاد آگیا۔"
"مگر وہ آپ کا درد سر ہے۔ مجھے نہیں پتا۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور ولی سوچنے لگا کہ واقعی جب جذبے سچے ہوں تو دولت کی کوئی اہمیت نہیں رہتی' مگر جب دلوں میں کھوٹ ہو تو یہی دولت سب سے اہم ہوجاتی ہے' انسانی اور خونی رشتوں سے بھی زیادہ اہم۔

☆ ☆

بند گلی

سندس جبیں

اس کے تھکے تھکے قدم جیسے ہی تنگ گلی میں پڑے' ٹھنڈی ہوا کا اک جھونکا اسے چھو گیا اس نے ایک طویل سانس لے کر اندر کی تپش کو باہر پھینکا۔ ہاتھ میں پکڑے ٹشو کی مدد سے چہرہ پونچھا۔ حالانکہ وہ پہلے ہی خاصا خستہ حال تھا اس نے ٹشو کو ایک طرف پھینک دیا اور قدم مزید آہستہ کر دیے۔

گرمی کی شدت آج پہلے تمام دنوں سے بڑھ کر تھی۔ مسلسل پندرہ منٹ سے اس گرمی بلکہ سخت چلچلاتی گرمی میں وہ سیدھی سڑک پہ چل رہی تھی جہاں کوئی سایہ نہ تھا' دھوپ جیسے سر میں گھسی جا رہی تھی۔ آج تو اس نے صبح سے ناشتا بھی نہیں کیا تھا اور اس وقت وہ بس گرنے کو ہی تھی مگر پھر وہی.....!

"تنگ گلی۔" یہ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع تھی۔ بڑے بڑے دو دو یا تین منزلہ مکانات میں گھری ہونے کی وجہ سے گلی کی چوڑائی بہت کم رہ گئی تھی مستزاد گھروں کی نکلی ہوئی سلیبیں اور تھڑے وغیرہ جنہوں نے صرف اتنی جگہ ہی چھوڑی تھی کہ پیدل چلتے ہوئے دو آدمی آسانی سے گلی سے گزر سکتے۔ چونکہ بلند عمارتیں تھیں جبھی یہاں دھوپ کا کوئی گزر نہ تھا۔ جیسے ہی وہ گلی میں داخل ہوتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے چند لمحوں کے لیے جیسے جنت کے سبزہ زاروں کی یاد دلا دیتے۔ اسے اپنی دن بھر کی تھکن لمحوں میں اترتی محسوس ہوتی اور سب سے مزے کی بات یہ تھی کہ تنگ گلی ہمیشہ خالی ہوتی تھی شاذ و نادر ہی یہ ہوتا کہ کسی کا گزر وہاں سے ہوتا۔ اس لیے وہ بڑے سکون سے گلی پار کرتی۔

دھیمے دھیمے چلتی' ٹھنڈی میٹھی ہوا کے مزے لوٹتی وہ اپنے گھر کے راستے کو مڑ جاتی۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر اسے یہ گلی بہت پسند تھی۔ چونکہ اسے باقی سارا راستہ رش بھرے علاقوں میں طے کرتے ہوئے آنا ہوتا تھا جبھی گلی کی خاموشی' ٹھنڈک' سکون اور تنہائی اسے حد درجہ غنیمت لگتی۔

گلی کے موڑ پر "ملکوں کا ڈیرا" تھا۔ ڈیرا دراصل ایک بہت بڑی عمارت تھی اس کے وسیع و کھلے احاطے میں بیک وقت تین کاریں کھڑی رہتی تھیں۔ جن میں دو سفید اور ایک سیاہ کرولا تھی۔ اور اس کے گیٹ کے سامنے ہمیشہ کرسیاں رکھے کئی افراد موجود ہوتے تھے۔ یہ ڈیرا "مظہر ملک" کی ملکیت تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ نور الصباح نے اسے بھی ان آدمیوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا ہو۔ ڈیرے کی شہرت بری نہیں تھی اور نہ ہی مظہر ملک کی مگر پتا نہیں کیوں ہمیشہ اس ڈیرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے نور الصباح کا دل ایک لمحے کو تھم جاتا' حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان براجمان آدمیوں نے کبھی کوئی غلط حرکت کی ہو یا آوازیں کسنے کی کوشش کی ہو۔

کبھی کبھی تو نور الصباح کو وحشت سی ہوتی تھی اسے کبھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ آخر اس ڈیرے میں کیا بزنس ہوتا تھا اور اتنے سارے آدمی ہمیشہ باہر کیوں بیٹھے رہتے تھے؟

ان ساری باتوں سے قطع نظر وہ جب بھی ڈیرے کے سامنے سے گزرتی اس کا سر اٹھا ہوتا اور قدموں میں پر اعتماد ہمواری ہوتی۔ وہ کبھی غیر معمولی تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی بلکہ جس رفتار سے چل رہی ہوتی اسی طرح چلتی ہوئی گزر جاتی۔ آج بھی ایسا ہی ایک تھکان بھرا اور پریشان کن دن تھا' کالج کی طرف سے کام کا بے حد برڈن تھا۔ اسے امید تھی کہ سرکاری کالجز کے ساتھ ہی انہیں بھی چھٹیاں دے دی جائیں گی مگر برا ہوا اس "سمر کیمپ" نامی بلا کا جس نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ان کے کالج نے چھٹیاں دینے کی بجائے سمر کیمپ اسٹارٹ کر دیا تھا اور اس جیسی باقی ٹیچرز بھی بری طرح سٹپٹائی تھیں مگر مجبوری سی مجبوری تھی کہ کوئی بھی جاب چھوڑ نہیں سکتی تھی۔

سو اب اسے کالج جانا پڑتا تھا جب سارے لوگ گرمیوں کی چھٹیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ایک پرائیویٹ کالج میں اردو کے شعبہ کی ہیڈ تھی۔ سیلری پیکج تو اچھا تھا مگر کام بھی حد سے زیادہ لیا جاتا تھا۔ گرمی کی شدت پہ کڑھتے ہوئے اس نے تنگ گلی

موڑ پہ پہنچتے ہی اس کی اچٹتی سی نظر ڈیرے کے باہر بیٹھے آدمیوں پر پڑی اور اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آج ان سب کے درمیان "مظہر ملک" موجود تھا۔

نور الصباح کی اچٹتی سی نظر جو پڑی تو سیدھی اس ہی سے ٹکرا گئی۔ وہ ایک طویل قامت اور خاصا چوڑا شخص تھا۔ سفید شلوار سوٹ اور پشاوری چپل میں خاصا شاندار لگ رہا تھا۔ نور الصباح نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں نظر واپس پھیری تھی اس شخص کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس نے اس کی رفتار بدل دی تھی۔ وہ اس گلی سے گزرتے ہوئے شاید پہلی مرتبہ تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اپنے گھر کے راستے کو مڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

نیلے روغن والے دروازے کو کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو ادھر ادھر دیکھتے ہوئے قدرے سہمی ہوئی۔ صحن ویران تھا اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے کی طرف پیش قدمی کی۔ بے آواز دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا تو جیسے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ وہ ہینڈ بیگ ایک طرف پھینکتی بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی۔

"امی جی۔ امی! اٹھیں۔" وہ تیزی سے گری ہوئی عارفہ خانم کو سیدھا کرنے لگی۔ ان کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور ان کی وہیل چیئر ایک طرف اوندھی پڑی تھی۔ اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اس نے جلدی سے چادر کا کونا اٹھایا اور ان کا خون صاف کرنے لگی۔ انہوں نے نڈھال سے انداز میں آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور رونے لگیں۔ وہ ساکت رہ گئی۔ لازماً" آج پھر ان پر حاجی حیات کا غصہ اترا تھا۔

حاجی حیات اور عارفہ خانم کی شادی یقیناً" بڑے ناگوار حالات میں ہوئی ہوگی مگر صرف ساڑھے چار سال بعد ہی یہ تعلق ایک بوجھ بن گیا تھا۔ شادی کے نو سال بعد نور الصباح اور اس کے دو سال بعد حمزہ کی پیدائش کے بعد ایک حادثے میں وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئی تھیں۔ عارفہ تو وہیل چیئر پر آ گئیں اور حاجی صاحب کا امتحان شروع ہو گیا۔ وہ عارفہ خانم کو چھوڑنا چاہتے تھے مگر اس میں سب سے بڑی رکاوٹ دونوں بچے تھے۔ اور ان کی والدہ اس بات پر قطعاً" آمادہ نہ تھیں کہ وہ سگی ماں کے زندہ ہوتے ہوئے دوسری عورت معصوم بچوں کے سر مونڈھ دے۔ اور حاجی حیات جو آج تک صرف والدہ کے آگے ہی سر جھکاتے تھے اس بار بھی خاموش رہ گئے۔

اس وقت تو انہوں نے صبر کا گھونٹ پی لیا مگر ان کی باقی ساری زندگی عارفہ خانم کو اپنے احسان تلے دبائے اور ان پر اپنا غصہ اتارتے گزری۔ اپنی والدہ کی وفات کے بعد تو وہ حد درجہ ذلالت پر اتر آئے تھے۔ نام تو ان کا "حاجی حیات" تھا مگر حقیقتاً" ان میں حاجیوں والی کوئی بات نہ تھی۔ اور اس نام کی بھی بڑی عجیب ہی ہسٹری تھی۔ نہایت کم عمری میں انہوں نے اپنے والد کے ساتھ حج کیا تھا جس کی بنا پر شروع سے ہی ان کے نام کے ساتھ حاجی لگ گیا۔ گلی محلے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ شاید اسی نام کی بنا پہ۔

وہ ایک غصہ ور سخت مزاج اور غصیلی طبیعت کے حامل تھے۔ اور اس غصہ کی زد میں ہمیشہ نور الصباح اور عارفہ خانم ہی آتی تھیں۔ حمزہ کے ساتھ انہیں خصوصی الفت تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ ہی سلاتے تھے اور شاید اسی وجہ سے حمزہ پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ تھی۔

جب بھی انہیں عارفہ پر غصہ آتا وہ بے دریغ ان پہ ہاتھ اٹھاتے' انہیں گالیاں دیتے اور آخر میں راہ میں آئی ہر چیز کو ٹھوکروں کی زد پہ رکھ لیتے اور عموماً" عارفہ کی وہیل چیئر بھی ایسی ہی کسی ٹھوکر کا نشانہ بن جاتی۔ شاید آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

نور الصباح آنسو ضبط کرتی ان کا زخم صاف کرنے لگی۔ اسپرٹ سے زخم صاف کر کے اس نے بینڈیج چپکائی اور انہیں سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ پھر خود ان کی الٹی پڑی وہیل چیئر سیدھی کرنے لگی۔ اسی دوران

قدموں کی چاپ ابھری' عارفہ خانم نے ہراساں ہو کر اسے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے دھاڑ سے دروازہ کھلا۔

"آگئی صاحب زادی۔" یہ غصیلی اور طنز بھری آواز حاجی حیات کی تھی۔ نورالصباح کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

"کان کھول کے سن لو محترمہ! جو تم اور تمہاری ماں چاہتی ہے نا! وہ فی الحال تو بالکل ممکن نہیں۔۔۔ کیسے کردوں تمہاری شادی؟ ہاتھ میں پیسہ ہے نہ کوئی شہزادہ تمہارے انتظار میں ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے' اور اگر ایسا کچھ ممکن بھی ہو تب بھی تمہاری ماں کا کیا ہوگا؟ اور ویسے بھی ابھی میری ساری بچت حمزہ کی یونیورسٹی پہ لگ چکی ہے' بہتر یہی ہوگا کہ تم خاموشی سے اپنا وقت گزارو۔۔۔ رہی شادی؟ تو وہ بھی ہوجائے گی جب قسمت میں لکھا ہوگا۔ دوبارہ اگر مجھ سے اس بات پہ بحث کرنے کی کوشش کی نا عارفہ خانم! تو اپنا انجام یاد رکھنا۔" وہ زہر زہر لہجے میں کہتے باہر نکل گئے۔ نورالصباح سفید چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ شام کا کھانا بنا رہی تھی جب وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے عارفہ خانم وہاں آگئیں۔

"نور! کیا بنا رہی ہو میری بچی؟" ان کے لہجے میں حلیمی اور حلاوت تھی۔ اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور انہیں مینیو بتانے لگی۔

"امی جی! آپ باہر چلی جائیں' ادھر گرمی ہے۔ آپ کا بی پی لو ہوجائے گا۔" نور ان کی چیئر دھکیلتی باہر لے آئی۔ شام کا جھٹپٹا سا چھا رہا تھا۔ وہ ان کے قریب زمین پہ پیڑھی کھینچ کے بیٹھ گئی اور ان کے پیر دبانے لگی۔

"رہنے دو بیٹا۔ تم پہلے ہی تھکی ہوئی آئی ہو اور آتے ہی کام میں لگ جاتی ہو۔" انہوں نے سہولت سے اسے منع کیا اور خود اسے قریب کرکے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"نور! میری بچی حوصلہ نہ ہارنا۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ دعا کرو۔ میں نے ایک کمیٹی ڈالی ہے ڈیڑھ لاکھ کی' نکلے تو سادگی سے تیرا نکاح کردوں گی۔"

"جانے دیں امی! مجھے نہیں کرنی شادی۔" چہرے پہ بےزاری اتر آئی۔

"ایسا نہ کہو۔" وہ بےچینی سے بولی تھیں۔

"میرا آپ سے دور جانے کو دل ہی نہیں امی۔"

"ارے! پاگل۔ جانا تو سب کو ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ تمہاری جلد از جلد شادی ہوجائے مجھے کچھ سکون ملے۔"

"امی جی! کیا شادی ہی سب کچھ ہے؟" وہ جھلا

"نہیں بیٹا! ایسا نہیں ہے مگر ہمارا معاشرتی سیٹ اپ ہی اس طرح کا ہے کہ لڑکی کو بہرحال شادی ہوتی ہے۔ اب اپنے گھر کو ہی لے لو میں آج ہوں نہیں۔۔۔ تو تب کیا تمہیں' تمہارے باپ اور بھائی کے سہارے چھوڑدوں؟ ہرگز نہیں۔" وہ سختی سے بولی تھیں۔ نورالصباح خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

رات کے کھانے کے بعد وہ کچن سمیٹنے لگی۔

"نور! ایک گلاس دودھ مل سکتا ہے؟" حمزہ کچن دروازے پہ کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"اچھا۔" وہ کہتی ہوئی دودھ گلاس میں نکالنے لگی۔

"کن خیالوں میں گم ہو؟" اس نے دودھ کا گلا تھامتے ہوئے اسے دیکھا۔

"شادی کے۔" وہ بےساختہ بولی پھر پچھتائی۔ حمزہ قہقہہ خاصا فلک شگاف تھا۔

"کیا بات ہے نور؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟" وہ روکتے ہوئے بولا۔

"بتاؤں ابو کو؟" لہجہ معنی خیز تھا۔

"پہلے میری پوری بات سن لو حمزہ! پھر ڈھنڈورا پیٹ دینا۔" وہ سٹپٹا گئی تھی۔

"اچھا بھئی پوری بات سنالو؟" وہ پھر سے مسکرایا۔ نور جھنجلا اٹھی۔

"امی کو پتا نہیں کیا وہم ہوگیا ہے حمزہ! اٹھتے بیٹھتے رات بس انہیں میری شادی کی ہی پڑی ہے۔ اتنا ان رہتی ہیں کہ حد نہیں' ہر وقت بی پی لو رہتا ہے۔ ہم نے اتنا سمجھایا کہ امی! آخر آپ کو کیا ہوگیا؟ اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ اور پھر میرے بعد ان کا دھیان کون رکھے گا؟ مگر وہ تو کچھ سمجھنے پہ آمادہ ہی نہیں ہیں۔ دیکھو! شادی کوئی خود سے تھوڑی ہوتی ہے جب قسمت میں ہوگا ہوجائے گی نا۔ اس میں کسی کا کیا قصور؟" وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"تم کتنی قناعت پسند ہو نور؟" حمزہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس میں قناعت پسندی کی کیا بات ہے؟ شادی تو قسمت کا کھیل ہے۔" وہ بےساختہ بولی۔

"ہر چیز قسمت پہ نہیں چھوڑتے نور! بعض چیزیں انسان کے اختیار میں بھی ہوتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہتا چلا گیا۔ نور حیران سی اس کی پشت تکتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے چند دن بہت عجیب سے تھے۔ بہت بےزار کردینے والے اور روکھے پھیکے سے' ایک تھکا دینے والے دن کے بعد وہ گھر لوٹتے ہوئے جس تنگ گلی میں راسکون محسوس کیا کرتی۔۔۔ وہ بھی ختم ہوچکا تھا۔

اور اس کی وجہ "مظہر ملک" تھا جو اب تقریباً روزانہ ہی ڈیرے کے سامنے موجود ہوتا تھا۔ نورالصباح کے تھکے تھکے قدم اب وہاں تھمنے کی بجائے تیز تر ہوجاتے تھے۔ ایک نامعلوم سا خوف تھا جو اسے محسوس ہوتا تھا۔ انہی محسوسات کے ہمراہ وہ گھر میں داخل ہوتی تو تھکن مزید دوچند ہوجاتی۔ گھر میں چاتی چپقلش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ عارفہ بیگم کسی طور جھکنے کو تیار نہ تھیں ان کا کہنا تھا کہ وہ ہر حال میں نورالصباح کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہیں۔

دوسری طرف حاجی حیات بھی کون سا کم تھے وہ ماش کی طرح اینٹھے ہوئے تھے تقریباً" روز ہی اس موضوع پر ہونے والی بحث سے حمزہ تو سخت تنگ آیا ہوا تھا۔ نورالصباح گھبرا کر کبھی ماں کو سمجھانے لگتی تو کبھی باپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے بیٹھ جاتی۔

وہ بھی ایسا ہی ایک ہی گرم اور تھکان بھرا دن تھا جب وہ کالج سے لوٹ رہی تھی۔ جونہی اس کے قدم تنگ گلی میں پڑے حسب معمول ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اسے فرحاں سا احساس دلایا گیا وہ بتدریج مدھم مدھم سے قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ موڑ مڑتے ہوئے اس کی غیرارادی نظر ڈیرے کی طرف اٹھی تھی اور سٹپٹا کر جھک گئی۔ "وہ" موجود تھا اور بڑی محویت سے اسے ہی تک رہا تھا۔ اس کی نظر میں بےحجابی نہیں تھی مگر اتنی گہرائی اور گیرائی تھی کہ نورالصباح کی اجلی پیشانی شکن آلود ہوتی چلی گئی۔ اس کے قدم بےساختہ تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ اپنی پشت پر اسے نظروں کی تپش بخوبی محسوس ہورہی تھی۔

گھر آکر بھی اس کا دھیان مظہر ملک کی طرف ہی تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں سے یوں آدھمکا تھا اور مسلسل کئی دنوں سے یوں ڈیرے کے آگے براجمان تھا جیسے اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ کھانا بناتے ہوئے بھی اس کی سوچ اسی طرف لگی رہی تھی اسی ادھیڑبن میں وہ چونکی تب جب حاجی حیات کے کمرے سے یکلخت اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اس کے ہاتھ میں موجود پانی کا گلاس لرز سا گیا تھا۔ اس نے تیزی سے گلاس شیلف پر رکھا اور اندر کی طرف لپکی۔ دروازے پر ہی اسے رک جانا پڑا۔ ابا اونچی آواز میں دھاڑ رہے تھے۔

"تم چاہتی کیا ہو؟ کہاں سے کردوں شادی؟ کون آئے گا اسے لینے؟ بولو؟"

"کوئی نہ کوئی تو ہوگا اس کی قسمت میں؟" عارفہ ہمت کرکے بولی تھیں۔

"تو پھر یہ "کوئی" اسے تین کپڑوں میں قبول کرلے گا؟" وہ پہلے سے بھی زیادہ غصے میں آگئے۔

"تھوڑا بہت ہم تو کرہی لیں گے۔ آپ کوشش۔۔۔؟" عارفہ کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

"کہاں سے کروں کوشش؟ کیا مسجد میں اعلان

کرواؤں کہ "حضرات! ہم غریب ہیں اپنی لڑکی کو کچھ دینے پہ قادر نہیں' جو خوف خدا رکھتا ہو وہ میری لڑکی سے عقد کرے۔" وہ تمسخر اڑاتے ہوئے بولے تھے۔
عارفہ خانم تڑپ اٹھیں۔
"خدا کے لیے۔ ایسا تو نہ کہیں۔ آپ میری بات پر غور تو کریں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔" ان کی آواز میں التجا غالب آگئی تھی۔
"راستہ تم خود نکال لو یا پھر نور سے کہو کہ وہ خود کسی کو ڈھونڈ لے۔" ان کا انداز سفاکانہ تھا۔
نور الصباح کا دل جیسے بند ہو گیا۔ یہ اس کا باپ تھا؟ اسے یقین نہیں آسکا۔ وہ لرزتی ٹانگوں سے آگے بڑھی۔ کچن میں آکر اس نے کتنے ہی چھپاکے منہ پر وے مارے تھے مگر آنکھوں کی جلن تھی کہ کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ کھانا اس نے تیار تو کر دیا مگر اتنی غائب دماغی سے کہ دو بار ہاتھ جلتے جلتے رہ گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے بستر میں جا کر پڑ گئی۔
عارفہ خانم نے اسے کئی آوازیں دیں مگر وہ منہ تکیے میں دیے پڑی رہی۔ اور آنسو بہاتی رہی۔ ناچار وہ واپس چلی گئیں۔ انہوں نے خود ہی حمزہ اور اس کے ابا کے لیے کھانے کی ٹرے سیٹ کی تھی۔
اگلی صبح وہ از حد ڈسٹرب تھی دل چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکلے تو واپس ہی نہ آنے پائے کہیں رستے میں ہی مر مرا جائے۔ من من بھر کے قدم اٹھاتے وہ اسٹاپ تک پہنچی تھی کالج پہنچ کر بھی اس کی غائب دماغ کیفیت نے ساتھی اساتذہ کو بھی چونکا دیا تھا۔ آخری دو پیریڈ لینے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اسٹاف روم میں آکر بیٹھنے کے بعد اس نے سر دونوں ہاتھوں پہ گرا دیا۔
اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا اور آنکھوں میں جیسے ریت سی چبھ رہی تھی۔ اسی دوران چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ وہ چیزیں سنبھالتی اٹھ گئی۔ چادر اوڑھتے ہوئے دیگر اساتذہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ گھر جا کر آرام کرے کیونکہ اس کی شکل ہی بتا رہی تھی کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ غائب دماغی سے سر ہلاتی رہی۔
واپسی کا سارا رستہ اس نے سوچوں میں گم طے کر لیا مگر ایک چیز نے اسے چونکا دیا تھا اور وہ تھا ڈیرے کا بند گیٹ۔ اس نے لاشعوری طور پر شکر کیا اور آگے بڑھتی چلی گئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے صحن میں مارچ پاسٹ کرتے حاجی حیات نظر آگئے۔ اس کے اندر کی کھولن لمحہ بھر میں ہی مزید بڑھ گئی تھی۔
انہوں نے ایک تیز کٹ دار اور زہر بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ نور الصباح خاموشی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی وہ بمشکل بیگ رکھ کر سیدھی ہی ہوئی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور حاجی حیات کے ساتھ عارفہ بیگم بھی اندر آگئیں۔ وہ چونک گئی۔
"کہاں سے آرہی ہو؟" وہ کڑک دار لہجے میں بولے تھے۔
"ظاہر ہے کالج سے۔" نور کا لہجہ سپاٹ تھا۔
"اچھا۔ تو تم۔ "پڑھا" کے آرہی ہو؟" اس بار ان کے لہجے میں کیا تھا نور الصباح جان نہ سکی۔
اس نے استفہامیہ نظروں سے ان دونوں کے چہرے دیکھے۔
"نور آ میری بچی۔" عارفہ اپنی چیئر دھکیلتی اس کے قریب آگئیں۔
"کیا ہوا امی؟" وہ استفسار کرنے لگی۔ ابا ہنوز اسے گھور رہے تھے۔
"بیٹا! یہ "مظہر ملک" کو تم کیسے جانتی ہو؟" عارفہ کے لہجے میں خوف و بے چینی کا رنگ تھا۔ نور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
"کیسے کا کیا مطلب؟ صاف پوچھو اس سے؟ کب سے چل رہا یہ چکر؟" ابا ہنکارے تھے۔
"ابا۔" وہ چیخ اٹھی تھی۔ اتنا بڑا الزام بلکہ بہتان؟؟؟
"چپ کر۔" انہوں نے دائیں ہاتھ کا بھرپور طمانچہ اسے دے مارا وہ لڑکھڑا کر گری۔ بیڈ سے ٹکرائی تو پیشانی سے خون پھوٹ پڑا۔ عارفہ زور زور سے رونے لگیں۔
"میں اسے نہیں جانتی امی۔" وہ سسک اٹھی۔
"کیسے نہیں جانتیں؟ جھوٹ بولتی ہو تم؟ بکتی ہو۔ اگر تمہارا اس کے ساتھ کوئی واسطہ رابطہ نہیں تو وہ کیسے چلا آیا۔ یوں بن بلائے منہ اٹھا کر۔" وہ دھاڑ رہے تھے۔
"مجھے کیا پتا وہ کیوں آیا تھا؟" وہ سر پہ ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔
"رشتہ لے کے آیا تھا وہ اپنا۔ شادی کرنا چاہتا ہے وہ تجھ سے۔" انہوں نے دھماکہ کیا۔ نور پہ جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔
"خدا کے لیے ابا! میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔" وہ لجاجت سے کہنے لگی۔
وہ دیر تک بکتے جھکتے رہے پھر باہر نکل گئے۔ اس دوران عارفہ خانم مسلسل درمیان میں بولنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں روکنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر وہ کہاں کسی کی سنتے تھے۔
گھر کا ماحول بے حد کشیدہ تھا۔ نور کے دل میں کیا تھا؟ یہ بتانا مشکل تھا البتہ اگلے روز اپنے بینڈیج شدہ ماتھے کے ساتھ جب وہ کالج کے لیے گھر سے نکلی تو اس کے چہرے پر ایک ناقابل بیان عزم کی تحریر رقم تھی۔
سہولت یہ ہوئی کہ آج ہاف ڈے تھا۔ واپسی پہ وہ ہمیشہ کی طرح جیسے ہی تنگ گلی میں داخل ہوئی ٹھنڈی میٹھی ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اس وقت اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ قطعاً "کچھ انجوائے نہ کر سکی۔ گلی کے موڑ پر ڈیرے کے باہر اپنی شاہانہ اور ٹھٹکا دینے والی شخصیت کے ساتھ "وہ" براجمان تھا۔
نور الصباح کے اندر شعلوں کی تپش بڑھ گئی۔ وہ آج پہلی بار بڑے مضبوط اور مستحکم قدموں سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر مظہر ملک کے چہرے پر کوئی حیرت نہیں ابھری تھی اس کے تاثرات بڑے معمول کے تھے۔
"بات کرنی ہے آپ سے۔" وہ از حد سرد اور روکھے لہجے میں بولی تھی۔ وہ مطمئن سا اٹھ کھڑا ہوا۔
"ضرور آئیے۔" وہ عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا گویا اسے مزید بحث کا موقع نہ دینے کا ارادہ تھا۔
نور الصباح دانت کچکچاتی اس کی پشت کو گھورتی اس کے پیچھے چل پڑی۔ عمارت اندر سے بہت وسیع تھی عمارت کے تین اطراف گھاس تھی اور بہت خوبصورتی سے پودوں کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ چوتھے حصے میں رہائشی عمارت تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کے پیچھے ہی وہ بھی داخل ہو گئی۔ یہاں اس نے خود کو ایک وسیع و عریض لاؤنج نما سٹنگ روم میں پایا۔
"تشریف رکھیے۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔
"مجھے آپ سے مسئلہ کشمیر حل نہیں کروانا جو تشریف رکھوں۔" وہ تلملا کر بولی۔ جواباً" اس کے لبوں پہ ایک گہری اور جان دار مسکراہٹ آگئی۔ وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ کا یہ اعتماد تو اچھا لگتا ہے نور الصباح۔" اس کی آواز میں کھنک تھی۔ نور الصباح کا رنگ بدل گیا۔
"پلیز۔" اس نے ٹوکا تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا تھا۔
"کہیے؟" وہ یوں متوجہ ہوا جیسے وہ کوئی بم پھوڑنے والی ہو۔
"کیا سوچ کر آپ نے میرے گھر آنے کی جرات کی؟" وہ غرا ہی تو اٹھی تھی۔
"آپ سے شادی کا سوچ کر۔" وہ پرسکون تھا۔
"مجھ سے پوچھا تھا کیا؟" وہ چلا ہی تو پڑی۔
"میرے خیال میں لڑکی کے والدین ہی اس کی مرضی معلوم کرتے ہیں۔" اس کا لہجہ اب بھی پر اطمینان تھا۔ نور کے اندر شعلوں کا رقص مزید بڑھ گیا۔
"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں ملک صاحب۔"
"بالکل غلط۔ میں نے تو سب سے اچھا اور جائز طریقہ استعمال کیا ہے نور الصباح! میں نے آپ کے والدین سے بات کی ہے۔ اس میں یقیناً "حد" کا کوئی گزر نہیں ہے۔ آپ کہیں انگیجڈ نہیں ہیں اس لیے آپ کسی پر قدغن نہیں لگا سکتیں۔" اس کا لہجہ ٹھوس اور ہموار تھا۔

"آپ کے پاس یقیناً" دلائل ہیں ملک صاحب! لیکن آپ نے یہ سوچا ہے کہ آپ نے مجھے کیسے میرے گھر والوں کی نظر میں مشکوک بنا دیا ہے؟" وہ بے حد غصے میں تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ حیران رہ گیا۔

"ہنسیے مت۔"

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا نور الصباح! مگر مجھے آپ یہ احساس دلا رہی ہیں جیسے میں نے آپ کو گڈنیپ کیا ہو؟ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید تب آپ مجھ پر حد لگا سکتی تھیں۔" وہ بھنویں اچکا کر بولا۔

"شٹ اپ۔" نور بے ساختہ چیخ اٹھی۔ پھر چند گہرے سانس لیتی خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

"دیکھیں آپ کو اپنا پرپوزل واپس لینا ہو گا۔" اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ مظہر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں؟ کیوں میری زندگی کو میرے لیے مزید مشکل بنا رہے ہیں؟" وہ اس بار قدرے تھکے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی تھی۔

"میں تو آپ کی پریشانیاں ختم کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بے ساختہ بولا۔ نور نے سٹپٹا کر اسے دیکھا۔

"آپ کو میری بات ماننا ہو گی ملک صاحب! ورنہ لاش سے تو بہر حال کوئی بھی شادی نہیں کر سکتا۔" اس کے دھیمے لہجے میں ایک سنگین عمل کی خونی بو تھی۔ مظہر کے تاثرات یکلخت بدل گئے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

گیٹ تک پہنچتے ہوئے اس نے کتنے ہی گہرے سانس لیے تھے خود کو چلنے کے قابل بنانے کے لیے۔ گیٹ سے باہر نکل کر اس نے ایک گہرا اور پر اطمینان سانس خارج کرنا چاہا تھا مگر جیسے ہی اس کی نظر سامنے پڑی اس کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا۔ ٹانگوں نے یکلخت اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا شاید اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ اور اس کی پسندیدہ "تنگ گلی" اس وقت "بند گلی" بن چکی تھی۔ اس کے سامنے "حاجی حیات" کھڑے تھے۔

اس کے بعد کے واقعات میں کوئی اتنی قابل ذکر بات نہ تھی۔ بہت سے روایتی باپوں کی طرح انہوں نے نور کو قطعاً" مزید وضاحت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ہی کافی تھا کہ انہوں نے اسے "رنگے ہاتھوں" پکڑا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے گھر آکر جو ہنگامہ کیا وہ ناقابل بیان ہے۔

قابل ذکر بات تھی تو صرف یہ کہ دو دن بعد انہوں نے نور الصباح کا نکاح "مظہر ملک" کے ساتھ طے کر دیا۔ اور اس سلسلے میں عارفہ کی کسی تاویل، کسی پوچھ گچھ کو قطعاً" اہمیت نہ دی تھی انہوں نے اور عارفہ نے نور سے بھی پوچھنے کی بار کوشش کی تھی مگر وہ تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ اگلی شام ملک صاحب کے گھر سے اس کی شادی کا جوڑا اور زیورات وغیرہ آ گئے تھے۔ حاجی صاحب خود ہی اس کے کالج جا کر استعفیٰ دے آئے تھے۔ اب اس کی کیا تاویل یا ہنگامی وجہ انہوں نے کالج انتظامیہ کو بتائی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ اور نور... وہ تو جیسے مجسمہ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اسے سجایا سنوارا جا تھا اور وہ اپنی ہی ذات کے گنبد میں محصور ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے تین سائن کیے۔ تین بار قبول کرنے کا دعوا کیا اور کسی الزام کی مانند اس شخص کو قبول کر لیا، جو اب بقول "ابا" اس کا مالک تھا۔ اگر شوہر "مالک" ہے تو پھر "رب" کون ہے؟؟؟

اس "مالک" نے اسے پانچ لاکھ حق مہر سکہ رائج الوقت کے عوض "خریدا" تھا۔ اور وہ خشک آنکھیں لیے اپنی بولی کا منظر دیکھتی رہی اپنی "نیلامی" دیکھنے کا حوصلہ جانے کہاں سے اس کے اندر آن سمٹا تھا؟

قفس ہجر میں سانسیں تو چل رہی ہیں مگر
زندگی کہاں ہے یہ ڈھونڈ رہی ہوں میں

اس کے بابل کے گھر سے اس کی ڈولی نہیں جنازہ اٹھا تھا اور شادی کی سنہری رات وہ اپنے "مالک" کے بازوؤں میں لیٹی تھی جیسے عقاب کے پنجے میں... مگر اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔ اس نے اندر اتار لیے اور لب سی لیے اور نظر... ہاں وہ ہی اس کی بڑی پر اعتماد نظر ہمیشہ کے لیے جھک گئی۔ کم ظرف انسان "تنگ گلیاں" "بند گلیاں" بنا دیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"مظہر!... پلیز... اٹھ جائیں... مظہر!... پھر آپ مجھے ڈانٹیں گے کہ میں نے آپ کو بروقت نہیں جگایا... اٹھیں نا۔" وہ چودھویں دفعہ اسے جگانے آئی تو خاصا جھنجلائی ہوئی تھی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اپنی نیند پوری کریں آپ۔ اگر آپ کا ضروری کام نہ ہوا تو مجھ سے مت کہیے گا۔" اس نے دبے دبے غصے سے کہا اور واپس مڑ گئی۔ اندر ہی کہیں یہ امید تھی کہ اب کی بار اس پر اثر ضرور ہو گا۔ مگر اس کی یہ خام خیالی جلد ہی دور ہو گئی۔ اس پر بھی وہ بدستور نیند میں غرق تھا نور اس بار خاموشی سے پلٹی اور ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔

زندگی بڑی عجیب ہو گئی تھی یا شاید... خوبصورت۔ نور الصباح کے لیے مظہر ملک ایک حیرت انگیز انسان ثابت ہوا تھا۔ وہ بہت اچھا انسان تھا اور نور الصباح کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ روایتی شوہروں کی طرح اس کی مین میخ نکالنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اس کے لیے جو کھانا بھی تیار کرتی خواہ وہ انڈوں کا آملیٹ (جو کہ مظہر کو خاصا ناپسند تھا) بخوشی کھا لیتا۔ دوسرے اس نے کبھی نور کو فورس نہیں کیا تھا کہ وہ بنے سنورے۔ وہ جس بھی حلیے میں گھومتی رہتی اسے اچھی ہی لگتی۔

نور الصباح کا واسطہ زندگی میں صرف دو ہی مردوں سے پڑا تھا۔ ان میں پہلے نمبر پہ "ابا" تھے اور پھر "حمزہ" اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی کاپی تھے، کبھی کبھی اسے ازحد حیرانی ہوتی وہ اس کی زندگی میں آنے والا تیسرا مرد تھا مگر پہلے دونوں سے بالکل مختلف...!

وہ بے حد نرم دل تھا اور بہت زیادہ سنجیدہ بھی... بہت ہٹ دھرم تھا اور بہت زیادہ لاپروا بھی... خامیوں اور خوبیوں کے اس مکسچر کے باوجود مجموعی طور پر اس کی ذات میں ایسی کوئی خامی نہ تھی جو نور الصباح کو تکلیف دیتی۔ وہ اسے چاہتا تھا اور اس کے ساتھ بہت پوزیسو بھی تھا، گھر کے سارے کام نور الصباح ہی کرتی تھی، کھانا بنانے سے لے کر کپڑے دھونے تک۔ وہ چاہتا تو ملازمہ افورڈ کر سکتا تھا مگر نور نے قطعاً" ترجیح نہ دی۔

وہ اتنا اچھا تھا کہ نور کو بھولنے لگا کہ وہ اس کی زندگی کا ساتھی کس "حادثے" کی صورت میں بنا تھا؟ دو تین مرتبہ وہ عارفہ سے مل آئی تھی جو اسے خوش دیکھ کر خاصی مطمئن تھیں۔ وہ اسی "ڈیرے" پہ رہائش پذیر تھے۔ رہائشی عمارت بے حد خوبصورت تھی اور مستزاد اس کو نور الصباح کے ماہرانہ ہاتھ لگ گئے تھے۔ وہ ناشتا تیار کرنے کے بعد لوٹی تو مظہر فریش ہو کے باہر آچکا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے بھنویں اچکائیں۔ نور کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی جو کہ اس کا اگلا فقرہ سنتے ہی غائب بھی ہو گئی۔

"تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟" معصومیت سے وہ پوچھ رہا تھا۔ نور نے آنکھیں سکوڑ کر نتھنے پھلا کر اسے دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی باہر نکل آئی پیچھے سے مظہر کا بلند آہنگ قہقہہ اسے احساس دلا گیا کہ "لازماً" وہ شرارت کر رہا تھا۔ وہ باہر آئی تو چونک گئی۔ گیٹ پہ کوئی گاڑی رکی ہوئی تھی۔ اس نے لاؤنج کے شیشوں سے پار دیکھا۔

گاڑی میں سے کوئی باہر آ رہا تھا۔

"نور... نور... نور الصباح۔" مظہر اسے بلا رہا تھا۔ وہ فوراً" واپس پلٹی اور اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"جی۔" اس نے نکھرے نکھرے سے اپنے صاحب کو دیکھا اور کہا۔

"کیا آج یہ لباس فاخرہ اتارنے کا موڈ نہیں... بدل ڈالیے اسے جناب؟" اس کا اشارہ نور کے ازحد مضحکہ خیز سلیپنگ سوٹ کی طرف تھا جو کہ حسب معمول مظہر کی شرٹ اور اس کے اپنے ٹراؤزر پر مشتمل تھا۔

"جا رہی ہوں میں... میرے خیال سے باہر کوئی آیا ہے۔ آپ دیکھ لیں۔" وہ کہتی ہوئی اندر کی سمت بڑھ گئی۔ ایک زبردست سا شاور لے کر اس نے آف وائٹ اور ڈارک بلو سوٹ زیب تن کیا اور باہر کی سمت آگئی۔ لاؤنج کی طرف آتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ مظہر کے ـــــ بولنے کی آوازیں آرہی تھیں وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئی چکرا کر رہ گئی۔

وہیل چیئر پہ ایک عورت براجمان تھی۔ ادھیڑ عمر... بالوں میں کہیں کہیں سفیدی... رنگ پژمردہ، آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، بجھی آنکھیں اور کمزور وجود گو وہ اتنی عمر رسیدہ نہیں تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے عرصے سے بیمار ہو۔ جبکہ مظہر طیش سے چلا رہا تھا اس کی نظر نور پہ نہیں پڑی تھی۔

"تمہاری جرات کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟ تم... گھٹیا... (گالی) ذلیل عورت... ساری زندگی مجھے خوشیوں کے لیے ترسایا... اب پھر آگئی ہو اپنا منحوس سایہ لے کر..." وہ دھاڑ رہا تھا۔ یہ کون سا "مظہر" تھا؟ نور الصباح کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکی تھی یا سر سے آسمان؟ اسے لگا آج ایک اور "حاجی حیات" اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہو۔ ویسے ہی بلند آواز میں بولتا، غصہ کرتا اور گالیاں دیتا اور پھر... وہی ہوا جو حاجی حیات، عارفہ پر غصہ نکالتے ہوئے کرتے تھے۔ مظہر نے بھرپور غصے اور وحشت سے پاگل ہوتے ہوئے اس عورت کی وہیل چیئر کو ٹھوکر ماری... اور... اور نور الصباح کا سکتہ ٹوٹ گیا۔

"مظہر" وہ چلاتی ہوئی آگے بڑھی اور مظہر کی زوردار ٹھوکر اچٹتی ہوئی کرسی کے پائے سے ہوتی ہوئی نور کے بازو پہ لگی مگر اس نے وہیل چیئر کو گرنے سے بچالیا تھا۔ جبکہ مظہر گنگ سا کھڑا تھا۔

"خدا کے لیے مظہر... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کس طرح بات کر رہے ہیں؟" وہ بلند آواز میں بولی تھی۔

"تم اس معاملے میں مت آؤ نور... جاؤ اندر۔" وہ خونی لہجے میں بولا۔

"کیوں نہ میں آؤں؟ کون ہیں یہ؟ اور کیوں کر رہے ہیں آپ یہ سب ان کے ساتھ؟" وہ بے خوفی سے کہہ رہی تھی۔

"جاننا چاہتی ہو کون ہے یہ... ؟ یہ... "فائزہ" ہے۔ فائزہ ملک میری پہلی بیوی۔" وہ اس کا بازو دبوچتے ہوئے غرایا۔ نور کے سر پہ جیسے کمرے کی چھت آپڑی۔

☆ ☆ ☆

ایاز ملک اور گلباز ملک دو ہی بھائی تھے اور شومئی قسمت دونوں کی ایک ہی گھر شادی ہوئی، اتفاق و سلوک اس قدر بڑھا کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی انہیں رشتہ ازدواج سے منسلک کردیا۔ خیال یہ تھا کہ مناسب وقت آنے پہ دوبارہ سے نکاح کردیا جائے گا۔ مگر تقدیر سے کس کو مفر ہے۔ گلباز ملک کی چہیتی اور پیاری سی فائزہ پیدائشی معذور تھی اور اس کا انکشاف پیدائش کے چند ماہ بعد ہی ہو گیا یوں وہ "اسپیشل چائلڈ" بن گئی۔ نہ عام بچوں کی طرح اسکول گئی نہ کبھی لوگوں میں گھلی ملی۔ دوسری طرف مظہر تھا از حد غصیلا اور ضدی۔ جب دونوں کو اپنے درمیان موجود اصل رشتے کا پتا چلا تب تک مظہر باپ کے ساتھ گاڑیوں کا بزنس جوائن کر چکا تھا۔ یہ اس کے لیے انتہائی دھچکا ثابت ہوا۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مگر باپ کے آگے اس قدر مجبور تھا وہ ان سے پیار بھی تو بے حد کرتا تھا کہ کچھ بھی نہ کر سکا سوائے صبر کا گھونٹ بھرنے کے۔ فائزہ صرف معذور ہی نہ تھی بلکہ وہ اس کے حقوق ادا کرنے سے بھی قاصر تھی۔ وقت گزرتا رہا... مظہر کے لیے سب سے زیادہ ناقابل برداشت اس کی خاموشی اور بے چارگی بھری عاجزی تھی۔ وہ اسے زہر لگتی جب وہ اسے مخاطب کرتا اور وہ بس ہوں ہاں کیے جاتی... مجبوری اور زبردستی کا یہ بندھن بس ماں باپ کے زندہ رہنے تک ہی تھا۔ اس کے بعد مظہر نے اپنی ایک الگ دنیا بسالی۔ اس نے فائزہ کو نوکروں کے ساتھ گھر میں تنہا چھوڑ دیا اور خود نور الصباح سے شادی کرلی۔

حالانکہ اس نے فائزہ کو واضح الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے کبھی نور اور اس کی زندگی میں اپنی موجودگی کا احساس دلا کر زہر گھولنے کی کوشش کی تو وہ اپنے مرتے باپ کی قسم توڑ کر اسے طلاق دے دے گا۔ مگر اس کے باوجود وہ آگئی تھی۔ نور الصباح کو اپنا احساس دلانے۔

☆ ☆ ☆

رات گہری اور تاریک تھی۔ نور الصباح بڑی دیر سے لاؤنج کے صوفہ پہ براجمان گھٹنوں پہ سر دھرے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی خشک آنکھوں کو ٹٹولا کیا وہ رونا چاہ رہی تھی؟ اس نے دھندلے سے نظر آتے لان پہ نظریں جمادیں۔

"کیا مظہر سوچ چکا ہو گا؟" اس نے سوچا پھر یکلخت وہ اٹھی، اس کے چہرے پہ ایک عزم تھا۔ وہ تیزی سے اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔

مظہر بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور نو د سلیپنگ سوٹ پہننے کے لیے ڈریسنگ کی سمت بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹی تو ایک خوبصورت ریڈ نائٹی میں ملبوس تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بیڈ کی طرف آئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ مظہر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مطالبہ واضح تھا۔ اس نے آہستگی سے دایاں بازو کھول کے بچھادیا۔ نور اس کے بازو پہ سر رکھ کے لیٹی تو اس نے دوسرا بازو اس کے گرد لپیٹ دیا۔

"آپ فائزہ کو یہاں لے آئیں مظہر" اس نے مظہر کے سینے میں منہ چھپائے کتنے حوصلے سے یہ بات کہی تھی۔ صرف وہی جانتی تھی۔ مظہر کو جھٹکا لگا۔

"مجھے ایک اور حاجی حیات نہیں چاہئیں... مجھے ایک اور عارفہ خانم نہیں چاہئیں مظہر... میں کسی کی دعا کا حصار نہیں بننے دینا چاہتی اپنے گھر کے گرد۔ مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے اس نے مجھے آپ کی صورت میں انعام دیا ہے اور فائزہ کی شکل میں آزمائش... میں آزمائش پہ پورا اترنا چاہتی ہوں میں رب کے انعام کا شکر ادا کرنا چاہتی ہوں مظہر! میں چاہتی ہوں اللہ مجھے صابرین اور شاکرین میں شامل کرے۔" وہ رو رہی تھی۔ رک رک کر بولتے ہوئے اور بہت زیادہ اذیت سے سسکتے ہوئے اس نے مظہر کو اپنے والدین کی ساری کہانی سنادی تھی اور یہ بھی بتادیا تھا کہ اس کے ابا نے اسے کیسے بے اعتبار اور بے وقعت کردیا تھا اس کی اپنی نظروں میں۔ یہ تو مظہر تھا جس نے اس کے بے جان وجود میں اپنی چاہت سے زندگی پھونکی تھی۔ اور یہ کہ اسے فائزہ کی بے بسی سے ڈر لگا تھا اسے اس معصوم و مظلوم کی آہ سے خوف آیا تھا۔ اسے یہ سوچ کر ہی وحشت ہونے لگی تھی کہ مظہر بھی بلند آواز میں بولتا ہے؟ وہ بھی گالی دیتا ہے؟

غرض اس نے اسے سب بتا دیا اور مظہر گنگ تھا۔ کیا تھی وہ؟ کتنی خاص! کتنی پیاری! اسے اپنے انتخاب پر فخر ہوا تھا اسے اس خالص لڑکی پر رشک آیا تھا۔ اس نے بے ساختہ نور الصباح کی آنکھیں پونچھیں۔

"مجھے چھوٹے دل والے بے رحم لوگوں سے ڈر لگتا ہے مظہر! آپ "ابا" جیسے نہیں بنیں گے نا..." وہ اس کی شرٹ کا کالر ہاتھوں میں دبوچے کتنی ہراساں تھی۔

مظہر نے بے اختیار اس کی پیشانی کو چوما۔

"ہاں۔ ہم اسے یہاں لے آئیں گے۔" اس نے نور کو یقین دلایا۔ رب رحیم فرماتا ہے "مومنوں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ

جب وہ عہد کریں تو اسے پورا کرنے والے ہوں اور تنگی اور مصیبت کے وقت صبر کریں اور یہ لوگ سچے ہیں۔" اور نور الصباح نے بھی اس آزمائش پہ پورا اترتے ہوئے مسلمان سے بڑھ کر مومن بننے کا پہلا قدم اٹھالیا تھا۔

☆ ☆

ریحانہ امجد بخاری

وہ کرچی ہے

خبرِ تحیرِ عشق سن' نہ جنوں رہا' نہ پری رہی
نہ تو' تو رہا' نہ تو میں رہا' جو رہی سو بے خبری رہی

فرزان نے الٹے ہاتھ کی آستین سے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ صاف کیا اور پھر سیدھے ہاتھ میں پکڑا ہوا لکڑی کا وزنی ہتھوڑا ایک طرف اچھال دیا۔ صبح سے کام کرتے کرتے اس کا بدن تھکن سے چور ہو چکا تھا۔

اس نے ایک طویل سانس لی' جیسے ساری آکسیجن ایک ہی مرتبہ اپنے پھیپھڑوں میں بھر لینا چاہتا ہو۔ پھر آپ ہی آپ اس کے قدم ورکشاپ کے بیرونی دروازے کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ پندرہ' بیس قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چیختی چنگھاڑتی' شور مچاتی گاڑیوں کے اژدھام کو کراس کرتے ہوئے وہ سڑک کی دوسری جانب پہنچ گیا۔ اب اس کا رخ سڑک کے کنارے تخت پوش لگا کر بیٹھے اس چائے والے کی طرف تھا۔ جس کی چائے اردگرد کے تمام بازاروں میں مشہور تھی۔

لکڑی کا ایک شکستہ تخت' اس پر رکھا ہوا مٹی کے تیل کا اسٹوو' چند چینک اور کچھ کپ اس چائے والے کی کل کائنات تھے' جن کو اس نے بڑی ترتیب سے سجا رکھا تھا۔ قریب ہی فٹ پاتھ پر رکھے لکڑی کے دو بینچ بھی موجود تھے۔ جن پر بیٹھے اکا دکا گاہک چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فرزان بھی بینچ کے ایک کنارے پر ٹک گیا۔ اس کے بڑے بڑے گرد آلود بال اس وقت جھاڑ جھنکار کا منظر پیش کر رہے تھے۔ میلی چکٹ شلوار قمیص اس انداز میں پہنی ہوئی تھی کہ سامنے دامن میں موجود تین' چار سوراخ صاف نظر آ رہے تھے۔

"رانا صاحب! ایک فرسٹ کلاس کپ ہمیں بھی عنایت کریں۔" پکڑ' کرتے میں ملبوس رانا صاحب نے سر ہلا دیا۔

باریک باریک مونچھوں والے رانا صاحب چالیس' پینتالیس سالہ پختہ عمر کے مالک دکھائی دیتے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ گزشتہ بیس سالوں سے ان کی شخصیت جوں کی توں تھی...! فرزان نے اپنے بچپن سے انہیں دیکھنا شروع کیا تھا اور اب وہ چوبیس سالہ بھرپور جوان تھا۔ لیکن رانا صاحب آج بھی جوں کے توں اسی حلیے میں نظر آتے تھے۔ جیسا فرزان انہیں بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ ان کی عمر جیسے ایک جگہ ٹھہر گئی تھی اور یہی نہیں تھا۔ ان کی چائے کا معیار بھی بالکل ویسے ہی ایک جگہ برقرار تھا۔

فرزان سر جھکائے گہری سوچ میں گم بیٹھا ہوا چائے کا منتظر تھا کہ اچانک ایک طرف سے بڑی بڑی داڑھیوں والے تین' چار اشخاص نمودار ہوئے جن کے کاندھوں پر بستر بند نما کوئی چیز لدی ہوئی تھی۔ انہوں نے رک کر چند لمحے رانا صاحب سے کچھ گفتگو کی۔ پھر ان میں سے ایک شخص بینچوں کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں بیٹھے تین' چار افراد سے مخاطب ہوا۔

"جناب دو منٹ کے لیے آپ بھی ادھر تشریف لے آئیں اور دین کی بات سن لیجیے۔" وہ تینوں لوگ اٹھ کر ان کے قریب پہنچ گئے' لیکن فرزان بدستور کسی گہری سوچ میں مستغرق رہا۔ اس شخص نے ایک مرتبہ پھر آواز لگائی۔

"جناب! دو منٹ کے لیے آپ بھی ادھر تشریف لے آئیں' علامہ صاحب دین کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں گے۔ آپ بھی سن لیجیے اللہ جزائے خیر دے گا۔" لیکن فرزان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شاید اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ تب دعوت دینے والے نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ فرزان نے ہڑبڑا کر ادھر دیکھا تو وہ صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔

"محترم! سارے دوست وہاں جمع ہیں' چند منٹ کے لیے آپ بھی تشریف لائیں۔ علامہ صاحب دین

کے بارے میں بیان فرمائیں گے۔"

"کیا بیان فرمائیں گے آپ کے علامہ صاحب؟" فرزان خشمگیں نظروں سے مخاطب کو گھورتے ہوئے بولا۔ "یہی کہیں گے نا کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، نیک اعمال کرو یا ان کے پاس کوئی اور نیا دین ہے؟" فرزان نے با آواز بلند کہا تو دوسرے لوگ بھی ادھر متوجہ ہوگئے۔ پھر غالباً" وہ علامہ صاحب ہی تھے جن کو جوش آگیا اور وہ آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

"میاں! کیسی گفتگو فرما رہے ہیں؟ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہے اور آپ اللہ کے نام پر چند منٹ صرف نہیں فرما سکتے؟ کیا ہوگا اس قوم کا؟" علامہ صاحب کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔ لیکن فرزان کا جوابی رد عمل علامہ صاحب کو مزید تاؤ دلا گیا۔ فرزان بلند آواز سے ہنسا تھا۔ ایک طویل ہنسی۔ پھر وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"علامہ صاحب! یہی تو فرق ہے آپ لوگوں کی اور میری سوچ میں۔"

بقول شاعر

زاہد گمراہ کے میں کس طرح ہمراہ ہوں
وہ کہے اللہ ہو میں کہوں اللہ ہوں

"نعوذ باللہ، استغفر اللہ۔۔۔ گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ اللہ ہیں؟ آپ خدائی کا دعوا کر رہے ہیں؟" علامہ صاحب نے غصے سے پھڑپھڑاتے ہوئے دبنگ آواز میں سوال کیا۔ علامہ صاحب کا لہجہ اتنا بلند تھا کہ ارد گرد موجود کچھ اور لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوگئے۔ اکا دکا راہ گیر اور چند رکشا ڈرائیور بھی قریب آکر ان کی گفتگو سننے لگے۔

فرزان دھیمے انداز میں نہایت تحمل کے ساتھ گویا ہوا۔

"جی نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کہا میں نے تو صرف ایک شعر سنایا ہے۔ اگر آپ کو یہ خدائی کا دعوا لگتا ہے تو پھر یہ دعوا اس شاعر نے کیا ہوگا جس کا یہ شعر ہے۔"

علامہ صاحب غصے اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ گویا ہوئے۔

"میاں یہ شاعر کا نہیں یہ تمہارا دعویٰ ہے، شعر تم پڑھ رہے ہو۔" فرزان نے عجیب سے انداز میں علامہ صاحب کی طرف دیکھا اور اکتاہٹ بھرے انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہر شخص ہر بات کو اتنا ہی سمجھتا ہے جتنی بلندی تک اس کی سوچ پرواز کر سکتی ہے، اب آپ کی مرضی ہے جیسا آپ سمجھیں میں آپ سے کیا بحث کروں۔"

"تم اپنے آپ کو بہت عالم فاضل اور ہر چیز پر قادر سمجھ رہے ہو؟ دعوا کر رہے ہو تو ثابت بھی کرو؟"

"جاؤ یار اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو، بات ختم کرو۔" فرزان کے لہجے میں بے زاری تھی۔

"ایسے کیسے ختم کردیں تم نے یہ بات کہی کیوں؟ اب کہی ہے تو ثابت کرو؟"

فرزان سوالیہ نظروں سے علامہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیسے ثابت کروں؟"

"تم سورج کو حکم دو کہ وہ زمین پر گر جائے۔" علامہ صاحب تلملا کر بولے فرزان کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ وہ علامہ صاحب کو گھورتے ہوئے بولا۔

"میں سورج کو کوئی حکم دوں یا نہ دوں آپ یہ بتائیں کہ مجھے یہ حکم دینے والے آپ کون ہیں؟"

"اچھا تم یوں کرو کہ یہیں کھڑے کھڑے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر دکھاؤ؟" علامہ صاحب بھی شاید سرک ہی گئے تھے۔

فرزان کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی شاید وہ خود بھی لطف لینے لگا تھا وہ شرارتی مسکراہٹ سے بولا۔

"آپ کو قیامت تک چھوٹ دی گئی ہے۔ ایک ہی مرتبہ سزا ملے گی۔" اسے مسکراتا دیکھ کر علامہ صاحب مزید جلال میں آگئے۔

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو، آخر تم ہو کیا چیز۔" فرزان طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

"علامہ صاحب میری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی میری لائن کچھ اور ہے۔"

جو مجھ میں بولتا ہے، میں نہیں ہوں
تمہیں دھوکا ہوا ہے، میں نہیں ہوں

انادے

وہ خود بیں، خود نما ہے، میں نہیں ہوں
مقابل آئینہ ہے، میں نہیں ہوں

بنا کر خود ہی اک مٹی کی مورت
وہ خود ہی آ بسا ہے، میں نہیں ہوں

کبھی ساجد، کبھی مسجود ہوں میں
اور اس پر یہ سزا ہے، میں نہیں ہوں

اگر کچھ بھی نہیں میری حقیقت!
تو یہ کس کی صدا ہے، میں نہیں ہوں

نہ سمجھو کچھ اگر تو، میں ہی میں ہوں
اگر سمجھو خدا ہے، میں نہیں ہوں

کوئی مانے نہ مانے، اس کی مرضی
یہ میرا فیصلہ ہے، میں نہیں ہوں

فرزان نے بڑے رسان سے چند اشعار سنائے اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔

"تاریخ میں ایک نامور آدمی گزرا ہے جسے لوگ تو تاریخ بھی کچھ اچھے لفظوں سے یاد نہیں کرتی لیکن اس کا ایک جملہ مجھے بے حد پسند ہے کہ اس دنیا میں رہنے کا بہترین اصول یہ ہے کہ جو جہاں ہے، جیسا ہے، اسے اس کے حال پر رہنے دو۔" فرزان کا یہ جواب سن کر علامہ صاحب مزید جوش میں آگئے اور جھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

"وہ سب چھوڑو، تم نے ابھی کیا کہا ہے کیا تم جانتے ہو؟"

"جی جانتا ہوں۔" فرزان نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو علامہ صاحب مزید سیخ پا ہوگئے اور زور و شور سے دھاڑنے لگے، غصے کی زیادتی کی وجہ سے ان کے نتھنے مسلسل پھول اور پچک رہے تھے، اور ان کے باقی ساتھی بھی لال پیلے ہوتے نظر آرہے تھے۔ اس دوران لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو چکا تھا اور مجمع سڑک تک پہنچ گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ایک پولیس وین وہاں آکر رکی پولیس کے "فرض شناس" جوان چھلانگیں لگا کر گاڑی سے اترے اور چیل کی طرح مجمع کی طرف لپکے۔ مجمع کائی کی طرح چھٹ چکا تھا اور لوگوں کے ارد گرد ہٹنے کی وجہ سے جو راستہ نمودار ہوا اس نے پولیس کے جوانوں کو عین فرزان کے سامنے لا پہنچایا۔ پھر ایک فرض شناس جوان نے فرض شناسی کی اعلا مثال قائم کرتے ہوئے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟ کیا کوئی مداری آیا ہوا ہے؟ کیوں مجمع لگا رکھا ہے؟" فرزان نے گہری نظروں سے پولیس مین کا جائزہ لیا اور پھر ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں انسپکٹر صاحب! میں تو کام پر سے چائے پینے آیا تھا، یہ مولانا صاحب خوامخواہ گلے فٹ ہو رہے ہیں۔" اور "فرض شناس" تو جوان جو شاید ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ایک ہی چھلانگ میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز کر دیے جانے پر نہال ہو گیا اور اس کا پہلے سے پھولا ہوا سینہ دو انچ مزید پھول گیا۔ پھر وہ متفکرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"یار یہ مولوی لوگ بھی نا۔۔۔ فساد برپا کرنے سے باز ہی نہیں آتے۔ کہیں مذہب تو کہیں فرقہ پرستی، ان لوگوں کو تو دکانیں چمکانے کا بہانہ چاہیے بس۔ کیوں جی مولوی صاحب! رانا صاحب کے ٹھیلے کے نیچے سے کون سا "دجال" برآمد ہو گیا ہے جو آپ نے یہاں مجمع لگا رکھا ہے؟" فرض شناس جوان علامہ صاحب پر چڑھ دوڑا۔

"توبہ توبہ، نعوذ باللہ۔۔۔ یہاں تو دجال سے بھی بڑا فتنہ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ معصوم صورت جو ہمارے سر الزام دھر رہا ہے، ابھی ابھی سب کے سامنے اس نے خدائی کا دعوا کیا ہے یہ کہتا ہے کہ نعوذ باللہ میں خدا ہوں۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ قیامت کی

نشانیاں ہیں۔" یہ سنتے ہی فرض شناس نوجوان کی بتی گل ہوگئی۔ اس کا چوڑا سینہ یکدم سکڑ کر اپنی اصل حالت میں آگیا بالکل یوں جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جاتی ہے۔ وہ فرزان کی طرف پلٹا تو یوں تو تا چشم ہو چکا تھا کہ چند لمحے پہلے ہونے والی اپنی ترقی کو بھی یکسر فراموش کر چکا تھا۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔

"اچھا...! تو یہ بات ہے۔ اوئے بٹھاؤ اوئے ان کو گاڑی میں... ایس ایچ او صاحب خود ہی ان کا فیصلہ کریں گے۔" پولیس مین تیزی سے فرزان کی طرف بڑھے لیکن وہ جلدی سے اٹھ کر خود ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ علامہ صاحب واپس پلٹے تو فرض شناس جوان کی دھاڑ بلند ہوئی۔

"آپ کدھر جا رہے ہو بادشاہو...؟ آپ کے بغیر اسٹوری کا کیا خاک مزا آئے گا؟ اٹھاؤ اوئے ان مولویوں کو' ڈالو ان کو بھی گاڑی میں۔" اور جوانوں نے علمائے کرام کو پکڑ کر "باعزت" طریقے سے گاڑی نشین کر دیا۔

☆ ☆ ☆

ازان حسب معمول ایک گاہک سے سودے بازی میں مصروف تھا اور ایک کلر ٹیلی وژن کی شان میں قصیدہ خوانی کر رہا تھا' جسے خریدنے کی غرض سے وہ گاہک اس کی دکان پر آیا تھا کہ اچانک موبائل کی بیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے جیب کو ٹٹولتے ہوئے موبائل نکالا اور کان سے لگا لیا۔

"اچھا... کب؟ کیسے...؟" پھر چند لمحے خاموش رہ کر اس نے دوسری جانب کی بات سنی اور پھر بولا۔

"اب کہاں ہے؟ ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں..." یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل کان سے ہٹا کر جیب میں ڈالا اور دکان کے اکلوتے ملازم سمیر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"سمیر! ان صاحب کو ٹی وی چلا کر چیک کرواؤ... اور اگر ان کو پسند آجائے تو دے دینا' میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں آدھے گھنٹے تک واپس آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ازان دکان سے باہر نکل گیا' اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ جیب سے چابی نکال کر اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور ایک طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس کی بائیک تھانہ بستی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی تھی۔

بائیک کو لاک کرنے کے بعد وہ تھانے میں داخل ہوا اور سیدھا ایس ایچ او کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک ایک طرف سے آنے والی آواز کو سن کر وہیں رک گیا۔ کوئی پکار رہا تھا۔

"ازان! کیسے آنا ہوا خیریت تو ہے؟" ازان نے پلٹ کر دیکھا تو ایس آئی ضیغم رشید لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف چلا آرہا تھا۔ ضیغم رشید ہائی اسکول میں ازان کا کلاس فیلو رہا تھا اور اس کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ ضیغم نے گرمجوشی کے ساتھ ازان سے مصافحہ کیا تو ازان نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ یار... یار ضیغم! مجھے پتا چلا ہے کہ بھائی کو تھانے لایا گیا ہے؟" ایک زوردار گھن گرج کے ساتھ ضیغم کا جوابی قہقہہ بلند ہوا پھر جیسے وہ زبردستی بریک لگاتے ہوئے عجیب مضحکہ خیز آواز میں گویا ہوا۔

"ہاں لایا تو گیا تھا۔" ازان نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر حیرت سے اس کا جملہ دہرایا۔

"لایا تو گیا تھا' یعنی... "تھا" سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" ضیغم اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

میں نے سمجھا تھا سمندر تم کو
"تھا" کا مطلب تمہیں آتا ہوگا

"ابے یار "تھا" یعنی صیغہ ماضی... اردو اتنی کمزور ہوگئی تمہاری؟ اب تھا کا مطلب بھی سمجھانا پڑے گا تمہیں؟ بھئی اسے لایا ضرور گیا تھا... لیکن... اب کچھ دیر پہلے اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔" ازان کے حلق سے ایک طویل اطمینان بھری سانس خارج ہوئی پھر ضیغم کو گھورتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"قصہ کیا تھا؟" اور ضیغم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی پھر جلدی سے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اسے کچھ مولویوں کے ساتھ لایا گیا تھا' جن کا کہنا

تھا کہ اس نے نعوذباللہ خدائی کا دعوا کیا ہے۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟" اذان نے ضیغم کا جملہ مکمل ہوتے ہی اگلا سوال داغا' حیرت اس کا انداز تھی۔ لیکن ضیغم کی ایک مرتبہ پھر ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر شاید اذان کی پریشانی دیکھتے ہوئے جلد ہی اس نے دوبارہ ہنسی پر قابو پالیا۔

"بس یار۔۔۔ ہونا کیا تھا! ایس ایچ او صاحب یہ سن کر شدید غصے میں آگئے اور پھر ان کا نادر شاہی حکم جاری ہوا "پاؤ اینو لمیاں" (لٹا دو اسے لمبا) ایک ملازم نے ٹانگوں سے پکڑا اور دو ملازموں نے ہاتھ قابو کر کے الٹا لٹا دیا پھر مولا بخش لایا گیا (یعنی چھتر والے کو بلوایا گیا) اور تم تو جانتے ہی ہو' پولیس والوں کا آٹھ انچ چوڑا اور ڈیڑھ فٹ لمبا چمڑے کا وہ "چھتر" دیکھ کر بڑے بڑوں کو اللہ یاد آجاتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے "آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے۔" ضیغم نے ایک لمحہ توقف کیا تو اذان نے بے چینی سے استفسار کیا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ کہ۔۔۔ ایک ہی چھتر لگا تو جوان کی دھاڑیں گونج رہی تھیں۔۔۔" ایس ایچ او نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بس ایک ہی چھتر میں چیخ رہے ہو؟ تم تو خدائی کے دعوے دار تھے! تو پتا ہے کیا جواب دیا صاحب بہادر نے۔۔۔؟"

"کیا؟" اذان نے پریشانی سے پوچھا۔

"اس نے چیخوں کا ریکارڈ یک لخت بند کیا اور گردن موڑتے ہوئے بولا۔"

"اوئے پاگلو! اگر کسی بچے کو اس کی ماں کی سامنے اذیت دوگے اور اس کا بس نہ چلے گا تو وہ چیخے گی' چلائے گی دہائی دے گی۔۔۔ اور۔۔۔ خدا تو اپنے بندے سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے محبت رکھتا ہے۔۔۔ اگر تم اس کے بندے کو تکلیف دوگے تو کیا وہ چیخے گا نہیں۔۔۔؟" اس کی یہ بات سن کر سب کی ہنسی چھوٹ گئی اور ایس ایچ او صاحب پہلو بدل کر رہ گئے۔ پھر کچھ لمحے سوچ کر انہوں نے کہا۔

"چھوڑ دو اسے۔۔۔ یہ پاگل ہے۔"

"موصوف اٹھ کر کھڑے ہوئے اور لگے ایس ایچ او صاحب کے شعری ذوق کا امتحان لینے' بھئی واہ! جو بھی ہے شعر مزے کے سنا گیا۔"

مجھ سے محروم بصیرت پہ یہ القائے نہاں
مالک ارض و سما مجھ کو یہ اعزاز نہ دے
یا تو ہر دور میں سولی کو روایت کردے
یا اناالحق کا مجھے نکتہ آغاز نہ دے

"وہ تو شاید ابھی کچھ اور کلام بھی سناتا لیکن ہمارے ایس ایچ او صاحب بدکلامی پر اتر آئے' وہ زور سے دھاڑے "نکلو یہاں سے۔۔۔" مجبوراً خود پر ضبط کرتے ہوئے اسے جانا ہی پڑا' ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ یہاں سے گیا ہے۔" اذان ہکا بکا کھڑا ضیغم کا منہ تک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"فیضی صاحب۔۔۔ فیضی صاحب۔" گلی کے کارنر پر موجود میڈیکل اسٹور کے مالک ملک ارشد کی آواز سن کر حسب معمول گردن جھکائے گلی میں داخل ہوتے فیضی صاحب نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ملک ارشد ہچکچاہٹ آمیز انداز میں ان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

"وہ۔۔۔ فیضی صاحب! آپ سے۔۔۔ آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ چند لمحے دے سکیں گے؟" اور فیضی صاحب جو ستر سالہ باریش بزرگ تھے مڑ کر میڈیکل اسٹور کی جانب چل دیے۔

"آیئے آیئے۔۔۔" میڈیکل اسٹور کے مالک نے احترام سے ایک چیئر پیش کرتے ہوئے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ فیضی صاحب بیٹھ گئے تو ملک ارشد نے کہنا شروع کیا۔

"دیکھیے فیضی صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔۔۔ اس لیے نہیں کہ۔۔۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں' بلکہ اس لیے کہ آپ نے ساری عمر صرف عزت کمائی ہے' پورا شہر آپ کی عزت کرتا ہے۔۔۔ کہنا تو نہیں چاہیے مگر مجھے انتہائی شرمندگی ہو رہی ہے کہ

میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔۔۔ بات ایسی ہے کہ کہے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ یہ تو آپ کی محبت ہے۔۔۔ آپ اتنا جھجک کیوں رہے ہیں' آپ کہیں کیا بات ہے؟" فیضی صاحب نے ملک صاحب کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔ آج میرے پاس ڈاکٹر اسلم' سلیم بخاری اور محلے کے چند دیگر معززین آئے تھے۔ میں شرمندہ ہوں فیضی صاحب دراصل اولاد جب جوان ہو جاتی ہے اور اولاد بھی وہ۔۔۔ جو اچھی نہ ہو تو والدین کے لیے اس سے بڑی شرمندگی اور کوئی نہیں ہوتی۔" اتنا کہہ کر ملک ارشد ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گئے۔

"ملک صاحب! ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی۔۔۔؟" فیضی صاحب نے دل ہی دل میں پریشان ہوتے ہوئے سوال کیا تو ملک صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔

"فیضی صاحب! آپ گزشتہ چالیس برسوں سے یہاں مقیم ہیں اور آپ سے کبھی کسی کو شکایت نہیں ہوئی۔ لیکن اب پچھلے کچھ دنوں سے۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ محلے والوں کا کہنا ہے کہ۔۔۔ کچھ دنوں سے رات کے دو' دو بجے تک آپ کی بیٹھک میں سے قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ گزرنے والوں نے چرس کی بو بھی محسوس کی ہے۔ اور کل تو حد ہی ہو گئی فیضی صاحب! رات ڈیڑھ بجے گلی میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر وٹرنری ڈاکٹر' اسلم صاحب نے دروازہ کھول کر دیکھا تو آپ کا صاحبزادہ دو تین لڑکوں کے ساتھ ایک لڑکے کو پکڑ کر سڑک کی طرف لے جا رہا تھا' جو بری طرح نشے میں دھت تھا۔۔۔

فیضی صاحب! یہاں سب آپ کی عزت کرتے ہیں۔۔۔ اور آپ کا گھرانہ ایک شریف گھرانہ ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کسی کو آپ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور سب لوگ مل کر میرے پاس آگئے۔

فیضی صاحب! حالات بہت خراب ہیں۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے ابھی چند دن پہلے پچھلی گلی میں ڈکیتی ہو گئی تھی اور ڈاکو جاتے جاتے نوجوان لڑکے شہباز کو گولی مار گئے تھے۔۔۔ آپ کے صاحبزادے کا یہ چلن کہیں آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کردے۔۔۔ آپ اسے سمجھائیں اور گلی محلے میں رات گئے تک اس قسم کی محفلیں جمانے سے منع کریں۔" فیضی صاحب جو پوری توجہ اور انہماک سے ملک صاحب کی بات سن رہے تھے ان کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ انہوں نے ملک صاحب کو تسلی دیتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"آئندہ ایسا نہیں ہوگا!" ان کے چہرے پر گہرا اضمحلال اور آنکھوں میں دھواں سا پھیل گیا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر چلے تو یوں لگا کہ جیسے ان کے کندھے مزید جھک گئے ہوں۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس سے بخوبی واقف تھے لیکن اولاد جب جوان ہو جائے تو بوڑھا باپ کسی قسم کی سرزنش کرتے ہوئے سو مرتبہ سوچتا ہے۔ فیضی صاحب بھی جان بوجھ کر صرف نظر کرتے آرہے تھے کہ شاید میاں صاحبزادے خود ہی سدھر جائیں لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی کو ان پر انگلی اٹھانے کا موقع ملا تھا۔

فیضی صاحب گھر میں داخل ہوئے اور پریشان سے انداز میں اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔

"خیریت تو ہے؟ فیضی صاحب! آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔" ذکیہ بیگم نے محبت سے پوچھا۔ انہوں نے اپنے شریک سفر کے چہرے سے جھلکتی ہوئی پریشانی کو محسوس کر لیا تھا۔

"کیا بتاؤں بیگم! اس اولاد نے تو ساری عمر کی کمائی ہوئی عزت کو خاک میں ملانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔"

ٹھیک اسی وقت ان کی بہو زارا نے پانی کا گلاس لا کر فیضی صاحب کی طرف بڑھایا فیضی صاحب نے افسردگی سے بہو کی طرف دیکھا' پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے پانی کا گلاس پکڑ لیا۔ پانی پی کر گلاس واپس بہو کو تھماتے ہوئے فیضی صاحب بولے۔

"مجھے تو تم پر بھی ترس آتا ہے بیٹا! کہاں نصیب پھوٹ گئے تمہارے؟ سوچا تھا کہ شادی ہوجائے گی تو سدھر جائے گا... لیکن... تیرا بھی مقدر ہی خراب ہے... بلاؤ ذرا اس کو...."

"جی اچھا۔" زارا سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد فرزان ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ فیضی صاحب چند لمحے ایک ٹک اسے گھورتے رہے پھر مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

"فرزان! بہت ہوگیا... آج زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے میری نظریں نیچی ہوئی ہیں... تمہاری وجہ سے... میں نے ساری عمر گزار دی لیکن کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا' کبھی کسی کی بات نہیں سنی اور آج... آج پہلی بار تمہاری وجہ سے 'مجھے بہت کچھ سننا پڑا ہے۔ اب میں رعایت نہیں کروں گا... تمہارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں یا تو اپنے ان لوفر دوستوں کی دوستی چھوڑ دو یا پھر... اگر تمہیں یہ قبول نہیں تو پھر۔ یہ گھر چھوڑ دو... میں اپنے گھر میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کروں گا۔"

فرزان جو سر جھکائے خاموش بیٹھا ان کی ساری بات سن رہا تھا اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنساتے ہوئے فیضی صاحب کی طرف دیکھا' چند لمحوں تک فیضی صاحب کے چہرے پر نظریں جمائے رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں اپنے دوستوں کو... نہیں چھوڑ سکتا۔" فیضی صاحب دنگ رہ گئے انہیں شاید فرزان کی طرف سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی' کچھ دیر کے لیے وہ چپ کے چپ رہ گئے۔ پھر جب وہ بولے تو ان کا لہجہ سرد اور چٹانوں کی طرح سخت تھا۔

"بس تو پھر فیصلہ ہوگیا' کل جب میں گھر واپس آؤں تو تمہاری صورت نہ دیکھوں' ایسی اولاد سے میں بے اولاد اچھا۔" فیضی صاحب کی آواز غصے کی شدت سے کپکپا گئی تھی۔ فرزان بغیر کوئی جواب دیے خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ فیضی صاحب اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک دروازے کو دیکھتے رہے پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے مڑ کر دیکھا ——— تو زارا ایک طرف کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔

"یہ کیا' کیا آپ نے؟ جوان بیٹا ہے... آپ کو ایسا سخت رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" ذکیہ بیگم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیگم... بس۔" فیضی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اب میں مزید کچھ نہیں سنوں گا' فیصلہ ہوگیا۔ کل جب میں آؤں تو یہ مجھے اس گھر میں نظر نہ آئے۔"

ذکیہ بیگم دل مسوس کر رہ گئیں۔

آخر بیٹا تھا ان کا... اور بیٹا چاہے جیسا بھی ہو' ماں تو ماں ہوتی ہے۔ انہیں فیضی صاحب کے اس فیصلے سے اختلاف تھا۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ فیضی صاحب سے بحث کرتیں۔ انہیں شوہر کے مزاج کا اچھی طرح اندازہ تھا' وہ جانتی تھیں کہ اب ان کا فیصلہ تبدیل نہیں ہوسکتا للذا ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ازان حسب معمول شاپ پر تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھا جب وہ میرون کلر کی کار دکان کے سامنے آکر رکی' ازان مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور ڈرائیور نے اتر کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا' کچھ ہی دیر کے بعد پچاس پچپن کے لگ بھگ سرخ و سفید رنگت اور بارعب شخصیت کا مالک ایک شخص دکان میں داخل ہوا جس کے عقب میں ڈرائیور بھی مودب چلا آرہا تھا۔ بارعب شخص سیدھا کاؤنٹر کی طرف آیا اور پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میرا نام اقبال ہے۔" آنے والے نے گویا انکشاف کیا۔ ازان نے پیشہ ورانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے کمال گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

"جی اقبال صاحب! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل

کر' فرمائیے... کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" ازان نے خوش اخلاقی کی اعلا مثال قائم کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ دل میں یہ ہی سوچ رہا تھا کہ تعارف تو ایسے چونکا دینے والے انداز میں کروایا جارہا ہے جیسے اقبال نہ ہو "علامہ اقبال" ہو... سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ علامہ اقبال کی بجائے میر تقی میر یا مرزا غالب بھی ہوں تو ازان کو اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ آنے والا سنسنی خیز انداز میں خاموش کھڑا ایک ٹک ازان کی طرف دیکھے جارہا تھا' مجال ہے جو ایک لفظ بھی اس نے آگے بولا ہو' پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اقبال نے شاید ازان کی ستاروں پر کمند ڈالنے والی سوالیہ نگاہوں کی تپش کو محسوس کرلیا اور اسے مہر خاموشی کو توڑنا ہی پڑا۔

"مجھے ازان صاحب سے ملنا تھا۔" اس نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے ازان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جی بصد شوق... ضرور ملیے... میرا ہی نام ازان ہے' کہیے... کیا "خدمت" کرسکتا ہوں؟" ازان نے خدمت پر ذرا زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا... اچھا... آپ ہی ازان ہیں؟ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر... دراصل! ہمارا تعلق پی۔ ای۔ ایف سے ہے۔ ہم پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی جانب سے مختلف دیہی اسکولوں میں "تعلیم کی اہمیت اور اس کے فروغ" کے لیے ہلکے پھلکے 'انٹرٹینمنٹ سے بھرپور اسٹریٹ پلے کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جب ہم نے یہاں کے مختلف لوگوں سے معلومات حاصل کیں' تو آپ کا نام سامنے آیا اور پتا چلا کہ یہ کام اس علاقے میں آپ سے بہتر اور کوئی نہیں کرسکتا۔"

ازان نووارد کی بے تکان گفتگو سے اس کی آمد کا مقصد بخوبی سمجھ چکا تھا۔ چند لمحے خاموش نووارد کا چہرہ تکنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

"جی۔ ٹھیک ہے میں سمجھ گیا' اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"دیکھیں! ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسٹریٹ پلے آپ خود تیار کریں' جس میں تحریر' کاسٹ' پرفارمنس سب کچھ آپ کے ذمے ہوگا۔ اسکولوں میں تمام انتظامات مثلاً" اسٹیج' ساؤنڈ آپ کی ٹیم کے لیے قیام و طعام ہمارے ذمہ ہوگا۔" اقبال صاحب نے اپنی بات ختم کی تو ازان نے دوسرا سوال کیا۔

"اسکولوں میں تو تمام انتظامات آپ کے ہوں گے' لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے ذریعہ سفر بھی تو درکار ہے' کنوینس آپ کی ہوگی یا ہماری؟" ازان کا جملہ مکمل ہونے پر اقبال صاحب گویا ہوئے۔

"چلیے ٹھیک ہے کنوینس بھی ہمارے ذمے... اب آپ یہ بتائیں کہ فی پلے کیا خرچ آئے گا؟"

"آپ کو ٹوٹل' کتنے اسکولوں میں پروگرام کرنا ہوگا؟" ازان نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً" پندرہ اسکول ہماری لسٹ میں شامل ہیں اگر آپ لوگ اچھا کام کرتے ہیں تو ہر اسکول میں آپ ہی کو پرفارم کرنا ہوگا۔" اقبال صاحب نے جواب دیا۔ ازان نے کچھ دیر توقف کیا پھر پرخیال انداز میں گویا ہوا۔

"دیکھیے اقبال صاحب پوری ٹیم ہماری ہوگی' مکمل تیاری کے ساتھ ہم لوگ آکر پرفارمنس دیں گے جو ان شاء اللہ آپ کو اور وہاں موجود تمام لوگوں کو پسند آئے گی' میں زیادہ بھی مانگ سکتا ہوں لیکن کیونکہ معاملہ تعلیم کا ہے اور کام بھی فلاحی ہے اس لیے ہم فی پروگرام آپ سے پندرہ ہزار روپے لیں گے۔"

تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد معاملہ طے پاگیا اور اقبال صاحب پہلے پروگرام کے لیے پندرہ ہزار روپے ادا کرکے رخصت ہوگئے۔

ازان خوش تھا کہ بیٹھے بٹھائے دو لاکھ پچیس ہزار کا بزنس ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے منصوبہ بندی کررہا تھا کہ کیا اور کیسے کرنا ہے؟ کون کون سے دوستوں کو شامل کرنا ہے؟ پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہوگیا۔ اسی رات اس نے ڈرامہ تحریر کرلیا' ہلکے پھلکے انداز میں تعلیم کی اہمیت پر ایک خوبصورت تحریر وجود میں آگئی' جس میں میسج کے ساتھ ساتھ مزاح بھی موجود تھا۔

اگلے دن اس نے اپنے دوستوں غضنفر ولیکا اور علی

شاہ سے رابطہ کیا انہیں ساری تفصیل بتائی اور تحریر شدہ ڈرامہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ کرداروں پر بحث کی گئی "کامیڈین کا کردار چونکہ غضنفر ولیکا کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا لہٰذا اس میں تو کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ علی شاہ کو باپ کا کردار ادا کرنا تھا" ایک ڈاکٹر" ایک دادا جان" ایک ماں اور ایک بچے کے کردار درکار تھے" ہنگامی طور پر ان کا بھی بندوبست کرلیا گیا لیکن ماں کا کردار دستیاب نہیں ہوسکا۔

"یار! فی میل کردار ڈالنا کیا ضروری تھا؟" علی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اب بتاؤ ماں کہاں سے ڈھونڈیں؟"

"میرے پاس اسکرپٹ ہے" ساتھی ایکٹرز ہیں" اسٹیج ہے" تمہارے پاس کیا ہے؟" ولیکا نے بڑے اسٹائل سے اذان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک فلم کے مشہور ڈائیلاگ کا بیڑہ غرق کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ماں ہے۔" پھر خود ہی دوبارہ بول اٹھا۔

"ابے یار ماں ہی کی تو تلاش ہے" ماں نہیں ہے نا؟"

اذان بولا" تحریر کی ریکوائرمنٹ تھی یار! جب لکھا گیا ہے تو پرفارم کرنے کے لیے بھی کوئی نا کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔" بحث ختم کردی گئی" کہانی غضنفر اور علی کو پسند آئی تھی انہوں نے اسکرپٹ اٹھایا اور ریہرسل شروع کردی۔ اذان کچھ دیر تک پرسوچ انداز میں بیٹھا اس مسئلے کا حل تلاش کرتا رہا پھر اٹھ کر باہر نکل گیا۔ شاید کوئی حل اس کی سمجھ میں آگیا تھا" کچھ ہی دیر کے بعد اس کی بائیک سائنٹفک انسٹیٹیوٹ کے سامنے جاکر رکی اور پھر وہ انسٹیٹیوٹ کے دفتر میں داخل ہوگیا۔

یہ ادارہ اس کے دوست رانا فہیم کا تھا.... فہیم نے اذان کو دیکھا تو کھڑے ہوکر اس کا استقبال کیا" چند لمحے ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد اذان نے حرف مدعا کہہ ڈالا۔

"یار فہیم ڈرامہ لکھ چکا ہوں" ٹیم بھی تقریباً" تیار ہوچکی ہے" مسئلہ صرف فی میل کریکٹر کا ہے اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہارے اسکول میں بہت سی لڑکیاں زیر تعلیم ہیں اور اسٹاف بھی فی میل ہے... کیونکہ پروگرام بھی تعلیمی حوالے سے ہے اور کیا بھی مختلف اسکولز ہی میں جائے گا اس لیے اپنے اسٹاف اور دوسری لڑکیوں سے اس سلسلے میں بات کرو اور کسی بھی طرح اس کردار کے لیے کسی کو تیار کرو۔" تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد فہیم نے وعدہ کرلیا کہ وہ اگلے دن تک کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ اذان نے اس سے اجازت لی اور اٹھ کر باہر نکل آیا۔

✡ ✡ ✡

فرزان واپس ورکشاپ پہنچا تو اس کے اردگرد مجمع لگ گیا" اشرف" کھاری" خلیل" یاسر اور دیگر تمام کاریگر اس کے اردگرد جمع ہوکر اسے یوں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے خدانخواستہ اچانک اس کے سر پر سینگ نمودار ہوگئے ہوں یا سینگوں کے نیچے اس کا وجود اگ آیا ہو! فرزان نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر سب پر ڈالی اور پھر استاد اچھو (اشرف) سے مخاطب ہوا۔

"کیا ہوگیا ہے ان سب کو؟ کیا یہ کسی انسان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں یا ان کے پنجرے ہی آج پہلی مرتبہ کھولے گئے ہیں؟"

"انسان تو ان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن ایسا انسان ان کے لیے ضرور دیکھنے کی چیز ہوگا جو خدائی کا دعوا کر بیٹھے! چائے والے رانا صاحب کچھ ہی دیر پہلے سارا واقعہ ——— بیان کرکے گئے ہیں اور یہاں یہ میٹنگ چل رہی تھی کہ تمہارے پیچھے پولیس اسٹیشن کون کون جائے گا؟ ابھی ہمارے درمیان کچھ طے بھی نہیں ہوا تھا کہ تم واپس بھی آگئے.... ہوا کیا تھا؟" استاد اچھو نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

فرزان نے ایک طویل سانس لی اور پھر گویا ہوا۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے تجھے کیا ہوگیا ہے!
خرد بے زار دل سے" دل خرد سے

کھاری اس کے شعر سنانے پر برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"یار! تمہاری یہ باتیں ہمارے پلے نہیں پڑتیں تم یہ بتاؤ کہ جب پولیس والے تمہیں اٹھا کرلے ہی گئے تھے تو پھر اتنی جلدی چھوڑ کیوں دیا؟" خلیل کا ہاتھ بے اختیار سر پر جا پہنچا پھر مسکرا کر کن انکھیوں سے فرزان کی طرف دیکھتے ہوئے کھاری سے مخاطب ہوا۔

"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اسے واپس نہیں آنا چاہیے تھا کیا پولیس والے اسے نہ چھوڑتے....؟"

"ہاں یار ویسے حیرت کی بات ہے پولیس والوں نے اتنی جلدی تمہیں چھوڑ کیسے دیا؟" یاسر نے بھی قدرے تعجب سے سوال کیا۔

"اچھا سچ سچ بتاؤ پولیس والوں نے "خدمت" تو نہیں کی۔" کھاری نے شرارت بھرے انداز میں لفظ "خدمت" پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا" فرزان نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "بس یار کیا بتاؤں؟

"بات تو سچ ہے مگر....
آج تو چائے پینا بھی مہنگا ہی پڑا۔"

"ویسے یار تمہیں سوجھی کیا؟ کیا ضرورت تھی مولویوں سے الجھنے کی؟" اشرف نے ہمدردانہ لہجے میں جیسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"بس غصہ آگیا مجھے بھی... پتا نہیں ہمارے علما یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اعتدال توازن اور ہم آہنگی کا نام ہے ہر بندے کو حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کو اپنی مرضی سے سمجھے" اپنی عقل سے پرکھے اور اپنے انداز سے جیے" میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایک لمٹ میں رہنا چاہیے حد میں جیو حد میں رہو اور نہ ہی دنیا میں اس قدر مگن ہوجانا چاہیے کہ اللہ کے احکامات سے بے نیازی اختیار کرلی جائے" اسلام تو وہ واحد مذہب ہے جو حدیں توڑنے کے خلاف ہے" جس میں بشریت کا درجہ سب درجوں سے افضل ہے پتا نہیں ہمارے علما اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے" وہ گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ ہر گروہ یہی سمجھتا ہے کہ ہم نے جو راستہ اپنا رکھا ہے وہی صراط مستقیم ہے۔"

"اور یہ خدائی کے دعوے کا کیا قصہ ہے؟" یاسر نے دریافت کیا تو فرزان کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"کچھ نہیں! بس کسی شاعر کا ایک شعر سنا دیا تھا جو ان لوگوں کو ہضم نہیں ہوا" میری نظر میں اللہ کے ساتھ ہر بندے کا اپنا ایک ڈائریکٹ تعلق ہے" جو عبادت کا ہو" پیار کا ہو" اپنائیت کا ہو جیسا بھی ہو" ہوتا ضرور ہے اب دیکھو نا وہ تو قادر مطلق ہے جو سب کی لاج رکھتا ہے" وہ تو بلا تخصیص دینے والا ہے یہ پوچھے یا جانے بغیر کہ میاں تو ہندو ہے؟ عیسائی ہے" کمیونسٹ ہے یا مسلمان وہ تو سب کا رب ہے" میرا اپنے اللہ سے جو رشتہ ہے میں نے کہہ دیا۔"

اساں آپ ہی مسجد مندر
اساں آپ ہی کعبہ مکہ
اتے اللہ ساڈا سکا!

اگر میں نے یہ بات کردی تو کیا غلط کیا؟ ہر شخص اللہ سے اپنے انداز میں بات کرسکتا ہے یہ اس کا اور اللہ کا ذاتی معاملہ ہے بلھے شاہ نے بھی تو کہہ دیا تھا۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی

اگر میں نے کہہ دیا تو پولیس پکڑنے آجائے یہ تو زیادتی ہوئی نا؟"

"یار تمہاری یہ باتیں بھی عالموں جیسی ہی ہوتی ہیں ہماری عقل میں نہیں گھستیں تم یہ بتاؤ پولیس والوں نے کوئی زیادتی تو نہیں کی؟" یاسر نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"اب اتنی عزت احترام اور محبت سے لے کر گئے تھے تو کچھ نہ کچھ اپنائیت کا اظہار تو ظاہر ہے انہوں نے بھی کرنا ہی تھا۔"

رہیں وہ وہ فرشتے ساتھ تو انصاف کیا ہوگا؟
کسی نے کچھ لکھا ہوگا" کسی نے کچھ لکھا ہوگا

فرزان نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے کہا اور پھر لکڑی کا مخصوص ہتھوڑا اٹھاتے ہوئے ایک

جانب بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

فیضی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو ذکیہ بیگم کمرے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہی تھیں۔ آنکھیں بند تھیں مگر آنسو ایک تسلسل سے ان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ شدت گریہ سے ان کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ فیضی صاحب کھڑے ہو کر چند لمحے ان کی طرف دیکھتے رہے، پھر ٹوپی اتھا کر مسہری کے سرہانے رکھی اور حسب معمول آواز لگائی۔

"زارا۔۔۔ بیٹا پانی تو پلاؤ۔" لیکن ان کی صدا پر کوئی کمرے میں نہیں آیا۔ انہوں نے حیران ہو کر دروازے کی طرف دیکھا پھر ذکیہ بیگم کو جن کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ انہوں نے دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا پھر جائے نماز اٹھاتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"کس کو آوازیں دے رہے ہیں۔۔۔؟ کوئی نہیں ہے گھر میں اب۔۔۔"

"کیا مطلب؟ کہاں گئے ہیں سب؟" فیضی صاحب کا انداز استفہامیہ تھا۔

"بھول گئے؟ آپ ہی نے تو کل حکم نامہ جاری کیا تھا کہ یا تو دوستوں کو چھوڑ دو یا گھر کو۔۔۔" ذکیہ بیگم کی آواز میں شکوہ ہی شکوہ تھا۔ فیضی صاحب چند لمحوں کو خاموش رہ گئے پھر ذکیہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"تو اس نے گھر چھوڑ دیا۔۔۔ بجائے اس کے کہ تم اپنے بیٹے کو اس کی غلطیوں کی نشان دہی کراتیں اس کو ڈانٹتیں۔۔۔ الٹا مجھ سے ناراض ہو رہی ہو۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ جو کر رہا تھا صحیح کر رہا تھا؟" ذکیہ بیگم آنکھیں پونچھتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں بولیں۔

"کیا کر رہا تھا میرا بیٹا؟ محلے والوں کو تو اور کوئی کام نہیں سوائے شکایتیں کرنے کے۔۔۔ اور آپ نے ان کی باتوں میں آکر جوان بیٹے کو گھر سے نکال دیا؟ دربدر کر دیا اسے؟"

"تم کیا چاہتی ہو؟ یہ عزت جو میری کل پونجی ہے، تمہارے بیٹے کی حرکتوں پر لٹا دوں؟ نہیں۔۔۔ نہیں، میں یہ نہیں کر سکتا۔" فیضی صاحب مسہری پر بیٹھتے ہوئے بولے، ان کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ ذکیہ بیگم نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ دوبارہ آئیں تو ان کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا جسے فیضی صاحب نے خاموشی سے تھاما اور گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔

اس دوران ذکیہ بیگم خاموشی سے کھڑی انہیں دیکھتی رہیں۔ فیضی صاحب ان کی طرف دیکھ کر قدرے نرم لہجے میں بولے۔

"تم کیا سمجھتی ہو، میں اپنے بیٹے کا دشمن ہوں؟ میں نے سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم مجھے میرے فیصلے میں کمزور نہیں کرو۔"

"میں جانتی ہوں۔۔۔ آپ نے سوچ سمجھ کر ہی یہ کیا ہوگا مگر۔۔۔ میں کیا کروں؟ ماں ہوں نا۔۔۔ میں اپنی مامتا کی وجہ سے مجبور ہوں۔" ذکیہ بیگم رو دینے والے انداز میں بولیں۔

"اپنی محبت میں تم اس کی زندگی کیوں برباد کرنا چاہ رہی ہو؟ اکیلا رہے گا تو اپنی ذمہ داریوں کا احساس جاگے گا اس میں۔۔۔ یہاں تھا تو بے فکر تھا۔ جو کماتا تھا اپنے آوارہ دوستوں پر اڑا دیتا تھا، نہ ماں باپ کو کچھ دیتا تھا نہ بیوی کی کوئی ذمہ داری پوری کرتا تھا۔۔۔ الگ رہ کر شاید احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے؟" فیضی صاحب کا انداز صلح جویانہ اور سمجھانے والا تھا۔

"احساس ذمہ داری تو اسے بہت ہے۔۔۔ مگر دنیا کی چالاکیاں اسے نہیں آتیں۔" ذکیہ بیگم نے کمزور سے انداز میں بیٹے کی وکالت کرنا چاہی لیکن فیضی صاحب ان کی اس کمزور دلیل کو ماننے والے نہیں تھے وہ ان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔

"ماں ہو نا۔۔۔ اسی لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ اذان بھی تو تمہارا ہی بیٹا ہے وہ تو کبھی غلط صحبتوں میں نہیں بیٹھا، نہ ہی کوئی بری عادت ہے اس میں۔۔۔ صبح کا گیا شام کو گھر واپس آتا ہے، کبھی اس کی شکایت کی کسی نے؟"

"ماشاء اللہ وہ تو ہیرا ہے ہیرا۔۔۔" ذکیہ بیگم کے لہجے میں فخر تھا۔

"میں چاہتا ہوں فرزان بھی ایسا ہو جائے، وہ بھی ہیرا ہے۔۔۔ مگر اسے تراشنا پڑے گا، کتنا ذہین ہے۔۔۔ مگر اپنی ذہانت کو غلط جگہ استعمال کر رہا ہے کوئی ڈھنگ کا کام نہیں آتا اسے، بحث جتنی دل چاہے کروا لو، بال کی کھال اتار لے گا، وکیلوں کی طرح جرح کرتا ہے لیکن۔۔۔" ابھی فیضی صاحب کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ذکیہ بیگم ان کی بات کاٹ کر خفگی سے بولیں۔

"آپ کو تو اس کی خوبیاں بھی خامیاں ہی لگتی ہیں۔" فیضی صاحب ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔

"اچھا بھئی! تمہارے بیٹے میں بہت خوبیاں ہیں، میں مان گیا۔۔۔ لیکن لگتا ہے کہ آج تمہارے بیٹے کی وجہ سے مجھے کھانا نہیں ملے گا۔" ذکیہ بیگم ان کی مزاج آشنا تھیں، جان گئیں کہ بات ختم ہو گئی، انہوں نے ایک طویل سانس لی اور کھانا لگانے کے لیے اٹھ کر باہر کی طرف چل دیں۔ فیضی صاحب پر سوچ نظروں سے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ایسے نہیں۔۔۔ کم از کم چار قدم چل کر رکنا ہے، پھر رائٹ سائیڈ پر دیکھتے ہوئے ڈائیلاگ ڈلیوری دینی ہے۔ رکو! میں کر کے دکھاتا ہوں۔" اذان نے علی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ وہ سب اس وقت سائنٹیفک انسٹیٹیوٹ میں جمع تھے اور زور و شور سے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف تھے۔

اذان بطور ڈائریکٹر ان کی موومنٹ، فیس ایکسپریشن اور ڈائیلاگ ڈلیوری کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا اور کہیں کہیں انہیں ٹوکنے کے ساتھ ساتھ اٹھ کر خود ایکٹ کر کے انہیں سمجھا بھی رہا تھا۔ اس نے چار قدم چل کر مکمل ایکسپریشن کے ساتھ جملے ادا کیے پھر علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب سمجھ میں آگیا، اب تم کر کے دکھاؤ۔" بات ختم کر کے اذان واپس پلٹا اور فہیم کے قریب جا بیٹھا جو ایک کرسی پر بیٹھا ان کا جوش و خروش دیکھ رہا تھا۔ علی نے اذان کے بتائے ہوئے انداز میں موو کیا اور پھر بالکل اسی کی طرح رائٹ سائیڈ پر مڑتے ہوئے مکالمہ ادا کیا۔

"ویل ڈن۔۔۔ یہ ہوئی نا بات! اسی لیے تو تمہارے ساتھ کام کرنے میں مزا آتا ہے۔" اذان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ علی ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر جاپانی انداز میں جھکتے ہوئے بولا۔

"اجی آپ کی محبت ہے اذان صاحب! ورنہ بندہ کس قابل ہے۔" پھر سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"محاورتاً" کہہ رہا ہوں، سچ مت سمجھ لینا۔۔۔ فردوس جمال کا شاگرد ہوں۔۔۔ اپنی صلاحیتوں پر شک نہیں، یقین ہے۔" جملہ ادا کرتے وقت اس کا انداز فخریہ تھا۔

"بس بس۔۔۔ رہنے دو! اب زیادہ اتراؤ نہیں۔۔۔ آٹھ مرتبہ بتایا ہے تب جا کے کر پائے ہو۔" اذان نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ٹھیک اسی لمحے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اذان سمیت سب چونک کر اس طرف متوجہ ہو گئے۔

"یہ کھلے ہوئے دروازے پر کون دستک دے رہا ہے؟" فہیم کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ پھر جب کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سب کی نظروں میں اشتیاق لہریں لے رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ پورے کمرے میں خوشبو چکرانے لگی۔ اس سراپا خوشبو نے اپنے لمبے سیاہ چمکدار بالوں کو ایک ادا سے پیچھے دھکیلا، لیکن پھر ان سب کو مسلسل اپنی طرف متوجہ پا کر سرخ سی ہو گئی۔

بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی سمیٹے اس نے فرداً "فرداً" سب کا جائزہ لیا پھر پر اعتماد انداز میں فہیم کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

"جی فہیم صاحب! آپ کے کہنے پر میں آتو گئی ہوں مگر۔۔۔ آپ کو میری ایک بات ماننی پڑے گی۔" فہیم

نے گڑبڑا کر اذان کی طرف دیکھا پھر جلدی سے بولا۔
"جی... جی! بولیں... کیا کہنا چاہتی ہیں؟"
"صرف یہ کہ پلے کی ویڈیو نہیں بنے گی... اور اگر بنے گی تو... کیبل پر نہیں چلے گی۔" فہیم نے اس کا جملہ ختم ہونے پر ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے اذان کی طرف دیکھا تو اذان نے کہا۔
"ٹھیک ہے... اور کچھ؟"
"تھینکس... مجھے میرا کام بتائیں؟" اب وہ براہ راست اذان سے مخاطب تھی۔
اذان نے اسکرپٹ کی ایک کاپی اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی تو فہیم شرمندہ سے انداز میں لڑکوں کی طرف دیکھ کر گویا ہوا۔
"سوری ایوری باڈی... میں تعارف کروانا تو بھول ہی گیا۔" پھر اذان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔
"یہ مس ماہم ہیں اور ہمارے اسکول میں بطور ٹیچر اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں... اور مس ماہم! یہ اذان صاحب ہیں معروف شاعر فیضان فیضی کے صاحبزادے! اور ہمارے اس پلے کے ڈائریکٹر... خود بھی بہت اچھے شاعر اور ادیب ہیں۔" فہیم نے تفصیلی تعارف کروایا تھا لیکن ماہم نے ایک سرسری سی نظر اذان پر ڈالنے کے بعد اسکرپٹ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اس کی ورق گردانی شروع کردی۔
اذان جو منتظر تھا کہ ان تعریفی جملوں پر ماہم اپنی کوئی رائے دے تو وہ بھی گفتگو کو آگے بڑھائے اس کے اس رویے پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے جھلا کر علی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
"چلو! کام شروع کرو... تم لوگ کام روک کر کیوں کھڑے ہوگئے؟ جانتے نہیں کل لائیو پرفارمنس دینی ہے ہمیں... تم تو اس طرح ایزی لے رہے ہو جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔" علی اور ولیکا دوبارہ سے اپنی لائنیں دوہرانے لگے۔ اذان ماہم کی طرف سے بالکل لاتعلق ہو کر بظاہر ان دونوں کی طرف متوجہ ہوگیا مگر اس کا سارا دھیان ماہم ہی کی جانب تھا جس نے سرسری انداز میں اسکرپٹ کی ورق گردانی کرنے کے بعد اسے ٹیبل پر ڈال دیا تھا اور پھر وہ ایک کرسی گھسیٹ کر آرام سے بیٹھ گئی۔ اذان جو کچھ نارمل ہو رہا تھا اس کی اس حرکت پر نئے سرے سے تلملا اٹھا لیکن بظاہر وہ لاتعلق بنا علی اور ولیکا کی طرف سے ہی متوجہ رہا۔
"ولیکا تم کیا سمجھ رہے ہو... صرف اسکرپٹ پڑھنے سے بندہ اداکار بن جاتا ہے؟ کتنی مرتبہ خود کر کے تمہیں دکھا چکا ہوں۔ تیزی سے بھاگ کر آؤ، تمہارا جملہ اسٹیج پر ان ہوتے ہی بے ساختہ انداز میں ہونا چاہیے چلو دوبارہ کرو۔" پھر ماہم کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔
"مس ماہم! یہ اسکرپٹ آپ کو مکالمے یاد کرنے کے لیے دیا گیا ہے... کل ہم نے پرفارمنس دینی ہے اور ابھی یہ... آپ کو کر کے دکھانا پڑے گا۔" ماہم نے حیرت سے اسے دیکھا اور اذان اس کی آنکھوں کی اس کھوئی کھوئی سی کیفیت کو محسوس کر کے عجیب سا ہوگیا، اسے خود اپنی کیفیت کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ صرف ایک احساس ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں اس کی گفتگو سے یکسر جدا تھیں۔ پھر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ انتہائی پریقین اور بااعتماد تھا۔
"جی! میں کرلوں گی۔" اذان جل ہی تو گیا۔ اگر اس کی آنکھیں مخاطب کو اسیر کرتی تھیں تو لہجے کا یقین پتا نہیں کیوں اذان کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔
"ٹھیک ہے... تو چلیں، کر کے دکھائیں۔" اس کی جھلاہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں اذان کی نظروں سے ٹکرائیں تو اذان کو شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آنکھیں اس سے اس کے لہجے کی شکایت کر رہی ہوں۔
وہ پراعتماد قدموں سے چلتی ہوئی علی اور ولیکا کے سامنے جا پہنچی اور پھر اسی اعتماد کے ساتھ جب اس نے اپنے مکالمے بولنا شروع کیے تو اذان حیران رہ گیا، مکمل پرفیکشن کے ساتھ اس نے مکالموں کی ادائیگی یوں کی تھی جیسے اسکرپٹ اس نے خود لکھا ہو، کردار کی ریکوائرمنٹ کے عین مطابق چہرے کے

تاثرات... مجموعی طور پر ماہم کی پرفارمنس شاندار تھی لیکن اذان شاید اسے داد دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حیران بہت تھا۔ اتنی سے دیر میں مکالموں کا یاد بھی ہو جانا اور پھر اس پرفیکشن کے ساتھ ان کی ادائیگی بھی... اذان کو یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ اتنا اچھا کر پائے گی۔ پھر بھی وہ ماہم کو ٹوکتے ہوئے گویا ہوا۔
"مس ماہم! ایسے نہیں... آپ کی ڈائیلاگ ڈلیوری بہت فاسٹ ہے... یہ درست نہیں... اپنے چہرے پر غم کے تاثرات پیدا کیجیے اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں علی کی آنکھوں میں دیکھ کر بولیں۔" اس کی بات سن کر ماہم نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اذان ایک مرتبہ پھر گڑبڑا سا گیا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کی آنکھوں میں کھو سا جاتا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ جانتی ہے کہ اذان خواہ مخواہ ڈائریکٹر ہونے کا رعب جھاڑ رہا ہے۔ اس کی شاکی نظریں جیسے اس سے سوال کر رہی تھیں کہ "جب میں اپنا کام درست کر رہی ہوں تو پھر یہ تنقید کیوں؟"
اذان ساکت بیٹھا اس کی آنکھوں میں گم تھا لیکن اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی کیونکہ وہ سر جھٹک کر اذان کے کہنے کے مطابق دوبارہ سے لائنیں دوہرانا شروع کر چکی تھی اور اذان اس کے سراپے پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا کہ اس سے ملاقات کبھی ہوئی تو کہاں... اور کس حال میں... تعارف بھلے ہی آج ہوا تھا، اس کے نام سے آگاہی بھی آج ہی حاصل ہوئی تھی لیکن وہ چہرہ... وہ چہرہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا...!
"چائے نہیں پلاؤ گی؟" فرزان نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کچن کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہوئے زارا کو مخاطب کیا۔ زارا جو پہلے ڈبے کی طرف دیکھ رہی ایک لمحے کو رک کر مڑ کے دیکھنے لگی۔ پھر چولہے پر چڑھی پتیلی میں چائے کی پتی ڈال کر خالی ڈبا فرزان کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔
"جی بنا رہی ہوں، پتی ختم ہوگئی تھی، پڑوس سے لی ہے۔ اب تو ان سے مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے دو دن سے مسلسل کبھی چینی کبھی پتی اور کبھی پیسے مانگ رہی ہوں۔"
"تو کیوں مانگ رہی ہو... کس نے کہا ہے مانگو؟" فرزان نے سگریٹ پھینک کر ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔
"کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" زارا نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تحمل سے پوچھا۔
"گلاس... پانی پینا ہے، ملے گا یا... اس کے لیے بھی پڑوس سے مانگنا پڑے گا؟" فرزان نے تلخی سے کہا۔
زارا نے خاموشی سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھایا اور پھر کپ میں چائے نکالنے لگی۔
"مجھے کوئی شوق نہیں مانگنے کا... یہ ذمہ داری تو آپ کی ہے کہ گھر کی چیزیں لے کر آئیں، راشن ڈلوائیں... صبح کے گئے شام کو آتے ہیں آپ اور وہ بھی خالی ہاتھ... میں اس انتظار میں رہتی ہوں کہ آج آپ کچھ لے آئیں گے مگر... میرا انتظار انتظار ہی رہتا ہے۔" فرزان طنزیہ انداز میں بولا۔
"ہاں... انتظار... ہر بیوی انتظار کرتی ہے مگر شوہر کا نہیں... اس کے لائے ہوئے پیسوں کا! پیسے ملیں، بہت سے پیسے ملیں مکان سجے، فانوس سجے، چراغاں ہو، مہمان آئیں، کھانے پکیں، رونقیں ہوں، میں آرزوؤں کی اس کثرت نے ہی تو انسان کو دکھی کر رکھا ہے کیونکہ کثرت ہمیشہ دکھی کرتی ہے۔ ایک خواہش پوری ہو تو دوسری پوری نہیں ہوتی لیکن پھر بھی خواہش سے خواہش جنم لینے کا یہ عمل رکتا نہیں ہے یہ جانے بغیر کہ انسان جو کچھ ہوتا ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا... آج کے انسان کا محبوب صرف پیسہ ہے، وہ اسی پیسے کو اپنا محبوب مانتا ہے، اسے چاہتا ہے، اسی کی پوجا کرتا ہے اسی کے وصال سے خوش ہوتا ہے، اسی کے فراق سے ڈرتا ہے، آج کے انسان کو موت سے بھی زیادہ غریبی کا ڈر ہے۔"
"ڈر کی بات رہنے دیں آپ... کیا آپ کو موت کا

خدیجہ مغل

ڈر نہیں ــــ؟ یہ ساری کتابی باتیں ہیں جو صرف سننے میں اچھی لگتی ہیں آپ خود سوچیں' ایک وقت کا کھانا نہ ملے آپ کو اور میں دن رات آپ سے بہت ساری فلسفیانہ باتیں کرتی رہوں' تو پیٹ بھر جائے گا آپ کا؟"
زارا کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

"دیکھو! اللہ نے ہمیں دنیا میں بھیجا ہے' انسانوں کی دنیا میں ــــ اگر وہ چاہتا تو اپنے پاس ہی رہنے دیتا' اس دنیا میں بھیجنے جانے کا مطلب ہی یہ ہی ہے کہ یہاں رہتے ہوئے اللہ کو یاد رکھا جائے لیکن ہم ہیں کہ ہمیں اللہ سے زیادہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کی فکر ہوتی ہے۔
فرزان کا انداز ناصحانہ تھا۔ "ہونہہ ــــ اللہ کو یاد ــــ اگر انسان کے لیے صرف یاد الٰہی ہی کافی ہوتی تو مقرب کی ذات غار حرا سے باہر نہ آتی ــــ جو انسان اللہ سے جتنا قریب ہو گا وہ مخلوق کے بھی اتنا ہی قریب ہو گا اور مخلوق سے مخلوق کے رشتے بھی ہوا کرتے ہیں ان رشتوں کے کچھ حقوق کچھ فرائض اور کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں جو انسان کو ہر حال میں نبھانا پڑتی ہیں۔ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت بھوک ہے اور آپ اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتے۔

فلسفہ مجھے بھی آتا ہے لیکن خالی پیٹ یہ ساری باتیں بے کار لگتی ہیں۔" زارا جلے کٹے انداز میں بولی۔

"محنت کر تو رہا ہوں' سارا دن مشقت کرتا ہوں' کتھیرے سے لوہے کی چادر کو کاٹتا ہوں' جوڑتا ہوں' اسے ایک شکل دیتا ہوں وزنی ہتھوڑے سے کوٹ کوٹ کر ٹرنک اور پیٹیاں بناتا ہوں' اتنی جان توڑ محنت کرنے کے باوجود بیوی کے منہ سے شکوے اور شکایتیں ہی سنتا ہوں' کیا چاہتی ہو تم ــــ؟ چوری کروں ڈاکے ڈالوں؟ جعلی نوٹوں کا دھندا کر لوں یا ڈرگز بیچنا شروع کر دوں؟ بولو جواب دو ــــ چپ کیوں ہو؟ جتنا کر سکتا ہوں اتنا ہی کروں گا!"
فرزان کا لہجہ تلخ ہوتا چلا گیا۔

"مجھے بھی تو آپ سے یہ ہی شکایت ہے اتنی محنت سے کمایا ہوا پیسہ آپ اپنے اوباش اور لالچی دوستوں پر خرچ کر دیتے ہیں۔ بابا کو بھی تو آپ سے یہ ہی شکایت ہے۔" زارا بدستور تحمل سے بولی۔

"تو میں تم لوگوں کی شکایتیں کیسے دور کروں؟ دوستوں کو تو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا ــــ ایک یہ ہی تو تفریح ہے میری۔" فرزان سختی سے بولا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے' آپ اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑیں ــــ مجھے ایک بات کی اجازت دے دیں۔" زارا نے بحث کو سمیٹتے ہوئے قدرے جھجک کر کہا۔

"ہاں بولو؟" فرزان نے دریافت کیا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں جاب کر لوں؟ پڑھی لکھی ہوں اچھا ہے ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے اور ــــ" ابھی زارا کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے بے اختیار پیچھے ہٹنا پڑا' فرزان نے ہاتھ میں موجود کپ سامنے دیوار پر دے مارا تھا زارا سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ اب وہ ادھر ادھر موجود چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا۔

"تم چاہتی ہو کہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرو؟ فیضان فیضی کی بہو اور فرزان فیضی کی بیوی ــــ گھر سے نکل کر بازار میں پہنچے اور غیر مرد نظر بازی کریں ــــ ــــ ہے نا' یہی عزت رہ گئی ہے ہماری؟ یہ نوبت آ گئی ہے ــــ؟"

"میں ایسا کچھ نہیں چا ــــ زارا کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ فرزان نے اس کی گردن دبوچ لی اور پھر اس کے چہرے کے بالکل قریب ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے فرزان کی غراہٹ آمیز سرد آواز ابھری۔

"تم جو چاہتی ہو وہ کبھی نہیں ہو سکتا ــــ آج تو تم نے یہ بات کہہ دی ــــ آئندہ اگر ایسی کوئی بات تمہارے ذہن میں آئی تو اس سامان کی جگہ تم فٹ بال بنو گی۔" فرزان نے اردگرد بکھری ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے دھکیلتے ہوئے کچن سے باہر نکل گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

"یقین کرو، سارے جہاں کی بے وقوفی آکر ختم ہی اس پر ہوتی ہے۔" فیصل نہ جانے کس کی بات کررہے تھے میں نادانستہ طور پر رک گئی شاید اس تجسس میں کہ جانوں فیصل کی یہ رائے ہے کس کے بارے میں۔

"سچ پوچھو تو بیوی میں اور کچھ ہو نہ ہو عقل ضرور ہونی چاہیے اور ہماری زوجہ میں اس اک چیز کا فقدان ہے جو اس کی باقی ہر خوبی کو گہنا دیتا ہے۔" فیصل کے اگلے الفاظ مجھے پاتال میں گرانے کے لیے کافی تھے' میں نے اس ایک پل میں دنیا کی ہر شے کو اپنے گرد چکراتا محسوس کیا تھا۔

"دنیا میں ہر چیز کا اعتبار کیا جاسکتا ہے سوائے مرد کے۔" میں نے بہت پہلے کہیں سنا تھا اب یقین بھی آگیا۔

"چھوڑیں بھی فیصل بھائی آپ مرد لوگ بھی حد کرتے ہیں عورت اتنی جاہل بھی نہیں ہوتی جس قدر آپ اسے بنا دیتے ہیں۔ یہ عقلمندی نہیں تو کیا ہے کہ وہ آپ لوگوں کی ہر خامی کے ساتھ سمجھوتا کرتی ہے۔ ہر اچھائی برائی پر پردہ ڈالتی ہے ہر تنگی ترشی میں آپ لوگوں کا ساتھ دیتی ہے اور ساری عمر کسی سے گلہ نہیں کرتی' بات' بات پہ بدقسمتی کا رونا نہیں روتی جبکہ آپ اس کی ذرا سی بھول پر اسے کٹہرے پر لا کھڑا کرتے ہیں' ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتاتے ہیں اس نے ہمارے حقوق پامال کیے مگر اس سے پہلے آپ بھولے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ عورت جو آپ کے نکاح میں ہے اس کے بھی کچھ حقوق آپ کی طرف نکلتے ہیں۔"

جواب میں ابھرنے والی آواز بھی نامانوس نہیں تھی۔ وہ حرا تھی میری اور فیصل کی ماموں زاد میری ہم دم' میری دوست اور فیصل کو سارے جہاں میں ملی بھی تو اک وہی میری برائیاں کرنے کے لیے وہی "حرا" جو بقول فیصل۔

"اس قابل بھی نہیں کہ اس سے بات ہی کی جائے کجا کہ دوستی رکھنا۔" آج فیصل اسی حرا کے سامنے بیٹھے میری ذات کے "بخیے" ادھیڑ رہے تھے۔

مجھے لگا میرا جسم کسی گہرے دلدل میں دھنس گیا ہے جس میں سے نکلنے کی کوشش میں' میں جتنے ہاتھ پاؤں چلاؤں گی اتنی ہی اندر تک دھنستی چلی جاؤں گی۔ تب میرے کانوں میں میری ہی آواز گونجنے لگی۔

"یہ میرب! اچی بڑا تنگ کرتی ہے مجھے تو سمجھ نہیں آتی اسے سنبھالوں کیسے بات بات پر ضد' رونا' اکڑنا اور لڑنا کوئی ایک بھی اچھی عادت نہیں ہے اس میں۔" کچھ دن پہلے جب حرا کے گھر آئی تھی تب اس نے گلہ کیا تھا جس کے جواب میں میں نے میرب کے تنگ کرنے کا ذکر کیا۔

"کیوں بھئی میرب! کیوں تنگ کرتی ہو مما کو اپنے پاپا پہ پڑی ہو ساری کی ساری۔" حرا نے میری شکایت کے جواب میں میرب کے رخسار پہ چٹکی لیتے ہوئے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہا مگر مجھ سے فیصل کے بارے میں اس کے کہے اتنے سے الفاظ بھی برداشت نہیں ہوئے۔

"نہیں بھئی فیصل میں کوئی بری عادت نہیں ہے۔" میں نے میرب کے گندے کپڑے سمیٹتے ہوئے ترت اسے ٹوک دیا۔

"بائی داوے میں نے یہ تو نہیں کہا فیصل بھائی میں ایسی کوئی بری عادت ہے اور اچھی بری عادتیں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ فیصل بھائی کیا سب سے الگ ہیں۔" وہ کچھ حیرانی کے ساتھ مسکرائی۔ جیسے مجھ سے اس ردعمل کی امید نہ رکھتی ہو۔

"ہوتی ہوں گی مگر فیصل میں نہیں ہیں۔" میں نے بڑی سختی سے اس کی تردید کی۔

"فیصل میں عام مردوں والے کوئی ناز نخرے نہیں' بات میں سختی نہ بے جا روک ٹوک ان میں تمام وہ خوبیاں موجود ہیں جن کی ایک عورت تمنا کرتی ہے کہ اس کے شوہر میں ہوں۔" پتا نہیں کیوں مجھ سے فیصل کے بارے میں کبھی کوئی غلط بات برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت میرے لہجے میں خود بخود اک فخر سمٹ آیا تھا۔

"اچھا بھئی تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں ایسا ہی ہے اور یہ بھی کہ تمہاری بیٹی نے تمام بری عادتیں اپنی حرا خالہ سے لی ہیں۔" حرا کے بات ختم کرنے والے انداز میں ہلکے تاسف اور بے یقینی کا سا شائبہ تھا جسے میں نے اپنا وہم خیال کرکے ٹال دیا تھا۔ مگر آج وہ بے یقینی کیسا یقین بن کر میرے منہ پر پڑی تھی کہ آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ سارے منظر سراب بن گئے تھے۔

مجھ میں مزید وہاں کھڑے رہنے کی سکت نہیں تھی۔ مگر میں کھڑی تھی کیونکہ قدموں کو فیصل کی آواز نے جکڑ رکھا تھا۔

"ہاں واقعی بات تو تمہاری ٹھیک ہے کہ گزارہ وہ کررہی ہے مگر یہ بھی میں کہوں گا کہ اس کی اس بے وقوفی کے سبب ہے کسی سے مقابلہ کرنے کے لیے بھی تو اس کی سطح پر آنا پڑتا ہے اور ہماری بھابھیاں تو ماشاء اللہ جہاں ہماری زوجہ کی بات ختم ہوتی ہے وہاں سے وہ بسم اللہ کرتی ہیں مان لو تمہاری دوست کا اوپری خانہ ہے ہی خالی۔" فیصل کا تمسخر اڑاتا انداز اور بے باک قہقہہ میرے دل کے آر پار ہوگیا۔

مجھے کتنا یقین تھا کہ فیصل مجھے سمجھتے ہیں مگر مجھے وہ کیا سمجھتے ہیں اس کا علم آج ہوا تھا۔ اور اب دل میں الگ طوفان اٹھ رہے تھے اور روح علیحدہ جھگڑوں کی زد میں تھی۔ آنکھوں میں کچھ چبھنے کا احساس ہوا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اس چبھنے والی چیز کو دور کرنا چاہا اور یہ کیا یہ تو آنسو کا اک قطرہ تھا بے ضرر اور بے رنگ پتا نہیں اتنی جلن کیسے پیدا کرلیتا ہے جیسے فیصل کے منہ سے نکلے یہ چند الفاظ جو اگر کوئی اور مجھے آکر بتاتا اور کہتا کہ یہ فیصل نے تمہارے لیے کہے ہیں تو شاید میں اک لفظ پر یقین نہ کرتی مگر کیا کرتی ان سماعتوں کا جن میں وہ پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جاچکا تھا یہ کچھ جھٹلانے کو تیار ہی نہ تھیں۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ بجائے اس کے کہ آپ اس بات کو اس کی سمجھ داری جانیں کہ وہ گھر میں لڑائی جھگڑوں کو ہوا نہیں دیتی آپ الٹا اسے اس کی کم عقلی گردان رہے ہیں جبکہ اگر ایسا کسی اور کی بیوی کرے تو اس کو مثال بنا کر سامنے لا کھڑا کریں۔" حرا کے دفاعی الفاظ میرے زخموں پر مرہم بننے کی بجائے نمک پاشی کا کام کررہے تھے کیونکہ جو الفاظ حرا ادا کررہی تھی وہ ہی الفاظ میں فیصل کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

"ارے چھوڑو بھی تمہاری تو دوست ہے تم طرف داری نہیں کروگی تو اور کون کرے گا مگر ایک عورت کو اس کے مرد سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ ابھی صرف ایک بچی ہے وہ تک تو سنبھالی نہیں جاتی اس سے' آگے تو اللہ ہی حافظ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے پڑھ لکھ کر سب چولہے میں جھونک ڈالا ہے اس عورت نے ہاں البتہ میری بیٹی میں صبر ہے ورنہ اس عمر کے بچے انگلیوں پر نچاتے ہیں ماؤں کو۔"

"یہ کیا کہہ رہے تھے فیصل اور کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے تو مرد اور عورت کو اک دوسرے کا لباس بنایا ہے۔ اگر مجھ سے انہیں کوئی شکایت ہے تو مجھ سے کہیں مگر یوں کسی اور کے سامنے بے لباس تو نہ کریں مجھے اور وہ بھی میری دوست کے سامنے۔"

اور فیصل جو ابھی رات کو مجھ سے کہہ رہے تھے۔

"ایک مرد کی خوش قسمتی دو چیزوں سے مشروط ہوتی ہے ایک نیک بیوی اور دوسری صالح اولاد۔ اور میں دونوں صورتوں میں خوش قسمت ہوں۔ ایک تو اس لیے کہ تم میری بیوی ہو اور دوسرا تم میری اولاد کی ماں ہو۔ تم میری زندگی کا حسین تحفہ ہو جس کے بغیر میں شاید زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" اور اب وہ کیا کہہ رہے تھے۔ آخر میں یقین کروں تو فیصل کی کس بات کا وہ جو انہوں نے مجھ سے کہی تھی یا وہ جو ابھی وہ حرا سے کہہ رہے تھے اور میں یقین کرنا بھی نہیں چاہتی تھی اس بات کا جو ابھی میں نے سنی تھی۔ مگر اس میں بھی قصور ان کانوں کا تھا جو فیصل کی آواز سے اس قدر مانوس تھے کہ شاید سننا بھول جائیں مگر فیصل کی آواز نہ بھولیں میرا دل چاہا کہ تڑپ تڑپ کر رودوں مگر کیا کرتی کہ اس دل کو اپنا پردہ بھی مقصود تھا۔

شادی والا گھر تھا ابھی جو کوئی اس طرف آجاتا تو میری اس قدر ناگفتہ بہ حالت سے کیا کیا نہ حظ اٹھاتا۔

میں نے آنکھوں میں چبھنے والے کانٹوں کو بے دردی سے ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور زلزلے کی زد میں آئے جسم کو بے پتوار کی کشتی کی مانند جی جان سے دھکیلنے لگی جو صرف اور صرف ہواؤں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے لہریں جہاں چاہیں پہنچا آئیں وہ چاہے سمندر کا عین وسط ہو یا کوئی کنارہ مگر کیسا کنارہ مجھے تو ہواؤں نے کنارے سے دھکیل ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے لگتا ہے میری زوجہ کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ طبیعت کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔" نکاح کی رسم کے بعد دولہا دولہن کا فوٹو شوٹ چل رہا تھا جب فیصل کیمرہ ہاتھ میں لیے ہمارے قریب چلے آئے تھے۔ میں نے یوں چونک کر دیکھا جیسے کسی گہرے خواب سے جاگی ہوں اور خواب ہی تو تھا حقیقت والے فیصل خواب والے فیصل سے کتنے مختلف تھے کہ آنکھیں پہچاننے سے انکاری ہو رہی تھیں۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے سستی ہو رہی ہے۔"

"پھر بھی یار کچھ "چل" کرو شادی کے ہنگامے تو پرجوش کر دیتے ہیں تم نے تھکن سوار کر رکھی ہے۔" انہوں نے نرمی سے میرے گال کو چھو کر کہا جیسے بک اپ کر رہے ہوں۔

مگر میں تو ان کے انداز میں کچھ گھنٹوں پہلے والا لہجہ تلاش رہی تھی۔ بلاشبہ یہ وہ فیصل نہیں تھے اگر وہی تھے تو اپنی زبان بدل آئے تھے یا چہرہ یا پھر سارے کے سارے ہی مجھے بڑا غور کرنے پر بھی وہاں کچھ دیر پہلے والے فیصل کا شائبہ تک نہیں ملا مگر وہ میرے فیصل بھی تو نہیں تھے وہ کوئی اور تھے۔ کوئی اجنبی جنہیں میں نے آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا، میں نے اک گہری سانس لے کر سر جھکا لیا

"فیصل بھائی کی نیچر کچھ عجیب سی ہے۔" میرے پھوپھی زاد ریحان نے ہماری شادی کے اوائل دنوں میں فیصل سے ملنے کے بعد کہا تھا تو میں نے جل ککڑا کہہ کر منہ پھیر لیا تھا۔ کیونکہ میرے خیال میں امی ابو نے ریحان کے بھائی جواد کے مقابلے میں فیصل کو ترجیح دے کر سارے خاندان کو باتیں بنانے کا موقع دیا تھا اور یہ انہیں باتوں میں سے ایک بات تھی مگر اب، اب مجھے لگ رہا تھا جیسے ریحان میرے سر پر کھڑا میرا تمسخر اڑا رہا ہے۔

"ارے! یہ نبیلہ ہے نا اپنے خاور کی سالی کچھ فربہ نہیں ہو گئی پہچانی ہی نہیں جا رہی۔" فیصل کے کہنے پر میں نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور خاور کی سالی کو بس دیکھ کر ہی رہ گئی وہ پہلے جیسی ہی تھی دبلی پتلی، خوش باش چاق و چوبند پھر فیصل کو وہ فربہ کیوں لگی یا شاید مجھے ہی نہیں لگی۔ یا شاید فیصل صرف اس کا ذکر کرنا چاہتے تھے یا نظروں کو سیراب کرنے کے لیے جواز درپیش تھا خاور کی شادی پر اچھا خاصا خوار کیا تھا اس نے فیصل کو۔

"اف تو کیا اب میں دنیا کی عام عورتوں کی طرح فیصل کی سادہ سی بات کے بھی موہوم معنی نکالوں گی۔" مجھے اپنی سوچ پر گہرا تاسف ہوا۔

"یار بیوی! تم بہت بور کر رہی ہو بھئی بندہ کم از کم کسی کی بات کا جواب ہی دے دیتا ہے مگر تم تو یوں پوز کر رہی ہو جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔" فیصل میری بے توجہی پر یونہی جھنجلا اٹھتے تھے، میں بس اک نظر انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"ہاں! اب بیوی تو بور کرے گی ہی آپ کو۔" اک اور لایعنی سوچ میں بس ہونٹ کچل کر رہ گئی۔

"عافیہ ادھر دیکھو میری طرف طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" انہوں نے میرا چہرہ اپنی طرف موڑا تھا جسے میں نے فوراً ہی گود میں بیٹی میرب کی اوٹ میں چھپایا مبادا انہیں میری آنکھوں میں چمکتے آنسو نظر نہ آجائیں جو ان کی جفا کے سبب لاکھ ضبط کے باوجود چلے آئے تھے۔

"تمہیں تو میرا خیال ہے بخار بھی ہے۔ ایسا کرتے ہیں میں کسی سے گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں ڈاکٹر کو دکھا کر گھر چل کر آرام کر لینا۔ آنکھیں بھی دیکھو کس

ل ہیں۔ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو بتا یہاں آنا ضروری تھا کیا۔" فیصل کی فکر مندی پہلے ی ہی تھی مگر میرا دل شاید بدل گیا تھا جو ان کی توجہ بھی خوش نہیں ہو پا رہا تھا۔

"اور میرب کو امی کے حوالے کرو آمنہ فائزہ سنبھال لیں گی مل کر۔" فیصل فوراً ہی اٹھ کر کھڑے گئے جبکہ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا اک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"کاش! فیصل آپ مجھ پر نہ کھلے ہوتے کاش۔" دل ہی دل میں ان سے شکوہ کرتی آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں، میں ہونٹ کچلنے لگی۔ فیصل کچھ دیر میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میرب کو لے کر آمنہ کی تلاش میں نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

"ہماری عافیہ بہت بھولی ہے بھابھی اور اپنی بہن کے مزاج کو بھی آپ جانتی ہیں بڑی دونوں تو ان جیسی ہیں تو گزارہ ہو رہا ہے مگر عافیہ کیسے بھگتے گی ان تینوں کو اور پھر فیصل میں بھی کچھ بات نہیں ہے۔" ہماری منگنی کے موقع پر عطیہ چچی نے کہا تھا تو امی کی فکر مندی پر میں نے کہہ دیا تھا۔

"یہ ان لوگوں کا حسد ہے۔" اور اب میں سوچ رہی ہوں کاش اس وقت چچی نے بھولی کی بجائے مجھے بے وقوف کہا ہوتا۔ کیونکہ میں ہوں ہی بے وقوف اب بھی میں جتنا سوچتی رہی تھی سوچیں اتنا ہی الجھتی جا رہی تھیں۔

"سب لوگ مجھ سے ہی حسد کرتے تھے انہیں کوئی اور کام نہیں تھا؟" یہ سب سوچنے کے لیے بھی عقل کی ضرورت تھی اور بقول فیصل وہی مجھ میں ناپید تھی۔

"کیوں بھئی فیصل بھائی یاد آ رہے ہیں۔" حرا ہاتھ میں کلینزنگ ملک کی شیشی پکڑے نہ جانے کب میرے پاس آ بیٹھی تھی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ اور چلتا تو تب نا جب میں وہاں موجود ہوتی میں تو کسی اور ہی

جہاں میں پہنچی ہوئی تھی۔
"کیا کہا تم نے؟" میں نے تھوڑا کھسک کر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے استفسار کیا۔
"بھئی میں کہہ رہی ہوں فیصل بھائی کی یادوں میں کھونے سے بہتر ہے تم ان کے پاس ہی چلی جاؤ کم از کم ہمیں یہ تو پتا ہو گا تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔" گزشتہ تین دن سے میں فیصل، خالہ امی اور میرب کے ساتھ علیحدہ کمرے میں سو رہی تھی اور حرا لوگوں کے بے حد اصرار پر بھی ان لوگوں کے ساتھ سونے نہیں آئی اب بھی حرا کا اشارہ اسی جانب تھا۔ جس پر باقی دونوں نے کھل کر قہقہہ لگایا، میں خجل سی ہو کر ساتھ لیٹی میرب کے بالوں سے کھیلنے لگی کہ جواب میں کچھ کہنے کی سکت نہیں تھی۔
"ارے باندھے اگر جناب آ ہی گئے ہیں تو سکون سے سونے دو انہیں خیال رہے وہ یہاں سونے آئے ہیں سو انہیں آپ لوگ ڈسٹرب نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔" یہ ثنا تھی جو مجھے ناراضی کے عالم میں گھور رہی تھی اور ناراض تو وہ مجھ سے پہلے دن سے ہی تھی جب میں نے ان لوگوں کے انتہائی اصرار پر بھی ان لوگوں کے کمرے میں سونے پر ہامی نہیں بھری تھی۔ اور وجہ وہی، فیصل نہیں چاہتے تھے میں ان تینوں خاص طور پر حرا کے ساتھ زیادہ گھلوں ملوں اور اب بھی میں نے فیصل کی بجائے خالہ امی کو بتایا تھا مبادا فیصل کو بتاؤں اور وہ پھر منع کر دیں جبکہ مجھے کم از کم آج کی رات ان کا ساتھ منظور نہیں تھا آج جب زخم تازہ ہے اپنے قاتل کو اپنے سامنے بیٹھا کیسے دیکھوں۔ میں انتہائی کوششوں کے بعد بھی ثنا کی بات پر صرف مسکرا ہی سکی تھی۔
"بھئی آج کی رات وہ ہم لوگوں کو عنایت کر تو رہی ہے۔ اب دور کرو یہ گلے شکوے ختم بھی کرو۔" انعم نے اپنے مزاج کے مطابق صلاح کی راہ نکالی۔
"مجبوراً" ہی آ بیٹھی ہے ہمارے درمیان اس لیے تو کہہ رہی ہوں جانے دو اسے ورنہ ساری رات بددعائیں دیتی رہے گی۔" ثنا کافی جلی بھنی بیٹھی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اس کی ناراضی سخت نوعیت کی ہے لیکن میں نہ تو اسے راضی کرنے آئی تھی نہ فیصل سے ناراض ہو کر میں تو اپنا احتساب کرنا چاہتی تھی وہاں جہاں فیصل نہ ہوں۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب بس شادی کے ہنگامے نے تھکا ڈالا ہے ورنہ تم لوگ تو جانتی ہو میں بیماری میں بھی نچلی نہیں بیٹھتی۔" میرا دل لاکھ نہ چاہے کسی سے بات کرنے کو مگر ثنا کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا ورنہ اس کا کیا پتا دوبارہ مجھے سولہ زینے چڑھ کر اوپر والے کمرے میں پہنچا کر ہی دم لیتی جہاں سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں آئی تھی۔
"ویسے صحیح کہہ رہی ہے ثنا بھی پتا نہیں کیا جادو کر رکھا ہے فیصل بھائی نے تم پر کہ تمہیں ان کے سامنے اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ ورنہ ہم لوگ بھی تو ہیں شکر کرتے ہیں کوئی ایسا موقع آئے مل بیٹھنے کا میاں تو ہمارے بھی ساتھ ہی ہیں مگر مجال ہے جو ہم نے برا بھی کی ہو گلہ کریں گے تو بعد میں دیکھی جائے گی مگر ابھی تو انجوائے کر لیں۔ شادی کے بعد کبھی کبھار ہی ایسا موقع ہاتھ آتا ہے۔ جب انسان کو محسوس ہوتا ہے ہاں اس کی اپنی بھی کوئی شخصیت ہے اس کی اپنی بھی چند ترجیحات ہیں۔
مگر یار تم تو وہ عافیہ ہی نہیں لگتیں جو کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی ورنہ ایک وہ جواد بھائی تھے تمہارے جن کے ایک بار زور سے ڈانٹ دینے پر تم نے ان سے شادی سے ہی انکار کر دیا اور کہاں یہ حال کہ فیصل بھائی جس طرف گھما دیں تمہاری سوئی وہیں اٹک جاتی ہے۔ ویسے کیا فیصل بھائی نے تمہیں ان چار سالوں میں ایک دفعہ بھی نہیں ڈانٹا جو تمہارا یہ حال ہے کہ تم سے ان کی چند لمحوں کی جدائی بھی برداشت نہیں ہو پا رہی۔" یہ انعم تھی جسے ہمیشہ ہی فیصل کے رویے سے الجھن رہتی تھی اس کے ذکر کرتے مجھے اک دفعہ پھر وہ دن یاد آ گئے تھے جب میں عافیہ فیصل کی بجائے عافیہ حیدر ہوا کرتی تھی اور جب جواد بھائی نے

سے واپسی پر بغیر بتائے دوست کے گھر چلے جانے ڈانٹ دیا تھا اور جواب میں میں نے ان کا رشتہ جو پایۂ تکمیل پا چکا تھا اور میرے فائنل ایگزیمز کے بعد رخصتی کی تقریب بھی متوقع تھی وہ رشتہ میں نے صرف اس بات کو جواز بنا کر ٹھکرا دیا کہ جو شخص ابھی اتنا رعب جماتا ہے بعد میں پتا نہیں کیا کرے اور میرا گزارہ نہیں ایسے بندے کے ساتھ۔
تب امی ابو کی لاکھ ڈانٹ پھٹکار بھی میری نہ کو ہاں میں نہیں بدلوا سکی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔
"کاش! فیصل نے کبھی کبھی مجھے ڈانٹا ہوتا کسی بات پر ٹوکا ہوتا کبھی کوئی اچھا برا کہا ہوتا مگر اس طرح پیٹھ پیچھے بیٹھ کر میری برائی نہ کی ہوتی تو یہ دل غم کے پہاڑ تلے یوں نہ دبا ہوتا۔"
"میرا خیال ہے فیصل بھائی نے اسے بتا دیا ہے۔ یہ اس طرح سوچتے ہوئے بالکل علامہ اقبال کی پوتی لگتی ہے۔" حرا نے میرے ہاتھ پر چٹکی بھر کر ایک بار پھر مجھے ہوش کی دنیا میں لا پٹخا تھا۔
"ہاں ضرور! یہ مرد اور ان لوگوں کی تعریفیں، انہیں صرف شادی کے پہلے دو مہینے ہی بیویوں پر پیار آتا ہے بعد میں تو ہم لوگ "بے وقوف اور پاگل عورت" بن کر رہ جاتے ہیں۔" انعم نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے اپنے بیٹے کو بیڈ پر پٹخنے کے سے انداز میں لٹایا گویا باپ کا غصہ بیٹے پر نکالا گیا ہو۔ مجھے اس کے طرز عمل پر ہلکا سا افسوس بھی ہوا مگر اس سے پہلے کہ میں اسے ٹوکتی میری توجہ فوراً ہی کسمساتی ہوئی میرب نے اپنی اور کھینچ لی۔
"ہاں جیسا کہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔"
کبھی حیات کی زمین کبھی وسیلۂ مرگ
نگاہِ یار تیرا کچھ اعتبار نہیں
برمحل اشعار تو ہر وقت ثنا کی نوک زباں پر رہتے تھے اس وقت بھی اس نے شعر سنا کر ہم تینوں کو ہنسنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔
"یہ تو تمہارا تجربہ ہے نا لیکن عافیہ کا معاملہ تم سے الگ ہے فیصل بھائی آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی پہلے دن کرتے تھے۔" یہ حرا تھی وہی حرا جو سب کچھ جانتی تھی۔ اس کی بات پر میں اک پل کو گنگ رہ گئی۔ میں نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا یہ تو میں جانتی تھی وہ طنز نہیں کر رہی نہ ہی مجھے کوئی آئینہ دکھا رہی تھی تو پھر وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ شاید وہ میرا بھرم رکھ رہی تھی۔
ہاں شاید بھرم ہی رکھ رہی ہو۔ میں جو کچھ دیر پہلے سوچ رہی تھی کہ آج ملنے والا دکھ میں اپنی بچپن کی سکھیوں کے ساتھ بانٹ لوں گی جیسے آج سے پہلے ہر سکھ دکھ ان کے ساتھ بانٹا تھا مگر حرا کے اس ایک جملے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ کچھ معاملوں میں بھرم رہ جانا ہی بہتر ہے اور میری اس سوچ کو تقویت پہنچائی تھی اک ننھے منے ہاتھ نے جس نے میرا ہاتھ اپنے ننھے ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا جیسے اسے کبھی نہ چھوڑنے کا ارادہ ہو۔ تبھی میرے موبائل پر بیل ہوئی۔
"فیصل بھائی کو تمہارے بغیر نیند نہیں آ رہی شاید۔" میرے موبائل نکالنے سے پہلے ثنا نے ٹکڑا لگایا۔ میں نے مسکرا کر موبائل اسکرین کو دیکھا جس پر فیصل کا نام جگمگا رہا تھا اور پھر اک نظر اپنے سامنے بیٹھی ثنا کو اور کال ڈسکنکٹ کر دی۔
"کون تھا؟ فون کاٹ کیوں دیا؟" حرا نے استفسار کیا۔
"رانگ کال تھی۔"
"اور پتا نہیں کبھی کبھی رائٹ نمبر سے رانگ کال کیوں آ جاتی ہے۔" میں نے تمام تر تلخ سوچوں کا کڑوا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر چہرے پر مسکراہٹ سجالی۔ کہ بھرم تو آخر رکھنا ہی تھا اور اس بھرم میں شاید میرا بھرم تھا۔

☆ ☆

صحرا میں عکس

عتیقہ ملک

تیار ہو کر اس نے آخری تنقیدی نگاہ آئینے پر ڈالی تھی۔ شیفون جارجٹ کا نفیس امبرائیڈری سے مزین نیلا سوٹ اس کے متناسب سراپے پر بے حد جچ رہا تھا۔ سیاہ آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر اور ہونٹوں پر پنک لپ اسٹک نے اس کی گندمی رنگت کو نکھار دیا تھا۔ دوپٹہ اس نے تہ کر کے پرس میں ڈالا اور سیاہ شال سے خود کو لپیٹ کر گیٹ کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

پیپرز کے بعد پریکٹیکل کا بہانہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ مگر کاشف کے بے حد اصرار پر اسے امی سے پارٹی کا بہانہ کرنا پڑا۔ وین میں اس کے بیٹھتے ہی پہلے سے موجود طالبات میں آنکھوں ہی آنکھوں میں معنی خیز اشاروں کا تبادلہ ہوا جسے اس نے مکمل طور پر نظرانداز کر کے یونہی پرس میں جھانکنا شروع کر دیا۔

"خیر تو ہے فروا؟ آج کہاں کی تیاری ہے؟" تھرڈ ایئر کی تسنیم نے بالآخر پوچھ لیا تھا۔

"وہ ایکچوئلی مجھے کالج میں اپنی ایک فرینڈ سے ملنا ہے۔"

"روا باجی آپ کی ایسی کون سی فرینڈ ہے جسے پیپر کے بعد بھی گھر پر آرام نہیں۔" سیکنڈ ایئر کی صبیحہ نے خاصے چبھتے ہوئے انداز میں قدرے طنز سے کہا۔

"وہ سیکنڈ ایئر کی طاہرہ ہے نا جو ہاسٹل میں رہتی ہے۔ اس نے بہت اصرار کیا تھا کہ جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔" فروا نے اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

وین کالج کے گیٹ پر رکی تو اندر کی طرف بڑھتے ہوئے دانستہ اس نے اپنے قدم سست کر لیے تھے۔ گیٹ سے اندر داخل ہو کر اس نے پرس کھول کر کچھ الجھن سے رک کر یوں دیکھنا شروع کیا گویا گھر پر کچھ بھول آئی ہو اس کے ساتھ آنے والی لڑکیاں جب اندر بڑھ گئیں تو وہ پلٹ کر گیٹ سے باہر آ گئی۔ گیٹ کے باہر کرسی پر بیٹھے چوکیدار کی نظر اس پر پڑی مگر چونکہ وہ یونیفارم میں نہیں تھی لہٰذا اس نے روکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ کالج موڑ پر سلور سوک سے ٹیک لگائے منتظر کاشف کو وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ کاشف نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا اور ایک بھرپور ستائشی نگاہ ڈال کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے فرنٹ ڈور کھولا تھا فروا ابراہیم تفاخر سے فرنٹ سیٹ پر اس کے ہمراہ بیٹھتے ہوئے خود کو بادلوں کے سنگ اڑتا محسوس کر رہی تھی۔

گاڑی کے اندر دھیمے دھیمے سروں میں بجتا میوزک اور کاشف چوہدری کی ہمراہی میں وہ جیسے کسی طلسم کدے کے سفر پر گامزن تھی۔ اس پر ہم سفر کی بار بار اٹھتی نگاہیں فروا کے چہرے کی چمک کو تفاخر کے ساتھ بڑھا رہی تھیں۔ پہلے پہل وہ کالج کے قریب کسی کینے میں بمشکل چند منٹ کے لیے ملنے پر راضی ہوئی تھی مگر آج کا دن اس نے کاشف کے نام کیا تھا۔ بہت سارا وقت ایک دوسرے کے سنگ گزارنے کے لیے کاشف نے جس ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا وہ کالج سے کافی فاصلے پر تھا۔ وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ اپنی چاہت کو دنیا والوں کی نظر میں لا کر رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ یوں باہر مل بھی رہے تھے تو فروا کی مجبوریاں اس کے آڑے آ رہی تھیں ورنہ بقول کاشف کے وہ اپنے اور اس کے درمیان کے سارے فاصلے منٹوں میں سمیٹ لیتا جو اگر فروا اسے مجبور نہ کرتی تو.....

ریسٹورنٹ کے مسحور کن ماحول میں بھی کاشف کی نگاہیں بار بار اس کے چہرے پر بھٹکتی اسے جھینپنے پر مجبور کر رہی تھیں تبھی ویٹر نے دو کولڈ ڈرنک ان کے سامنے لا کر رکھیں۔ کاشف نے سپ لیتے ہوئے ایک نگاہ فروا کے گلاس پر ڈالی تھی۔ ایک ایسی برانڈ کا وہ مشروب صرف اس لحاظ سے مختلف تھا کہ کاشف کے گلاس میں نیلے رنگ کا جبکہ فروا کے گلاس میں سرخ رنگ کا اسٹرا تھا۔ شاید رنگوں کا یہ فرق مشروب کے ذائقے کو بھی مختلف بنا رہا تھا مگر یہ بات صرف کاشف کے علم میں تھی فروا کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں فروا کا انداز سست ہوتا چلا گیا بالآخر دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنا سر ٹیبل پر لگا دیا۔

"فری، فری کیا ہوا ہے ہوش کرو۔" اس کے انداز

کو بغور دیکھتے ہوئے کاشف نے بوکھلاہٹ میں اسے کندھوں سے تھاما تو اردگرد کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ قریبی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے درمیانی عمر کے میاں بیوی اور کاؤنٹر کلرک ان کے پاس آگئے تھے۔

"آنٹی میری وائف کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ پلیز آپ ذرا گاڑی تک جانے کے لیے میری ہیلپ کریں گیں۔" کاشف نے خاتون سے مدد کی درخواست کر ڈالی۔ پھر اس خاتون کی مدد سے ہی وہ فروا کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔

"بیٹا کتنا عرصہ ہوا ہے شادی کو۔" وہ عجلت میں خاتون کا شکریہ ادا کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا جب اس نے پوچھ لیا تھا۔

"آنٹی چھ ماہ پہلے ہماری شادی ہوئی ہے۔"

"پریشان مت ہو ان شاء اللہ کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔" ان خاتون نے مسکرا کر تسلی دی تو ایسی ہی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کاشف چوہدری نے گاڑی آگے بڑھادی۔

✡ ✡ ✡

"ہمارے پاس اس سبجیکٹ کی فرسٹ ایئر سے ایم اے تک اسی رائٹر کی بکس آتی ہیں۔" سیلز مین نے چند کتابیں شمع کے سامنے کاؤنٹر پر دھروی تھیں۔

"نہیں۔ مجھے سلمان اکرم نامی رائٹر کی بک چاہیے۔ وہ خاصی ڈی ٹیل میں ہے اور ہماری ٹیچر بھی اسی سے نوٹس بنواتی ہیں۔" وہ کتابوں پر سرسری سی ایک نظر ڈال کر سیلز مین سے مخاطب ہوئی تھی۔ کاشف ان کے پیچھے کھڑا لیڈیز فرسٹ کے مصداق فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" سیلز مین نے مڑ کر شیلف میں سجی کتابوں پر ایک نظر دوڑائی تھی۔

"ابھی تو آپ کی مطلوبہ بک ہمارے پاس نہیں ہے البتہ آپ کہیں تو چند روز میں ہم آپ کو منگوا کر دے دیں گے۔" شمع کے اثبات میں جواب دینے پر وہ ایک ڈائری نکال کر اس میں رائٹر اور بک کا نام درج کرنے لگا۔

"آپ فرائیڈے تک پتا کر لیجیے گا۔" کاشف کے ہاتھ سے کتابوں کی لسٹ لیتے ہوئے سیلز مین نے گویا ان دونوں لڑکیوں کو فارغ کیا تھا۔

"دیکھو بہت ہی زبردست ناول ہے نغمہ رعنا کا "ادھورے حوصلے" "ایک منٹ پلیز بھائی دکھائیے گا۔" فروا نے شمع کی توجہ ریک میں سجے ناول کی طرف کروائی اپنی پسندیدہ مصنفہ کا نیا ناول دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک گئیں۔

"جیب میں دھیلا نہیں ہے نکلوا کس خوشی میں رہی ہو۔" شمع کو اس پر غصہ آیا تھا۔

"بکو مت، دیکھنے پر کوئی ٹیکس نہیں لگ جائے گا۔" فروا کتاب کو چھونے کے شرف سے محروم نہیں رہنا چاہتی تھی سو اسے کہنی مار کر کہنے لگی۔

ان دونوں کی گفتگو کو لفظ بہ لفظ سنتے کاشف نے ایک مسکراتی نگاہ گندمی رنگت والی اس لڑکی پر ڈالی جس کے چہرے پر کتاب ہاتھ میں لیتے ہوئے اشتیاق اُمڈ آیا تھا۔

"ایسا کرتے ہیں ففٹی ففٹی کر کے ناول خرید لیتے ہیں۔ مل کر پڑھیں گے۔" فروا کا کتاب واپس رکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"بھک بھنگڑے عشق بنیرے۔" شمع نے جل کر کہتے ہوئے کتاب اس کے ہاتھ سے لے کر کاؤنٹر پر رکھی اور تقریباً" زبردستی سے کھینچتے ہوئے باہر قدم بڑھائے تھے۔ تو کاشف مسکراتے ہوئے سیلز مین کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنی مطلوبہ کتابیں اٹھاتے ہوئے اس کی نظر ان دو کتابوں پر پڑی جو وہ ناول کی شیدائی اس لڑکی کے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے کتاب کا ابتدائی ورق اٹھا کر پلٹا۔

"فروا ابراہیم کلاس تھرڈ ایئر۔" کاشف کے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی۔

سیلز مین حساب کتاب کرنے میں مگن ہوا تو اس نے وہ دونوں کتابیں بھی شاپر میں ڈال لیں گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کی نظر واپس آتی ان دونوں لڑکیوں پر پڑی جو چند قدم آگے جا کر پلٹ چکی تھیں۔ مگر کاشف ان کے پاس رکے بغیر گاڑی آگے بڑھا لے گیا کہ وہ گندمی رنگت والی لڑکی اسے اس قابل نہیں لگ رہی تھی کہ اتنی آسانی سے اس کی کتابیں واپس لے کر اپنی راہ لی جائے۔

✡ ✡ ✡

وہ سو کر اٹھی تو باہر سے اشفاق ماموں کی آواز آرہی تھی یقیناً" وہ امی کے ساتھ محو گفتگو تھے۔

"السلام علیکم۔" منہ دھو کر اس نے باہر بیٹھے ہوئے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام کیا حال ہیں بیٹا' پڑھائی کیسی جارہی ہے۔"

"بالکل ٹھیک' پڑھائی بھی بس چل ہی رہی ہے۔ آپ سنائیں ماموں شانزے آپی کیسی ہیں؟"

"شانزے بالکل خیریت سے ہے ابھی دو دن پہلے ہی ہفتہ رہ کر گئی ہے۔" انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کا حوالہ دیا۔

اشفاق ماموں کے دو ہی تو بچے تھے۔ شانزے بڑی تھیں تین سال پہلے وداع ہو کر پیا دیس سدھاریں اور چھوٹا بلال جو بی ایس سی فارمیسی کے بعد کسی میڈیکل کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ خود فروا اور احمر بھی دو بہن بھائی تھے ان کے والد بچپن میں ہی انتقال کر گئے۔ کچھ اپنی ہمت سے اور تھوڑی بہت اشفاق ماموں کی مدد کے سہارے امی نے ان کی پرورش کی تھی۔ احمر نائنتھ کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا جبکہ فروا تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ یوں تو اشفاق ماموں نے بیوہ بہن کا ہر طرح سے خیال رکھا مگر اب اس رشتے کو مزید ایک مضبوط ڈور سے باندھنے کا خیال بھائی بہن میں پرورش پا چکا تھا۔ فروا اور بلال کے مستقبل کی صورت میں تبھی برآمدے میں پڑے فون کی بیل بجی تھی۔

"ہیلو۔" شمشاد بیگم نے بھائی کے سامنے چائے کی ٹرے رکھی اور جا کر ریسیور اٹھایا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔" دوسری طرف غالباً" خاموشی تھی۔ تبھی انہوں نے ٹھک سے ریسیور رکھ دیا۔

"کل سے اس خاموش فون کال نے تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔ سی ایل آئی بھی نہیں کہ نمبر کا پتا چل جائے۔" واپس آکر بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"بھائی جان' بھابھی بیگم سے کہیں کسی روز چکر لگائیں میں خود آنا چاہ رہی تھی۔ مگر آج کل سیزن شروع ہونے کی وجہ سے بوتیک والے کام زیادہ بھجوا رہے ہیں تو موقع ہی نہیں ملتا۔"

"تمہاری بھابھی کو جوڑوں کے درد نے نڈھال کر رکھا ہے۔" انہوں نے چائے کا سپ لے کر سرسری سا کہا۔

"ماموں' فاروق چچا کے مکان کا جو جھگڑا چل رہا تھا۔ اس کا کیا بنا؟" فروا کو خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"جھگڑے کا بھلا کیا بنے گا مزید فساد ہی ہو گا میں نے تو کہہ دیا ہے تینوں بھائیوں سے کہ اس مکان کو بیچ کر رقم تقسیم کر لو۔" اشفاق ماموں نے اپنی سمجھ کے مطابق دیے جانے والے مشورے کا ذکر کر ڈالا۔

"اچھا' بیٹا' شمشاد میں چلتا ہوں۔ فرصت ملے تو تم ہی ایک چکر لگا لینا۔" ماموں اٹھ کھڑے ہوئے تو تبھی فون کی بیل ایک مرتبہ پھر بجی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ اوئے خبردار جو اس نمبر پر دوبارہ فون کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" ماموں نے خود ہی جا کر فون اٹھایا اور کوئی جواب نہ ملنے پر کراری سی دھمکی بھی دے ڈالی تھی۔

✡ ✡ ✡

"فروا' میں ذرا بصیرہ کی طرف جا رہی ہوں۔ اس کے سسر پچھلے کئی دن سے بیمار ہیں میں پوچھنے نہیں جا سکی آج تھوڑی فرصت ملی ہے یہ ڈیوٹی بھگتا ہی آؤں۔" اپنے لیے چائے بناتی فروا امی کی آواز پر کچن کے دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔

"کنڈی لگالو' بھائی ٹیوشن سے واپس آنے والا ہو گا۔ اس کے لیے بھی چائے بنالینا۔" شمشاد بیگم نے چادر اوڑھتے ہوئے مزید ہدایات دیں تو وہ سر ہلاتی ان کے پیچھے گیٹ تک گئی۔ گیٹ کی کنڈی لگا کر واپس کچن کی طرف جارہی تھی جب فون کی بیل بجی۔

"اف۔" اس نے سر تھام کر ریسیور اٹھایا یقیناً" وہی سرسراتی ہوئی خاموشی سننے کو ملتی۔

"فروا ابراہیم۔" دوسری طرف محتاط مردانہ آواز ابھری تھی۔

"جی آپ کون؟" قدرے حیران ہو کر اس نے استفسار کیا۔

"میرا نام کاشف چوہدری ہے اور میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ آپ کی دو بکس میرے قبضے میں آچکی ہیں۔"

"اوہ تھینک یو۔" یک دم جیسے فروا کے سر سے کوئی بوجھ اترا تھا۔

دو دن پہلے پاکستان بک شاپ پر وہ رہ جانے والی بکس جو واپس پتا کرنے پر بھی نہ مل سکی تھیں ان کی وجہ سے وہ خاصی پریشان تھیں کہ امی سے کیا کہہ کر رقم کا مطالبہ کرے۔ مگر اک فون کال نے اس کی ساری پریشانی ختم کرڈالی تھی۔

"یہ بکس اب آپ کو میں کہاں واپس کروں مس فروا۔" دوسری طرف کاشف چوہدری پوچھ رہا تھا۔

"پاکستان بک ڈپو کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔"

"جی جی میں پرسوں وہیں پر تو گیا تھا کچھ بکس لینے واپسی پر سیلز مین نے یہ دو بکس بھی غلطی سے مجھے تھما دیں۔" کاشف نے اس کی بات کاٹ کر وضاحت کی۔

"تو آپ وہیں پر دے دیں اور انہیں بتادیں کہ ..."

"اوہ نو مس فروا یہ بڑا کنجلک سا مسئلہ ہو جائے گا۔ کالج سے چند قدم کے فاصلے پر کمیٹی چوک کے سامنے جو ریسٹورنٹ ہے آپ وہاں آکر مجھ سے بکس لے جائیں۔"

"چلیں یہ بھی ٹھیک رہے گا۔" اس نے مانتے ہوئے سوچا کہ بک شاپ سے سیلز مین سے جا کر بکس لیتی یا ریسٹورنٹ میں کاشف سے 'ایک ہی بات تھی' نیم بے دلی سے اقرار کر کے اس نے فون رکھ دیا۔

"اوہ یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ کاشف صاحب وہاں کرتے کیا ہیں۔" تھوڑی دیر بعد خیال آیا تو سر پہ ہاتھ مار کر رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

"اس شمع کی بچی کو بھی آج ہی چھٹی کرنا تھی۔" کپکپاتے ہاتھوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اسے شمع پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔ چند منٹوں میں وہ کمیٹی چوک کی سڑک کراس کر کے ریسٹورنٹ کے سامنے تھی۔ کالج گیٹ ساڑھے بارہ بجے کھلتا تھا۔ جبکہ وین ایک بجے آتی تھی۔ سو کوئی جلدی تو نہیں تھی مگر اکیلے آنا بہت عجیب لگ رہا تھا۔

سلور سوک کی ڈرائیونگ سیٹ پر تک سک سے تیار کاشف چوہدری سن گلاسز لگائے بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے رسٹ واچ پر منتظر نظریں دوڑاتے ہوئے ارد گرد دیکھا جہاں سامنے سے وہ چلتی آرہی تھی۔ اگرچہ اس نے چہرے پر نقاب لے رکھا تھا جو کسی کسی وقت ڈھلک رہا تھا۔ مگر کاشف پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر ریسٹورنٹ کے اندر چلی گئی تو وہ فوراً" ہی اس کے پیچھے داخل ہوا۔

"ایکسکیوز می مس۔" وہ جو ادھر ادھر تلاش گمشدہ کے انداز میں نظریں دوڑا رہی تھی بھاری مردانہ آواز پر پیچھے مڑی۔

"آپ مس فروا ہیں؟"

"جی آپ ..."

"جی میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا آئیے پلیز۔" اس نے قریبی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی نہیں۔ میں ذرا جلدی میں ہوں پلیز میری بکس ..." فروا اسے پریشانی سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی کہ وہ تو خالی ہاتھ نظر آرہا تھا۔

"بکس بھی مل جائیں گی آپ بیٹھیں تو ..." اس نے شائستگی سے قریبی ٹیبل پر چیئر کھسکا کر اسے بیٹھنے کا

چڑیا۔ مگر اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔ اس نے آنسو اندر اتار لیے اور لب سی لیے اور نظر۔ ہاں وہ ہی اس کی بڑی پر اعتماد نظر ہمیشہ کے لیے جھک گئی۔ کم ظرف انسان "تنگ گلیاں" "بند گلیاں" بنا دیتے ہیں۔

✡ ✡ ✡

"مظہر! پلیز۔ اٹھ جائیں۔ مظہر! ... پھر آپ مجھے ڈانٹیں گے کہ میں نے آپ کو بروقت نہیں جگایا۔ اٹھیں نا۔" وہ چودھویں دفعہ اسے جگانے آئی تو خاصا جھنجلائی ہوئی تھی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اپنی نیند پوری کریں آپ۔ اگر آپ کا ضروری کام نہ ہوا تو مجھ سے مت کہیے گا۔" اس نے دبے دبے غصے سے کہا اور واپس مڑ گئی۔ اندر ہی کہیں یہ امید تھی کہ اب کی بار اس پر اثر ضرور ہو گا۔ مگر اس کی یہ خام خیالی جلد ہی دور ہو گئی۔ اس چکر پہ بھی وہ بدستور نیند میں غرق تھا تو راس بار خاموشی سے پلٹی اور ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔

زندگی بڑی عجیب ہو گئی تھی یا شاید ... خوبصورت۔ نور الصباح کے لیے مظہر ملک ایک حیرت انگیز انسان ثابت ہوا تھا۔ وہ بہت اچھا انسان تھا اور نور الصباح کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ روایتی شوہروں کی طرح اس کی مین میخ نکالنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اس کے لیے جو کھانا بھی تیار کرتی خواہ وہ انڈوں کا آملیٹ (جو کہ مظہر کو خاصا ناپسند تھا) بخوشی کھالیتا۔ دوسرے اس نے کبھی نور کو فورس نہیں کیا تھا کہ وہ بنے سنورے۔ وہ جس بھی حلیے میں گھومتی رہتی اسے اچھی ہی لگتی۔

نور الصباح کا واسطہ زندگی میں صرف دو ہی مردوں سے پڑا تھا۔ ان میں پہلے نمبر پہ "ابا" تھے اور پھر "حمزہ" اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی کاپی تھے' کبھی کبھی اسے ازحد حیرانی ہوتی وہ اس کی زندگی میں آنے والا تیسرا مرد تھا مگر پہلے دونوں سے بالکل مختلف ...!

وہ بے حد نرم دل تھا اور بہت زیادہ سنجیدہ بھی ... بہت ہٹ دھرم تھا اور بہت زیادہ لاپروا بھی ... خامیوں اور خوبیوں کے اس مکسچر کے باوجود مجموعی طور پر اس کی ذات میں ایسی کوئی خامی نہ تھی جو نور الصباح کو تکلیف دیتی۔ وہ اسے چاہتا تھا اور اس کے ساتھ بہت پوزیسو بھی تھا' گھر کے سارے کام نور الصباح ہی کرتی تھی' کھانا بنانے سے لے کر کپڑے دھونے تک۔ وہ چاہتا تو ملازمہ افورڈ کر سکتا تھا مگر نور نے قطعاً" ترجیح نہ دی۔

وہ اتنا اچھا تھا کہ نور کو بھولنے لگا کہ وہ اس کی زندگی کا ساتھی کس "حادثے" کی صورت میں بنا تھا؟ دو تین مرتبہ وہ عارفہ سے مل آئی تھی جو اسے خوش دیکھ کر خاصی مطمئن تھیں۔ وہ اسی "ڈیرے" پہ رہائش پذیر تھے۔ رہائشی عمارت بے حد خوبصورت تھی اور مستزاد اس کو نور الصباح کے ماہرانہ ہاتھ لگ گئے تھے۔ وہ ناشتا تیار کرنے کے بعد لوٹی تو مظہر فریش ہو کے باہر آچکا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے بھنویں اچکائیں۔ نور کے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی جو کہ اس کا اگلا فقرہ سنتے ہی غائب بھی ہو گئی۔

"تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟" معصومیت سے وہ پوچھ رہا تھا۔ نور نے آنکھیں سکوڑ کر نتھنے پھلا کر اسے دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی باہر نکل آئی پیچھے سے مظہر کا بلند آہنگ قہقہہ اسے احساس دلا گیا کہ لازماً" وہ شرارت کر رہا تھا۔ وہ باہر آئی تو چونک گئی۔ گیٹ پہ کوئی گاڑی رکی ہوئی تھی۔ اس نے لاؤنج کے شیشوں سے پار دیکھا۔

گاڑی میں سے کوئی باہر آرہا تھا۔

"نور ... نور ... نور الصباح۔" مظہر اسے بلا رہا تھا۔

وہ فوراً" واپس پلٹی اور اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"جی۔" اس نے نکھرے نکھرے سے اپنے صاحب کو دیکھا اور کہا۔

"کیا آج یہ لباس فاخرہ اتارنے کا موڈ نہیں ... بدل ڈالیے اسے جناب؟" اس کا اشارہ نور کے ازحد مضحکہ خیز سلیپنگ سوٹ کی طرف تھا جو کہ حسب معمول مظہر کی شرٹ اور اس کے اپنے ٹراؤزر پر مشتمل تھا۔

پکڑے بیش قیمت موبائل پر میسج ٹون بجی' یہ موبائل بھی کاشف نے ہی اسے گفٹ کیا تھا اور اس کی بدولت ان کے درمیان فاصلوں کی دیواریں سمٹتی چلی گئیں۔ میسج پڑھ کر اس نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر یونہی بے خیالی میں وہ پاس پڑی نغمہ رعنا کی کتاب "ادھورے حوصلے" کے ٹائٹل پر ہاتھ پھیرنے لگی یہ ناول کاشف نے اسے لندن سے واپس آنے کے پندرہ دن بعد بذریعہ کوریئر بھیجا تھا۔ ثمینہ چوہدری کی طرف سے بھیجا جانے والا یہ ناول کوریئر سے وصول کرکے وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی مگر ایڈریس پر دھیان دیا تو گویا ساری بات سمجھ میں آگئی۔

"آپ کو میرا ایڈریس کہاں سے ملا؟" اگرچہ اس نے کاشف کو اس کی اس حرکت پر ٹوکنے کے لیے ایڈریس کے ساتھ لکھا موبائل نمبر ڈائل کیا تھا۔ مگر اس کا انداز اتنا شائستہ تھا کہ چاہتے ہوئے وہ کچھ کہہ نہیں پائی۔ سو اس کی چند باتوں کے بعد شکریہ ادا کرکے حیرت کا اظہار کر ڈالا۔

"بھئی آپ کا فون نمبر تو میرے حافظے میں محفوظ تھا پھر ایڈریس حاصل کرنا بھلا کیا مشکل ہوتا۔" بہت جلد وہ اسی راہ کی مسافر بن گئی' جس کی مسافت اسے کاشف چوہدری نے سونپنا چاہی تھی۔

کاشف نے مس فردا سے فردا اور پھر فری کا سفر بہت تیزی سے طے کیا اور یہ اس کی کوششوں کا ہی دخل تھا کہ فردا کے دل میں خوشبو کے دیے جلے اور وہ سر سے کاشف صاحب اور پھر کاشف ہو کر رہ گیا اس کا اپنا کاشف۔

اس کے دل میں خواہشات کی ننھی سی کونپل نے محبت کے ہرے بھرے توانا شجر کی صورت اختیار کرلی جس کی شاخوں پر صرف کاشف چوہدری کے نام کے پنچھی اڑتے۔ خوشبو کے جزیرے پر محبت کا چراغ روشن کیے۔ کچے خوابوں کے آنگن میں اس کے تصور سے لکن چھپی کھیلتے ہوئے کئی بار وہ خود سے الجھ پڑتی۔ اس کا ضمیر اسے ماں اور بھائی سے دھوکا دینے کا احساس لیے اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا۔ مگر کاشف نے اس کے گرد اپنی والہانہ گفتگو کا جو حصار باندھا تھا۔ وہ بھی بے حد مضبوط تھا اس کی شخصیت کا طلسم فردا کو سارے احساسات جھاڑنے پر مجبور کر دیتا شمع اور اس کی دوستی کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اگرچہ شروع شروع میں شمع نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ جس راہ کی مسافر تھی وہاں کی مسافت عقل اور سمجھ بوجھ سے ماورا صرف دل کی روشنی میں طے ہوتی ہے۔

کاشف چوہدری' اخلاق چوہدری کا لاڈلا سپوت جو پڑھنے کے لیے شہر آیا تو گویا یہاں کی رنگینیوں میں کھو گیا' چار سال سے یونیورسٹی میں اٹکا ہوا تھا صرف اس لیے کہ وہاں آنے والے نت نئے چہروں کی کشش نے کاشف کو اس نگری سے باندھ لیا تھا اور اس کی سرگرمیوں میں ہاتھ بٹانے والے اس کی پیٹھ ٹھونکنے والے اس سے بھی دو چار ہاتھ آگے تھے۔ اس کے دوست۔

☼ ☼ ☼

چند روز پہلے ہی اس نے فردا سے بات کی تھی کہ وہ اپنے فادر کو اس کے گھر بھیجنا چاہتا ہے رشتے کی بات کرنے کے لیے فردا بے حد الجھن کا شکار تھی بلال اشفاق اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا تھا۔

"کاشف آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں ماموں کے بے حد احسانات ہیں ہماری فیملی پر جب تک بلال کی شادی نہیں ہو جاتی یہ ممکن نہیں ہے اگلے دو تین سال میں....."

"خدا کا خوف کرو فری' میں دو تین ماہ بھی انتظار نہیں کر سکتا۔ تم نہیں جانتیں' تم سے جدائی کا ایک ایک پل مجھ پر کتنا بھاری گزرتا ہے۔"

"آپ میری پرابلم نہیں سمجھ رہے کاشف۔"

"میں تمہاری پرابلمز کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں' مگر تم میرے دل کی حالت سے انجان ہو' جانتی ہو میں تمہارے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا اور پھر یوں ہمارا روز روز ملنا بھی مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو..... میرا کیا ہے میں تو مرد ہوں جسے اس معاشرے میں کوئی نہیں پوچھتا مگر تم..... تم اپنے بارے میں سوچو..... تمہاری کیا عزت رہ جائے گی اگر کسی نے دیکھ لیا اور ایسی ویسی بات کہہ دی اور تمہاری عزت پر کوئی آنچ آئے یہ میں قطعاً" برداشت نہیں کر سکتا۔ سو اس سے پہلے کہ ہماری محبت کا کسی دوسرے کو علم ہو۔ میں تمہیں باعزت طریقے سے اپنا لینا چاہتا ہوں۔" کاشف اس کی بات کاٹ کر شدت جذبات سے سرخ چہرہ لیے بولتا چلا گیا اور فردا ابراہیم جیسے فضاؤں میں اڑنے لگی تھی۔

ایک طرف کاشف کا اصرار روز بروز بڑھ رہا تھا دوسری طرف ممانی اور ماموں کے چکر لگنے شروع ہوئے تو گویا فردا کی جان سولی پر لٹک گئی تھی۔

"امی مجھے ابھی بہت سا پڑھنا ہے اس سلسلے کو فی الحال ختم کریں۔" ایک روز وہ ترخ کر ماں سے کہہ رہی تھی۔

"لو ابھی کون سا شادی ہو رہی ہے نیلم بھابھی صرف ایک رسم ہی تو کرنا چاہتی ہیں۔ باقی شادی تو تمہاری پڑھائی مکمل ہونے پر ہی ہوگی۔" انہوں نے سہولت سے جواب دیا تھا۔

"نہیں امی کوئی رسم نہیں ہوگی میں ان فضول کے بکھیڑوں میں الجھنا نہیں چاہتی۔" فردا کو بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ ماں کو کیسے سمجھائے۔

"یوں بھی بلال مجھے بالکل پسند نہیں اور....."

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا' اتنا اچھا پڑھا لکھا سلجھا ہوا لڑکا تمہارا نصیب بننے جا رہا ہے اور تمہارے مزاج نہیں مل رہے' ارے لوگ تو ایسے رشتوں کو ترستے ہیں۔"

"لوگ ترستے ہوں گے مگر میں نہیں' پلیز آپ ماموں لوگوں کو منع کر دیں وہ بلال کے لیے کوئی اور رشتہ دیکھیں' میں ابھی بہت سارا پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"ارے واہ ایسے کیسے منع کر دوں' میں نے خود بھائی جان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا ورنہ نیلم بھابھی تو اپنی بھانجی کو بہو بنانے کا سوچے بیٹھی تھیں' میری تو دلی مراد بر آئی ہے۔"

"تو بنا لیں ممانی اپنی بھانجی کو بہو' مگر میرا کوئی نام نہیں لے گا۔" وہ روہانسی ہو کر پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

امی حسب معمول بوتیک پر تیار کیے ہوئے کچھ ڈریسز دینے گئی تھیں۔ احمر ٹیوشن کے لیے گیا ہوا تھا جب بیرونی دروازے کی بیل بجی ایسے میں وہ عموماً" گیٹ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر پہلے بندے کی شناخت کر لیا کرتی۔

"بلال بھائی امی تو گھر پر نہیں ہیں۔" سیڑھیوں سے جھانکنے پر بلال کا سر نظر آیا تو اس نے وہیں سے کہہ دیا۔

"احمر بھی نہیں ہے؟" وہ ذرا سا ہٹ کر سر اٹھا کر پوچھنے لگا۔

"نہیں وہ بھی ٹیوشن پڑھنے گیا ہوا ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تو بلال وہیں سے پلٹ گیا تھا۔ فردا پرسوچ انداز میں اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔

"بلال بھائی' بلال بھائی۔" اچانک ایک سوچ نے ذہن کے در پر دستک دی تو اس نے دور جاتے بلال کو دو مرتبہ زور سے آواز دے ڈالی تھی۔ نتیجتاً" وہ واپس مڑا اور وہیں رک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"ایک منٹ بات سنیے۔" با آواز بلند کہہ کر وہ جلدی سے چند سیڑھیاں نیچے اتر کر گیٹ کھولنے لگی۔

"اندر آئیے پلیز۔" دروازے سے ہٹ کر اندر آنے کا اشارہ کرکے وہ واپس مڑی تھی۔

"بولو کیا بات ہے۔" گھر کے اندر آنے کے بجائے وہ صحن میں پڑی چارپائی پر ٹک گیا۔

"بلال بھائی آپ کو پتا ہے کہ....." بات کرتے کرتے وہ اٹک کر رک گئی۔ وہ ہنوز سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ ماموں اور ممانی ہمارے گھر

.....

"ہاں مجھے سب پتا ہے' آگے بولو۔" بلال کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"تو آپ انہیں منع کریں نا پلیز۔" فروا نے بھی بات کو طول دیے بغیر اپنا مدعا بیان کردیا۔

"کیوں منع کردوں؟" وہ لب بھینچ کر اسے گھورنے لگا۔ دھواں دھواں ہوتے چہرے نے اسے باور کرایا کہ جو کچھ ہونے جارہا ہے اس میں بلال کی مرضی اور خوشی بھی شامل ہے۔

"اس لیے کہ مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی۔" وہ یکدم گویا پھٹ پڑی۔

"انکار کی بھی تو کوئی وجہ ہونی چاہیے؟"

"عجیب ڈھیٹ انسان ہیں آپ' انکار کی یہ وجہ کافی نہیں ہے کہ مجھے آپ بالکل پسند نہیں ہیں بلکہ سخت برے لگتے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی رشتہ نہیں جوڑنا اور....." تبھی احمر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو فروا کی بات ادھوری رہ گئی۔

"بلال بھائی آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" فروا نے یکدم شائستہ انداز میں آداب میزبانی نبھانے کی کوشش کی۔ احمر نے ابھی رکنے پر اصرار کیا مگر وہ الجھا الجھا سا کسی کام کا بہانہ بنا کر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

کاشف کی سالگرہ تھی اور وہ یہ دن ہر صورت میں فروا کے ساتھ سیلبریٹ کرنا چاہتا تھا۔ فروا کے لیے کالج چھوڑنے کے بعد گھر سے نکلنا بے حد مشکل تھا سو اس نے بہت آنا کانی کی مگر جب کاشف نے ناراض ہو کر دو دن کے لیے بات چیت بند کی تو مجبوراً اسے ماننا پڑی۔ فروا کے سنگ کاشف کی خوشی کا انداز ہی نرالا تھا۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتیں آج میں کتنا خوش ہوں اس سال کا برتھ ڈے میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہے کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔" پندرہ منٹ کی ڈرائیو میں کاشف نے چوتھی مرتبہ یہی بات کہی تو وہ اس کی سرشاری پر مسکراتی رہی۔ اس نے ہوٹل میں کیک آرڈر کر رکھا تھا مگر وہ تو پورا دن گزارنے کے بجائے دن کی شروعات میں بھی ہوش و حواس گنوا بیٹھی۔

بہرصورت یہ دن گزارنا تو اسے کاشف چوہدری کے ساتھ ہی تھا۔ آخر اتنے عرصے سے اس کی مسلسل کی گئی محنت رنگ لائی تھی۔ کئی دن وہ اسے اپنا گھر دکھانے کی آفر کرچکا تھا مگر فروا انکار کردیتی بلکہ وہ تو ریسٹورنٹ آکر بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی تھی۔ سو ریسٹورنٹ سے گھر تک لانے کے لیے اسے یہی طریقہ مناسب لگا اور کوئی بھی نہ جان سکا کہ ہوش و حواس سے بے گانہ جس لڑکی کو وہ انجانے راستوں پر لیے جارہا تھا اس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ فروا ابراہیم بے مول ہوگئی تھی۔ اپنی قیمتی متاع سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور کاشف چوہدری..... اسے تو بس اس ویٹر کو پیشگی بھاری ٹپ دینا پڑی تھی' جس نے فروا کے ڈرنک میں نیند کی دوا ملائی تھی۔ وہ جو پھولوں کی شاہراہ پر قدم دھرتی آئی تھی۔ واپس پر دامن میں اتنے کانٹے سمیٹ چلی تھی کہ موت کی چاہ بھی دور کھڑی منہ چڑاتی محسوس ہورہی تھی۔ کیا لوگ اتنی آسانی سے دوسروں کی بربادی کا سامان بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ اس کے سن ہوتے اعصاب اس سے بڑھ کر کچھ سوچنے کے قابل نہ تھے۔

تین دن سے بخار کے نام پر اندھیرے میں منہ چھپائے اپنی شکستہ کرچیوں کو سنبھالنے میں ناکام تھی جب اس کے موبائل پر میسج ——— موصول ہونا شروع ہوئے نمبر نیا مگر ساتھ تو پرانا تھا سو وہ کیسے نہ جان پاتی۔ اس کے ساتھ ایک نہیں بلکہ تین افراد تھے۔ یقیناً "کسی جدید ٹیکنیک کی بدولت" اس نے سوچا تھا۔

"مجھے برباد تو کرچکے ہو' اب اور کیا چاہتے ہو' مجھ سے کیا دشمنی ہے تمہاری؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟" کاشف کا نمبر ڈائل کرکے وہ اس سے اپنا جرم پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے فری میں تو اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"یہ تصویریں کیوں بھیج رہے ہو مجھے۔ اب کون سا مقصد حاصل کرنا رہ گیا ہے۔"

"ایمان سے فری میں تمہیں کوئی تصویریں نہیں بھیج رہا۔ غور سے دیکھو کیا میرا نمبر ہے؟ اچھا کل تم مجھے وہیں کالج روڈ سے تمہیں پک کرلوں گا پھر دیکھتے ہیں ان کو جو تمہیں تنگ کررہا ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر فون بند کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرے چہرے پر
ان گنت تحریریں ہیں
ہر سطر میں
ہزاروں مضمحل خواب
ان خوابوں کی ٹہنیوں سے لپٹے
خار گلاب ایسے
بہت ہی ستم رسیدہ
کسی بے حد
بوڑھے فقیر کے جیسے
حسن کا کاسہ
بہت سی دعاؤں سے
ویران ہے
سیراب ہونے کا منتظر
زوردار بارش کا طلب گار
آئینہ جب بھی دیکھوں تو
مرے چہرے پہ
ان گنت جھریاں
بے شمار سلوٹیں
دکھائی دیتی ہیں
تھکی ہوئی بیمار آنکھیں
کسی شفایاب لمحے کی منتظر
میں بھی
بوڑھے فقیر کے جیسی ہوں

"تم نے میرے قدموں تلے تپتی ریت بچھادی ہے کاشف چوہدری' میرے پیروں میں ببول کے کانٹے اگے ہیں میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں اور تم مجھے اس راہ کی مسافت سونپ رہے جس کا راستہ میرے گھر کو نہیں جاتا۔ میں خود کو مزید انجانے راستوں پر چلنے کی عادت نہیں ڈال سکتی۔" وہ انہی سوچوں کو دہراتی کاشف چوہدری کے گھر چلی آئی تھی۔ جہاں ہوش و حواس میں رہ کر وہ آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

"میرے سر میں بہت درد ہے کاشف' ایک کپ چائے مل جائے گی۔" اس کے بیڈ روم میں بیٹھ کر فروا نے کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے پوچھا۔

"وائے ناٹ' تم بیٹھو' میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں تم رہنے دو' میں خود بنالیتی ہوں۔ کچن کس طرف ہے بس اتنا بتادو۔"

اور پھر چند ہی منٹوں میں وہ اپنے اور کاشف کے لیے چائے کے دو کپ لیے چلی آئی تھی۔ چائے پیتے

ہی کاشف پر تیزی سے غنودگی طاری ہوئی تھی۔ تو فروا کے ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ نوحہ کناں ہو گئی اس نے پرس سے تیز دھار والی چمکتی چھری نکالی اور لرزتے قدموں اور کانپتے ہاتھوں سے اس کی طرف بڑھ گئی۔ جو اپنی تمام سفاکیوں، عیاریوں سے بے بہرہ صرف اور صرف غفلت کی نیند سو رہا تھا اس بات سے بے خبر کہ موت اس کے سرہانے کھڑی تھی۔

کاشف کا موبائل پرس میں ڈال کر شال کو اچھی طرح سے اوڑھتے ہوئے وہ باہر نکلی مگر کھٹکے کی آواز پر ساکت ہو گئی۔ وہ جو تصویروں کو کمپیوٹر تکنیک کا شاخسانہ سمجھ رہی تھی تو یہ اس کی غلطی تھی۔ پہلے روز کی طرح آج بھی اس چار دیواری کے اندر تین گدھ اس کے منتظر تھے۔

☆ ☆ ☆

عمر قید کی سزا پانے والی اداس لڑکی اتنی چپ تھی کہ بے ساختہ ہی سکینہ بی بی کا دل اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس چار دیواری کے اندر آنے والی تمام عورتیں شروع میں یونہی گم سم ہوتی ہیں مگر نہ جانے کیوں سکینہ بی بی کا دل اس کا درد بٹانے کو ہمکنے لگا تھا۔ وہ تین وقت کے بجائے ایک وقت میں چند نوالے زہر مار کرتی تب سکینہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کھانا اپنے پاس رکھ لے تاکہ جب بھی بھوک لگے کھا لے، مگر فروا ابراہیم اسے نہ بتا سکی کہ اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا تھا اس کی بھوک پیاس کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ وہیں جہاں پر اس کے بہکے قدموں نے پہلی بار ماں کو دھوکا دیا تھا۔ اپنے گھر کا چھوٹا سا آنگن اسے بے حد یاد آتا۔ ماں کی عمر بھر کی کمائی اسے خون کے آنسو رلاتی اور بلال اشفاق، جس کی آنکھوں میں اس کا فیصلہ سن کر اداسی ٹھہر گئی تھی۔

"تم کس جرم کی سزا میں یہاں آئی ہو۔" اس روز ——— سکینہ بی بی نے اس کے قریب لیٹ کر پوچھا تو وہ سسک کر اپنے جرم گنوانی چلی گئی۔

اک برس کے عرصے میں
چار چھ ملاقاتیں
شام کی حویلی میں
صبح کے مہکنے کی بے یقین سی باتیں
کچھ عذاب ماضی کے
گفتگو کا موضوع تھے
کچھ سوال خوابوں کے
کچھ جواب آنکھوں کے مشترک سے جذبوں کے
آئینوں میں دیکھے تھے
آئینے تو سچے تھے
اور وہ ملاقاتیں
چار چھ ملاقاتیں
جن میں تیری باتوں کی بارشوں کے موسم نے
جتنے جھوٹ بولے تھے
شام کی حویلی میں جتنے زہر گھولے تھے
تیرا بے وفا لہجہ دھیان میں جب آتا ہے
تب سوال کرتی ہیں
میری عمر کی راتیں
ایک برس کے عرصے میں
چار چھ ملاقاتیں

"دکھ یہ نہیں ہے کہ میں برباد ہوئی ہوں۔ مجھ جیسی بیٹیوں کا یہی انجام ہونا چاہیے، مجھ جیسی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا چاہیے۔ وہ کیوں بھول جاتی ہیں بے راہ روی کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے کہ گدھ ان کے منتظر ہیں۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میں نے اپنی ماں کو زندہ درگور کر دیا میں نے اپنے بھائی کو جینے کے قابل نہیں چھوڑا، کیسے زندہ رہے گا وہ اس معاشرے میں جہاں عورت کی چھوٹی سی غلطی بڑا سا طعنہ بن جاتی ہے۔ میرے اپنے دامن نے میرے اپنوں کو زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔" دور کسی بیرک کے باہر سنتریوں کی مدھم گفتگو کے دوران قہقہہ بلند ہوا تھا ——— بیرک کے اندر فروا کی سسکیاں گونج رہی تھیں جبکہ سکینہ بی بی سوچ رہی تھی۔

"چاہے جانے کی تمنا رکھنے والی بنت حوا کو یہ ابن آدم کب تک چاہ کے زہر سے ڈستا رہے گا؟"

شعاع محمود

کرن کرن خوشبو

طب حبیب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور طب جدید

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مریض کی عیادت کی بہت تلقین کی۔ آپ فرماتے ہیں۔

"مریض کے پاس روزانہ جاؤ بلکہ ہر دوسرے دن اس کی مزاج پرسی کرو۔ اس کی دلجوئی کی باتیں کرو اور اس سے امید افزا گفتگو کیا کرو۔" آپ مریض کے پاس بیٹھ کر یہ دعا کیا کرتے تھے۔

"میں اللہ سے سوال کرتا ہوں، جو بڑا عرش کا رب ہے کہ تجھے شفا بخشے۔"

اب سے کچھ عرصہ پیشتر ایک سروے سے معلوم ہوا ہے کہ اٹھانوے فیصد ایسے مریض ہیں۔ جو زندگی اور صحت سے مایوس ہو چکے تھے اور حوصلہ افزائی اور بار بار کے ملاسے سے شفایاب ہو گئے۔

(ڈاکٹر زاہد علی کی کتاب طب نبوی جدید دور میں سے ایک اقتباس)

کنول شاہین۔۔۔ جلال پور جٹاں

چھوٹی سی بات

○ رنگین خواب دیکھنے سے بہتر ہے کہ انسان زندگی کی بلیک اینڈ وائٹ حقیقتوں کا سامنا کرے۔

○ دوستوں کی چھوٹی چھوٹی خامیاں نظر انداز کر دیا کریں کیونکہ وہ آپ کی بڑی بڑی خامیاں نظر انداز کرتے ہوں گے۔

○ پانی میں اترتے وقت پانی کی گہرائی نہ دیکھیے بلکہ اپنا قد دیکھیے۔

○ ریچھ کی دوستی بہت مہنگی پڑتی ہے اگر وہ خوش ہو جائے تو گلے لگا لیتا ہے۔

○ جن میں خوبی ہوتی ہے وہ باتیں نہیں کرتے اور جن میں خوبی نہیں ہوتی وہ باتیں کرتے ہیں۔

امبر آصف۔۔۔ کراچی

علم و ادب سے محبت

مسلمانوں کو علم و ادب سے کس قدر محبت تھی۔

اس کی ایک مثال ابن خشاب (صوفی ۷ ۵ھ) کی ہے۔

وہ ایک دفعہ بازار گئے تو ایک کتاب پسند آگئی اس کی قیمت پانچ سو دینار طے پائی لیکن جیب خالی تھی۔ ادائیگی کے لیے تین دن کی مہلت لی۔ گھر پہنچ کر ذاتی مکان پانچ سو بیس دینار میں فروخت کیا اور حسب وعدہ ادائیگی کر دی۔

شائستہ رشید۔۔۔ لاہور

انمول موتی

○ اتنا پھیلو کو سمٹنا مشکل نہ ہو اور اتنا حاصل کرو کہ چھوڑتے وقت تکلیف نہ ہو۔

○ بچہ بیمار ہو تو ماں کو دعا مانگنے کا سلیقہ خود بخود ہی آجاتا ہے۔

○ غم باعث عروج بھی ہے اور باعث زوال بھی۔

○ اگر زندگی بچانے کی قیمت پوری زندگی بھی مانگی جائے تو انکار نہ کرنا۔

○ گناہوں میں مبتلا انسان کا دعاؤں پر یقین نہیں رہتا۔

○ زندگی سے تقاضا اور گلہ نکال دیا جائے تو سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

○ جو انسان اپنی وفا کا ذکر کرتا ہے وہ اصل میں دوسرے کی بے وفائی کا ذکر کر رہا ہوتا ہے، وفا تو ہوتی ہی بے وفا سے ہے۔

○ کسی کے احسان کو اپنا حق نہ سمجھو۔

○ ذوق سفر کے بغیر کوئی راہ آسان نہیں ہو سکتی۔

(کرن کرن سورج۔۔۔ واصف علی واصف)

عامرہ چوہدری، گجرات

رفتار قلب

قابوس والئی گورگان کا بھتیجا ایک پر اسرار مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کسی طبیب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا سے اس کو دیکھنے کی درخواست کی گئی۔ بوعلی سینا نے بیمار کے معائنے کے بعد ایک ایسے شخص کو بلایا، جو شہر سے واقف تھا۔ اس سے کہا کہ اس شہر کے محلوں کے نام لینا شروع کرے۔

اسی دوران بوعلی سینا مریض کی نبض شمار کرتا رہا۔ ایک محلے کے نام پر پہنچ کر بوعلی سینا نے کہا کہ "اب اس محلے کی گلیوں اور کوچوں کے نام لو۔" پھر ایک خاص گلی کے نام کے بعد کہا کہ "اب اس کوچہ کے رہنے والوں کے نام بتاؤ۔" ایک خاص اہل خانہ کا جب نام آیا تو کہا کہ "اس گھر کے رہنے والوں کے نام بتائے جائیں۔" اس دوران بوعلی سینا نبض بھی شمار کرتا رہا اور مریض کے چہرے کے تغیرات پر بھی نظر رکھتا رہا۔

جب ایک خاص نام آیا، جو ایک خاتون کا تھا تو بوعلی سینا نے محسوس کیا کہ مریض کے دل کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ یہ مریض اس کے عشق میں گرفتار تھا۔ اس کیفیت کا اظہار عندلیب شادانی کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی کہ نہیں

(ڈاکٹر سید اسلم کی کتاب "قلب" سے اقتباس۔)

شارقہ۔۔۔ ٹنڈو الہ یار

حقیقت

☆ پاؤں گیلا کیے بغیر سمندر تو پار کیا جا سکتا ہے مگر آنسو بہائے بغیر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔

☆ زبان کو شکوہ سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہو گی۔

☆ ہم خیال لوگ ہم سفر ہو جائیں تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔

☆ محبت اور نفرت دونوں اگر حد سے بڑھ جائیں تو جنون کی حد میں داخل ہو جاتی ہیں۔

☆ مجبوریوں کے بندھن اور ساتھ بہت عارضی اور ناپائیدار ہوتے ہیں کیونکہ ایک نہ ایک دن یہ عارضی بندھن ٹوٹنا ہی ہوتا ہے۔ تو بہتر نہیں کہ آپ خود ہی اس کو آزاد کر دیں تاکہ آپ کی عزت نفس برقرار رہے۔

☆ عجلت، دانش و حکمت کی دشمن ہے۔

ارم کاشف۔۔۔ ملتان

محرومی

دنیا تو کیا خود سے بھی کرتے رہے گریز
جب تک ملے کسی سے، کسی سے نہیں ملے
جو بے طلب تھا اس کی ہمیں جستجو رہی
جو ملنا چاہتا تھا اسی سے نہیں ملے

فوزیہ ثمرٹ۔۔۔ گجرات

کچھ لفظ چنے ہیں گوہر سے

☆ کچھ دل بہت نازک ہوتے ہیں ان پر لفظ استعمال کرنے سے پہلے ان کے حوصلوں کو جان لو ورنہ یاد رہے دل ٹوٹ جائے گا یا تم خود۔

☆ کچھ دعائیں بڑی بے ساختہ ہوتی ہیں اچانک ہی دل کے مندر میں گھنٹیوں کی طرح بجنے لگتی ہیں۔

☆ دیواریں صرف کمروں کی نہیں ہوتیں دل کے گرد بھی ہوتی ہیں، کئی خواب کئی خیال ان ہی میں قید رہ جاتے ہیں۔

☆ محبتیں چھینی یا وصول نہیں کی جاتیں بلکہ رویوں سے کشید کی جاتی ہیں۔

☆ مزا تو تب ہے جب شام ڈھل رہی ہو اور آپ کے اندر سورج طلوع ہو رہا ہو۔

☆ بعض اوقات کئی چھٹی اور ناہموار زمین پر

زلزلے آجائیں تو دکھوں کے پہاڑ اور خوشیوں کے ذرے ایک ہو جاتے ہیں اور راوی چین ہی چین لکھتا ہے زندگی سیدھی اور ہموار ہو جاتی ہے۔

☆ ہم بعض لوگوں کو چاہنے کے باوجود نظر انداز نہیں کرسکتے اور بعض لوگوں کو ہم چاہتے ہوئے بھی عزت نہیں دے سکتے۔

☆ جو تم کو بری بات سے ڈرائے وہ تم کو خوشی کی بشارت دیتا ہے۔

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھروڑپکا

کہاں ہے

لڑکیاں شادی کے معاملے میں نرالی ہوتی ہیں۔ رشتہ آنے پر لڑکے کے بارے میں ایسے ایسے سوالات کرتی ہیں۔ جیسے لڑکے کو اپنا خاوند نہیں منیجر بنا رہی ہوں۔

لیکن جوں جوں ان کی عمر گزرتی ہے سوالات میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔

بیس سال کی عمر میں لڑکی کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے

"لڑکا کیسا ہے۔" پچیس سال کی عمر میں جب رشتہ آتا ہے تو پہلا سوال کچھ یوں ہوتا ہے۔

"لڑکا کیا کرتا ہے۔" اور جب لڑکی کی عمر تیس سال سے تجاوز کر جاتی ہے تو کوئی رشتہ آنے پر اس کا پہلا سوال ہوتا ہے۔

"کہاں ہے؟"

فوزیہ ثمرہ بٹ۔۔۔ گجرات

دوست

○ ایک اچھا دوست ریاضی کے زیرو جیسا ہوتا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی پر وہ جس کے ساتھ جڑ جائے اس کی قیمت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔

○ سچا دوست دو جسموں میں ایک روح کی طرح ہوتا ہے۔

○ دوستوں کو کھو دینا غریب الوطنی سے بدتر ہے۔

○ آزمائش دوست کی ہو، محبت کی ہو یا کسی دلبر لمحے کی کبھی بھی سود مند نہیں ہوتی کون جانے اس لمحے وہ کتنا مجبور ہو۔

○ دوست کبھی نہیں بچھڑتے، جو چلے گئے وہ یادوں میں زندہ رہتے ہیں۔

○ دوستی میں کوئی غرض پنہاں نہیں ہونی چاہیے، سوائے اس کے کہ روح کی گہرائیاں پیش نظر ہوں۔

○ دوست کی نسبت کسی دشمن کو معاف کر دینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

○ لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں بحث کو مگر نہیں چھوڑتے۔

○ دوستی اور چائے کی حدت اور تیزی ہی ان کی خوبی ہے نہ کہ حد درجہ مٹھاس۔

نوشین اقبال نوشی۔۔۔ گاؤں بدر مرجان

انمول موتی

☆ ایمان اور حیا دو ایسے پرندے ہیں جن میں سے اگر ایک اڑ بھی جائے تو دوسرا خود بخود اڑ جاتا ہے۔
(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

☆ اس غربت پر صبر کرنا جس میں عزت محفوظ ہو یہ اس امیری سے بہتر ہے جس میں ذلت و رسوائی ہو
(حضرت امام حسین رضی اللہ عنہا)

☆ ایک لمحے کی سچی خوشی بے شمار گھڑیوں کے دکھ کا بدل ہو سکتی ہے۔ (امام غزالیؒ)

☆ جو عقل مند سے لڑے وہ عزت کی توقع نہ رکھے (شیخ سعدیؒ)

☆ ہر چیز کی زکوۃ ہے اور گھر کی زکوۃ مہمان خانہ ہے
(علی ہجویریؒ)

☆ کردار وہ مالا ہے اگر اس کا ایک موتی بھی ٹوٹ جائے تو ساری مالا بکھر جاتی ہے۔ (افلاطون)

☆ جب آپ کسی سے روٹھ کر نفرت سے بات کرو اور وہ اس کا جواب محبت سے دیں تو یہ جانو کہ وہ آپ کو خود سے زیادہ پیار کرتا ہے (حضرت علیؓ)

سدرہ وزیر۔۔۔ خوشاب

بشریٰ محمود

یادوں کے دیپ جلے

سیدہ نسبت زہرا، کی ڈائری میں تحریر

ابراہیم ذوق کی غزل

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے یہ وقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے باد صبا اب کبھی چلے

فوزیہ ثمرہ بٹ، کی ڈائری میں تحریر

فیض احمد فیض کی نظم

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام ہو کہ دُر
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
یہ ساغر شیشے لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں لہو رلاتے ہیں

اسماء بدر، کی ڈائری میں تحریر

سلیم کوثر کی نظم

بڑا دشوار ہوتا ہے
ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جیون کی کہانی کو
بیان بے زبانی کو
کہاں سے یاد رکھنا ہے
کہاں سے بھول جانا ہے
اسے کتنا بتانا ہے
اس سے کتنا چھپانا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے
کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے
کہاں آواز دینی ہے
کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں رستہ بدلنا ہے
کہاں سے لوٹ آنا ہے

نوشین اقبال نوشی، کی ڈائری میں تحریر

احمد ندیم قاسمی کی غزل

آنکھوں سے خواب، دل سے تمنا تمام شد
تم کیا گئے کہ شوق نظارہ تمام شد

کل تیرے تشنگان سے یہ کیا معجزہ ہوا
دریا پہ ہاتھ رکھے تو دریا تمام شد

دُنیا تو اک برف کی سل سے سوا نہ تھی
پہنچی ذرہ جو آنچ تو دُنیا تمام شد

عشاق پر اب کے عجیب وقت آپڑا
مجنوں کے دل سے حسرتِ لیلیٰ تمام شد

شہرِ دلِ تباہ میں پہنچوں تو کچھ کھلے
کیا بچ گیا ہے راکھ میں اور کیا تمام شد

ہم شہرِ جاں میں آخری نغمہ سُنا چکے
سمجھو کہ اب ہمارا بھی تماشا تمام شد

اک یادِ یار ہی تو پس انداز ہے ندیم
ورنہ وہ کارِ عشق تو کب کا تمام شد

ارم آفتاب، کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی غزل

آنکھ سے دُور نہ ہو دل سے اُتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اُتر جائے گا

زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

ضبط لازم ہے مگر دُکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

نمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر

کرامت بخاری کی غزل

یہ دُنیا اس حوالے سے حسیں ہے
نظر آتا ہے جو کچھ وہ نہیں ہے

جسے میری نگاہیں ڈھونڈتی ہیں
وہ جلوہ میرے اندر جاگزیں ہے

نہیں ہم گردشِ دوراں میں تنہا
ہمارے ساتھ گردش میں زمیں ہے

کھلا یہ راز اُن سے دُور رہ کر
تصور اُن کا اُن سے دل نشیں ہے

کسی کے عشق میں اتنا مگن ہوں
مجھے مرنے کی بھی فرصت نہیں ہے

اسی کو اوڑھ لوں گا اپنے اوپر
مرے قدموں کے نیچے جو زمیں ہے

دلِ بیمار نے پوچھا ہے مجھ سے
دوائے دل زمانے میں کہیں ہے

کمی محسوس ہو گی اس کو میری
مجھے اپنی محبت پہ یقیں ہے

مجھے یہ شعر پسند ہے

شگفتہ سلیمان

رانی ———— کراچی
کیسے اظہار کروں اپنی وفاؤں کا اُن سے
میں ابھی سوچ رہا تھا وہ بُرا مان گئے
لوگ ہرجائی ہوا کرتے ہیں رسماً ان سے
بس یہ ہی میں نے کہا تھا وہ بُرا مان گئے

مہک رباب ———— فیصل آباد
کب مہکتی ہے بھلا رات کی رانی دن میں
ٹھہر سویا تو تیری یاد کی خوشبو جاگی

رخشندہ ———— کراچی
کس قدر احترام کرتے ہو
دل دکھانا ثواب ہو جیسے

فوزیہ تمر بٹ ———— گجرات
کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر بات پہ رونا آیا
ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ہیں ان کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

آسیہ جاوید ———— علی پور چٹھہ
سچ کہوں مجھ کو یہ عنوان بُرا لگتا ہے
ظلم سہتا ہوا انسان بُرا لگتا ہے
کس قدر ہو گئی مصروف یہ اپنی دُنیا
ایک دن ٹھہرے تو مہمان بُرا لگتا ہے

نمرہ، اقراء ———— کراچی
طویل ہو نہ کہیں اپنی چاہتوں کا سفر
سنا ہے اہلِ طلب عمر بھر ترستے ہیں

عظمیٰ، نادیہ ———— کراچی
آج کے دور میں امیدِ وفا کس سے رکھیں
دھوپ میں بیٹھا ہے خود پیڑ لگانے والا

لائبہ، ایمن ———— آزاد کشمیر
روز اٹھتا ہوں نیا ایک ارادہ لے کر
فاصلہ دیکھ کر پرواز بدل جاتی ہے

سعدیہ، مریم ———— شریف آباد
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

اقصیٰ، ناہید ———— کراچی
ہم بھی ہیں کیا عجیب کہ کڑی دھوپ کے تلے
صحرا خرید لائے ہیں برسات بیچ کر

ندا، فضہ ———— فیصل آباد
تمام عمر ترا انتظار کر لیں گے
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے

اسماء حسن ———— لاہور
آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

عشرت ———— لاہور
آتشِ غم کے سیلِ رواں میں نیندیں جل جل راکھ ہوئیں
پتھر بن کے دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو

افشاں ———— کراچی
کچھ بھی نہ ملا ہاتھ کو کشکول بنا کے
یہ دستِ دعا کاسہ خالی ہے خودی کا

انجم ———— ملتان
کرن آفتاب کی دشت و درِ تپش جھڑک کے چلی گئی
مگر اک ذرۂ منفعل جو بجھا رہا سو بجھا رہا

زینب صدیقی ———— کوٹ چٹھہ
پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو ہم نے امجد بچتے دیکھا کم
ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انسان
بہت خوشی میں آنکھیں اکثر ہو جاتی ہیں نم

نوشین اقبال نوشی ———— گاؤں بدر مرجان
وہ پاس تھا تو اس حیات کے عنوان تھے بہت
خوش رہنے اور ہنسنے کے سامان تھے بہت
جُدا ہوا تو دلِ مطمئن کا اطمینان نہ گیا
مجھ خوش فہم کو پلٹ آنے کے گمان تھے بہت

حافظ ردا ناصر ـــــــ بورے والا

کبھی پیغام الفت، کبھی مجھ سے بدگمانی
تیری یہ بھی مہربانی، تیری وہ بھی مہربانی

فوزیہ جلیل ـــــــ بورے والا

مجھ سے ہی محبت ہے لیکن یہ دستور ہے اس کا
غیر سے ملتا ہے ہنس ہنس کے مجھ سے ہی شرماتا ہے

فوزیہ خان، سمیرا، عائشہ ـــــــ ڈگری ہوسٹل

اک محبت کا مشغلہ لے کر
زندگی خوب کی تباہ ہم نے

اقصیٰ ناصر ـــــــ کراچی

بس اب کچھ دیر میں محسن وہ پتھر ٹوٹ جائے گا
میں اس کی سرد مہری پہ محبت مار آیا ہوں

فوزیہ بٹ ـــــــ گجرات

ضرورت ہو نہ ہو اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے
جنہیں ہو مانگنا وہ حسب عادت مانگ لیتے ہیں
ابھی ہم خیریت بھی پوچھنے نہیں پاتے اُن کی
وہ آتے ہی جانے کی اجازت مانگ لیتے ہیں

صابرہ یار محمد ـــــــ اسلام آباد

پلک جھپکتے ہی دُنیا اُجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں
فراز ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

امبر آصف ـــــــ لاہور

آسان نہ کر دی ہو کہیں موت نے مشکل
روتے ہوئے بیمار بڑی دیر سے چپ ہیں
اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چپ ہیں

آمنہ امتیاز ـــــــ کراچی

زندہ در گور ہوئے اہل نظر
کس قدر مردہ پرستی ہے یہاں
زیست وہ جنس گراں ہے کہ فراز
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں

کرن عدنان ـــــــ کراچی

نہ اجنبی، نہ مسافر، نہ شہر والے ہیں
کوئی پکار دو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

شافعہ ـــــــ لاہور

حالات کی دوپہر کڑی ہے ساقی
تقدیر برہنہ سر کھڑی ہے ساقی
کچھ دیر غم جہاں پہ ہنس لیں آؤ
رونے کو تو زندگی پڑی ہے ساقی

صائمہ ـــــــ گوجرانوالہ

حضرت انساں سر دنیا و دنیا احقر ہوا
اشرف المخلوقات ہو کر کس قدر بدتر ہوا
اب کہاں جاکر چھپائیں اپنی جان بے اماں
آدمی ہی آدمی کے واسطے اژدر ہوا

رانی ـــــــ کراچی

رات ٹھہری تھی ہُو کا عالم تھا
اپنے سینے میں بے صدا دل تھا
اب غم روزگار کافی ہے
ہاں کبھی صرف مسئلہ دل تھا

صبا ـــــــ لاہور

انہیں مجھ سے محبت ہو رہی تھی
نہ کھلتی آنکھ تو بس ہو گئی تھی

نوشین اقبال نوشی ـــــــ گاؤں بدر مرجان

ہجر لازم ہے تو پھر وصل کا وعدہ کیسا
یوں خزاں رت پہ بہاروں کا لبادہ کیسا
زخم دے کر تو نہ تم درد کی شدت پوچھو
درد تو درد ہے تھوڑا یا زیادہ کیسا؟

تحریم ـــــــ گوجرہ

ہر گھڑی مجھ پہ نگاہ رکھتا ہے
تم سے تو میرا رقیب اچھا ہے

سدرہ نذیر ـــــــ خوشاب (جبیل)

پھولوں کی نمائش میں اگر وہ بھی ہوا تو
اس بادگاہوں کو بڑی آگ لگے گی

ندا، نفضہ ـــــــ فیصل آباد

یہ سائنوں کی بستی ہے ذرا دیکھ کے مل وصی
یہاں کا ہر شخص بڑے پیار سے ڈستا ہے

صائمہ جبی ـــــــ کراچی

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں
کوئی اس درد کا مرہم نہیں ہے

ریحانہ امجد بخاری

مسکراتی کرنیں

وغیرہ وغیرہ

○ باپ "تم نے لڑکی سے کہہ دیا ہے تاکہ اگر اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تو اسے جائیداد میں سے کچھ نہیں ملے گا۔"
ماں "اس سے کہنے کی کیا ضرورت تھی، میں نے لڑکے سے کہہ دیا تھا اور وہ اس دن کے بعد سے نہیں آیا۔"

○ جو شادی شدہ مرد دعوا کرے کہ وہ گھر کا سربراہ ہے، اس سے دوسرے جھوٹے دعووں کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔

○ کچھ ادیب کافی ہاؤس میں اس لیے آیا کرتے ہیں کہ وہ بے گھر ہوتے ہیں جبکہ کچھ اس لیے وہاں جاتے ہیں کہ وہ گھر والے ہوتے ہیں۔

○ ایک مصنف نے اپنی کتاب کا انتساب لکھا۔
"پیاری بیوی کے نام، جس کی غیر موجودگی میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔"

○ قاضی صاحب نے وعظ فرمایا "لوگ ذرا عقل سے کام لیں تو طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔"
پچھلی نشست سے ایک آواز آئی۔ "لوگ ذرا عقل سے کام لیں تو شادی ہی نہ کریں۔"

○ کنوارے کلب کا فارم بھرتے ہوئے ایک صاحب نے سیکریٹری سے پوچھا "آپ کا کوئی ممبر شادی کر بیٹھے تو کیا اسے سزا دی جاتی ہے۔۔۔؟"
"جی نہیں!" سیکریٹری بولی۔ "ہمارے نزدیک شادی بہ ذات خود ایک بڑی سزا ہے۔ اس کے بعد کسی سزا کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"

شائستہ زہرہ۔۔۔ ہزارہ

صحیح تشخیص

دماغی امراض سے چند مریض روبہ صحت تھے۔ ڈاکٹر نے ان میں سے ایک کا نفسیاتی جائزہ لینے کی غرض سے اس سے کہا۔
"تمہاری بیوی تم سے ملنے کے لیے باہر بیٹھی ہوئی ہے۔"
مریض نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ اس سے کہہ دیجیے کہ مجھ پر پاگل پن کے شدید دورے پڑتے ہیں۔ وہ میرے قریب نہ آئے۔۔۔ ورنہ میں اس کا منہ نوچ لوں گا۔"
ڈاکٹر نے اس کی رپورٹ میں لکھا۔
"یہ مریض اب بالکل ٹھیک ہے، اس لیے اسے چھٹی دے دی جائے۔"

صفیہ۔۔۔ لطیف آباد

دور اندیش

دو ماہ کی چھٹیاں گزار کر آنے والے ملازم نے اگلے روز جب اپنی شادی کے لیے دو دن رخصت کی درخواست دی تو مالک نے حیرت سے پوچھا۔
"دو ماہ کی چھٹیوں میں تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"
ملازم نے کہا۔ "اجی چھوڑیئے جناب۔۔۔! کون اپنی چھٹیاں غارت کرواتا۔"

رضیہ۔۔۔ کراچی

سرپرائز

لڑکی نے اپنے منگیتر کو بتایا۔
"تمہیں یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ جب ہماری شادی ہوگی تو تمہارے گھر میں ایسی عورت آجائے گی،

جو کھانے پکانے میں بے حد ماہر ہے۔"
"وہ اچھا......!" منگیتر نے خوشگوار حیرت سے کہا۔
"مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم کھانے پکانے میں ماہر ہو۔"
"میں اپنی بات نہیں کر رہی۔" لڑکی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "شادی کے بعد میری امی ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آجائیں گی۔"
شاہدہ...... کراچی

دلیل

ایک سیاستدان کو اس کے دوست نے مشورہ دیا۔ "لوگوں سے گفتگو یا تقریر کے دوران تم صرف اپنی بات کیا کرو، اس کے حق میں دلیل مت دیا کرو۔"
سیاستدان نے حیرت سے پوچھا۔
"وہ کیوں......؟"
دوست بولا۔ "دراصل تمہاری بات تو سب خاموشی سے سن لیتے اور برداشت بھی کر لیتے ہیں مگر دلیل سن کر بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں۔"
ساجدہ خان...... لطیف آباد

حادثہ

ایک صاحب ملازمت کے لیے انٹرویو دے رہے تھے۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے پوچھا۔
"آپ کبھی بیمار رہے ہیں؟"
"جی نہیں۔"
"کوئی حادثہ وغیرہ پیش آیا؟"
"ہرگز نہیں۔"
"لیکن انٹرویو دینے کے لیے آپ بیساکھیوں کے سہارے تشریف لائے ہیں۔"
"دراصل میں کل آیا تھا اور زبردستی اندر آنا چاہ رہا تھا، آپ کے چپراسی نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیا تھا۔"
"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو حادثہ پیش آچکا ہے۔"
"جی نہیں! یہ حادثہ نہیں تھا، آپ کے چپراسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔"

مہوش...... کراچی

جمہوریت

ایک شخص نے پاگل خانے کی سیر کرتے ہوئے ایک پاگل سے دریافت کیا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"
پاگل نے جواب دیا۔ "اس جمہوری نظام کی وجہ سے۔"
اس شخص نے پوچھا۔
"وہ کیسے......؟" پاگل نے جواب دیا۔
"لوگ کہتے تھے کہ میں پاگل ہوں اور میں کہتا تھا کہ یہ لوگ پاگل ہیں۔"
اس شخص نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"
پاگل نے جواب دیا۔ "ان کے حق میں زیادہ ووٹ پڑ گئے۔"
انجم...... کنگن پور

جدوجہد

ایک طالبہ نے پروفیسر خاتون سے پوچھا۔ "معاف کیجیے گا، میں آپ کو پروفیسر کہہ کر مخاطب کروں یا مسز؟"
پروفیسر خاتون نے جواب دیا۔ "مجھے مسز کہہ کر مخاطب کرو بیٹی! کیونکہ مجھے مسز بننے میں زیادہ محنت کرنا پڑی ہے۔"
ثمینہ اختر...... کراچی

ہرمرچیں

☆ "میرا بھائی دس سال سے وائلن بجانے کی مشق کر رہا ہے۔"
"اب تو بہت اچھا بجانے لگا ہو گا؟"
"زیادہ اچھا نہیں......! دراصل نو سال کے بعد کی مشق کے بعد تو جا کر اسے یہ پتا چلا کہ وائلن منہ سے نہیں بجایا جاتا۔"
☆ "ذرا فون سن لینا۔"
"لیکن گھنٹی تو بجی نہیں۔"
"تم بھی ہر کام اس وقت کرتے ہو، جب وہ سر پہ

آن پڑے۔"
☆ "تمہیں ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے۔"
"لیکن سر......! میں نے کچھ کیا بھی نہیں۔"
"اسی لیے تو برخاست کیا جا رہا ہے۔"
☆ "اللہ کے نام پر چائے پینے کے لیے 50 روپے دیتے جائیں۔"
"لیکن چائے 50 روپے کی تو نہیں آتی؟"
"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن میرا دوستوں کے ساتھ ارادہ ہے۔"
☆ "تمہارا بھائی کیا کر رہا ہے؟"
"میرے بھائی نے دکان کھولی تھی۔"
"کیسی چل رہی ہے؟"
"معلوم نہیں......!"
"کیوں......! بھائی سے ملاقات نہیں ہوتی؟"
"ہوتی ہے، وہ چھ ماہ سے جیل میں ہے، اس نے ہتھوڑے سے دکان کھولی تھی۔"
شافعہ اعوان...... کراچی

خوش فہمی

کسی ملک کے بادشاہ نے ایک مرتبہ فوج کے ایک چھوٹے افسر کو امتیازی نشان عطا کیا تو اس نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا۔
"جہاں پناہ! میں خود کو اس کا حق دار نہیں سمجھتا۔ یہ تمغہ میں صرف میدان جنگ میں ہی وصول کر سکتا ہوں۔"
فوجی افسر کو یہ توقع تھی کہ بادشاہ اس کے جواب سے خوش ہو کر مزید انعام و اکرام سے نوازے گا یا کم از کم تحسین کے کلمات تو ضرور کہے گا۔ لیکن توقع کے برخلاف بادشاہ نے کہا۔
"عجیب احمق آدمی ہو، کیا تمہاری خاطر میں جنگ چھیڑ دوں۔"
غزالہ...... لاہور

صحیح طریقہ

ڈیفنس میں نئے نئے آباد ہونے والے دو پڑوسی اپنے اپنے لان کے مسائل پر تبادلہ خیال کر رہے تھے، ایک بولا۔
"لان پر جب پودے نمودار ہونا شروع ہوتے ہیں تو صحیح پتا نہیں چلتا کہ وہ واقعی پودے ہیں یا بے کار جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں۔"
"میں تو نمودار ہونے والے سارے پودوں کو زمین سے اکھاڑ لیتا ہوں، اگر وہ دوبارہ اگ آئیں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ بے کار جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں ہیں۔" دوسرے پڑوسی نے بتایا۔ شکیلہ...... ٹنڈو محمد خان

معذرت

ایک شخص بہت غیر حاضر دماغ تھا۔ ایک دن وہ صبح سو کر اٹھا تو اسے یاد آیا کہ بدھ کو ایک خاتون کے ہاں کھانے پر جانا تھا۔ وہ بے حد پریشان ہوا اور فون کی طرف دوڑا۔
"مائی ڈیئر! میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔" اس کی سانس پھول رہی تھی۔
"بدھ کو نہ آنے کے باعث میں بے حد شرمندہ ہوں۔ نہ جانے میں کیسے بھول گیا۔ مہربانی کر کے اب کسی اور دن مجھے بلا لو۔ میں ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں۔"
دوسری طرف دیر تک خاموشی رہی پھر خاتون کی سرد آواز سنائی دی۔ "کس بات کی معذرت؟ تم بدھ کو دعوت میں موجود تو تھے۔"
حسینہ...... میرپور خاص

معمولی فرق

وہ اس کا جڑواں بھائی ہے، جو ہو بہو اس کے مشابہ ہے۔ ایک ہی روز پیدا ہونے والے ان بہن بھائی میں معمولی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بھائی کی عمر پچاس سال ہے...... جبکہ وہ ابھی پچیس سال کی ہے۔
یمنیٰ خان...... کراچی

☆ ☆

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

آلو کی بھجیا

اجزا :

آلو (ابال لیں) ایک کلو
پیاز (چوکور کٹی ہوئی) دو عدد
ہری مرچ (کاٹ لیں) چار عدد
نمک حسبِ ذائقہ
گرم مسالا پاؤڈر آدھا چائے کا چمچہ
سفید تل (بھون کر کوٹ لیں) دو کھانے کے چمچے
کلونجی ایک کھانے کا چمچہ
تیل تین کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا (کٹا ہوا) چار کھانے کے چمچے
ٹماٹر (چوکور کٹے ہوئے) چار عدد (بڑے)
شملہ مرچ (چوکور کٹی ہوئی) تین عدد
کٹی لال مرچ ایک چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا ایک چائے کا چمچہ
کھٹائی پاپاؤڈر ایک کھانے کا چمچہ
میتھی دانہ ایک کھانے کا چمچہ
لیموں (رس نکال لیں) دو عدد
ہلدی پاؤڈر دو چائے کے چمچے

ترکیب :

ابلے ہوئے آلو کو چوکور کاٹ لیں (صرف ایک آلو بچا کر رکھیں) آلو میں پیاز ٹماٹر، کٹی ہوئی لال مرچ، چاٹ مسالا، گرم مسالا، بھونے اور کٹے ہوئے تل، کھٹائی پاؤڈر اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ ایک بچے ہوئے آلو کو اچھی طرح میش کرکے ایک کپ ٹھنڈا پانی ملائیں اور باقی آلو میں ملا دیں۔

ایک فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور ہلدی ڈال دیں پھر میتھی دانہ اور کلونجی ڈال کر فرائی کریں۔ دو منٹ بعد شملہ مرچ ڈالیں۔ جب شملہ مرچ کا رنگ کھل جائے تو ہری مرچ بھی ڈال کر فرائی کریں۔ دو منٹ بعد اتار کر بھجیا میں ڈال دیں۔ ہرا دھنیا سے گارنش کردیں پوری یا پراٹھوں کے ساتھ سرو کریں۔

قیمہ بھرے بینگن

اجزا :

قیمہ (دھو کر پانی خشک کرلیں) تین کپ
بینگن (درمیانے سائز کے) دو عدد
تیل دو کھانے کے چمچے
پیاز (سلائس کاٹ لیں) ایک عدد
ادرک (کش کرلیں) ایک چائے کا چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ
لہسن کا جوا (کوٹ لیں) ایک عدد
ہلدی پاؤڈر چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر (چوپ کرلیں) ایک عدد
نمک حسبِ ذائقہ
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں) دو کھانے کے چمچے

گارنشنگ کے لیے :

پیاز (سلائس کاٹ لیں) ایک عدد
چیری ٹماٹو دو عدد (چار چار ٹکڑے کرلیں)
ہرا دھنیا تھوڑا سا

ترکیب :

بینگن کو دھو کر خشک کرنے کے بعد اسے لمبائی کے رخ پر دو ٹکڑوں میں کاٹ کر گودا نکال کر کھوکھلا کرلیں۔ اب اس خول کو تیل سے برش کریں۔ درمیانے سائز کے سوس پین میں ایک کھانے کا چمچہ تیل گرم کریں اور اس میں پیاز ڈال کر گولڈن براؤن کرلیں۔ اب اس میں ادرک، سرخ مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، نمک اور لہسن ڈال کر تلیں۔ اس کے بعد اس میں چوپ کیے ہوئے ٹماٹر ڈال کر آنچ دھیمی کردیں اور پانچ منٹ پکائیں۔ قیمہ شامل کرکے درمیانی آنچ پر سات سے دس منٹ تک بھونیں۔ اب اس میں شملہ مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر سوس پین کو چولہے سے اتار لیں۔ بینگن میں یہ آمیزہ بھر کے کناروں پر برش سے تیل لگائیں درمیانے گرم باربی کیو پر بیس منٹ تک پکائیں یا پہلے سے گرم اوون میں رکھ کر بیک کرلیں۔ پیاز کے سلائس، چیری ٹماٹو اور ہرے دھنیے سے گارنش کرکے سرو کریں۔

فروٹ اینڈ بسکٹ ٹرائفل

اجزا :

اسفنج کیک دو پاؤنڈ
گرم دودھ ایک کپ
چینی ایک کھانے کا چمچہ
بسکٹ ایک پیکٹ
اخروٹ ایک کپ (چھلے اور کٹے ہوئے)
تازہ کریم ایک پیکٹ
اسٹرابیری جیلی ایک پیکٹ
آڑو ایک ٹن
لیموں دو عدد

ترکیب :

جیلی کو تیار کرکے فریج میں سیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ دودھ کو پکا کر اس میں بسکٹ چورا کرکے شامل کریں اور چینی بھی ملا دیں۔ اب اتنا پکائیں کہ پیسٹ گاڑھا ہو جائے۔ آنچ ہلکی کریں کہ آمیزہ جلنے نہ پائے۔ ایک پھیلی ہوئی ڈش میں بسکٹوں اور دودھ کا آمیزہ پھیلا کر ڈالیں۔ اسفنج کیک کے سلائس اس کے اوپر پھیلا کر رکھیں۔ اس کے اوپر گرم دودھ اور لیموں رس چھڑک دیں۔ اب جیلی، آڑو اور اخروٹ ڈال دیں۔ اسی طرح تہہ جماتی رہیں۔ آخر میں تازہ کریم پھینٹ کر ڈال دیں۔

اسپراؤٹس اور مٹر کا سلاد

اجزا :

مٹر (ابال لیں) 250 گرام

بروکلی (بھاپ پر پکائیں)	250 گرام
بین اسپراؤٹس	ایک کپ
تل	ایک کھانے کا چمچہ
ہری پیاز	دو عدد (لمبے ٹکڑ کاٹ لیں)

گارنشنگ کے لیے :

ادرک (کش کرلیں)	دو چائے کے چمچے
لیموں کا رس	تین چائے کے چمچے
زیتون کا تیل	چوتھائی کپ
شکر	دو چائے کے چمچے
نمک ' سیاہ مرچ پاؤڈر	حسبِ ذائقہ

ترکیب :

تل کو ایک فرائنگ پین میں ڈال کر گولڈن براؤن ہونے تک بھون لیں۔ اب ایک سلاد باؤل میں مٹر ' بروکلی ' بین اسپراؤٹس اور ہری پیاز ڈالیں۔ ادرک ' لیموں کا رس ' زیتون کا تیل ' شکر ' نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر کو ایک ساتھ مکس کرکے اس کے اوپر ڈال کر ٹوڑ کرلیں۔ اس کے اوپر بھنے ہوئے تل چھڑک کر سرو کریں۔

چیز آملیٹ

اجزا :

انڈے	چار عدد
لیمن جوس	دو چائے کے چمچے
نمک	حسبِ ذائقہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
مکھن	20 گرام
چیز (کش کیا ہوا)	آدھا کپ

ترکیب :

ایک پیالے میں انڈوں کی زردی ' لیمن جوس ' نمک اور کالی مرچ ڈال کر دو منٹ الیکٹرک بیٹر سے پھینٹ لیں۔ یہاں تک کہ آمیزہ کریم کی شکل اختیار کرلے۔ ایک پیالے میں انڈوں کی سفیدی کو بھی اسی طرح پھینٹ لیں۔ اب زردی اور سفیدی کے آمیزے کو یکجا کرلیں۔ مکھن کو فرائنگ پین میں ڈال کر گرم کریں۔ اب اس میں آملیٹ کا آمیزہ ڈال دیں اور آگ تیز کردیں۔ ایک منٹ پکائیں پھر چیز کو آمیزے کے اوپر پھیلا کر اوون میں گرم گرل پر دو منٹ رکھیں جب آملیٹ گولڈن ہو جائے تو نکال لیں۔ آملیٹ تیار ہے۔

حسن و صحت

ادارہ

زیادہ تر بیوٹی مصنوعات قدرتی اجزا سے ہی تیار کی جاتی ہیں جو کہ ہماری روزمرہ کی خوراک کا بھی حصہ ہوتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے پودے اور جڑی بوٹیاں ہیں جن کے رس کو ان کے خواص کی وجہ سے ان مصنوعات میں شامل کیا گیا ہے جن میں بعض تو ایسے ہیں کہ جواب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پکوان کے اجزا میں شامل ہیں۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ برصغیر کے باشندے طرز حسن اور قدرتی اجزا کے خواص کو بہت پہلے ہی پہچان چکے تھے اور اب وہ انہیں خوشنما بوتلوں اور پیکٹوں میں بھر کر نہایت دیدہ زیب لیبل کے ساتھ دنیا بھر کے اسٹوروں تک پہنچا چکے ہیں یا پھر جڑی بوٹیوں سے متعلق اہم باتیں تو ہر طرف عام ہو چکی ہیں۔

کریم ' لوشن اور یا کسی محلول میں شامل یہ قدرتی اجزا جسم پر لگانے یا چہرے پر لیپ کرنے کی صورت میں جلد کے اندر سرائیت کر جاتے ہیں حالانکہ یہی اجزا ہم اپنی خوراک میں بھی استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ مختلف اجزا میں پائی جانے والی خصوصیات کی مقدار یا تعداد اور اثر آفرینی کے بارے میں ماہرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ اس حوالے سے بحث و تمحیص میں پھنسے دکھائی دیتے ہیں لیکن دماغ میں یہ سوچ بھی بیدار ہوتی ہے کہ حسن کی بہترین اعانت وہ وقت اور محنت ہے جو آپ خود کو حسین اور پرکشش بنانے پر کر رہی ہوتی ہیں اور اس کا صلہ محض وہ تعریف ہے جو کہ دوسروں کی زبانی سننے کو ملتی ہے۔ یہاں ہم کاسمیٹکس مصنوعات میں شامل چند اجزا کا تذکرہ کر رہے ہیں جن کا استعمال آپ کے چہرے اور جلد کو بہتری عطا کر سکتا ہے اور اس کے لیے صرف آزمائش شرط ہے۔

ایلوویرا : یعنی گھیکوار جو شفا کے خواص سے مالا مال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کے وقت میں یہ سپاہیوں کے زخموں کو مندمل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں جسم کے جلے ہوئے حصے کو

راحت اور ٹھنڈک پہنچانے کی زبردست خاصیت پائی جاتی ہے۔ امریکہ کے ریڈ انڈین اس کی اس تاثیر سے واقف ہوگئے تھے تاہم آج سائنس نے اس بات کا پتا چلالیا ہے کہ ایلوویرا میں نا صرف حیاتین کا ایک ذخیرہ ہے جو جلد میں سرائیت کر کے اپنا اثر دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ اس میں امینو ایسڈ خامرے اور بیٹا کیروٹین بھی پائے جاتے ہیں۔

الفلفا : اسے اسپین اور قدیم یونانیوں نے ایک جنرل ٹانک اور محرک کی حیثیت سے نئی دنیا سے متعارف کرایا۔ اب اسے ٹونر اور لوشن میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اسے بعض اوقات چہرے کے بعض حصوں میں پانی کی زیادتی کو کم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہولی بیسل : یہ ایک خوشبودار جڑی بوٹی ہے جسے تلسی بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ شروع ہی سے نظر بد سے بچنے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ اس کا آمیزہ جلد کو جراثیم سے تحفظ عطا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

لونگ : یہ ایئر فریشنر ہے۔ اس کے علاوہ جراثیم کش اور خوشبودار بھی ہے۔ یہ کسی حد تک منہ میں لہسن اور پیاز کی ناگوار بو کو دور کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ حسن کو نکھارنے میں بھی اس کا اہم کردار ہے۔

فینو گریک : یہ ہاضمہ کو درست کرنے کے لیے بے حد مجرب ہے لیکن کاسمیٹکس کی دنیا میں شیمپو کنڈیشنرز اور شہد کے آمیزے میں دانہ میتھی کا استعمال زیادہ اثر آفرین ثابت ہوا ہے۔ اگر اسے کھایا جائے تو یہ پیٹ کی اندرونی سطح کو نا صرف نرم و ملائم کرتی ہے بلکہ اس پر ایک لیس دار حفاظتی تہ بھی جما دیتی ہے اور اگر اسے کسی بھی سطح پر لگایا جائے تو یہ اتنی ہی موثر ثابت ہوتی ہے۔

لہسن : اس میں صرف ایک برائی ہے اور وہ ہے اس کی ناگوار بو لیکن یہ ہر مرض کے لیے اکسیر ہے بالخصوص یہ عمر میں اضافے کے ساتھ جلد پر نمودار ہونے والی جھریوں کے اسباب کا مکمل خاتمہ کر دیتا ہے۔ لہسن جھریوں کا مخالف جزو ہے تاہم اس حقیقت کی تشہیر نہیں کی جاتی اور کاسمیٹکس کی بہت کم مصنوعات اسے استعمال کرتی ہیں۔

جن سینگ : اس کے خواص میں جی متلانے سے لے کر حافظے کی کمزوری تک ہر مرض کے لیے معجزاتی شفا ہے۔ یہ کاسمیٹکس کی متعدد مصنوعات کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ اس کا استعمال خواتین کے لیے مضر بھی ہو سکتا ہے۔

جئی : اس میں جسم اور چہرے کے میل کو صاف کرنے کی زبردست تاثیر ہے۔ یہ وٹامن "ای" سے مالا مال ہے۔ اس کا استعمال بے رونق جلد میں نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک عمدہ اور راحت بخش موئسچرائزر ہے جو جلد کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔

کیلا : یہ پھل چہرے اور بالوں کے لیے زبردست ماسک ہے۔ اس میں بہت سی معدنیات اور حیاتین پائی جاتی ہیں جو کنڈیشنگ کے لیے بے حد موثر ہیں۔ یہ دنیا بھر میں موئسچرائزر کے طور پر سالہا سال سے استعمال کیا جارہا ہے۔

ناریل : اس کا تیل کثیر المقاصد ہے' چاہے اسے غذا کے طور پر استعمال کریں یا جسم پر اور بالوں میں لگائیں یہ ہر طرح سے بہترین ہے۔ کیرالہ کی عورتوں کی چکنی' چمکدار جلد اور سیاہ گھنے بالوں کا راز اس ناریل کے تیل میں مضمر ہے جہاں اسے نا صرف کھاتے ہیں بلکہ پورے جسم پر اس کی خوب مالش بھی کرتے ہیں۔

کھیرا : یہ سبزی تھکی ہوئی جلد کو سکون اور تازگی بخشتی ہے۔ اگر اس کی قاشیں چند منٹ تک آنکھوں پر رکھی جائیں تو یہ آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقوں کی سیاہی دور کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اکثر اس کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے کریم میں بھی استعمال کرتے ہیں جبکہ یہ جلد کے لیے بے حد مفید ہے اور ایک عمدہ حفاظتی موائسچرائزر ہے۔ جو جلد کو دھوپ کی شدت سے سیاہ پڑنے سے بچاتا ہے۔ یہ جلد کی رنگت نکھارنے میں بھی موثر ثابت ہوتا ہے۔

ٹماٹر : اس سبزی کا گودا قدرتی طور پر جلد اور بالوں کی صفائی کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ ایک بہترین کلینزر ہے۔ کچن میں موجود یہ ساری چیزیں بڑی آسانی سے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ تھوڑا سا عرق گلاب' دہی اور شہد لیں اور تینوں کی آمیزش سے ایک فیس پیک تیار کرلیں۔ یہ آمیزہ تھکی ہوئی جلد کو راحت بخشتا ہے۔ چہرے' جسم اور بالوں کو غذائیت پہنچانے کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ اسی طرح ٹماٹر' کھیرا اور گاجر کے عرق کو ایک ساتھ ملالیں اور اسے چہرے اور پورے جسم پر اچھی طرح ملیں۔ اس سے جلد کے کھلے ہوئے مسام بند ہو جائیں گے اور چہرے کی چکنائی میں بھی کمی آئے گی۔ یا پھر کیلے کو کچل کر اس میں دودھ' لیمن جوس اور پسی ہوئی جئی ملا کر ایک پیسٹ تیار کرلیں یہ جلد اور بالوں کے لیے عمدہ کنڈیشنر ہے۔

حالیہ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اگر ہم اپنی جلد کی حفاظت کریں تو ہماری جلد 80 سال کی عمر میں بھی بے داغ' چکنی اور بے شکن رہ سکتی ہے۔ دھوپ سے جلد کے ڈھلکنے اور اس پر شکن نمودار ہونے کا سبب یہ نہیں کہ یہ چیزیں ہمیں ورثے میں ملی ہیں بلکہ یہ ہے کہ دھوپ میں زیادہ رہنے کی وجہ سے ہمارے لچک دار ریشے جو جلد کو نرم و گداز رکھتے ہیں پہلے تو موٹے ہو جاتے ہیں اور پھر آنے والے سالوں میں رفتہ رفتہ غائب ہو جاتے ہیں۔ اس دوران ہماری جلد کی بالائی سطح یعنی ایپی ڈرمس ہمارے جسم کو نقصان پہنچنے سے بچانے کی کوشش کرتی ہے۔

ایک اہم مسئلہ جو سالہا سال تک ان دیکھا رہتا ہے وہ نقصان ہے جو باسل کی تہ کو پہنچتا ہے۔ یہ جگہ ڈرمس اور ایپی ڈرمس کے درمیان ہوتی ہے جہاں میلانو سائٹس واقع ہوتے ہیں۔ یہ میلانو سائٹس یا میلانن یعنی بھوری یا سانولی رنگت پیدا کرتے ہیں جو درحقیقت ہماری جلد کو سورج کی الٹرا وائلٹ شعاعوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگر میلانو سائٹس تباہ ہو جائیں تو وہ اپنے فنکشن کو تقسیم کرنے اور کنٹرول کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں اور جلد شکن آلود اور جھریوں والی ہو جاتی ہے۔

کولاجن جو ہماری جلد کو گداز پن عطا کرتا ہے جس سے ہماری جلد نرم و نازک نظر آتی ہے وہ بھی سخت ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے۔ جس کی وجہ سے جلد کی بالائی سطح اندر کی طرف مڑ جاتی ہے جس سے جھریاں' شکنیں اور سلوٹیں پڑنے لگتی ہیں لہٰذا اگر آپ اپنی جلد کو بے داغ' چکنی اور گداز رکھنا چاہتی ہیں تو ضرورت سے زیادہ دھوپ میں رہنے سے بچیں اور اپنی خوب صورتی کے تحفظ اوائل عمر سے ہی کرنا شروع کر دیں اور ان اجزا کے استعمال کو اپنا معمول بنالیں جن کا ہم نے یہاں تذکرہ کیا ہے۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شماروں کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

نہلے پہ دہلا

نازش صباحمید... خیرپور میرس

س اگر کوئی شادی شدہ مرد خواب دیکھے کہ وہ کنوارا ہے تو اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟
ج صبح بیوی کی شکل دیکھ کر اسے احساس ہوتا ہے کہ رات پھر اسی قسم کا خواب دیکھے گا۔

مسز افغان عثمانی چوہان... فیصل آباد

س دل اگر سمندر ہے تو اس میں مچھلیاں کیوں نہیں ہوتیں؟
ج دل کے سمندر میں مچھلیاں تو ہوتی ہیں، لیکن انہیں پکارا کسی اور نام سے جاتا ہے۔

عاصمہ نازلی، مصباح قریشی... کالا گوجراں

س سوئیٹ ذوقی بھیا؟ اگر لڑکیاں گھوڑے پر بیٹھ کر بارات لے کر آتیں اور لڑکے ڈولی میں بیٹھ کر جاتے تو کیسا رہتا؟
ج بہت عمدہ رہتا، بلکہ اگر ایسا ہو جائے تو بہت عمدہ رہے۔

روبینہ ظفر... کبیروالا

س اگر آپ کو فلم میں ہیرو کا رول مل جائے تو ولن کس کو منتخب کریں گے؟
ج ڈبل رول کروں گا۔

مسز سلامت علی... کراچی

س عاشق الو ہوتا ہے یا محبوبہ؟
ج دریافت کرنے پر پتا چلا کہ دونوں۔

سید مجتبیٰ خرم... بھکر سٹی

س نین جی! کیا آپ جیسے کسی اور آزاد آدمی کو زنجیر کی بجائے بیوی سے بھی باندھا جا سکتا ہے؟
ج ناممکن باتیں نہ کرو۔

مس شائستہ مظفر... فیصل آباد

س مجھے اپنی ساس سے جھگڑے کا بڑا شوق ہے۔ بتائیے کیا کروں؟
ج مس شائستہ! بی بی، پہلے شادی کرو۔

شبانہ آرزو... نوشہرو کینٹ

س بعض اوقات کسی چیز کا حصول مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ اور اسے پانے کی تمام خواہشیں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن اگر خلاف توقع یہ خواہش پوری ہو جائے تو؟
ج ہمارے نزدیک سونا چاندی ہو جائے۔

رفعت علیزئی... ڈیرہ اسماعیل خان

س بھائی جی، کہیں آپ بھی ان لوگوں میں سے تو نہیں مثلاً "جیسے اکثر عورتیں شٹل کاک برقعہ پہن کر لوگوں کے گھر میں جاتی ہیں، کیونکہ آج کل اکثر لڑکیاں آپ سے مشورہ مانگتی ہیں۔ آپ بھی میرے خیال میں بڑی پگڑی باندھ کر شروع ہو جائیے، کیا خیال ہے؟ شادی کروانے والے بن جائیے۔
ج آپ کہیں اور میں نہ مانوں۔

مسرت روحی... کراچی

س ذوالقرنین بھیا میری ایک سہیلی نے آپ کے بارے میں مجھ سے کہا کہ "نکمے آدمی کا سر شیطان کی دکان ہے۔" آپ بتائیے میں اسے کیا جواب دوں؟

ج اگر اس سے دوستی برقرار رکھنی ہے تو اس کی ہاں میں ہاں ملائے جائیے۔

شگفتہ بشیر بھٹی... کراچی

س زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کون سا پیٹرول استعمال کیا جاتا ہے؟
ج بی بی! تم جو اپنی زندگی کی گاڑی چلا رہی ہو وہ پیٹرول سے نہیں بلکہ دو وقت کی روٹی اور دو وقت کی چائے سے چل رہی ہے۔ ورنہ تم پیٹرول کے لیے لائن میں کھڑی ہوتیں۔

نسیم شیروانی... سمارو

س نین بھیا پہلی بار آپ کی بزم میں شرکت کر رہی ہوں، کیا اندر آنے کی اجازت دیں گے؟
ج بی بی میں تو خود باہر بیٹھا ہوں۔ اندر جانے کے لیے۔

یاسمین مرزا... سکھر

س بھیا یہ تو بتائیں روح نکلے تو جسم تڑپتا ہے، دل ٹوٹے تو آنسو نکلتے ہیں۔ احساس مرجائے تو کیا ہوتا ہے؟
ج بے حس ہوتا ہے۔

نصرت حسن انصاری... جھنگ

س اگر راہ چلتے کوئی بھکاری آپ کو یہ کہہ دے کہ دیکھیں نا تھوڑی دیر کے لیے میرا یہ کشکول پکڑلو، میں ذرا اس دکان سے پھل لے آؤں، پھر آپ کیا کریں گے؟
ج بی بی اس کا کشکول لے کر مسجد کی جانب رخ کروں گا اور اپنے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں کشکول رکھ کر اپنے لیے اور اس بھکاری کے لیے دعا مانگوں گا کہ خدا اسے نیا کشکول دلوا دے۔

طاہرہ شفیع... کراچی

س پاکستان کی ساری لڑکیاں دیکھ لیں، ایک بھی ڈھنگ کی نہیں؟ آپ ذرا افریقہ میں جا کر دیکھیں پاکستانی لڑکیوں سے کہیں بہتر نخرے میں دو ہاتھ آگے خوب صورتی میں پائیدار؟
ج واقعی آپ کے سوال کا جواب نہیں کیا پائیداری ہے آپ کے سوال میں؟

ن صباحمید... خیرپور میرس

س عورت کے مسکرانے اور پھول کے کھلنے میں کیا فرق ہے؟
ج کوئی فرق نہیں دونوں ہی وقتی ہوتے ہیں۔

رشنا کماری، بیلا کماری... کوٹری

س ذرا یہ بتاؤ شاعر ہمیشہ اپنے اشعار میں ذکر کرتے ہیں چاند سا مکھڑا، یا ستاروں جیسی آنکھیں، یہ بتائیے کہ جب چاند، ستارے پتھر ہیں تو پھر شاعر چاند سا مکھڑا کہنے کی بجائے پہاڑ سا مکھڑا، یا فرش سا چہرہ کیوں نہیں کہتا؟
ج بے چارہ صرف شاعر ہوتا ہے، سائنس دان نہیں۔

فرزانہ امیر... گوجرانوالہ

س بھیا کیا میں بھی فرضی نام لکھ کر آپ سے سوال پوچھا کروں، کیونکہ آپ فرضی نام والی بہنوں کے

خطوط کے جواب دیتے ہیں اور ہمارے چالیس پیسے کردیتے ہیں ضائع آخر ایسا کیوں جلدی ہو گیے؟

ج یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ فرضی ناموں والی صرف بہنیں ہی ہوتی ہیں۔

بی فاطمہ۔۔۔۔ کراچی

س زلفی' اگر دنیا کے سارے مرد تمہارے جیسے ہو جائیں تو کیا ہو گا؟

ج شہر میں دن کے وقت صرف عورتیں گھوما کریں گی۔

آر رانا بوبی۔۔۔ سیالکوٹ

س عشق کا بھوت کب اترتا ہے؟

ج میری اچھی سی بہن' بھوت جب چڑھ جاتا ہے' تب جیسے تم پر۔

شہلا نگار ڈار۔۔۔ فیصل آباد

س بدتمیزی کی حد کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہ ختم ہوتی ہے؟

ج آپ کے سوال سے شروع ہو کر میرے جواب پر۔

عرفانہ واثق۔۔۔۔ کراچی

س ذوقی بھیا! پچھلے ماہ تم کیا آنسوؤں کی گہرائی ناپنے کسی جھیل میں اتر گئے تھے یا پھر فضا میں بادلوں سے ملنے گئے تھے؟

ج گلاس میں بھرے اپنے چند آنسوؤں کو جھیل کی گہرائی کہتی ہو۔

شازیہ ثمین۔۔۔ تاندلیانوالہ

س نین بھیا ذرا یہ تو بتائیں کہ آپ کے کھانے میں کون سا مسالا شامل ہوتا ہے جو آپ کے جوابات اتنے چٹ پٹے ہوتے ہیں؟

ج میرا کھانا ہر قسم کے مسالا جات سے پاک وصاف ہے۔

ملکہ افروز روہیلہ۔۔۔۔ کراچی

س انسان پہیہ کی مانند چکر میں رہتا ہے۔ زیست کا چکر' لوگوں کو مسکراہٹیں دینے کا چکر اور پتا نہیں کتنے چکر جو انسان کو چکر دے کر خود رفو چکر ہو جاتے ہیں' آخر کہاں؟ بتانا پسند کریں گے آپ؟

ج بی بی' آپ کا اتنا چکردار سوال پڑھ کر مجھے تو خود چکر آنے لگے۔

روبینہ جبیں۔۔۔۔۔ لاہور کینٹ

س : اب پتا چلا ہمارے سوال کہاں گول ہو جاتے ہیں یہ سب عینک کا کیا دھرا ہے ہمارے جواب عینک اتار کر دیا کرو؟

ج : سوال ہی نظر نہیں آرہا۔

س : اوہو یاد آیا کہ تمہاری شکل شریف کافی جانی پہچانی معلوم دیتی ہے دراصل تمہاری صورت ہمارے سابقہ نوکر سے کافی ملتی جلتی ہے جو پچھلے اپریل سے غائب ہے کہیں تم وہی تو نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو تم فوراً" پہنچ جاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا؟ بلکہ تمہیں نوکری پر دوبارہ بحال کر دیا جائے گا؟

ج : مسمی ذوالقرنین کو اس خط کے ساتھ واپسی کا کرایہ نہیں ملا اسی لیے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا جا رہا۔

شازیہ تاج۔۔۔۔۔ جیکب آباد

س : دل ٹوٹ جائے تو جینے کا مزا چلا جاتا ہے اور اگر کسی کا اعتماد ٹوٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟

ج : پانی پینے کا مزا چلا جاتا ہے۔

حنا یوسف۔۔۔۔۔ گجرات

س : سنا ہے اگر کالی بلی سامنے سے نکل جائے تو برا ہوتا ہے اگر کالا آدمی نکل جائے تو کیا ہوتا ہے؟

ج : اچھا ہوتا ہے۔

س : فرض کیجیے آپ کو پوری دنیا کی حکومت اور بادشاہی مل جائے تو آپ سب سے پہلے کیا کریں گے؟

ج : فرض ہی تو نہیں کر سکتا۔

☼ ☼

اقصیٰ اکرم چدھڑ۔ چک نمبر 19 جنوبی

اپریل کے شمارے کا جس شوق سے انتظار تھا اور ان انتظار کے گھنگھروؤں کی چھنکار کا جو ربط "اورے پیا" سے ہے بالآخر پورے دس ماہ ایک سحر میں مبتلا ہونے کے بعد اور پورے دس ماہ کا بھرپور تبصرہ لیے کرن کی بزم میں حاضر ہوں۔

اپنی تمام تر فطانت اور فراست کا نچوڑ جو آخری چار قسطوں میں دیکھا اسے الٹ پایا۔ ذہن و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حریم کی محبت کو زوباریہ کے جنون اور عشق کا گرہن لگ جائے گا۔ تاحال خود کو بے بس پا رہی ہوں' بہت مشکل میں ہوں' بہت سحرزدہ ہوں' لفظ بہت ہیں پر لکھنا کبھی اتنا بھاری نہیں لگا۔

"اورے پیا" ایک خوب صورت شاہکار' مصنفہ کی محنت اور دل سے لکھے گئے لفظوں کا نچوڑ' قارئین کی دلوں کی دھڑکن' مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ "اورے پیا" اپنی اختتامی منزل تک پہنچ گیا ہے۔ اگلے ماہ ہماری نظر سے نہیں گزرے گا۔ مگر سالوں کبھی ذہن سے نہیں مٹے گا۔

اس تحریر میں مجھے محبت کا ایک نیا "باب" پڑھنے کو ملا ہے۔ اس شاہکار ناول میں چار قسم کے مختلف لوگوں کی محبت کو مختلف انداز میں دکھایا گیا ہے۔ ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا گیا ہے۔

زرجان عباس کی خاموش' پاکیزہ محبت کا ایک دلفریب رخ' وہ صبر میں لپٹی محبت جو اسے وصل کی سرشاری سے نواز گئی۔

ماہیر جس کی وفا اور محبت کو کسی "جنون خیز" کی نظر کھا گئی۔

حریم جس نے ایثار اور قربانی کے جذبے پر محبت کو قربان کیا۔ حریم کا ایثار' حریم کی ماہیر سے جدائی کے وہ مکالمے' وہ لفظ' وہ دکھ جس سے حریم گزر رہی تھی دھیرے دھیرے پلکیں نم کرتے گئے' آنسو گرتے رہے' صفحے پلٹتے رہے' لفظ بکھرتے گئے۔

زوباریہ' جس کے عشق کی انتہا جان کر بے اختیار گزشتہ قسط پڑھنے کے بعد دعا نکلی کہ کیا فرق پڑ جاتا جو "زوباریہ کو ماہیر مل جاتا" خواہش تو پوری ہوئی' دل سے اٹھتی صدا پوری ہوئی۔ بالآخر ایک طویل انتظار کے بعد زوباریہ نے حریم کے ماہیر عالم کو حاصل کر لیا۔

اب اپنی دعا کی قبولیت پر روتے یا ماہیر اور حریم کی جدائی پر؟ آخر یہ دعا خود بخود لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ حریم نے ایک نسل کی بقا کے لیے' اپنے باپ کی عزت اور حانی کی معصومیت کو بچانے کی خاطر محبوب شوہر کی محبت کا صدقہ دیا۔۔۔۔ حریم جمال کے ایثار نے ابھی تک پلکوں کو نم کر رکھا ہے۔ عفیفہ کے طویل دکھوں کا انعام شاہنواز کی صورت میں طبیعت کے بوجھل پن کو خوشگوار کر گیا۔

نیب عالم نے بالآخر "وہ" پا لیا جس کی اسے تلاش تھی۔ اسے رب تعالیٰ کی محبت کا قرب ملا' اسے دنیا کے جھنجھٹوں سے آزادی مل گئی۔ نیب کے زوباریہ کے لیے وہ الفاظ ابھی تک ذہن میں نقش ہیں۔

"کانچ کے شہر کی عورت کا کشکول بھرا اور وہ پھر بھی خالی رہی۔ خالی کر دینے والے ہمیشہ خالی رہتے ہیں۔"

اگرچہ "اورے پیا" کا اختتام ہو چکا ہے مگر سالوں بعد ایسی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں اور ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ گزشتہ سال "عشق آتش" اور اس سال "اورے پیا" بازی لے گیا۔

اکثر قارئین کو اس ناول کی طوالت کی شکایت تھی اور میں کہتی ہوں اس کی دس اور قسطیں بھی میرے لیے ناکافی ہیں۔ میں نے محبت پر اتنی خوب صورت' نفیس اور مضبوط لفظوں سے سجی تحریر آج تک نہیں پڑھی۔

بہرحال مصنفہ کو بے حد مبارک باد۔

اب اگر "دردِل" پر تبصرہ نہ کروں تو "دردِل" کے

کرداروں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ایک خوب صورت پلاٹ پر لکھی گئی تحریر' مصنفہ کی محنت اور کہانی پر گرفت انیس قسطیں گزر جانے کے بعد بھی ڈھیلی نہیں پڑی۔ علیزے کی معصومیت' اس کے باپ کی علیزے کے لیے محبت' فکر' شفقت اس گھڑی کے آنے کا خوف جگا رہی ہے جو آفندی ولا پر بہت بھاری ہوگی۔

دل آور کے کردار کی مضبوطی' اس کا غصہ' اس کی انا پرستی سب بہت دل کو بھاتی ہے۔

عدیل کی مشقت بھری بھاگ دوڑ کا کب اختتام ہوگا؟ اسے ورکشاپ سے کب نجات ملے گی؟ مدیحہ اور عدیل اگر ساتھ ساتھ ہوں تو کیا مضائقہ ہے؟ زری سچ مچ کسی دلدل میں اترنے والی ہے؟ مصنفہ کا اشارہ خطرے کا الارم بجا رہا ہے۔

منصور حسین علیزے کا حقیقتاً "محافظ بنے گا؟ تاحال الجھن برقرار ہے۔ جودت' مریم کے ساتھ کون سا کھیل کھیلے گا؟ یہ الجھی گتھی ابھی نہیں سلجھی۔ مومنہ کا قصہ کیا ہے ———— کومل کو آذر ملے گا یا نہیں؟ اس بحث میں نہیں پڑیں گے۔ بہرحال کومل کا حسد کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا۔

حویلی والوں پر اگلی قسطیں بہت بھاری معلوم ہوتی ہیں چونکہ مصنفہ کرداروں کی وضاحت کے قریب قریب پہنچ چکی ہیں البتہ ابھی گتھیاں ابھی سلجھنے سے بہت دور ہیں۔ یہ قسط گزشتہ قسطوں کی طرح بہت جاندار رہی۔ یقیناً "نبیلہ کا یہ ناول بہت شاہکار ثابت ہوگا اور دل آور کے لیے آخر میں نیک تمنائیں۔ مجھے مضبوط کریکٹر ہمیشہ سے بہت پسند رہے ہیں۔

جہاں تک بات "مقید خاک" کی ہے تو آخری قسط میں غیر فطری' اچھوتی' منفرد اور بے حد چونکا دینے والی حقیقتوں سے پردہ اٹھنے پر ابھی تک ورطہ حیرت میں مبتلا ہوں۔ مریاقس کا معاملہ بہت دل چھو لینے والا تھا۔ تحریر کی مضبوطی' مصنفہ کی گرفت کرداروں پر خوب مضبوط رہی۔

فوزیہ کو تاحال نہیں پڑھا۔ اس کے لیے کچھ کہوں گی نہیں۔ سلوی علی بٹ کی تحریر خاصی متاثر کن تھی۔

آخر میں وہ لوگ جو بھرپور محبت اور محنت سے تحریر کو سجاتے ہیں اور وہ لوگ جو کرن کو اتنی ہی محبت اور لگن کے بعد ہم تک پہنچاتے ہیں' سب کے لیے سلام محبت۔

آئمہ سید..... کوٹ مومن

اپریل کا شمارہ بیس کو ملا انتہائی لیٹ بے حد تاخیر کے ساتھ۔

اپریل کے شمارے سے بہت سی امیدیں' توقعات اور انتظار وابستہ تھے۔ پربتوں کی چڑھائی جیسا کٹھن انتظار' سرما کی ٹھٹھرا دینے والی سردی اور گرما کی پگھلا دینے والی گرمی جیسا انتظار۔

بالآخر بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ انتظار کی گھڑیوں کا اختتام ہوا۔ جو فروش گندم نما (فریبی) تھے ان کی اصلیت سے پردہ اٹھا "اور ے پیا" میں موجود رشتوں' ناتوں کی گرہیں کھلیں' عکس واضح ہوئے' نقش واضح ہوئے' چہرے واضح ہوئے۔ محبتوں کے امین ایثار کے جام اٹھا کر خاموش ہو گئے۔ جنون عشق کے بانی ایک بپھرے طوفان سے گزر کر پھر بھی دل میں کسک لیے ہی رہے۔ ایسے لوگ' ایسے کھلاڑی جو اپنا داؤ جیت گئے تھے پھر بھی خالی ہاتھ اور ناکام رہے اور جو جیت کر ہار رہے تھے وہ پھر بھی جیتے ہی گئے۔

بالآخر زوباریہ کی نگاہ کے حسد نے حریم اور ماہیر کی راہیں جدا کر ہی دیں ماہیر نے زوباریہ کے عشق کی گرماہٹ کو محسوس کر کے سر تسلیم خم کر ہی دیا مگر سوال یہ اٹھتا ہے بھلا حریم کی محبت میں بس اتنی سی طاقت تھی جو ذرا سی ضرب سے وہ حصار ٹوٹ گیا' ماہیر اس سے بدگمان ہوا' دل بدل گیا' راہ بدل گیا۔

شاید وہ حالات ایسے تھے' وہ وقت ایسا تھا' وہ لفظ ایسے تھے جو حریم کے منہ سے نکلے تھے اور ان لفظوں کی تلواروں نے ایک حالات کے مارے ایک مجبور و بے بس پریشان حال اندرونی طور پر ٹوٹے بکھرے آدمی کو حریم سے بدگمان کر دیا ایسا کچھ ناممکن تو نہیں تھا؟

جدائی؟ وہ جدائی جو ان دونوں کے درمیان ازل سے کھڑی تھی۔ وہ لفظ جنہوں نے ماہیر کو حریم سے جدا کر دیا ان لفظوں کی طاقت درد اور آنسوؤں نے کتنا رلایا؟ اسے لفظوں میں بتایا جا نہیں سکتا۔ ابھی تک انہی لفظوں کے حصار میں ہوں۔ یہ سحر ابھی تک قائم دائم ہے۔

اس سال کی بہترین تحریر اور ے پیا کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ میں نایاب باجی کو اس خط کے توسط سے ڈھیروں مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔

"دردل" جس کے بارے میں پیشگی پیش گوئی کرنا قطعاً مناسب نہیں۔ ناول رواں دواں ہے۔ بہت سلیقے قرینے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بہت خوب صورتی سے مصنفہ اسے پرت در پرت کھولنے کی کوشش میں ہیں۔ میرا

فیورٹ کردار زری اور علیزے ہے۔

"دست کوزہ گر" میں خرم اور نمل کے ہمیشہ سے میرے پسندیدہ رہے ہیں مصنفہ سے گزارش ہے ناول میں تیزی لائیں۔ زوبی بے چاری کے حال پر بھی رحم کھائیں آخر کب تک وہ اس خوف کے حصار میں رہے گی؟ ایک جیسی باتیں' ایک جیسا خوف اب کچھ تو نیا پن دکھانا چاہیے آخر کب تک اس روح کے قصے پر پردہ پڑا رہے گا۔

زوباریہ ساحر نے بھی بہت بہترین تحریر لکھی۔ ہر ہر لفظ دل میں اتر گیا۔ یہ سچ ہے اس جہان میں کچھ بھی انوکھا نہیں ہے مریاقس کے ساتھ ہونے والا ظلم اور وہ سحر کی وجہ سے محسوس کیا جانا اس تکلیف وہ عذاب کے بارے میں پڑھ کے مجھے میری باجی کی ایک ٹیچر یاد آ گئی تھیں۔ حاسدوں کے سحر نے انہیں بھی زندہ درگور کر دیا تھا۔ بلاشبہ ایک اچھی تحریر لکھی ہے زوباریہ نے۔ باقی ناولٹ' افسانے سب اچھے تھے آخر میں کرن کے لیے دعائیں۔

اقرا مظفر' عنیزہ مظفر..... چھوکر خورد ضلع گجرات

میں کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی کہ دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھلا اور عفی (چھوٹی بہن) کمرے میں داخل ہوئی۔

"آنکھیں کھولو اقرا۔" میں اس کی آواز پہ ٹس سے مس نہ ہوئی کہ اپنے حصے کا کام بھی میرے سر پہ ڈال دیتی تھی اور میں مسکین مروت کی بندی تھی خاموشی سے اس کے حصے کا کام بھی کر ڈالتی' شاعر نے شاید میرے لیے ہی کہا ہے۔

مروت کا بندہ ہوں عادت سے مجبور ہوں

خیر اس نے مجھے جھنجھوڑ کے اٹھایا اور میرے سامنے کوئی چیز لہرائی اور میں جو مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی حیرت سے میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں تڑپ کے اٹھی مگر وہ ہنستی ہنستی اسے پیچھے کر گئی۔ خیر پھر ہم دونوں نے اکٹھے ہی اس کو پڑھا کس کو بھلا؟؟ بھئی کرن کو اور کس کو۔

ٹائٹل گرل اپنی معصومیت کے باعث دل میں اتر گئی اب آتی ہوں سلسلے وار ناولوں کی طرف۔

"دردل" کیا بات ہے نبیلہ آپی آپ کی منصور حسین کا کردار زبردست ہے ویسے آپس کی بات ہے مجھے تو کافی میسنا لگتا ہے کومل مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگتی اور جودت کی تو کیا ہی بات ہے اینڈ زری ڈیئر میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔

فوزیہ جی "دست کوزہ گر" میں تیزی لائیں ورنہ تو یوں چل رہی ہے جیسے ہمارے چاچو کی پھٹیچر اسکوٹر۔ مائنڈ مت کیجیے گا۔ تھوڑی رفتار بڑھائیں ویسے مجموعی طور پر کہانی زبردست ہے اب دیکھتے ہیں رومیلہ بی بی کا کیا بنتا ہے؟ یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ میری تین سالہ خاموشی کو توڑنے کی وجہ کون سی کہانی بنی (ذرا سوچیں تو) چلیں بتا دیتی ہوں۔

میری موسٹ فیورٹ رائٹر نایاب جیلانی کی کہانی رسالے کی جان "اور ے پیا" اف کیا بتاؤں نایاب آپی آخری قسط میں آپ نے ہمیں کتنا رلایا ہے۔ اس وقت تو میں پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی جب حریم' ماہیر سے ملنے جاتی ہے اور مجبوراً "تلخ گوئی کرتی ہے میں یہ گلہ نہیں کروں گی کہ آپ نے ماہیر کو حریم سے کیوں جدا کیا۔ کیونکہ اسی میں کہانی کا چارم تھا اور زرجان کو بھی تو اس کی خاموش محبت اور صبر کا انعام ملنا تھا حریم کی صورت۔

تبصرہ تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ ویسے انیقہ انا' عمر جہانگیر سے آپ کی محبت قابل رشک ہے ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ آپ سے بھی کوئی عمر نامی اور ایسی ہی خصوصیات کا حامل بندہ ٹکرا جائے (آمین) ارے مدیرہ آنٹی آپ تو ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی ہیں' بھئی جا رہی ہوں' اس سے پہلے کہ آپ ہمیں دھکے دے کر یعنی (خط کو ردی) میں پھینک کر اس محفل سے نکالیں ہم شرافت سے آپ کو اللہ حافظ کہتے ہیں۔

ان شاء اللہ آئندہ اپنے تعارف اور تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی بشرطیکہ یہ خط شائع ہوا تو علاوہ ازیں..... ہم بھی ڈھیٹ بنت ڈھیٹ ہیں۔ (فی امان اللہ)

گل زرینہ..... جودھ پور خانیوال

ایک خاموش قاری کی حیثیت سے کرن ہمیشہ میرے زیر مطالعہ رہا ہے لیکن جس طرح تڑپ کر کاغذ قلم سنبھال کر کرن میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اس کی وجہ "اور ے پیا" بنا ہے۔ جس طرح نایاب جیلانی نے شادی شدہ محبت کرنے والے جوڑے کو الگ کیا ہے۔ میرا دل کرلا رہا ہے اور مارے دکھ کے آنکھوں سے آنسو ہی نہیں رک رہے۔ حریم کا جوڑ زرجان سے بنا کر اور ماہیر کو زوباریہ کا بنا کر کتنا درد ناک اینڈ کیا ہے۔ کیا واقعی حریم اور ماہیر اس کے حق دار

تھے اور پھر زوباریہ کو ماہیر محبت سمیت دے کر نایاب جیلانی نے قاری بہنوں کو تڑپا دیا ہے۔ زوباریہ کو اولاد کا نہ ملنا ایسی عبرتناک سزا تو نہیں جیسی سزا حریم اور ماہیر کو ملی۔ اگرچہ دل کو دھڑکا تو تھا کہ ان دونوں کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ لیکن حریم' زرجان کی اور ماہیر' زوباریہ کو ملے گا یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

عورت ذات ازل سے ابد تک اپنے گھر کو بچانے کی کوشش کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی اور اپنی محبت قربان کرکے بھی اپنے سہاگ کو اپنانے اور بچانے کی کوشش کرتی ہے زوباریہ جیسی عورتوں کو تو عبرتناک سزا ملنی چاہیے۔ محبت' محبوب کا ملنا تو نہیں ہوتا محبت تو ہر حال میں زندہ رہتی ہے چاہے محبوب ملے یا نہ ملے۔ بہرحال نایاب جی کا یہ ناول مدتوں یاد رہے گا۔

ضوباریہ ساحر کا ناول "مقید خاک" بھی آخر اختتام پذیر ہوا۔ اختر کی موت جس کا بہت پہلے سے یقین تھا کہ اختر کو کچھ ہو گا اور وہ واقعی مر گیا مہر جی کا اقرار محبت' آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ یہ ناول شروع سے آخر تک ایکشن سے بھرپور تھا۔ اس کا ٹرینڈ بالکل جاسوسی ناولوں کی طرح تھا۔

"دردل" بھی آہستہ آہستہ آگے کی طرف رواں دواں ہے۔ سلویٰ بٹ کا مکمل ناول "کچھ رات کٹے" عورت کی ممتا کی بھرپور عکاسی کرتی ہوئی تحریر تھی۔ بہت اچھا لگا۔ عورت میں ممتا اللہ تعالیٰ کا وہ عطیہ ہے۔ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" بھی اپنی کھٹی میٹھی باتوں اور لڑائیوں کو لے کر بہت اچھا چل رہا ہے۔ بے چاری رومیلہ کو اپنے بھائی کے کیے کا تاوان بھرنا پڑے گا۔ لیکن یہ آج سے نہیں صدیوں سے ہو رہا ہے عورت ہی تاوان بھرتی آرہی ہے چاہے وہ رشتے کی کسی بھی شکل میں ہو۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔ لیکن ماہ اپریل کے کرن کی ہر کہانی کا اختتام آنسوؤں پر جا کر ختم ہوا۔ اس دفعہ شمارے میں ایسی کہانیاں شامل تھیں جس نے دکھ اور آنسو دیے یا میرا دل بہت حساس ہے۔ کوئی بھی ناول یا ناولٹ ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ بلکہ تمام ناول اور ناولٹ نے دل پر گہرا اثر کیا۔ امید ہے کہ میرا پہلا خط شمارے کی زینت ضرور بنے گا تمام اسٹاف اور مصنفین کو میرا سلام۔

فوزیہ ثمروٹ ..... گجرات

اٹھارہ تاریخ کو کرن ہاتھ میں آیا۔ سادہ سے بیک گراؤنڈ والا سرورق موہو ہی تھا۔ حسب عادت اک سرسری نگاہ انٹرویوز پہ ڈالی۔

"دو کا پہاڑا" میں سلیم معراج سے ملاقات اچھی رہی۔ "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" میں ایک پاورفل کردار کو بہت خوب صورتی سے نبھا رہے ہیں۔

تمام انٹرویوز کو جلدی جلدی پڑھنے کے بعد دوڑ لگا دی فیورٹ ناول کی طرف۔ نایاب جی سب سے پہلے تو بہت بہت مبارک ہو آپ نے ناول کا بہت خوب صورت اختتام کیا ہے۔ ہر کردار کے ساتھ انصاف ہوا ہے۔ تمام قارئین بہنیں تمام اقساط میں یہی کہتی رہیں کہ ماہیر اور حریم کو جدا نہیں ہونا چاہیے۔ مگر رائٹر صاحبہ نے کہانی کو کچھ اس انداز سے موڑا ہے۔ حریم ہمیشہ سے ایک اچھی بیٹی، بہن' بیوی رہی تھی۔ تو وہ کیسے ایسے نازک حالات میں اپنی بہن کو اکیلا چھوڑ سکتی تھی۔ میرے خیال میں ہر کردار نے ایک دوسرے کا خیال رکھا۔ زوباریہ نے اگر نو سال اپنے رب سے ماہیر کو مانگا تو حالات جیسے بھی ہوں بے شک زوباریہ کا طریقہ غلط تھا۔ مگر اس نے ماہیر کو پا لیا۔ زوباریہ نے وہی کیا جو اس کا دل مانگتا تھا اور پھر زرجان بے چارے کو بھی تو خاموش محبت کا صلہ کسی طریقے سے ملنا ہی تھا۔ حریم نے اچھا فیصلہ کیا تنہا رہ کر زندگی کو جامد کرنے سے بہتر تھا کہ وہ زرجان کی زندگی میں بہار لے آتی۔ مگر یہ کسک زوباریہ کے ساتھ ہمیں بھی رہ گئی کہ اتنے دلوں کو دکھی کرنے والی زوباریہ ہمیشہ اولاد کے نہ ہونے کا دکھ سہتی رہے گی۔

ماہیر ایک مرد مومن اپنے قول و فعل کا سچا۔ اس نے زوباریہ سے وفا کی وفا نبھائی مگر زوباریہ نے جو کچھ کیا۔ بدلے میں بے اولادی کا دکھ بھی دے دیا۔ اب اتنے درد کی حق دار تو ہے نا زوباریہ بیگم۔

"مقید خاک" اچھا ہوا یہ تحریر سمیٹ لی گئی۔ کہانی کا اینڈ بھی کوئی خاص متاثر نہ کر سکا۔

ناولٹ میں "بار محبت" اچھی کہانی تھی۔ بہت عرصہ بعد کوئی کہانی پڑھ کر مزا آیا۔ ماہی اور آفاق کی مزے دار لڑائیاں اور قہقہے لگانے والے جملے۔ سبھی کچھ اچھا تھا۔

افسانے سب ہی اچھے تھے مگر "تھکن" اچھا لگا۔ مستقل سلسلے اچھے جا رہے ہیں۔ شاعری میں سب کے شعر پسند آئے۔ مسکراتی کرنیں اس بار بھی اچھی تھیں۔ حسن

صحت' کرن کا دسترخوان کیا اس کی جگہ کچھ نیا نہیں شروع ہو سکتا۔ نامے میرے نام میں نئے ناموں کا اضافہ اچھا لگا۔ اجازت چاہوں گی۔ اس امید کے ساتھ خط پسند آیا تو شامل کر لیجیے گا سب کو سلام دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

شگفتہ ناز ..... گوجرانوالہ

سب سے پہلے ہم کرن کے مشکور ہیں کہ اس نے اپنے پرانے قارئین کے ساتھ ساتھ نئے آنے والوں کو بھی اچھے طریقے سے خوش آمدید کہا۔ کرن کی تمام ٹیم کا بہت بہت شکریہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کرن کے اس شمارے میں اپنے خط کو دیکھ کر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اب خود کہانیوں کی طرف آتے ہیں سب سے پہلے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ماہ کے شمارے میں تمام کہانیاں موجود تھیں۔ اس کے بعد سب سے پہلے ہم نے "مقید خاک" پڑھا ضوباریہ ساحر صاحبہ نے اس کا اختتام تو بہت اچھا کیا مگر اختر کی ڈیتھ نے دل ہلا کر رکھ دیا۔ ضوباریہ جی کیا تھا اگر اختر مرنے سے پہلے مہر جی کا اظہار محبت سن لیتا۔ دوسرے نمبر پر "اور رے پیا" پڑھا' نایاب جیلانی سے ہمیں شکوہ ہے کہ آپ نے ماہیر عالم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ کیا کمی تھی اس کی محبت میں جو اسے زوباریہ سے ملا دیا۔ یقین جانیں اتنی خوشی حریم اور زرجان کے ملاپ کی نہیں ہوئی جتنا دکھ ماہیر سے حریم کی جدائی کا ہوا ہے۔ ہمارے تو آنسو ہی رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ والدہ محترم سے علیحدہ ڈانٹ پڑی یہ دونوں کہانیاں پڑھنے کے بعد دل کچھ ایسا افسردہ ہوا کہ باقی کے ڈائجسٹ کو اگلے دن کے لیے چھوڑ دیا۔ اس ماہ کے لیے اتنا ہی باقی اگلے ماہ' خدا کرن کو ایسے ہی دن دگنی رات چگنی ترقیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

آسیہ اکبر ہاشمی ..... بھکر

اپنے دلی جذبات کو لفظی شکل دینے سے پہلے آپ سے نہایت ادب سے پوچھنے کی گستاخی کر رہی ہوں۔ جو ہم نے ناولٹ افسانے وغیرہ بھیجے کیا وہ شائع ہونے کے لائق ہیں یا نہیں ضرور بتایئے گا کیونکہ ہر مہینے بے صبری سے ایک ایک دن کاٹنا کتنا مشکل ہے اور ڈائجسٹ ہاتھ میں آنے کے بعد اپنی کسی تحریر کو موجود نہ پا کر دل کے ٹوٹنے کا لمحہ بھی بہت اذیت ناک محسوس ہوتا ہے پلیز ہمارا دل بہت نازک واقع ہوا ہے آپ رحم کیجیے۔

اب آتے ہیں تبصرے کی طرف' کرن ماشاء اللہ لاجواب ہے' جب رسالہ ہمیں ملتا ہے اور پڑھنے تک یقیناً" اگلے مہینے کا رسالہ چھپائی کے آخری مراحل میں ہوتا ہو گا لہٰذا صرف سلسلہ وار ناول کی بات کرتے ہیں نایاب جیلانی صاحبہ کا "اور رے پیا" اپنی دلچسپی کھونے کے قریب تھا کہ نئے نئے موڑ آنے پر ہمیں پھر جکڑ گیا۔ امید نہیں تھی کہ نایاب کہانی کا اس طرح اینڈ کریں گی۔ زبردست نایاب جی اور "مقید خاک" تو ہمیں جیسے بھکر کی سرزمین سے اٹھا کر سپنوں کی ڈراؤنی دنیا میں لے گیا۔ ضوباریہ ساحر صاحبہ ہمیں بھی اس طرح زبردست اور خوب صورت لکھنے کا کوئی گر بتا دیجیے ..... اللہ تعالیٰ کرن کو مزید دن دگنی رات چگنی ترقی دے آمین۔ کرن فاطمہ ..... قصور

سب سے پہلے ہماری پیاری رائٹر نایاب جیلانی کو سالگرہ مبارک۔ دس اپریل کو ان کی سالگرہ تھی۔ دلی دعا ہے کہ اللہ انہیں خوشیوں سے بھرپور مسکراتی لمبی عمر عطا کرے۔ (آمین) خط لکھنے کی بنیادی وجہ یقیناً" ناول "او رے پیا" ہے۔ تبصرہ کیا جائے نیوٹرل ہو کر تو نایاب چاہتیں تو اسے 5 قسطوں میں مکمل کر دیتیں۔ شروع میں رفتار آہستہ تھی پر آخر میں بہت جلدی میں سمیٹا گیا' مجھے تو یہ ہی محسوس ہوا انہیں تھوڑی میانہ روی کی ضرورت تھی ناول شان دار تھا۔ جس طرح نایاب نے ہر ایک کے جذبات نہایت خوب صورتی سے بیان کیے وہ واقعی قابل تعریف ہیں۔

حریم کا ایثار اور اعلا ظرفی قابل رشک تھی۔ حریم کا زرجان سے اور عفیفا کا شاہنواز سے جوڑ بہت مناسب تھا لیکن چپکے سے کہیں دل نے ماہیر کے لیے بھی دہائی دی خیر تقدیر میں جو لکھا جا چکا ہے کون روک سکتا ہے؟ بس خدا سے دعا ہے کہ زوباریہ جیسی زندگی کسی کو عطا نہ ہو جس میں کہیں نہ کہیں خلا رہ جائے۔ وہ بھی اپنی فطرت سے مجبور تھی ایسا جنون کسی کو بھی نہ میسر ہو جو اپنے آپ کو جلانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی راکھ کرتا ہے۔ جہاں عشق کے قابل خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ جیسی ہستی موجود ہو وہاں کوئی بھی مٹی سے بنا شخص اس قابل نہیں کہ اس کی پوجا کی جائے جیسی زوباریہ نے ماہیر کی کی۔

منیب عالم کی پیش گوئیاں ہی ناول کی بنیاد تھیں۔ آخر

میں اینڈ مناسب تھا۔ مجھے مجموعی طور پر نایاب جیلانی کا استعارہ کا استعمال' طرز تحریر اور محسوسات کو بیان کرنا بہت متاثر کر گیا جو ان کے ہر ناول کا خاصہ ہوتا ہے۔

کرن سے ریکویسٹ ہے کہ وہ سلسلہ "مجھ سے ملیے" میں نبیلہ ابر راجہ' فرحانہ ناز ملک' نازیہ کنول نازی سے جلد ملاقات کرائیں اور پلیز "دردل" اور "دست کوزہ گر" کے صفحے بڑھادیں ان کا بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہے۔ تشنگی رہتی ہے انیقہ انا کے تبصرے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ ام طیفور آپ کا ایک افسانہ پڑھا تھا اچھی کاوش تھی۔ بقیہ افسانے اور ناولز مصروفیت کے باعث پڑھ نہ سکی تو تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ اجازت دیں اس دعا کے ساتھ اللہ پاک تمام رائٹرز اور قارئین کو بچی خوشیاں نصیب کرے اور کرن مزید ترقی کے مدارج طے کرے (آمین)

ثنا نوید...... کراچی

میں پچھلے آٹھ سال سے کرن پڑھ رہی ہوں۔ پہلی بار جس کہانی نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ نایاب جیلانی کی "او رے پیا" ہے نو مہینے سے اس کہانی کے الفاظ نے مجھے اپنے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔

حریم اور ماہیر کی محبت' ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ بالکل حقیقت کا روپ دھارے ہوئے تھے' لیکن آخری قسط کو پڑھ کر ایک جھٹکا سا لگا کہانی کا انجام ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ زوباریہ نے آکر ایک ہی جھٹکے میں سب اپنے نام کرلیا ماہیر اور حریم کی محبت بالکل کمزور نکلی حانی کو اغوا کیا تو اس کے گھر والوں یا حریم نے زرجان عباس سے مدد نہیں مانگی زرجان کا اثر ورسوخ ماہیر کے کام بھی نہ آیا۔

میری نظر میں اس کہانی کو شروع سے اتنا حقیقی روپ میں دکھانے کے بعد انجام انتہائی ڈرامائی کردیا۔

بس اس کہانی نے ہی مجھے لکھنے پر مجبور کیا ورنہ میں کرن کی خاموش قاری ہوں۔ سارے سلسلے بہت اچھے ہیں اور کرن ایک بہترین ڈائجسٹ ہے۔ امید ہے کہ میرا خط ردی کی نذر نہیں ہوگا۔ ان شاءاللہ آئندہ بھی تبصرہ کروں گی کوئی غلطی ہوگی ہو تو معافی کی طلب گار ہوں۔ اپنی محفل میں ضرور جگہ دیجیے گا۔

عنبرین فیض...... ملتان شریف

بڑی امید کے ساتھ آپ کو یہ اپنی زندگی کا سب سے پہلا خط لکھ رہی ہوں۔ میرا یہ خط کرن میں ضرور شامل کیجیے گا۔ میرے خط لکھنے کی وجہ ضوباریہ ساحر کا مکمل ناول "مقید خاک" ہے۔ پلیز آپ ڈاکٹر شکیل ظفر کی شخصیت کو واضح کریں۔ مجھے آخر تک یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ بزرگ ہیں یا نوجوان۔

"دردل" تو ہٹ جارہا ہے۔ حالانکہ نایاب جیلانی میری فیورٹ رائٹر ہیں لیکن ان کا ناول "او رے پیا" میں اتنی جان نہیں ہے۔ "دست کوزہ گر" میں مکمل کو اپنی انا کچھ زیادہ ہی پیاری ہے۔ جس کے لیے وہ خرم جیسے اچھے لڑکے کے ساتھ اچھا نہیں کررہی ہے۔ بے چارے الیان کا کیا قصور ہے۔ اسے ناحق سولی پر لٹکایا جارہا ہے۔ پلیز کوئی اس کی مدد کرے۔

کرن ایک نہایت اچھا رسالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔ (آمین)

کلثوم آصف...... فیض پور

میری طرف سے کرن اسٹاف اور کرن پڑھنے والوں کو پیار بھرا سلام' کرن کے سب ہی سلسلے بہت اچھے ہیں اس میں چھپنے والا ہر ناول' افسانہ و ناولٹ اور سلسلے وار ناول بہت اچھے ہوتے ہیں یا اگر یوں کہہ لیں کہ ہم جیسی لڑکیوں کی تربیت میں ماں کے بعد کرن کا بہت بڑا ہاتھ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ کرن تمام معاشرتی برائیوں اور اچھائیوں کی کھل کر عکاسی کرتا ہے۔

اب بات ہوجائے کرن میں چھپنے والی کہانیوں کی ماشاءاللہ سے کرن ڈائجسٹ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کرن کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

آخر میں ایک بات نایاب جیلانی سے کہ وہ "او رے پیا" کے بعد آتی رہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری دوسری کچھ رائٹر کی طرح وہ بھی غائب ہوجائیں یہ ہمیں قطعی منظور نہیں اب اجازت دیں' اللہ حافظ۔

ام رومان...... عبدالحکیم

کرن پندرہ کو ملا' طویل اور بور ترین دونوں میں کرن کا ساتھ بہت زیادہ اچھا لگا' ٹائٹل گرل بہت پیاری لگ رہی تھی' حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد سب سے پہلے کرن میں اپنی موجودگی کی تسلی کی اس کے بعد فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" پڑھا خرم کا شرط جیت جانا بے حد اچھا لگا'